جرم وفا

محی الدین نواب

مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے دوران بنگالیوں، بہاریوں اور مشرقی پاکستان میں مقیم مغربی پاکستانیوں نے جو المناک صعوبتیں برداشت کیں اور انسانی تاریخ کے جس خونچکاں اور غیر انسانی دور سے وہ گزرے، ماضی کی حکومت نے اس دور کے اذیت ناک واقعات پر پردہ ڈالنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن اب صحافیوں، ادیبوں اور مبصروں کو اظہارِ حقیقت کی مکمل آزادی ہے اور میجر جنرل (ریٹائرڈ) ایم امراؤ خان (ستارۂ پاکستان) اور بریگیڈیر (ریٹائرڈ) عبدالرحمٰن صدیقی نے المیۂ مشرقی پاکستان کا بھرپور عسکری تجزیہ کیا ہے۔ زیرِ نظر کہانی بھی ایک ایسا ہی آئینہ ہے جس میں ہم اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔

نام کتاب : جُرمِ وفا
مصنف : محی الدین نواب
قیمت : تیس روپے
سنِ اشاعت ۱۹۸۵ء
مطبوعہ : ایس . ایس . آفسیٹ پرنٹرس دہلی
ناشر : کتاب والا ۲۷۹۴ ، پہاڑی بھوجلہ دہلی ۶

محی الدین نواب

جرم وفا

میں راقم الحروف محی الدین نواب پیدائشی طور پر بنگالی ہوں۔ آباؤاجداد نسبت سے مدراسی ہوں۔ مشرقی پاکستان میں جب وہاں کے باسیوں نے بہار، یوپی، سی پی، پنجاب، سرحد اور مدراس وغیرہ کے لوگوں کو مجموعی طور پر ماوڑا (بہاری) کہنا شروع کیا تو میں بھی بہاری کہلانے لگا۔ بنگالی لغات میں ماوڑا لفظ نہیں ہے۔ یہ لفظ محض بہاریوں سے نفرت کے اظہار کے لیے تراشا گیا ہے۔ جب ہم اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر کرتے ہیں تو ایک دوسرے کے لیے ماوڑا جیسے نفرت انگیز الفاظ تراش کر لسانی تاریخ میں نئے نئے الفاظ کا اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

یہ ایک فخریہ حقیقت ہے کہ اپنے وطن کی کوئی بات کرتے تو ہم سینہ تان کر خود کو پاکستانی کہتے ہیں اور یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ صوبائی، قومی اور ذات برادری کی برتری ثابت کرتے وقت ہم تقسیم ہو جاتے ہیں خود کو پاکستانی کہنا بھول جاتے ہیں۔ ایسی بھول کا عبرتناک انجام ہمارے سامنے بنگلہ دیش کی صورت میں ہے۔

مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش بننے تک وہاں کے بنگالیوں، بہاریوں، پنجابیوں نے بڑی اذیت ناک صعوبتیں برداشت کی ہیں اور تاریخ کے سب سے خونچکاں اور غیر انسانی دور سے گزرتے آئے ہیں۔ ماضی کی حکومت نے تاریخ کے اس ندامت انگیز دور پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوششیں کیں لیکن موجودہ حکومت نے صحافیوں اور مبصروں کو اظہارِ حقیقت کا حوصلہ دیا ہے۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) ایم امراؤ خان (ستارۂ پاکستان) اور بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) عبدالرحمٰن صدیقی نے المیۂ مشرقی پاکستان کا بھرپور عسکری تجزیہ کیا ہے۔ میں بھی زیرِ نظر کہانی میں عسکری، سماجی اور اقتصادی تجزیہ پیش کر رہا ہوں۔

میں یہ واضح کر دوں کہ یہ داستان موضوع کے اعتبار سے سیاسی ہے لیکن یہ ابتدا سے انتہا تک مکمل رومانی داستان ہے۔ انگڑائیاں لیتی ہوئی، سسکتی اور تڑپتی ہوئی اور پھول کھلاتی ہوئی محبتوں کے پہلو بہ پہلو اسمگلنگ، سازشوں اور تحیر انگیز واقعات کے ایسے چونکا دینے والے سلسلے اس داستان میں ہیں کہ آپ ایک قسط پڑھنے کے بعد دوسری اقساط کا بے چینی سے انتظار کریں گے لیکن آپ پہلی قسط کو یہ سوچ کر پڑھیں کہ ابھی کہانی کی اٹھان ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ کسی کو گولی ماری گئی۔ وہ گولی ایک طرف کی کنپٹی کو توڑتی ہوئی دوسری کنپٹی سے پار ہو گئی اور وہ شخص ابھی اورنگی ٹاؤن (کراچی) میں زندہ ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ ایک شخص کا گلا نرخرے تک کاٹ دیا گیا۔ وہ دوبارہ زندگی حاصل کرنے کے لیے آدھی کٹی ہوئی گردن کے ساتھ اسی میل تک پیدل چلتا رہا۔ وہ سید پور بنگلہ دیش میں آج بھی زندہ ہے۔

میں اس کہانی میں ایسے جتنے ناقابلِ اعتبار کردار پیش کروں گا، ان سب کے نام اور پتے درج کرتا جاؤں گا۔ آپ ان سے مل کر اُن کی میڈیکل رپورٹ وغیرہ پڑھ کر ایمان لے آئیں گے کہ جو بات انسان کے امکان میں نہیں ہے وہ ربِ کریم کے دستِ غیب میں ہے اور ایسے معجزے ہم سب کو ربوبیت پر دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

اس سچی اور ناقابلِ فراموش داستان کو قلمبند کرنے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل حضرات کے اخباری کالموں اور کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے

۱۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) ایم امراؤ خان (ستارۂ پاکستان) ۲۔ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) عبدالرحمٰن صدیقی ۳۔ میاں ظفیر احمد ۴۔ ممتاز مؤرخ ڈاکٹر صفدر محمود کی کتاب "پاکستان ڈیوائیڈڈ"۔ ۵۔ میجر (ریٹائرڈ) معین باری، سابق رکن قومی اسمبلی۔ ۶۔ منظور احمد بحوالہ روزنامہ "جنگ"۔

راقم الحروف

محی الدین نواب

کلثوم نے دودھ سے بھرا ہوا پیالہ اپنی جوان بیٹی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "تارا! یں دودھ پلانے کے لیے ہوتی ہیں لیکن میں تجھے زہر پلا رہی دل۔ نجات کا یہی ایک راستہ رہ گیا ہے۔ اسے پی لے۔"

گر تارا نے اپنی جھکی جھکی پلکیں اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ ب وہ پیدا ہوئی تھی تو اس کی کٹورا جیسی بڑی بڑی سیاہ نکھوں کو دیکھ کر باپ نے کہا تھا "اس کا نام بھی تارا ہونا چاہیے۔"

تارا نے سر گھما کر اپنے ابا جان کو دیکھا۔ وہ خیمے کے یک طرف لکڑی کے صندوق پر ایک مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ خیمے کا ایک پلہ اٹھا ہوا تھا۔ باہر دور تک اور بہت سے خیمے نظر آ رہے تھے۔ ان کے اندر اور باہر مرد، عورتیں اور بچے گھر گرہستی کے سامان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جنیوا ریڈ کراس سوسائٹی کے کارکن ان کے درمیان راشن تقسیم کرتے پھر رہے تھے۔

ابھی تارا کے آگے بھی زہر ملا راشن رکھا ہوا تھا وہ رونے لگی۔ کلثوم نے پوچھا "کیوں رو رہی ہو؟ کیا عزت کی موت سے ڈر لگتا ہے؟"

"امی! موت چاہے کیسی ہی کیوں نہ ہو، زندہ رہنے والوں کو ڈر لگتا ہے۔"

"ہمیں تو ڈر نہیں تھا۔ مجھے دیکھو، اپنے ابا کو دیکھو، ہم نے تمہارے سامنے قسم کھائی ہے جب تم مر جاؤ گی جب ہمیں تمہاری طرف سے اطمینان ہو جائے گا تو ہم بھی اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔"

"آپ کے لیے جان پر کھیل جانا آسان ہے، کیونکہ آپ دونوں اپنی عمر تقریباً گزار چکے ہیں اور میں ابھی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔"

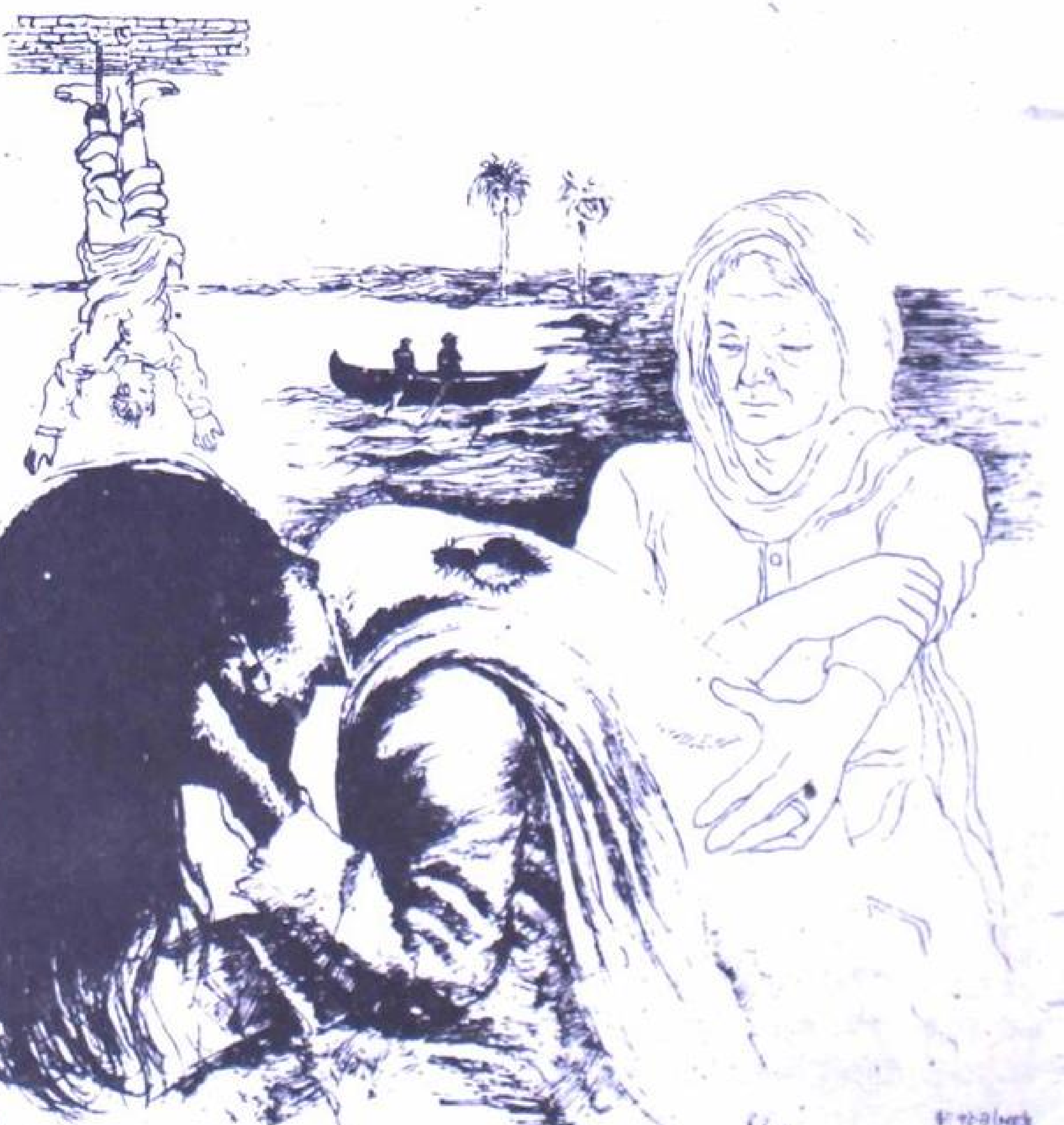

باپ نے سر اٹھا کر بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک معصوم کلی کی طرح تھی۔ ابھی اس کے کھلنے کا موسم آیا تھا۔ اس کے ہاتھ پیلے کرنے کے متعلق وہ سوچتے آ رہے تھے۔ حالات بھی سمجھاتے جا رہے تھے کہ برا وقت آنے والا ہے۔ سب سے پہلی بری خبر سولہ دسمبر کی رات کو سنائی دی۔ ریڈیو سے بار بار اعلان ہو رہا تھا کہ فوج نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی سب لوگوں نے اپنے اپنے گھر کے دروازے اور کھڑکیوں کو اندر سے بند کر لیا تھا۔ تمام مرد، عورتیں، بچے سہمے ہوئے سے تھے۔ رات کو رہ رہ کر جے بنگلہ کے نعرے سنائی دیتے تھے۔ کبھی کبھی بیک فائرنگ ہوتی تھی۔ امیر علی نے نین تارا اور اس کی امی کو تاکید کی تھی کہ وہ فرش پر لیٹی رہیں۔ وہ خود چاروں شانے چت پڑے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے فائرنگ ہو رہی ہے۔ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ کوئی گولی دروازے یا کھڑکی کو توڑ کر آئے گی اور کسی کا قصہ تمام کر دے گی۔

نین تارا پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کو تک رہی تھی۔ باہر سے جے بنگلہ کے نعرے سن کر کانوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے دل میں آپ ہی آپ پاکستان زندہ باد کے نعرے مچل رہے تھے۔ اس نے کروٹ بدل کر پوچھا: "ابا جان! اب کیا ہوگا؟"

وہ سرگوشی میں ڈانٹ کر بولے: "خاموش رہو۔ جوان لڑکی کی آواز خواہ کتنی ہی دھیمی ہو، بندوق کی گولی کی طرح باہر جاتی ہے۔"

وہ چپ رہی۔ سبھی چپ تھے۔ سبھی بے یقینی کے مرحلے سے گزر رہے تھے۔ ان کا یقین محکم کہہ رہا تھا۔ یہ بھیانک رات گزر جائے گی۔ پھر وہ ہمیشہ کی طرح کل بھی پاکستان کی صبح دیکھ سکیں گے۔

اس رات کسی کے سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کی آنکھیں یوں کھلی رہیں جیسے وہ پلک جھپکنا بھول گئے ہوں۔ آدھی رات کے بعد فائرنگ میں کچھ کمی ہوئی۔ انہوں نے فرش پر سے اٹھنے کی ہمت کی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سہمے ہوئے انداز میں کھڑکیوں اور دروازوں کو دیکھتے رہے۔ کبھی کبھی سڑک پر سے بھاری بھرکم گاڑیوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ پھر سناٹا چھا جاتا تھا۔ اس طویل سناٹے کے بعد اچانک ہی فائرنگ کی آواز سنائی دیتی تو وہ خوف سے لرز جاتے تھے۔

صبح ہوتے ہی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اعلان ہونے لگا: "خانص پور کے بہاریوں کو وارننگ دی جاتی ہے کہ جب تک ان کے گھروں کی تلاشی نہ لی جائے اس وقت تک وہ باہر نہ نکلیں۔ جن کے پاس ریوالور، پستول، رائفل یا دوسرے ہتھیار ہیں وہ تھانے میں لا کر جمع کر دیں۔ جو چالاکی دکھائے گا اسے گولی مار دی جائے گی۔"

سب اپنے اپنے گھروں میں بند رہے۔ امیر علی نے آنگن میں آ کر پڑوسی کو آواز دی: "موسیٰ بھائی! کہاں ہو؟ میری آواز سن رہے ہو؟"

دوسری طرف سے موسیٰ بھائی نے کہا: "ہاں سن رہا ہوں مگر کچھ سنا نہیں سکتا۔ سمجھ میں نہیں آتا ہمارا انجام کیا ہوگا؟"

"اپنے انجام سے زیادہ اپنی جوان بیٹیوں کی فکر کرنی چاہیے۔" پڑوسن نے کہا: "بھائی صاحب! لڑکیوں کا سوچ سوچ کر جان آدھی ہو رہی ہے۔ یہ آپ کے بھائی جھوٹی تسلیاں دے رہے ہیں۔ کہتے ہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"کیسے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمارے گھروں کی تلاشی لینے والے دوست نہیں ہو سکتے اور جو دشمن ہوتے ہیں وہ جان و مال کے ہی نہیں عزت کے بھی دشمن ہوتے ہیں۔"

موسیٰ بھائی نے کہا: "سنو امیر بھائی! تلاشیاں لینے والے بیک وقت تمام گھروں کی تلاشیاں نہیں لے سکیں گے۔ ہم یہاں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ وہ لوگ جن گھروں میں آئیں گے ان گھروں کی لڑکیاں پیچھے گندی گلیوں میں چلی جائیں گی۔ وہاں سے وہ دوسرے گھروں میں جا کر چھپ جائیں گی۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

وہ تلاشی لینے والوں کا انتظار کرنے لگے۔ صبح سے دوپہر ہو گئی، کوئی نہیں آیا۔ گھروں کے اندر اور باہر سناٹا چھایا رہا۔ سڑک پر کبھی کبھی گاڑیوں کے گزرنے کی آواز آتی اور کبھی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ پتہ چلا کہ نیو کالونی کی دکانوں کو لوٹا جا رہا ہے۔ جن کی دکانیں تھیں وہ بے چارے گھر سے نکل نہیں سکتے تھے۔

شام کو چند گھروں کی تلاشی لی گئی۔ رات کو پھر وہی تاریکی اور پر ہول سناٹا چھایا رہا۔ عورتیں اور بچے اپنے اپنے گھروں میں سہمے ہوئے بیٹھے رہے۔ مردوں نے احتیاطی تدابیر پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ آنگن کی کچی زمینوں کو کھود کر وہاں چاقو، دوسرے ہتھیار، نقد رقم اور زیورات وغیرہ چھپا رہے تھے تاکہ کسی اور وقت انہیں کام میں لا سکیں۔ جن گھروں کی دیواریں ایک دوسرے سے ملی تھیں وہاں ایک آنگن سے دوسرے آنگن تک کوئی ضروری خبر آسانی سے

پہنچادی جاتی تھی۔ کبھی کسی کے آنگن میں ہمیں سے کاغذ کا ایک گولا آکر گرتا تھا۔ اس طرح ایک گھر والا دوسرے گھر والے کو تحریر کے ذریعے اطلاع فراہم کرتا تھا کہ فلاں گھر کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ ان میں ملاؤں کے ساتھ مکتی باہنی کے غنڈے بھی ہیں اور ان کے پاس خطرناک قسم کے ہتھیار ہیں۔

چار دن تک گھر گھر کی تلاشی لی گئی۔ سب نے ان مکتی باہنی کے خطرناک جوانوں کو دیکھا۔ ابتدا میں ان کی پہچان یہی تھی کہ دور سے ان کی بڑی بڑی زلفیں نظر آتی تھیں، جو کاندھے تک ہوتی تھیں ورنہ ان کا کوئی مخصوص لباس نہیں تھا۔ وہ پتلون اور شرٹ پہنتے تھے یا پھر ہندوستانی فوج کی اترن وردی میں ملبوس رہتے تھے۔ ان کے پاس روسی ساخت کی بندوقیں تھیں جو ایک وقت میں اٹھائیس کارتوس کا ایک راؤنڈ فائر کرتی تھیں۔

پہلے انہوں نے بڑی نرمی سے تلاشی لی۔ پوچھتے رہے کہ انہوں نے اپنا مال کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ وہ ریڈیو، ٹی وی اور دوسرے قیمتی سامان اٹھا کر لے جاتے تھے لیکن انہیں حیرانی ہوتی تھی کہ کسی بھی بہاری کے گھر سے پچاس روپے! سو روپے سے زیادہ نہیں ملتے تھے۔ کسی کے ہاں زیور بھی نظر نہیں آئے۔ یہ یقین کرنے والی بات نہیں تھی کہ وہ کنگال ہیں۔ بنگالیوں کے مقابلے میں بہاری زیادہ دولت مند سمجھے جاتے تھے اور لوٹنے والوں کو دولت نہیں مل رہی تھی۔

آخر انہوں نے جھنجھلا کر کہا: "یہ ماوڑسے بہاری بہت بدمعاش ہیں۔ ان کا دانہ پانی بند کرو۔"

دوسرے دن سے دانہ پانی بند تو نہیں کیا گیا لیکن مہنگائی بڑھ گئی۔ صبح کے وقت آٹا تین روپے سیر تھا وہی آٹا شام کو دس روپے سیر ہو گیا۔ چاول پندرہ روپے سیر کے حساب سے فروخت ہونے لگے۔ مضافاتی علاقوں سے سبزی اور مچھلیاں لا کر بیچنے والے بنگالیوں نے منہ مانگی قیمت وصول کرنا شروع کر دی۔ اب کھانے والے مجبور تھے۔ پیٹ مہنگائی کو نہیں دیکھتا۔ وہ زمین میں چھپائی ہوئی نقد رقم نکال نکال کر خریدنے لگے۔ جو غریب تھے وہ کبھی فاقے کرنے لگے کبھی [illegible] اور ستو سے پیٹ بھرنے لگے۔

ایک ہفتے بعد کھانے پینے کا سامان بیچنے والوں نے پاکستانی روپے لینے سے انکار کر دیا۔ جو بھی مال خریدنے جاتا تھا اس سے کہا جاتا تھا ہندوستانی کرنسی لے کر آؤ۔ یہ اعلان بنگلہ دیشی حکومت کا نہیں تھا، مکتی باہنی کے غنڈوں نے بہاریوں کی چھپی ہوئی دولت نکلوانے کے لیے ہندوستانی کرنسی کی اہمیت بڑھا دی تھی۔ اب پاکستانی نوٹوں کے عوض ہندوستانی نوٹ نہیں ملتے تھے۔ انڈین

گل فروش نے اپنے سامنے سے گزرنے والے ایک نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اپنی محبوبہ کے لیے پھولوں کا ایک ہار لیے جائیے جناب۔"

"میری کوئی محبوبہ نہیں ہے" نوجوان نے جواب دیا۔

"تب اپنی بیوی کے لیے ایک ہار لے جائیے۔"

"افسوس، ابھی تک میں غیر شادی شدہ ہوں۔"

"اے دنیا کے سب سے خوش قسمت انسان!" گل فروش نے نوجوان کی طرف ہار بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تب یہ ہار میری طرف سے اپنی خوش قسمتی کے تحفے کے طور پر بالکل مفت لے جائیے۔"

* * *

ایک روز شاہد میاں اپنے پڑوسی حامد میاں کے باغیچے میں پہنچے اور ادھر ادھر دیکھ کر بولے "تم اس گڑھے میں کیا بو رہے ہو؟"

"چند بیج بو رہا ہوں۔" حامد میاں نے روکھا سا جواب دیا۔

"بیج بو رہے ہو۔" شاہد میاں نے غصے سے کہا "مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے تم میری کسی مرغی کو دفن کر رہے ہو۔"

"تم بھی درست کہتے ہو۔" حامد میاں نے جواب دیا۔ "اور میں بھی درست کہہ رہا ہوں کیونکہ سب بیج تمہاری مرغی کے پیٹ میں ہیں۔"

کرنسی حاصل کرنے کے لیے انھیں اپنے گھر کا سامان اور زیور بیچنے پڑتے تھے۔ اس طرح مٹی میں چھپے ہوئے زیورات بھی نکلنے لگے۔

روٹی ہر دور میں سونے سے زیادہ مہنگی ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ روٹی کو خریدنے کی قوت ہوتی ہے اس لیے اس کی مہنگائی کا احساس نہیں ہوتا لیکن قوتِ خرید کمزور ہو جائے یا ختم ہو جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے سامنے سونا بھی سستا ہے اور اس وقت یہی ہو رہا تھا۔ ہندوستانی فوج کے سپاہی بہاری بستیوں میں گشت کرتے رہتے تھے

بنیے وہاں آتے

تھے اور پچاس روپے تولے کے حساب سے سونا خریدتے تھے اس سے زیادہ وہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مجبوراً پاکستانی ان کی مقرر کردہ قیمت پر سب کچھ فروخت کرنے پر مجبور تھے۔ اگر وہ فروخت نہ کرتے تو انھیں ہندوستانی کرنسی نہ ملتی۔ پھر یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ بنیے خرید کر نہیں لے جائیں گے تو مکتی باہنی کے غنڈے چھین کرے جائیں گے۔ فی الحال ہندوستانی فوجیوں نے ان غنڈوں کو ایسی حرکتوں سے باز رکھا تھا۔

بارہ دن کے بعد جینوا ریڈ کراس سوسائٹی کی امداد پہنچ گئی۔ آٹا، چاول، دودھ، شکر، کپڑے، کمبل اور دوائیں وغیرہ ملنے لگیں۔ اگرچہ تین وقت پیٹ بھر کر کھانے کے لیے راشن نہیں ملتا تھا لیکن اس حد تک اطمینان ہو گیا تھا کہ اب گھر کا بچا کھچا سامان فروخت نہیں کرنا پڑے گا۔ دن کو بھوکے رہیں گے، کوئی بات نہیں رات کو پیٹ بھر کر سوئیں گے۔ ویسے یہ ضروری نہیں ہے کہ پیٹ بھرنے سے نیند آجائے۔ نیند کے لیے لازمی ہے کہ دماغ فکر سے آزاد ہو اور وہ اپنی عورتوں اور جوان لڑکیوں کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ ایک ماہ کے بعد پتہ چلا کہ دور دور رہنے والے بہاریوں کے گھروں سے کتنی ہی لڑکیاں غائب ہو گئی ہیں کتنے ہی بوڑھوں اور جوانوں کو رات کی تاریکی میں گولی مار دی گئی ہے۔ کس کی زندگی کب ختم ہو جائے گی؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ بس وہ اس امید پر جی رہے تھے کہ مغربی پاکستان کے بھائی ان کے لیے فکرمند ہوں گے۔ انھیں امداد پہنچانے یا انھیں اپنے پاس بلانے کی کوشش میں مصروف ہوں گے۔

دو ماہ گزر گئے۔ تیسرے ماہ پتہ چلا کہ دنیا کے مختلف ممالک سے سیاسی اور جنگی مبصرین، اخباری رپورٹر اور فوٹوگرافر وغیرہ آ رہے ہیں۔ ایسے وقت تعلیم یافتہ نوجوانوں نے گھر گھر پہنچ کر مردوں اور عورتوں کو سمجھانا شروع کیا۔ "ہم پاکستانی ہیں۔ ملکی یا غیر ملکی اخبارات کے رپورٹر کوئی بھی سوال کریں تو ہم پاکستانی کی حیثیت سے جواب دیں گے۔"

نعیم الدین خسرو ان پاکستانی جوانوں میں پیش پیش تھا۔ اس نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ نیو کالونی میں اس کی ایک الیکٹریکل گڈز کی دکان تھی۔ اسے بجلی کے کاموں میں مہارت حاصل تھی۔ اگرچہ اس کے پاس کوئی سند نہیں تھی لیکن وہ اچھا خاصا الیکٹریکل انجینئر تھا۔ اس نے امیر علی کے ہاں آ کر پوچھا: "چچا میاں! کیا آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟"

"نہیں بیٹے! میری بیوی اور بیٹی [illegible] پڑوسیوں کے ہاں گئی ہیں۔"

"ہم نے ایک ٹیم بنائی ہے اور ہم تمام لوگوں کو سمجھاتے پھر رہے ہیں کہ ہم پاکستانی تھے۔ پاکستانی ہیں اور پاکستانی رہیں گے۔ کوئی بھی ہم سے سوال کرے تو ہم سب کا ایک جواب ہونا چاہیے۔"

امیر علی نے کہا: "لیکن بیٹے! بنگالی اخبارات یہ تاثر دے رہے ہیں کہ یہاں کوئی پاکستانی نہیں رہا۔"

"لیکن ریڈ کراس سوسائٹی کی یہ رپورٹ جینوا تک پہنچ چکی ہے کہ کسی بہاری نے اپنے مکان کی چھت پر اب تک بنگلہ دیش کا پرچم نہیں لہرایا ہے۔ آپ اپنے آس پاس رہنے والے بزرگوں اور جوانوں کو بلا کر لے آئیں۔ ہم یہاں بیٹھ کر آئندہ کے لیے لائحہ عمل تیار کریں گے۔"

"تم یہاں بیٹھو میں ابھی لوگوں کو بلا کر لاتا ہوں۔"

وہ مکان کا اگلا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ ادھر وہ گیا، ادھر گندی گلی کا پچھلا دروازہ کھل گیا۔ نین تارا کسی پڑوسی کے ہاں سے آ رہی تھی۔ خسرو اگلا دروازہ بند کر رہا تھا۔ آواز سن کر اس نے کمرے کے اندر سے دور آنگن کی طرف دیکھا۔ وہ آتے جاتے کسی لڑکی کو دیکھتا تھا تو نظریں جھکا لیتا تھا۔ اس وقت اس کی نظریں جھک نہ سکیں۔ پہلے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اچھی کیوں لگ رہی ہے جیسی جوان لڑکیاں ہوتی ہیں ویسی ہی وہ بھی تھی۔ بہت سے لوگ پھولوں کو دیکھ کر گزر جاتے ہیں۔ وہی پھول کسی کے جوڑے میں لگا ہو تو نگاہیں ٹھہر جاتی ہیں۔ قدم رک جاتے ہیں۔ در اصل دیکھنے والی نگاہیں وقت اور ماحول کے مطابق کسی نظارے سے متاثر ہوتی ہیں۔ جنگ کے زمانے میں چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ شعلے بھڑک رہے تھے۔ ایسے میں نین تارا ایک ٹھنڈی چاندنی سی لگی۔ بارود کے کان پھاڑ

دینے والے دھماکوں میں وہ ایک سُریلی سرگوشی کی طرح سنائی دی۔ دھواں دھواں فضاؤں میں ایک نور کی کرن کی طرح نگاہوں کے سامنے چلی آئی۔ ویسے وہ اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ البتہ ایک مدت کے بعد اُسے دیکھا تھا اس نے۔

وہ بڑے اطمینان سے آنگن میں آئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اباجان گھر پر نہیں ہیں، کسی کا ڈر نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے دور کمرے کے اندر نہیں دیکھا۔ آنگن سے باورچی خانے کی طرف جانے لگی۔ والدین اپنی جوان بیٹیوں کو کبھی بنا کر دشمنوں کی نظروں سے چھپا نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ان دنوں احتیاطی تدابیر اختیار کرتے تھے۔ انہیں شوخ رنگ کا لباس پہننے نہیں دیتے تھے۔ کنگھی چوٹی سے منع کرتے تھے۔ نین تارا نے میلا سا لباس پہنا ہوا تھا لیکن بدن کا رنگ تو اجلا تھا وہ لباس کی طرح د میلا ہو سکتا تھا نہ اس پر دھبہ لگ سکتا تھا۔ دھبہ بھولے سے لگ جاتا تو وہ چاند کا داغ کہلاتا۔ اس نے کنگھی نہیں کی تھی۔ چوٹی نہیں گوندھی تھی۔ اس کی زلفیں رات کی طرح کالی، آرزوؤں کی طرح گھنی اور انجانی منزل کی مسافت کی طرح لانبی تھیں۔ کوئی بھی مسافر بھٹک جاتا۔ بہتر تھا کہ وہ چوٹی گوندھ لیتی یا جوڑا باندھ لیتی۔ وہ اپنے حسن کو چھپانے کی کوشش میں کچھ اور حسین ہو گئی تھی۔

وہ بھوکی تھی۔ کھانے کے لیے باورچی خانے میں آئی تھی۔ ایک طرف چولہا ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ موری کے پاس جھوٹے برتن رکھے ہوئے تھے۔ وہ ایک پلیٹ کو دھونے کے بعد ہانڈی سے بھات نکالنے لگی۔ اسی وقت اسے آہٹ سنائی دی۔ اس کے اباجان کھڑاؤں پہنتے تھے۔ چلتے تھے تو دور ہی سے ان کی آواز سنائی دیتی تھی۔ جوتا پہن کر چلنے والوں کی چاپ کچھ اور ہوتی ہے۔ نین تارا کو خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے ذرا سر گھما کر دیکھا۔ پھر ایک دم سے چیخ مار کر کھڑی ہو گئی۔ سہم کر پیچھے ہٹنے لگی۔

"ڈرو نہیں۔ میں بہاری ہوں۔ میرا نام نعیم الدین خسرو ہے۔ تم نے وہ الیکٹریکل گڈز کی دکان دیکھی ہوگی۔ وہی جو تمہارے اسکول کے راستے میں پڑتی ہے۔ کوئی ڈیڑھ دو برس پہلے تم ادھر سے اسکول جایا کرتی تھیں مگر تب

آخری تجویز

جب مریض کو ڈاکٹر کی باتوں سے اپنی صحت یابی کے بارے میں پوری ناامیدی ہوگئی تو اس نے اپنے لڑکوں کو وصیت وغیرہ کرنے کے لیے رجوع کیا۔ جب وہ انہیں اچھی طرح تمام ہدایتیں دے چکے تو لڑکوں نے خوشنودی کے لیے اپنی طرف سے یوں اظہار رائے شروع کیا۔ ایک بیٹے نے کہا "پاپا جی! ہم نے آپ جیسا محبت اور شفقت کرنے والا باپ نہیں دیکھا۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم آپ کی تجہیز و تکفین کے انتظام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ آپ یقین کریں کہ آپ کے تابوت کے ساتھ عزیز و اقارب اور پھولوں سے لدی ہوئی کم از کم ایک سو کاریں ہوں گی اور . . . دوسرے بیٹے نے بات کاٹ کر کہنا شروع کیا۔ "ذرا ہوش کی بات کریں۔ پاپا نے اپنی محنت سے جو دولت کمائی ہے کیا آپ لوگ اسے اس طرح ضائع کرنے پر تل گئے ہیں۔ صرف دس کاریں اور چند قریبی عزیز رشتہ دار کافی ہوں گے۔" اس کے چپ ہوتے ہی منجھلا بیٹا بول پڑا "ابھی آپ لوگ خواہ مخواہ خرچ بڑھانے پر مصر ہیں۔ بس دو کاریں ٹھیک رہیں گی۔" سب سے چھوٹے نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا "جی یہ کار والا چکر ہی خرچ کی بات ہے سادگی کا طریقہ ہی مناسب ہے گا یعنی گھوڑا گاڑی۔" یہ تمام گفتگو سن کر مریض مرنے والے نے میٹھے لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا۔ "ابھی کچھ وقت باقی ہے ذرا میرے کپڑے لا دو۔ میں پیدل ہی قبرستان تک چلا جاؤں گا۔"

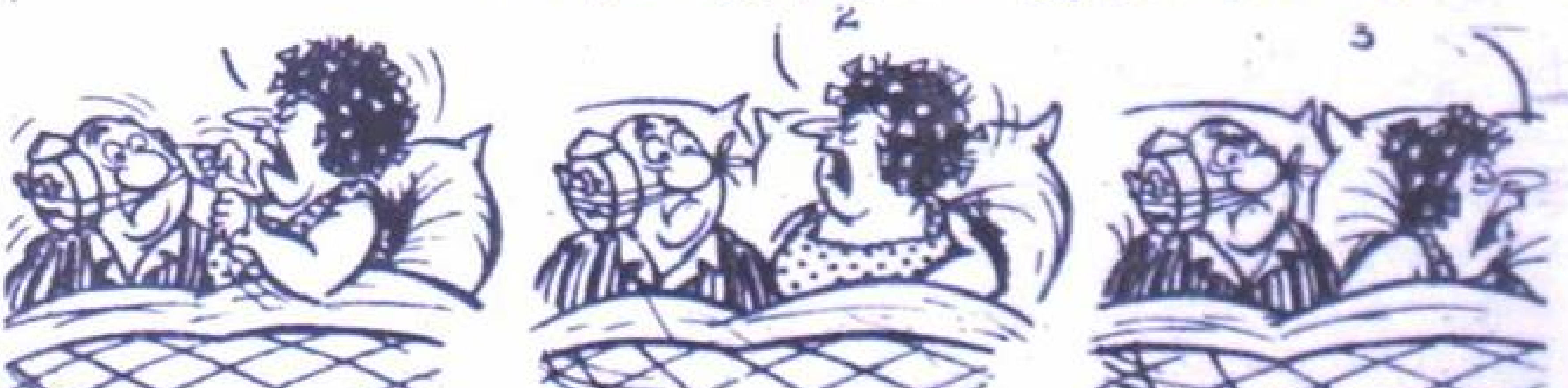

میں اور اب میں بہت فرق ہو گیا ہے۔ میں پہلے تمہیں پہچان نہیں سکا۔ تم تارا ہو؟ نین تارا ہے نا؟"

وہ سہمے ہوئے انداز میں اوپر سے نیچے سر ہلاتے ہوئے بولی: "ہاں مگر تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"تمہارے والد سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔ وہ مجھے یہاں چھوڑ کر پڑوسیوں کو بلانے گئے ہیں۔ ابھی یہاں ایک اہم میٹنگ ہے۔"

وہ چپ چاپ اس کا منہ تک رہی تھی۔ اس نے کہا: "تارا! میں ایک بات کہتا ہوں۔ تمہیں برا لگے گا مگر میں ضرور کہوں گا۔ ابھی تمہیں دیکھ کر میرے دل سے دعا نکل رہی ہے کہ ہماری مائیں بہنیں اور بیٹیاں خوبصورت نہ ہوں۔"

نین تارا کو اپنی امی کی باتیں یاد آ گئیں۔ وہ بھی کچھ ایسا ہی کہتی تھیں: "اری جنم جلی! موسیٰ بھائی کی بیٹی کو دیکھ، کیسی سانولی ہے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور دانت بڑے بڑے ہیں۔ تو بھی ذرا سی بدصورت ہو جاتی تو کیا فرق پڑ جاتا؟ اس بات کا دھڑکا تو نہ رہتا کہ کوئی تجھے اٹھا کر لے جائے گا۔"

خسرو نے کہا: "میں نے بنگلہ میڈیم سے تعلیم حاصل کی ہے۔ بنگالی مجھے بنگالی سمجھتے ہیں اور بہاری مجھے بہاری۔"

نین تارا نے سہم کر پوچھا: "تم کون ہو؟ بہاری؟"

خسرو نے انکار میں سر ہلایا۔ نین تارا نے دوبارہ سہم کر پوچھا: "بنگالی؟"

خسرو نے پھر انکار میں سر ہلا کر کہا: "نہ میں بنگالی ہوں نہ بہاری، صرف پاکستانی ہوں۔"

وہ آگے بڑھا۔ وہ خوف کے مارے پیچھے ہٹی۔ پھر دیوار سے جا کر لگ گئی۔ خسرو نے ادھر ادھر دیکھا۔ جھوٹے برتنوں کے پاس ایک توا اوندھا رکھا ہوا تھا۔ وہ ادھر گیا۔ پھر اس نے جھک کر اپنی دونوں ہتھیلیاں توے پر رکھیں۔ توے کو سہلایا، پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نین تارا کی طرف بڑھتے ہوئے بولا: "میں اگر تم پر کوئی ظلم کروں تو تم زیادہ سے زیادہ چیخ سکتی ہو۔ اگر میں ظالم ہوتا تو تمہارا گلا بھی دبا سکتا ہوں۔ تم چیخنا بھی بھول جاؤ گی۔"

وہ جیسے چیخنا بھول گئی تھی۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔ وہ بالکل قریب چلا آیا تھا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ اس کی ہتھیلیاں توے کی کالک سے سیاہ پڑ گئی تھیں۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں کی ساری سیاہی اس کے چہرے پر مل دی۔

وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ پہلی ملاقات میں دشمن ہی اتنے قریب آتے ہیں اور کسی اچھی نیت سے نہیں آتے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ زندگی میں پہلی بار کسی غیر نے اسے ہاتھ لگایا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر اس کے ہاتھوں کو محسوس کر رہی تھی۔

سیاہی مل کر خسرو پیچھے ہٹ گیا۔ اس سے ذرا دور جا کر کھڑا ہو گیا۔۔۔ اور ایک میلے کپڑے سے اپنے ہاتھوں کی کالک کو صاف کرتے ہوئے بولا۔

"پچیس دسمبر کی رات کو ایک غنڈا غفار ماما کے گھر سے ایک لڑکی کو کھینچ کر لے جا رہا تھا۔ میں نے موقع پا کر اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا، اسے ختم کر دیا۔ اس کی تلاشی لی تو جیب سے صرف ایک ریوالور نکلا۔ اس میں ایک ہی گولی رہ گئی تھی۔ میں نے اس ریوالور کو رکھ لیا۔"

وہ بڑی جرأت سے کام لیتے ہوئے بولی: "تت... تم نے مجھے ہاتھ کیوں لگایا؟"

"میں جو کہہ رہا ہوں چپ چاپ سنو۔ میرے لیے بڑی مشکل ہے۔ میں کھل کر دشمنوں سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ لوگ مجھے بنگالی سمجھتے ہیں۔ میں انہیں خوش فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی ایک ہفتے پہلے کی بات ہے۔ وہ ایک بہاری لڑکی کو اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس طرح اس لڑکی کی عزت بچا سکتا ہوں۔ میرے پاس ریوالور تھا لیکن اس میں صرف ایک ہی گولی تھی۔ جانتی ہو میں نے کیا کیا؟"

وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا: "میں نے اس گولی کو ضائع نہیں کیا۔ جب میں نے دیکھا کہ کسی طرح اس لڑکی کی عزت محفوظ نہیں رہ سکتی ہے تو میں نے لڑکی کو گولی مار دی۔"

وہ دم سادھ کر رہ گئی۔ اسے بے یقینی سے دیکھنے لگی۔ خسرو نے اس کے کالک زدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج میں نے تمہاری صورت بگاڑی ہے۔ کبھی حالات بگڑیں گے تو تمہیں بھی گولی مار دوں گا۔"

وہ دیوار سے لگی ہوئی ایک طرف چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ پھر فوراً ہی پلٹ کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسی وقت اس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھلنے

جب کوئی بچہ یہ پوچھنا چھوڑ دے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور یہ بتانے سے انکار کرنے لگے کہ وہ کہاں جا رہا ہے تو سمجھ لو اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔

گھنٹی بجتے ہوئے ٹیلیفون کو تنہا چھوڑ دینے کے لیے مضبوط قوتِ ارادی کی ضرورت ہوتی ہے اور افسوس کہ ہم میں سے بیشتر افراد کی قوتِ ارادی مضبوط نہیں ہے۔

مجھے ایک بھی ایسی شادی شدہ عورت دکھا دو جو اپنے آپ کو خوش اور مطمئن کہتی ہو۔ میں ثابت کر دوں گی کہ اس سے بڑھ کر کوئی عورت بیوقوف نہیں ہو سکتی۔

لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کے سارے مرد برابر ہیں لیکن ابھی تک اس بات پر اتفاق نہیں ہو سکا ہے کہ آیا عورتیں بھی آپس میں برابر ہوتی ہیں یا نہیں۔

روپیہ آج بھی بولتا ہے لیکن آہستہ آہستہ اپنی آواز کھوتا جا رہا ہے۔

سندھی میں گدھے کو "کھوتا" کہتے ہیں۔ جب سے یہ بات معلوم ہوئی ہے اس مقولے کا مطلب بھی سمجھ میں آگیا ہے کہ جو شخص سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔

کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ابا جان کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہے تھے: "بھئی! تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ وہ اُدھر ہمارے ایک پڑوسی ہیں۔ ان کی طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی۔ ایسی حالت میں انہیں چھوڑ کر آنا مناسب نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگایا ہے۔ بے چارے دمے کے مریض ہیں۔ اب ذرا آرام ہے۔ یہ دیکھو میں ان جان پہچان والوں کو پکڑ لایا ہوں۔ سارے ہی میرے ہم عمر ہیں۔ جوانوں کا کچھ پتہ نہیں ہے، کچھ تمہاری طرح اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ کچھ ایسے بے حس اور بے پروا ہیں کہ کسی گندی گلی میں بیٹھ کر تاش کھیل رہے ہیں۔"

نین تارا اپنے کمرے میں ایک دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھے ابا جان کی آواز سن تو رہی تھی مگر سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہواؤں میں اڑی جا رہی ہو۔ گردن اور چہرے کے آس پاس گرمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اب تک ان ہاتھوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔

دوسرے کمرے سے اس کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا: "غیر ملکی صحافیوں اور دانشوروں کے سامنے اپنے نظریات اور مطالبات پیش کرنے کے تین راستے ہیں۔ ایک تو ہم بیان دیں گے۔ دوسرے تحریر کے ذریعے اپنی آواز ان تک پہنچائیں گے۔ تیسرے یہاں آنے والوں کے سامنے عملی ثبوت پیش کریں گے کہ ہم نے بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا ہے۔"

وہ سن رہی تھی۔ خسرو کی آواز سیدھی اس کے سینے میں آ کر بج رہی تھی۔ اس لیے دل ہی دل میں کہا: "او نہہ! بڑے لیڈر بنتے پھر رہے ہیں۔ دشمن کی ایک گولی چلے گی تو ساری لیڈری ناک کے رستے نکل جائے گی۔ بڑے آئے کالک لگانے والے۔ کس نے کہا تھا کہ آؤ، مجھے دیکھو اور میری صورت سے جل جاؤ۔"

وہ کہہ رہا تھا: "ہم اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر اسکول کے میدان میں جھیل تلا کے پاس رہیں گے۔"

ایک بوڑھے نے کہا: "یہ کیا کہتے ہو۔ ہم اپنا گھر کیوں چھوڑیں؟ ہمارے بچے، ہمارا سامان ان سب کا کیا ہوگا؟"

"ہم عورتوں، بچوں کے ساتھ اپنا سامان لے کر کھلے میدان میں رہیں گے۔ باہر سے آنے والوں کو بتائیں گے کہ ہمارا کوئی گھر نہیں ہے، کوئی بستی نہیں ہے۔ ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل چکی ہے۔ ہم ایک بار پھر مہاجر بن چکے ہیں اور ہم پھر ایک بار پاکستان کی طرف ہجرت کرنا چاہتے ہیں۔"

"بیٹے! تم لوگ جوشیلے اور جذباتی جوان ہو۔ ہم نے دنیا دیکھی ہے۔ بھلا پختہ چار دیواری سے نکل کر کھلے میدان میں جانے کی حماقت کیوں کریں؟ یہاں تحفظ ہے۔ کھلی جگہ تو کہیں سے بھی گولی آ کر لگ سکتی ہے۔"

"بے شک آپ بزرگ ہیں۔ جہاں دیدہ ہیں۔ دشمن

سے محفوظ رہنے کے لیے یقیناً پختہ چار دیواری کی ہی ضرورت پیش آتی ہے لیکن ہم الگ الگ چار دیواریوں میں رہتے ہیں۔ اگرچہ ایک ہی بستی میں رہتے ہیں لیکن ہمارے مکانات ایک دوسرے سے دور دور ہیں۔ رات کی تاریکی میں غنڈے بدمعاش آتے ہیں۔ کسی ایک مکان پر دھاوا بولتے ہیں۔ لوٹ مار کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ہم کھلے میدان میں متحد ہو کر ایک کیمپ میں رہیں گے تو مکتی باہنی کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ ہم متحد ہو کر کم سے کم نقصان اٹھائیں گے۔ دشمن اگر کسی کی بیٹی یا بہن کو اٹھا کر لے جانا چاہیں گے تو سب مل کر ان کے آگے دیوار بن جائیں گے۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ تصور کی آنکھ سے نین تارا نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کے اور دشمن کے درمیان بھی دیوار بن سکتا تھا۔ اس کی حفاظت کر سکتا تھا مگر کس رشتے سے؟

خسرو نے دل ہی دل میں کہا: "انسانیت کے رشتے سے۔ میں دوسری لڑکیوں کے لیے بھی فکر مند رہتا ہوں۔ نین تارا کے لیے بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"

دل نے کہا: "دوسری لڑکیوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ ایک کی حفاظت نہ کر سکے تو اسے گولی مار دی تاکہ وہ عزت کی موت مر جائے اور دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھے۔ کیا نین تارا کو گولی مار سکتے ہو؟"

اس سوال کے بعد ہی نین تارا سہمی ہوئی نظر آئی۔ وہ باورچی خانے کی دیوار سے لگی کھڑی تھی اور خوفزدہ نظروں سے خسرو کو دیکھ رہی تھی۔ کیسی اجلی رنگت تھی۔ خوف سے اس کا سفید چہرہ کچھ زرد پڑ گیا تھا۔ شاید چولھے کی گرمی سے یا موسم کی گرمی سے یا ایک اجنبی کی موجودگی سے پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ حیا سے سرخ پڑ رہی تھی۔ خسرو نے اب سے پہلے اتنے قریب سے ایسا حسن نہیں دیکھا تھا جو بیک وقت چاند کی طرح زرد ہو، اجلی اجلی صبح کی طرح سرد ہو اور حیا کی گرمی سے سرخ ہو۔ نظر آتا ہو مگر خواب سا لگتا ہو۔

وہ مرد آہن تھا۔ اس کے پاس فولاد کا دل اور سپاہی کے بازو تھے مگر وہ انسان بھی تھا اس لیے شاعر کی پرواز رکھتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایک لڑکی اچھی، بہت اچھی لگی تو سپاہی کے اندر بیٹھے ہوئے شاعر نے کہا: "اسے گولی نہیں ماری جا سکتی۔ اس کے لیے گولی کھائی جا سکتی ہے۔"

وہ خیالات سے چونک گیا۔ ایک بزرگ پوچھ رہے تھے "کیا بات ہے بیٹے! تم بولتے بولتے رک کیوں گئے؟ کیا سوچ رہے ہو؟"

"آں۔" اس نے آس پاس خالی خالی نظروں سے دیکھا چند بوڑھے نظر آئے۔ پھر اس کی نظریں بے اختیار اس دیوار کی طرف گئیں جس کے دوسری طرف دوسرا کمرہ تھا اور دوسرے کمرے میں نین تارا دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس دیوار کے پاس آ گئی جو خسرو سے نسبتاً قریب تھی۔ ایسے پردے کی طرح حائل تھی جسے ہٹا کر دیکھ نہیں سکتی تھی مگر سن سکتی تھی۔ وہاں بڑوں کے بزرگ حضرات نہ ہوتے تو وہ ضرور پوچھتی: "تم مجھے گولی مارنے والے کون ہوتے ہو؟ کیا میرے ماں باپ نے مجھے تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے؟"

وہ دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک بڑا سا آئینہ نظر آیا۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہی وہ ایک لمحے کے لیے دم بخود رہ گئی۔ اس نے قریب آ کر آئینے میں دیکھا۔ گویا رنگ کالا ہو گیا تھا۔ چہرے کی گوری رنگت کہیں کہیں جھلک رہی تھی۔ سیاہی پوری طرح نہیں لگی تھی۔ چہرے پر ایک سے زیادہ تل نکل آئیں تو لڑکیاں اسے برداشت نہیں کرتیں۔ گوری رنگت پر کسی طرح کا نشان بیٹھ جائے تو منہ دھو دھو کر اس نشان کو مٹانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایک وہ تھی جو اب تک سیاہی کو برداشت کر رہی تھی۔

دراصل آئینہ دیکھنے سے قبل اسے اس کالک کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا۔ آئینہ دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ کالک تو گنہگاروں کے منہ پر لگائی جاتی ہے۔ اس نے کیا سوچ کر ایسا کیا اور میں نے کیا سوچ کر برداشت کر لیا۔

دراصل وہ کالک لگانے والے سخت اور کھردرے ہاتھ خیالوں میں اسے ستاتے رہے تھے۔ اپنے حسن کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا۔ اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر سوچا۔ یہ کوئی دلیری سی دلیری ہے کہ پہلی ملاقات میں پہنچے تک پہنچ گئے اور یہ بزدلی سی بزدلی ہے کہ میں چپ رہی۔

اس نے ایک انگلی اٹھا کر اپنے رخسار کو چھو کر دیکھا۔ ارادہ تھا پہلے کپڑے سے چہرے کو پونچھے پھر صابن سے منہ دھوئے لیکن اس کی انگلی اپنے رخسار پر ٹھہر گئی ——

وہ سوچتی جا رہی تھی۔ جہاں جہاں گوری رنگت جھلک رہی تھی وہاں ایک انگلی سے کالک کو پھیلاتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ چہرہ پوری طرح کالا ہو گیا۔ صرف دیدے سفید رہ گئے تھے۔ رات کو آئینہ دیکھتی تو اپنے

آپ سے ڈر جاتی۔ تب اس نے تسلیم کیا، دشمن بھی اس سے ڈریں گے تو نہیں لیکن منہ پھیر کر چلے جائیں گے۔

وہ جو آیا تھا وہ بڑا ہنر والا تھا۔ صورت بنائے رکھنے کے لیے صورت بگاڑ کر گیا تھا۔ وہ آئے گا، ہر نفس آئے گا وہ بگاڑے گا بار بار بگاڑے گا۔ دنیا کی ہر عورت اپنے مرد کے ہاتھوں بڑے پیار سے بگڑتی ہے۔ ہاں بگڑتی ہے تب ہی اس کی بن آتی ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ خسرو کے دن بڑی مشکل سے گزر رہے تھے۔ وہ اپنی دکان میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارتا تھا۔ خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہزار مصروفیات کے باوجود وہ روشن آنکھوں اور کالے چہرے والی دھیان میں آجاتی تھی۔ اس کے کالے چہرے کی یاد آتے ہی وہ بے اختیار مسکرانے لگتا تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ کسی بہانے امیر علی کے مکان کی طرف جائے۔ شاید وہ نظر آجائے گی۔ شاید بات کچھ آگے بڑھے۔

لیکن وہ بار بار بہاریوں کے گھروں میں جا کر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اسے بنگالیوں کا اعتماد حاصل تھا۔ دکان کے پیچھے اپنا دو کمروں کا ایک مکان تھا جہاں وہ تنہا رہتا تھا۔ بنگالی دوستوں کی محفل جمتی تھی۔ اس کے دور کے رشتے دار سید پور میں تھے جن سے دور کی صاحب سلامت تھی۔ بچپن میں پہلے اس کی والدہ کا پھر والد کا انتقال ہو گیا۔ پندرہ برس کی عمر تک اس نے رشتے داروں کے رحم و کرم پر زندگی گزاری ـــــ ایک ایک دو دو وقت فاقے کرکے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ جب وہ آٹھویں جماعت میں تھا تو اس کی چچی نے اس پر چوری کا الزام لگایا۔ وہ وہاں سے بھاگ کر کھلنا آگیا۔ کھلنا میں اس نے ایک بجلی کے مستری کے ہاں ملازمت کی۔ اس سے کام بھی سیکھتا رہا اور روزی بھی حاصل کرتا رہا، تعلیم بھی جاری رکھی۔ اس کی مسلسل محنت اور مستقل مزاجی نے اور تعلیمی صلاحیتوں نے آج اسے اس مقام پر پہنچایا تھا۔ آج وہ کسی کا محتاج نہیں تھا اپنی دکان تھی، اچھا کماتا تھا، اچھا کھاتا اور پہنتا تھا۔

چونکہ اردو بولنے والا کوئی رشتے دار اس کے ہاں نہیں آتا تھا۔ اس کے دوستوں میں بنگالیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کے پاس بنگالی میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کا سرٹیفکیٹ موجود تھا اس لیے سب اسے بنگالی سمجھتے تھے۔

ایسی صورت میں وہ ہر وقت بہاریوں سے رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی اس بہانے سے ان کے گھروں کی طرف چلا جاتا تھا کہ شاید وہ کوئی سامان سستا بیچ رہے ہوں تو ان سے خرید کر لے آئے گا۔ اکثر بہاری اس کی دکان میں سامان خریدنے یا بیچنے کے بہانے آتے تھے۔ وہ انہیں بتاتا رہتا تھا کہ مکتی باہنی کے غنڈے کہاں ہیں اور کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ کس طرح بیرونی ممالک سے لوگ یہاں آنے والے ہیں اور اس سلسلے میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔ بہاریوں کے لیڈر جان محمد نے اس سے التجا کی تھی کہ وہ کسی نہ کسی بہانے ان کی بستی میں آئے اور ان کے بڑے بوڑھوں کو سمجھائے ورنہ کوئی اپنا گھر بار چھوڑ کر کیمپ میں رہنے کے لیے نہیں جائے گا۔

ماہرِ نفسیات اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی روزی کمانے کے لیے دوسرے لوگوں کا دماغ استعمال کرتا ہے۔

* * *

دریافت کیا ایک دریافت کرنے والے نے کسی ماہرِ نفسیات سے "میں ایسی لڑکی کو اس کے گھر سے بھگا لے جانا چاہتا ہوں جو چھٹی منزل پر رہتی ہے لیکن میرے پاس اتنی طویل سیڑھی نہیں ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟"

جواب دیا ماہرِ نفسیات نے "کسی دوسری کو، جو نچلی منزل پر رہتی ہو۔ بھگانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

* * *

یہی سمجھانے کے لیے وہ ایک گھر سے دوسرے گھر گیا۔ پھر امیر علی کے گھر پہنچ کر اپنے گھر کا بھی نہ رہا۔ اپنے گھر میں بھی وہی وہ نظر آتی تھی۔ عجیب بات تھی۔ دو برس پہلے جب وہ دکان کے سامنے سے اسکول جایا کرتی تھی تو اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس ایک عام سی اسکول میں پڑھنے والی لڑکی تھی۔ پھر جانے کیا ہوا کہ اس نے اسکول چھوڑ دیا۔ شاید اس نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ تب ہی وہ دو سال سے نظر نہیں آتی تھی اور اب اچانک نظر آئی تو بالکل بدل چکی تھی۔ اتنی بدل چکی تھی کہ اسے بھی بدل رہی تھی۔

پندرہ دن بعد بہت سے بہاری اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر اپنا تمام سامان سمیٹ کر اسکول کے سامنے والے میدان میں جمع ہو گئے تھے۔ ایسے لوگ جو خود مکان مالک تھے یا زیادہ دولت مند تھے وہ اپنی دولت اور جائداد کو چھوڑ کر کیمپ میں رہنا نہیں چاہتے تھے۔ امیر علی،

زیادہ دولت مند تو نہیں تھے لیکن خوشحال تھے۔ ان کے دو بیٹے کراچی گئے ہوئے تھے۔ بڑا بیٹا اچھا خاصا کاروبار کر رہا تھا۔ اسی نے چھوٹے بھائی کو بلا لیا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ ایک سال بعد وہ ماں باپ اور چھوٹی بہن نین تارا کو بھی بلا لیں گے۔ اب اُدھر ان کی کچھ مجبوریاں ہوں گی۔ اِدھر یہ مجبور ہو گئے تھے۔ وہاں دو بیٹے بدستور پاکستانی تھے۔ یہاں بوڑھے ماں باپ اور چھوٹی بہن پھر سے پاکستانی کی حیثیت سے اپنی شناخت کرانے کے لیے کیمپ میں جا رہے تھے۔

خسرو نے ان کا تمام سامان کیمپ میں پہنچا دیا تھا———ریڈ کراس سوسائٹی کی طرف سے خیمے لگائے جا رہے تھے۔ ایک خیمہ امیر علی کے حصے میں بھی آیا اور یہ سب خسرو کی کوششوں سے ہو رہا تھا۔ کلثوم اور امیر علی اسے دعائیں دے رہے تھے۔ نین تارا اسے آتے جاتے دیکھ کر خوش ہو جاتی تھی۔ جی میں آتا تھا، ذرا کنگھی کرے، ذرا صاف ستھرا لباس پہن لے۔ کچھ نہیں تو آنکھوں میں کاجل ہی لگا لے۔ یہی تو بننے سنورنے دیکھنے اور دکھانے کی عمر تھی لیکن اس کی زندگی میں عجب دیکھنے والا آیا تھا جو اسے کالی کلوٹی ہی دیکھنا چاہتا تھا۔

ایک ہفتے کے اندر ہزاروں خیمے نصب ہو گئے تھے اس کے باوجود بہت سے خاندان خیموں کے بغیر کھلے آسمان تلے اپنے سامان کے ساتھ رہ رہے تھے۔ انہیں ریڈ کراس سوسائٹی کی طرف سے یقین دلایا گیا تھا کہ خیمے مہیا کیے جائیں گے یا پھر بانس کی چھت ڈال دی جائے گی۔

ایک رات کلثوم نے امیر علی سے کہا: "سنتے ہیں جی! یہ روز کسی نہ کسی خیمے میں شادی ہوتی رہتی ہے۔ یہ اپنی لڑکیوں کو سہاگن بنائے جا رہے ہیں۔"

"ہاں، شادی ہو رہی ہے۔ مگر کیا وقت آیا ہے۔ نہ گانا نہ بجانا، ڈھولک کی تھاپ بھی بری لگتی ہے۔ چپ چاپ لڑکیوں کا نکاح پڑھا کر لڑکوں کے حوالے کیا جا رہا ہے۔"

"کچھ بھی ہو، لڑکیوں کا بوجھ تو سر سے اتر رہا ہے۔"

"بوجھ اترنے سے کیا ہوتا ہے؟ کیا سہاگن بن جانے سے لڑکیوں کی عزت محفوظ رہ سکتی ہے؟"

"بات ذرا سمجھنے کی ہے۔ لڑکی اگر ماں باپ کے ہاں رہے اور اٹھا لی جائے یا کسی طرح بدنام ہو جائے تو ساری بدنامی ماں باپ کے حصے میں آتی ہے۔ اگر بیاہ دی جائے تو اس کا ذمے دار اس کا شوہر ہو جاتا ہے۔ وہی اس کی حفاظت کرتا ہے حفاظت کرنے میں ناکام رہے تو اپنی بیوی کو کسی طرح کا الزام نہیں دے سکتا۔"

امیر علی نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "ٹھیک کہتی ہو۔ ماں باپ کے گھر میں لڑکی پر الزام نہیں آنا چاہیے۔ الزام آنے سے پہلے ہی اسے اٹھا دینا چاہیے۔"

"یہ لڑکا خسرو بہت اچھا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ہاں اچھا ہے لیکن موسیٰ بھائی اپنے لڑکے کے لیے کہہ رہے تھے۔"

"اسے لعنت بھیجیے اس پر، کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا۔ میں تو اپنی بیٹی کبھی نہ دوں۔"

"لیکن خسرو کی ذات برادری کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ سبھی اسے بنگالی کہتے ہیں۔"

"کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں۔ اس نے مجھے بتایا ہے وہ بہاری ہے۔"

اس سے پوچھو" کیا وہ ہمارے ساتھ پاکستان چلے گا؟"

نین تارا اپنی چارپائی پر چادر اوڑھے، آنکھیں بند کیے یوں پڑی ہوئی تھی جیسے سچ مچ سو رہی ہو لیکن اس کے کان خسرو کا ذکر سن رہے تھے۔ دوسرے دن خسرو نے کلثوم کے سامنے سر جھکا کر کہا: "آپ میری ماں کے برابر ہیں۔ آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ کو دھوکا نہیں دوں گا۔ میں شادی کے بعد یہیں رہوں گا۔"

"کیوں نہیں جاؤ گے؟ تمہیں یہاں کیا ملے گا؟"

"ماں جی! مجھے یہاں سب کچھ ملا ہے۔ میں یہاں کی تہذیب میں رچ بس گیا ہوں۔ میرا کاروبار اچھی طرح چل رہا ہے۔ یہاں کے لوگ میری عزت کرتے ہیں۔ میں پیدائشی طور پر پاکستانی ہوں۔ ہزاروں لاکھوں پاکستانی غیر ملکوں میں روزی کماتے ہیں۔ وہاں رہتے ہیں لیکن پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ میں بھی یہاں رہ کر پاکستان سے محبت کرتا رہوں گا۔"

رات کے وقت امیر علی نے کہا: "میں پہلے ہی کہتا تھا کہ لڑکا اچھا ہے مگر ضدی ہے۔ یہیں رہے گا۔ ہماری بیٹی بھی یہیں رہ جائے گی۔ ہم پھر تقسیم ہو جائیں گے۔ بیٹے اُدھر، بیٹی اِدھر۔"

"سمجھ میں نہیں آتا ہم کیا کریں۔ جوان بیٹوں سے رابطہ ختم ہو گیا ہے۔ کوئی معقول مشورہ دینے والا نہیں ہے۔"

"بھئی مشورہ کیا لینا ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ اس کیمپ میں لڑکوں کی کمی نہیں ہے۔ ماشاء اللہ ہماری لڑکی

لاکھوں میں ایک ہے۔ وہ بھی شادی کے لیے راضی ہو جائے گا اور ہمارے ساتھ پاکستان چلے گا۔"

"یہاں کیمپ میں کوئی اچھا کھانے کمانے والا لڑکا نہیں ہے۔"

"یہاں کوئی نہ کماتا ہو لیکن پاکستان پہنچنے کے بعد وہ ملازمت یا کاروبار کر سکتا ہے۔"

"پہلے لڑکے کا گھر، کاروبار، آمدنی دیکھی جاتی ہے اور یہ سب کچھ خسرو کے پاس ہے۔"

"تم تو خسرو کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ کیا بیٹی کو یہاں چھوڑ کر جانا چاہتی ہو؟"

نین تارا اپنے بستر پر آنکھیں بند کیے سن رہی تھی اور مایوس ہو رہی تھی۔ خسرو سے یہی اختلاف تھا۔ وہ یہاں رہنا چاہتا تھا اور وہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس طرح دریا کے دو کنارے بن کر وہ مل نہیں سکتے تھے۔

امیر علی نے فیصلہ کر لیا۔ نین تارا کی شادی موسیٰ بھائی کے بیٹے سے ہوگی۔ دوسرے دن صبح نکاح کا وقت مقرر کیا گیا۔ ماں باپ نے بیٹی کی رضامندی نہیں پوچھی۔ ان کے ہاں بیٹیوں سے پوچھنے کا دستور نہیں تھا۔ لڑکیوں کی زندگی میں محبت چور دروازے سے آتی ہے اس لیے وہ چور بنی رہتی ہیں۔ زبان سے کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرتیں۔ جرأت ہوتی ہے ہے تو شرم آڑے آتی ہے۔

اس رات نین تارا کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ وہ دوسری صبح سہاگن بننے والی تھی۔ تمام رات بستر پر پڑی رہی۔ ماں نے کہا: "کیوں جاگ رہی ہو، سو جاؤ۔"

وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ کلثوم نے کہا: "میں جانتی ہوں، تجھے دکھ پہنچ رہا ہوگا۔ نہ مہندی کی رسم ادا ہو رہی ہے، نہ ڈھولک پر گیت گائے جا رہے ہیں نہ ہی تیرے لیے ہم سہاگ کا جوڑا تیار کر سکے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد ہم تیری شادی کی تقریب خوب دھوم دھام سے منائیں گے۔"

وہ منہ چھپا کر رونے لگی۔ رات کے گیارہ بجے موسیٰ بھائی نے خیمے کے سامنے آکر آواز دی۔ امیر علی نے کہا۔ "اندر آجاؤ، آپ سے کیا پردہ؟ ہماری بیٹی تو آپ کی بہو ہونے والی ہے۔"

موسیٰ بھائی خیمے کا پردہ ہٹا کر اندر آئے۔ پھر پریشان ہو کر بولے: "میرا اکبر شام کو کچھ خریدنے کے لیے گیا تھا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔"

واقعی پریشانی کی بات تھی۔ اسے تلاش کو کے لیے کوئی کیمپ سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ کوئی دن کے وقت بھی تنہا بازار یا جوڑا گیٹ وغیرہ کی طرف نہیں جاتا تھا۔ کہیں جانا ہوتا تو چار چار چھ چھ کی ٹولیوں میں جاتے تھے۔ موسیٰ بھائی نے کہا: "میں جان کی پروا کیے بغیر اسے تلاش کرنے جا سکتا ہوں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہاں تلاش کروں؟ کس سے پوچھوں کہ وہ کہاں گم ہو گیا ہے؟ میرا دل بڑا گھبرا رہا ہے۔ اس کی ماں نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا ہے۔"

حجام کی دکان میں ایک شخص داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھ کر شیو بنانے کے لیے کہا۔

حجام کے نو عمر نائب نے حجام سے درخواست کی: "ازراہِ کرم مجھے ان صاحب کا شیو بنانے کی اجازت دے دیجیے۔ میری کچھ پریکٹس ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے جاؤ شیو بناؤ۔" حجام نے اپنے نو عمر نائب سے کہا۔ "لیکن ذرا ہوشیاری سے شیو بنانا، کہیں اپنے ہاتھ کو زخمی نہ کر بیٹھنا۔"

نین تارا چادر میں لپٹی ہوئی بستر پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی: "خدایا! کسی کی گود نہ اجڑے۔ مجھے اکبر سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ وہ زندہ سلامت واپس آجائے۔ بس ایک ہی دعا ہے کہ یہ شادی ٹل جائے۔"

صبح ہو گئی۔ اکبر واپس نہیں آیا۔ شادی کا وقت بھی گزر گیا۔ دوپہر کو پتہ چلا، اس کی لاش پھیری گھاٹ کے پاس پڑی ہوئی ہے۔ اس کے ایک ساتھی نے اسے شناخت کیا تھا۔ کسی نے اسے گولی مار دی تھی۔ لاش کو دیکھتے ہی کہرام مچ گیا۔ شادی کے گھر میں ماتم شروع ہو گیا۔ اکبر کی ماں نے سینہ پیٹ پیٹ کر بین کرتے ہوئے کہا۔ "میں پہلے ہی منع کرتی تھی کہ یہ شادی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ بنگالی کا بچہ خسرو دشمنی پر اتر آئے گا۔ دیکھ لو اس نے میرے بچے کی جان لے ہی لی۔"

کلثوم نے حیرانی سے کہا: "اے بہن! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تم اپنی بیٹی کو بار سامنے

سمجھو۔ وہ خسرو سے جلتی ہوتی ہے۔ اس نے رقابت کے مارے مکتی باہنی کے کسی غنڈے سے قتل کرادیا ہے۔"

"دیکھو بہن! تمہیں جوان بیٹے کا صدمہ ہے۔ تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں ہے لیکن میں ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں کہ غصے میں میری بیٹی کو بدنام نہ کرو۔"

ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے سے کیا ہوتا تھا۔ تیر کمان سے نکلا ہوا اور بات زبان سے نکلی ہوئی واپس نہیں آتی۔ یہ بات سارے کیمپ میں پھیلنے لگی۔ یوں تو کیمپ کے پہلے ہی دن سے لوگوں نے خسرو کو امیر علی کے خیمے میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ان کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لاتا رہتا تھا۔ کلثوم نے پہلے کبھی کسی عورت سے کہا تھا کہ لڑکا اچھا ہے۔ پاکستان جانے کے لیے راضی ہوگا تو اسے داماد بنائیں گے۔ یہ بات اس عورت سے دوسری عورتوں میں پھیل گئی تھی پھر سب نے دیکھا تھا کہ خسرو سے طے ہونے والا رشتہ اکبر سے طے ہوگیا تھا اور اب اکبر قتل کردیا گیا تھا۔ اگرچہ پہلے بھی کتنے ہی بہاری نوجوانوں کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا لیکن بات نین تارا کے حوالے سے ہو رہی تھی اس لیے اسے ایک عاشق کا انتقام سمجھا جارہا تھا۔

یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ زبانِ خلق نقارۂ خدا ہو۔ خلق کے اندیشے اور اندازے غلط بھی ہوسکتے ہیں لیکن ان کو غلط ثابت کرنے کے لیے اپنی حمایت میں کچھ کہنے کے لیے خسرو موجود نہیں تھا۔ وہ کئی دنوں سے کیمپ میں نہیں آرہا تھا اس لیے اس کے خلاف رائے عامہ مضبوط ہو رہی تھی۔

نین تارا پریشان ہو کر کبھی خیمے میں بیٹھی رہتی، کبھی خیمے کے باہر آکر دور دور تک دیکھتی۔ اس کا دل کہتا تھا کہ خسرو ایسا نہیں کرسکتا۔ اس کی باتوں سے، حرکتوں سے اور آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اسے چاہتا ہے۔ اس نے چاہت کے اظہار کے لیے شادی پر رضامندی بھی ظاہر کی۔ یہ معاملہ اس بات پر کھٹائی میں پڑ گیا کہ وہ یہیں رہنا چاہتا تھا۔ اب وہ ایسا دیوانہ تو نہیں تھا کہ رشتہ نہ ملنے پر انتقامی کارروائیوں پر اتر آتا اور کسی ایسے شخص کو قتل کر دیتا جس سے اس کی دشمنی نہیں تھی۔

نعیم خسرو خالص پور چھوڑ کر کچھ دنوں کے لیے کھلنا چلا گیا تھا۔ خالص پور میں اسے نیند نہیں آتی تھی۔ بار بار کیمپ کی طرف دھیان جاتا تھا۔ دل اُدھر جانے کو مچلتا تھا۔ وہ کھلنا سے جیسور چلا گیا۔ وہاں بھی اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار پتہ چل رہا تھا، دل کی لگی کیا ہوتی ہے۔ آدمی دور جا کر نئی بستیاں بسا سکتا ہے مگر دل کی بستی، دل والی سے ہی آباد ہوسکتی ہے۔

ایک بنگالی دوست نے آکر بتایا: "نین تارا کی شادی جس لڑکے سے ہونے والی تھی اسے مکتی باہنی کے جوانوں نے گولی مار دی ہے۔"

جسے گولی ماری گئی تھی اسے خسرو نہیں جانتا تھا لیکن ذکر محبوب کا تھا اس لیے وہ نگاہوں کے سامنے مسکرانے لگی۔ اس کے دوست نے پوچھا: "کیا سوچ رہے ہو۔ واپس چلو۔ وہ تمہارے نصیب میں لکھی گئی ہے۔"

"میں ان سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ان کا خاندان دو ملکوں میں تقسیم ہو جائے۔"

"ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ کیا دوسرے لوگ شادی کرنے کے بعد اپنی بیویوں کو دوسرے ملک نہیں لے جاتے ہیں؟ وہاں اپنے ساتھ رکھ کر ملازمت نہیں کرتے ہیں؟ کیا لڑکیاں ماں باپ سے دور ہزاروں میل کے فاصلے پر نہیں رہتی ہیں؟"

"ایسا ہوتا ہے لیکن بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان نفرت کی خلیج ہے۔ یہ خلیج کب پٹے گی ۔۔۔ کب آنے جانے کی سہولتیں ہوں گی، یہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ اگر وہ میری شریکِ حیات بن کر ادھر رہے گی تو اس کا دل اُدھر لگا رہے گا اور میں چاہتا ہوں کہ میری بیوی کا دل صرف میری طرف لگا رہے۔"

"تم اسے بہت چاہتے ہو لیکن یہ بھول رہے ہو کہ مکتی باہنی والے ان میں سے کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے تمہاری نین تارا کو بھی نقصان پہنچائیں۔ تمہیں وہاں رہنا چاہیے۔"

دوست کے سمجھانے پر وہ خالص پور واپس آیا۔ جب وہ جوٹ مل ہاؤسنگ سوسائٹی کے قریب پہنچا تو اس کے محلے کے ایک بنگالی نے اسے دیکھتے ہی کہا: "خسرو میاں! تُومی کوتھائے چھیلے؟ خسرو میاں! تم کہاں تھے؟ مکتی باہنی کے جوانوں نے تمہاری دکان لوٹ لی ہے۔ تمہارے گھر پر قبضہ جما لیا ہے۔"

خسرو یہ سن کر حیران رہ گیا۔ ایسا اب تک نہیں ہوا تھا۔ کسی مکتی باہنی نے کسی بنگالی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ خسرو نے اپنے محلے کے اس بزرگ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"دادو! مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"ہمیں بھی یقین نہیں آ رہا تھا مگر خالص پور میں دور دور تک یہ خبر پھیل گئی ہے کہ تم بنگالی نہیں بہاری ہو۔"

اس نے چونک کر پوچھا "یہ خبر کس نے اڑائی ہے؟"

"تمہارے دو رشتے دار سید پور سے تمہیں تلاش کرتے آئے ہیں۔ وہ مکتی باہنی والوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان کے ذریعے انہیں پتہ چلا کہ تمہارا تعلق سید پور کے ایک بہاری خاندان سے ہے۔"

یہ سنتے ہی اس نے اپنی دکان کی طرف دوڑ لگائی۔ راستے میں اور بھی شناسا ملے۔ محلے کی دو چار عورتوں نے اسے دیکھا تو کسی نے اپنے دروازے بند کر لیے۔ کسی نے دور ہی سے آواز دی "خسرو میاں! اے کی سنتے چھی۔ تو کی بہاری؟ (خسرو میاں! یہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ کیا تم بہاری ہو؟)"

اس نے کسی کی باتوں کا جواب نہیں دیا۔ وہ دکان کے راستے سے اپنے گھر کے اندر جانے لگا تو مکتی باہنی کے دو جوانوں نے اسے پکڑ لیا۔ جب پتہ چلا کہ وہی نصیر الدین خسرو ہے تو وہ اسے کھینچتے ہوئے مکان کے اندر لے گئے۔ وہاں چار مکتی باہنی کے جوان تھے۔ باہر آنگن میں اس کے ایک بوڑھے چچا اپنے جوان بیٹے کے ساتھ اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے حلیے سے پتہ چلتا تھا کہ ان کی اچھی خاصی پٹائی کی گئی ہے۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ بدن پر کئی جگہ زخم کے نشان تھے۔ چہرہ سوجا ہوا تھا۔ چچا نے اسے دیکھتے ہی کہا "بیٹا! دیکھو ہماری کیا حالت ہو گئی ہے۔ یہ ہمیں مار ڈالیں گے۔ خدا کے لیے بچاؤ۔ یہ تمہاری بات مان لیں گے۔ تم تو یہاں بنگالی بنے ہوئے ہو۔"

خسرو نے غصے سے کہا "چچا جان! آپ ذرا اپنے الفاظ پہ غور کریں۔ آپ کی باتیں انہیں گمراہ کر رہی ہیں۔ بنگالی بنے ہونے کا تو مطلب یہی ہوا کہ میں بنگالی نہیں، صرف بہاری ہوں۔ بے شک میں پیدائشی طور پہ پہلے بہاری، پھر پاکستانی اس کے بعد بنگالی ہوں۔ میں نے بنگالی زبان کو بنگالی تہذیب کو اپنایا ہے اور بنگالی سوسائٹی میں دوست بن کر رہتا آ رہا ہوں۔"

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی مکتی باہنی کے ایک جوان نے رائفل کا ایک کندا اس کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا پھر زمین پہ گر پڑا۔ اس نے کہا "بس ہم یہی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ تم پیدائشی طور پر بہاری ہو۔ تم نے خود اپنی زبان سے اقرار کیا ہے۔"

خسرو کے دانت جیسے ہل رہے تھے۔ ایسی سخت ضرب لگائی گئی تھی کہ منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ اس نے پھر بھی ہکلاتے ہوئے کہا "بہاری ہونا کوئی جرم نہیں ہے لیکن بنگالی بننا دوستی کی، محبت کی علامت ہے۔"

وہ سب فوجی جوتے پہنے ہوئے تھے۔ ایک نے جوتے کی نوک اس کے سینے پہ مارتے ہوئے کہا "تم ہمیں بوکا (بے وقوف) بناتے رہے ہو۔ تم بنگالیوں کے دوست نہیں بلکہ بہاریوں کے لیے جاسوس بن کر آتے ہو۔ یہی تو ہم سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ آخر ہم لوگوں کا پروگرام بہاریوں کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔ کیسے ان لوگوں نے ایک ایک کر کے اپنے گھر چھوڑ دیے ہیں اور کیمپ میں جا کر پاکستانی جھنڈا لہرا دیا ہے۔ اب غیر ملکی مبصرین یہاں آئیں گے تو وہ یہی تاثر دیں گے کہ بنگلہ دیش کی زمین پہ آج بھی پاکستان سے محبت کرنے والے اور اس کا پرچم لہرانے والے موجود ہیں۔"

پھر اسے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ ہر طرف سے لاتیں اور جوتے پڑنے لگے۔ کوئی گھونسے مار رہا تھا۔ کوئی بندوق کے کندے سے اسے ضربیں لگا رہا تھا۔ اگر اسے مہلت ملتی تب بھی لوگ اس کا یقین نہیں کرتے کیونکہ اس کے دو بہاری رشتے دار ٹھوس ثبوت کے طور پر یہاں آ پہنچے تھے۔ پھر بھی اس نے خاموشی سے مار کھاتے رہنا گوارا نہیں کیا۔ مارنے والوں کے حملوں کو کبھی روکتا رہا، کبھی جوابی حملے کرتے ہوئے کہتا رہا "میں کسی سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ میں یہیں پیدا ہوا۔ یہیں میں نے بنگالی زبان سیکھی، بنگالی تہذیب کو اپنایا۔ تم جیسے غنڈوں سے ڈر کر زندگی نہیں گزار سکتا۔"

وہ جواب دیتا جا رہا تھا اور سوال کے طور پر وہ حملے کرتے جا رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تھک ہار کر گر پڑا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کے مقابلے میں چھ مسلح دشمن تھے۔ وہ مار کھاتے کھاتے بے سدھ ہو گیا تھا۔ دماغ کام کرنے سے انکار کرنے لگا۔ اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ اسی وقت ایک شخص نے آ کر کہا "خسرو میاں سچ مچ بنگالی ہے لیکن آج کل کسی بہاری لڑکی کی محبت میں گرفتار ہے۔ اس لڑکی کی وجہ سے وہ بہاریوں کی حمایت کر رہا ہے اور ان کو یہاں کی خبریں پہنچاتا رہتا ہے۔"

ایک غنڈے نے پوچھا "کون ہے وہ لڑکی؟"

دوسرے نے پوچھا "کہاں رہتی ہے؟"

تیسرے نے پوچھا "کیا نام ہے اس کا؟"

آنے والے شخص نے جواب دیا: "نین تارا۔"

نین تارا کا نام سنتے ہی خسرو کے اعصاب سمٹ گئے۔ اس کا دماغ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ بے ہوش ہونے لگا۔ پتہ نہیں وہ بے ہوشی کتنی دیر کی ہوتی، اچانک وہ ہڑبڑا کر آنکھیں کھول کر دیکھنے لگا۔ دشمن بالٹی میں پانی بھر کر اس کے منہ پر مار رہے تھے۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ایک نے پوچھا: "کیا نین تارا بنگالی جانتی ہے؟"

اس نے سر جھکا کر سوچنا شروع کیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ نین تارا کیا جانتی ہے کیا نہیں جانتی ہے۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ اپنی نین تارا کو چاہتا ہے۔ دل کی زبان سے اور دل کی آنکھ سے اور دل کسی کی بھاشا، کسی کا مذہب کسی کا عقیدہ اور کسی کے نظریات نہیں دیکھتا۔

وہ تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولا: "مجھے نہیں معلوم ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ بنگالی زبان جانتی ہے یا نہیں۔"

ایک نے کہا: "تم اردو ضرور جانتے ہوگے۔ اسے خط لکھو کہ یہاں تمہارے پاس آجائے۔ تم اس سے شادی کروگے۔"

"محبت فریب سے پاک ہوتی ہے۔ میں جھوٹ بول کر اسے نہیں بلاؤں گا۔"

ایک مکتی باہنی کے جوان نے آگے بڑھ کر اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر سر کو جھٹکتے ہوئے کہا: "ہم جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔ وہ یہاں آئے گی تو تمہاری شادی اس سے کرادی جائے گی۔"

"میں خوب سمجھتا ہوں۔ وہ تم لوگوں کی ہوس کا نشانہ بن جائے گی۔"

اس کے منہ پر ایک زبردست ٹھوکر پڑی۔ وہ پھر زمین پر چاروں شانے چت ہوگیا۔ تکلیف سے کراہتا رہا، درد سے تڑپتا رہا۔ پھر ایک نے کہا: "ایک بہاری لڑکی کے لیے اتنی محبت، اتنی ہمدردی ہے کہ مار کھا رہے ہو، اسے بلانا نہیں چاہتے ہو۔"

دوسرے نے پوچھا: "کیا تم نہیں جانتے کہ اب سے پہلے بنگالی عورتوں پر کتنے مظالم ڈھائے گئے ہیں؟ اگر تم بہاری لڑکی کو ہمارے پاس پہنچا دوگے تو ہم تسلیم کریں گے کہ تم بنگالی ہو اور بنگالی عورتوں کا انتقام لے رہے ہو۔"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا: "نہیں، محبت انتقام لینا نہیں جانتی۔ وہ نفرت نہیں امن چاہتی ہے۔" یہ کہتے کہتے وہ بے ہوش ہوگیا۔ بے ہوشی کے آخری مرحلے پر اسے نین تارا کی صورت نظر آرہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ اسے اپنی طرف بلا رہی تھیں اور وہ بے ہوشی یا خواب کے عالم میں اس کے پاس پہنچ رہا تھا۔

نین تارا بھی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بالکل اپنے سامنے ہو۔ دوپہر کے دو بجے وہ اپنے ابا جان کے ساتھ ہفتے کا راشن لینے کے لیے جینوا ریڈ کراس سوسائٹی کے دفتر میں گئی۔ وہ دفتر اسکول کے ایک کمرے میں تھا۔ اس اسکول میں بنگالی، بہاری، مکتی باہنی اور ہندوستانی فوجی سبھی آتے جاتے رہتے تھے۔ امیر علی اپنی بیٹی کو ادھر لے جانا نہیں چاہتے تھے لیکن ان دنوں بیمار تھے، حالات نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ راشن اٹھا کر لانا ان کے بڑھاپے کے بس میں نہیں تھا اس لیے وہ جوان بیٹی کو ساتھ لے گئے۔

یوں تو کیمپ کی اور بھی جوان عورتیں راشن اور دوائیں لینے کے لیے وہاں جایا کرتی تھیں لیکن کچھ اجنبیوں نے نین تارا کے کانوں میں یہ سحر پھونکنا شروع کیا کہ خسرو اسے یاد کر رہا ہے۔ اس کے لیے تڑپ رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کیمپ میں یہ شادی نہیں ہوسکے گی۔ اس لیے اپنے پاس بلا رہا ہے۔

نین تارا نے جانے سے انکار کردیا حالانکہ دل ادھر کھنچا جا رہا تھا مگر وہ مشرقی تہذیب کی پروردہ تھی۔ اپنے ماں باپ کی عزت داؤ پر لگا کر اپنی قسمت کا فیصلہ نہیں کرسکتی تھی۔ مکتی باہنی کے ایک جوان نے رائفل کو اپنے شانے سے لٹکایا پھر اچانک ہی نین تارا کی کلائی پکڑ لی۔ وہ چیخنے لگی: "بچاؤ، مجھے بچاؤ۔۔۔"

دشمن نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے ایک ذرا جھک کر اپنے کاندھے پر لاد لیا۔ اس کے دو ساتھی اس کے آگے چلنے لگے۔ چند بہاری جوانوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ وہ سب مل کر چیخنے چلانے لگے۔ ان کی آوازیں سن کر کیمپ کے کتنے ہی لوگ دوڑے چلے آئے۔ اچھا خاصا جھگڑا شروع ہوگیا۔ عورتیں بھی زور زور سے چیخ رہی تھیں۔ فریاد کر رہی تھیں۔ اسی وقت سامنے والی سڑک پر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ لڑکی چیخ رہی تھی اور غنڈے اسے گاڑی میں لاد کر لے جا رہے تھے۔ پھر فائرنگ شروع ہوگئی۔ جو جدھر تھا ادھر منہ اٹھا کر بھاگنے لگا۔ ہندوستانی فوج کے سپاہی

گئے تھے۔ جب فوجی آتے تھے تو مکتی باہنی کے غنڈے چپ چاپ چلے جاتے تھے۔ دس منٹ کے اندر ہی ہنگامہ سرد پڑ گیا۔

امیر علی زمین پر اوندھے منہ پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ ایک غنڈے نے ان کے منہ پر زبردست گھونسا رسید کیا تھا۔ وہ چکرا کر گر پڑے تھے۔ اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے گئے تھے مگر بیٹی تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ ان کا سر زمین پر جھکا ہوا تھا۔ آنسو بھرے چہرے سے مٹی چپک رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے: "میں کیسے منہ اٹھاؤں۔ دنیا والوں کو کیا منہ دکھاؤں۔ اب کیمپ والے آئیں گے۔ مجھ سے زبانی ہمدردی کریں گے لیکن آپس میں یہی کھسر پھسر کریں گے کہ وہ درندے جوان لڑکی کی پوجا کرنے نہیں لے گئے ہیں۔ یقیناً اس کی عزت کی دھجیاں اڑا رہے ہوں گے۔"

وہ زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ شرم سے اندر زمین میں گڑنے لگے۔ عورتوں اور مردوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں: "ارے لے گئے۔ وہ بدمعاش رشیدہ کو اٹھا کر لے گئے۔"

کسی عورت نے کہا: "اللہ کرے ان کی ماؤں بہنوں کو بھی کوئی اٹھا کر لے جائے۔ کوئی ان کے بھی جوان بیٹوں کو اذیتیں دے دے کر گولی مارے۔ ہائے، ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ کوئی ہماری مدد کرنے والا، کوئی ہماری فریاد سننے والا نہیں ہے۔"

ہندوستانی فوجی ان فریاد کرنے والی عورتوں اور مردوں کو چپ کرا رہے تھے اور یقین دلا رہے تھے کہ وہ اغوا کی جانے والی لڑکی کو واپس لے آئیں گے۔ امیر علی زمین پر سے اٹھ سکتے تھے۔ تکلیف کم ہو گئی تھی لیکن اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جی یہی چاہتا تھا کہ وہیں پڑے پڑے موت آ جائے۔

اسی وقت ان کے ہاتھ پر ایک نرم ملائم سا ہاتھ آیا۔ پھر بیٹی کی آواز سنائی دی: "ابا جان!"

وہ ایک دم سے چونک گئے۔ سر اٹھا کر دیکھا تو... نین تارا ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ ان کے آس پاس چند عورتیں اور کچھ بوڑھے کھڑے ہوئے تھے۔ ایک عورت نے کہا: "میں مرچیں خریدنے جا رہی تھی، دیکھا کہ بدمعاش نین تارا کو اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔ میں نے مرچوں کا پاؤڈر اس کی آنکھوں میں جھونک دیا۔"

کہا ایک امریکی بیوی نے
اپنے چہیتے شوہر سے: "آج تمہیں
جھوٹے برتن دھونے کی ضرورت
نہیں۔ آج تو تمہاری سالگرہ
ہے۔ انھیں کل کے برتنوں کے ساتھ دھو لینا۔"

ایک بوڑھے نے کہا: "تم نے نین تارا کو بچا لیا مگر دوسرے غنڈے رشیدہ کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ اس ہنگامے سے انہوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔"

ایک اور شخص نے کہا: "کس کی آئی تھی اور کس پر بیت گئی۔ وہ سب نین تارا کو اٹھانے آئے تھے اور بے چاری رشیدہ کو اٹھا کر لے گئے۔"

ایک اور شخص نے کہا: "یہ مصیبتیں صرف اس لڑکی کی وجہ سے نازل ہو رہی ہیں ورنہ غنڈے بدمعاشوں کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس کیمپ میں آ کر بدمعاشی کرتے۔"

یہ باتیں تمام کیمپ میں پھیلنے لگیں۔ کوئی کہتا تھا: خسرو نے نین تارا کو اٹھوانے کے لیے مکتی باہنی کے لوگوں کو بھیجا تھا۔

کہیں سے آواز آتی تھی: جب تک یہ لڑکی کیمپ میں رہے گی، دوسری لڑکیوں کی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔ بدمعاش تو آخر بدمعاش ہوتے ہیں۔ ایک کو نہ لے جا سکے تو دوسری کو لے جاتے رہیں گے۔

بات بڑھتی رہی۔ کیمپ میں ایک پنچایت کمیٹی بنائی گئی۔ اس پنچایت نے فیصلہ سنایا کہ نعیم خسرو سے بات کی جائے۔ اسے بلایا جائے اور سمجھوتے کی کوئی راہ نکالی جائے۔ یا تو خسرو نین تارا کو حاصل کرنے کی ضد سے باز آ جائے یا پھر نین تارا کو اس سے بیاہ کر کیمپ سے رخصت کر دیا جائے۔ ریڈ کراس سوسائٹی کے فادر بنجامن نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں خسرو سے رابطہ قائم کرے گا اور اسے سمجھوتے پر آمادہ کرے گا۔

کلثوم نے ناگواری سے کہا: "میں اپنی بیٹی کبھی اس غنڈے کو نہیں دوں گی۔ جب وہ شادی سے پہلے میری بیٹی کو اٹھوا رہا ہے تو شادی کے بعد کیا کرے گا؟"

سب جانتے تھے کہ بہاری عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ انہیں کلکتہ شہر کے بازارِ حسن سونا گاچھی

پہنچا دیا جاتا تھا۔ جو بہاری کیمپوں میں بنگالی زبان روانی سے بولنا جانتے تھے وہ بنگالی بن کر ایک شہر سے دوسرے شہر آتے جاتے تھے۔ مختلف کیمپوں کے بہاریوں سے رابطہ قائم کرتے تھے۔ کلکتہ تک سفر کرتے تھے اور آنکھوں دیکھا حال قسمیں کھا کر بیان کرتے تھے کہ انہوں نے ہندوستان کے کتنے ہی بازاروں میں بہاری لڑکیوں کو دیکھا ہے۔

یہ سن سن کر جوان لڑکیوں کے والدین کانپ کانپ جاتے تھے۔ اس رات امیر علی نے روتے ہوئے نین تارا کو دیکھا۔ بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر بڑے کرب سے پوچھا: "بیٹی! کیا تم کسی طرح مر نہیں سکتیں؟"

کلثوم نے چونک کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ پھر جوان بیٹی کو دیکھا تو نظریں جھک گئیں۔ وہ بھی کئی دنوں سے، کئی راتوں سے یہی دعائیں مانگ رہی تھی کہ بیٹیوں سے کوئی رابطہ قائم ہو اور نین تارا کراچی پہنچ جائے یا پھر کسی طرح مر جائے۔

ماں کی زبان پر بیٹی کے لیے دعا بھی تھی اور بددعا بھی۔ وہ روتے ہوئے بولی: "ہائے! ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ وقت آئے گا۔ تیری ڈولی اٹھانے کی آرزو تھی تیری میت ہی اٹھانے کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ یہ وقت آنے سے پہلے ہم مر کیوں نہ گئے۔ مریں بھی کیسے؟ جب تک تو ٹھکانے نہیں لگے گی، ہمیں مر کے بھی چین نہیں آئے گا۔"

نین تارا یوں ندامت سے سر جھکائے ہوئے تھی،

جیسے واقعی اس سے زندہ رہنے کا جرم سرزد ہو گیا ہو۔ خیمے کے باہر بارش ہو رہی تھی۔ اندھیرے کیمپ میں دور دور تک لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنا اپنا سامان سمیٹ کر خیموں میں لے جا رہے تھے۔ کہیں کہیں لالٹین کی روشنی تھی۔ جن کے پاس خیمے نہیں تھے وہ بانسوں کی کھپچیوں سے بنائی ہوئی چھت کے نیچے بارش سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے اس لیے اسکول کے برآمدے میں پناہ لینے جا رہے تھے۔ ایسے وقت دور کہیں سے رات کے سناٹے میں دو بار فائرنگ کی آواز سنائی دی۔

وہاں سبھی لوگ فائرنگ کی آواز سنتے رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اب انہیں ڈر نہیں لگتا تھا۔ وہ کان لگا کر سنتے تھے اور سمت کا تعین کر دیتے تھے کہ فلاں سمت سے فائرنگ ہوئی ہے۔ چونکہ دو بار فائرنگ کی آواز دور سے آئی تھی اس لیے سب مطمئن تھے۔ خوف، دہشت، عداوت، نفرت، دکھ اور بیماری کے ماحول میں رہنے والے رفتہ رفتہ خطرے کی گھنٹی سننے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ سمجھ لیتے ہیں کہ جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔ وقت آنے پر بچاؤ کی اپنی سی کوششیں کر لی جائیں گی۔

آدھی رات کو اچانک شور اٹھا: "رضو آ گئی، رضو آ گئی۔"

امیر علی اس وقت اونگھ رہے تھے۔ سونا ہی چاہتے تھے کہ چونک کر اٹھ بیٹھے۔ کان لگا کر آوازوں کو سننے لگے۔ بارش کے شور میں اچھی طرح سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کلثوم نے کہا: "ذرا باہر نکل کر دیکھیں۔ یہ لوگ کیوں چلا رہے ہیں؟"

بڑے میاں نے بستر سے اٹھ کر کھڑاؤں پہنے، سر پر برساتی رکھی۔ پھر لالٹین کی لو اونچی کر کے باہر آ گئے۔ آس پاس کے خیموں سے بھی لوگ اپنی اپنی لالٹینیں لے کر نکل آئے تھے۔ امیر علی نے پوچھا: "کیا ہوا؟ وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"پتہ نہیں۔ آؤ دیکھتے ہیں۔"

وہ اپنی اپنی برساتی اور چھتریاں سنبھال کر ادھر جانے لگے۔ بڑی دھواں دھار بارش تھی۔ لالٹین کی روشنی میں دھواں سی لگ رہی تھی۔ آگے کا راستہ اچھی طرح نظر نہیں آتا تھا۔ وہ مختلف خیموں کے قریب سے گزرتے ہوئے سڑک کے قریب پہنچے۔ وہاں کچھ لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ ان کے درمیان حیات مستری کی لڑکی رضو کھڑی ہوئی تھی۔ حیات مستری جماعت اسلامی کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ اس لیے سترہ دسمبر کی رات کو مکتی باہنی کے جوانوں نے اسے، اس کے جوان بیٹے اور اس کی بیوی کو گولی مار دی، پھر رضو کو اٹھا کر لے گئے۔ تب سے وہ لاپتہ تھی۔ کچھ روز تک اس کا چرچا ہوتا رہا۔ پھر سب نے اسے بھلا دیا کیونکہ سب کو اپنا اپنا دکھ بھاری تھا۔ سب اپنی اپنی فکر سے آدھے ہو رہے تھے۔

ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر لالٹین کو اونچی کرتے ہوئے اسے دیکھا، پھر پوچھا: "بیٹی! یہ تم ہو؟ اتنے دنوں تک کہاں تھیں؟ کہاں سے آ رہی ہو؟"

وہ گم صم کھڑی خلا میں تک رہی تھی۔ پلکیں جھپکانا بھول گئی تھی۔ بارش کی تیز دھار کے باوجود اس کی پلکیں نہیں جھپک رہی تھیں۔ پھر بڑے میاں نے پوچھا: "تم چپ کیوں ہو؟ بولو!"

وہ بولنے لگی۔ اگر نہ بولتی تو اس کے مُردہ ہونے کا گمان ہوتا۔ اس کی آواز جیسے اندھے کنویں سے آ رہی تھی وہ کہنے لگی: ”جوا ڈانگا کی سرحد پر ہمارا بازار لگتا ہے۔ سونا گاچھی کے دلال آتے ہیں اور لڑکیوں کو چھانٹ کر لے جاتے ہیں۔ مجھے بھی وہاں رکھا گیا تھا مگر کسی نے مجھے پسند نہیں کیا۔ میرے منہ پر چیچک کے داغ ہیں۔ میں کالی ہوں۔ وہاں دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں ہمیشہ بدصورت سمجھی گئی اسی لیے کسی نے میری قیمت نہیں لگائی۔“

کسی نے پوچھا: ”اتنے دنوں تک تم کہاں تھیں؟“

وہ ایک بڑی سی چادر لپیٹے ہوئے کھڑی تھی۔ گردن سے نیچے اس کا جسم چھپا ہوا تھا۔ بارش کے شور میں اس کی کربناک آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی: ”میرا کوئی مول نہیں تھا، اس لیے مجھے کبھی کوئی لے جاتا تھا اور کبھی کوئی۔ میں نہیں جانتی کہ کہاں کہاں گئی۔ کہاں کہاں رہی۔ وہ مجھے مارتے تھے، پھر سہلاتے تھے۔ پھر تھوک کر چلے جاتے تھے۔ تھوک کر چلے جاتے تھے۔ تھوک کر چلے جاتے تھے۔۔۔!“

وہ پلکیں جھپکائے بغیر خلا میں تک رہی تھی اور ایک ہی فقرے کو بڑبڑا رہی تھی۔ بڑبڑانے کے دوران اس نے اپنے جسم پر سے چادر ہٹا دی۔ اچانک ہی بادل زور سے گرجے۔ بجلی ایک کڑک دار آواز کے ساتھ چمکی۔ پھر بجھ گئی۔ اس کی لمحاتی چمک میں اس کا ناکردہ گناہ چمک اٹھا

سب کی گردنیں جھک گئیں۔ بارش کا پانی اس کے چیچک زدہ چہرے پر پھسل رہا تھا۔ اسے سر سے پاؤں تک بھگو رہا تھا۔ اس نے چادر کو سنبھال کر دوبارہ اپنے جسم کو چھپا لیا۔ پھر اسی طرح خلا میں تکتے ہوئے، پلکیں جھپکائے بغیر آگے بڑھنے لگی۔ لوگ ایک طرف ہٹنے لگے۔ اب اس سے پوچھنے کے لیے کیا رہ گیا تھا؟ اب تو اس کے سر پر ہمدردی سے ہاتھ رکھنا تھا مگر کون رکھتا؟

کسی نے آگے بڑھ کر نہیں پوچھا۔ اب تم کیا کرو گی؟ اب تم کہاں جاؤ گی؟

نہ پوچھنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ سب بے حس، بے غیرت اور سنگ دل تھے۔ وہ سب یقیناً رضو پر ترس کھا رہے تھے لیکن ان کی اپنی اپنی مجبوریاں تھیں۔ جن کے خیموں میں جوان لڑکیاں تھیں وہ رضو کو وہاں نہیں لے جانا چاہتے تھے اور جن کے ہاں جوان لڑکے تھے وہ بھی رضو کو اپنے ہاں نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ ایک خیمے کے سامنے جا کر رکی۔ پھر وہاں سے آگے بڑھ کر دوسرے خیمے کے سامنے پہنچی۔ اس کے پاؤں کیچڑ میں سنے ہوئے تھے۔ اس کا لباس تربتر تھا۔ وہ ہولے ہولے کھانستے ہوئے تیسرے خیمے کے سامنے گئی۔ وہاں سے پھر ایک اور خیمے کے سامنے پہنچی۔ امن اور خوشحالی کے دور میں بھی لوگ ایسی لڑکیوں کو اپنے گھروں میں جگہ نہیں دیتے۔ اس وحشت و جنوں کے دور میں سب اپنی اپنی بچی کھچی عزت کو سمیٹنے کی فکر میں مبتلا تھے ایسے میں کون اسے اپنے ہاں بلاتا؟

ایک خیمے سے آواز آئی: ”بیٹی! بھیگتی رہو گی تو بیمار پڑ جاؤ گی۔ اسکول کے برآمدے میں چلی جاؤ۔“

بادل گرج رہے تھے ـــــ بجلیاں چمک رہی تھیں۔ ان کے چمکنے سے تاریکی دور نہیں ہو سکتی تھی ـــــ ہمدردی کے ایک بول سے بدنصیبی کا علاج نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک اور خیمے سے کسی نے کہا: ”فادر جنامن بچھانے کے لیے چٹائی اور اوڑھنے کے لیے کمبل دے دیں گے۔ آج کی رات وہاں گزار لو صبح تمہارا کہیں ٹھکانہ بنا دیا جائے گا۔“

آج تک یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جن عورتوں کو شریف محلوں میں جگہ نہیں ملتی۔ انھیں بدنام محلوں میں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ وہ ایسی بدنصیب تھی کہ اسے کسی بازار میں بھی جگہ نہیں ملی تھی۔ یہ کوئی انصاف نہیں ہے، خوشبو نہ ملے تو غلاظت بھی نہ ملے۔ جزا نہ ملے تو سزا بھی نہ ملے۔ آنسو ہوں تو آنسو پونچھنے والا نہ ملے۔ آنکھ ویران ہو تو کوئی رلانے والا نہ ملے۔ اے شہرِ بے خبراں دنیا پرستاں! تم سے یہ بھی نہ ملے وہ بھی نہ ملے تو پھر تمہاری دنیا میں کیا ملے؟ میں پھر پھر کے تھک گئی۔ چلو پاک سرزمین نہ ملے، دو گز زمین تو ملے۔

وہ بھیگتے بھیگتے۔ چلتے چلتے رک گئی۔ ایک قد آور نوجوان نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ چھ ماہ کے عرصے میں جانے کتنے لوگ اس کا راستہ روکتے رہے تھے۔ وہ اعتراض کرنا بھول چکی تھی۔ نوجوان نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے دونوں شانوں پر رکھے۔ وہ کچھ نہ بولی۔ خلا میں تکتی رہی۔ بارش میں بھیگتی رہی۔

نوجوان کے ہاتھ اس کے شانوں پر سے رینگتے ہوئے گردن تک پہنچ گئے۔ شاید وہ گلا دبانا چاہتا تھا۔ وہ چپ رہی۔ جان کے دشمن ہوں یا عزت کے، اس کے لیے اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

کچھ لوگ رضو سے دور رہ کر اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے، یہ منظر دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ آس پاس کے خیموں سے عورتیں جھانکنے لگیں۔ نوجوان کے ہاتھ اس کی گردن پر سے رینگتے ہوئے دونوں رخساروں پر

گئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھام کر کہا: "انسان کو صرف ایک بار مرنا چاہیے اور تم ہزار بار مر چکی ہو۔ اب میں تمھیں مرنے نہیں دوں گا۔"

وہ اب تک جذبات سے عاری تھی۔ چلتی پھرتی تھی مگر بے حس لاش کی طرح تھی۔ نوجوان کی بات سن کر پہلی بار اس کے سپاٹ چہرے سے حیرانی ظاہر ہوئی۔ اس کی آنکھیں سوال کرنے لگیں، جیسے پوچھ رہی ہوں: "یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

نوجوان نے کہا: "اگر آج تمھیں سہارا نہ ملا، اگر آج تمھیں کسی نے گلے نہ لگایا تو تم سے پہلے انسانیت مر جائے گی۔"

پھر وہ یکبارگی زور سے چیخ کر بولا: "اے کیمپ والو! سنو، یہ اکیلی، لاوارث نہیں ہے۔ آج سے میں اس کے آنچل کا محافظ ہوں۔ آج سے برسوں پہلے بہار کے شہر پٹنہ میں اس کی ماں نے اسے پیدا کیا تھا۔ اس ننھی سی بچی کو دیکھ کر اس کی ماں نے ہر ماں کی طرح اس کے دولہا کا سپنا دیکھا ہوگا۔ میں اس کی ماں کے سپنوں سے آیا ہوں۔ یہ آج بھی وہی ننھی سی معصوم بچی ہے اور معصومیت جسم کے پیمانے سے نہیں، خیالات کی پاکیزگی سے قائم رہتی ہے۔"

اس نے اِدھر سے اُدھر دیکھتے ہوئے کہا: "ماؤں، بہنوں، بیٹیوں والو! گواہ رہنا۔ میں رضو کو قبول کر رہا ہوں۔ اس کے بچے کو قبول کر رہا ہوں۔ یہ میری ہے۔ اس کا ہونے والا بچہ بھی میرے نام سے منسوب رہے گا۔"

اچانک رضو کو ایک زور کی ہچکی آئی۔ نوجوان نے اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر پوچھا: "کیا ہوا؟"

وہ کچھ نہ بول سکی۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ اوپر اوپر سانس لے رہی تھی۔ مارے خوشی کے اس کی سانس اٹک رہی تھی۔ اچانک ملنے والی خوشی گلے میں ہڈی کی طرح اٹک جاتی ہے۔

اس کا چہرہ مسرتوں سے مالا مال ہو رہا تھا۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ جیسے کہنا چاہتی ہو، کہہ نہ سکتی ہو۔ ان چند لمحوں میں اس نے اتنا کچھ پا لیا تھا کہ پچیس برس کی زندگی میں بھی نہیں پا سکی تھی۔ پھر اس کا کانپتا ہوا جسم یکبارگی ساکت ہو گیا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ ایک کڑک دار آواز کے ساتھ بجلی چمکی، بادل گرجنے لگے۔ ہوائیں اتنی تیز تھیں کہ خیموں کی طنابیں تھرا رہی تھیں۔ بجلی پھر چمکی پھر بجھی۔ پھر چمکی پھر بجھی۔ وہ چمک چمک کر رضو کے بے نور چہرے کی جھلک کبھی دکھاتی رہی، کبھی چھپاتی رہی۔

ارے ظالم! تو نے غبارے کی گنجائش سے زیادہ ہوا بھر دی۔ ایک بدنصیب کی اوقات سے زیادہ خوشیاں دے دیں۔ یہ کیسا غضب کیا۔ دشمن اسے نفرت سے مارتے آ رہے تھے، نہ مار سکے۔ تو نے محبت سے ایک پل میں مار ڈالا۔

* * *

اس رات کوئی سو نہ سکا۔ یہاں سے وہاں تک تمام خیمے والے جاگتے رہے۔ پچھلے پہر بارش کا زور کم ہو گیا۔ پھر بھی کسی کو نیند نہیں آئی۔ آسمان پر سیاہ بادل اُمڈ اُمڈ کر دھمکیاں دے رہے تھے کہ ابھی اور برسیں گے۔ وہ سب سہمے ہوئے تھے ــــ حالات بھی دھمکیاں دے رہے تھے۔ رضو پہلی لڑکی نہیں تھی۔ اس سے پہلے بے شمار لڑکیوں پر قیامتیں گزر چکی تھیں اور رضو آخری لڑکی نہیں تھی۔ اس کے بعد بھی جانے کتنی لڑکیوں پر سے قیامتیں گزرنے والی تھیں۔

نین تارا خیمے کے اندر لکڑی کے ایک صندوق پر سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ایک کھاٹ پر کلثوم اور امیر علی بیٹھے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔ اب اسے ہی دیکھنا رہ گیا تھا۔ اس کے لیے ہی غم کھانا اور اس کی طرف سے خوف زدہ رہنا مقدر بن گیا تھا۔

بڑی دیر بعد نین تارا نے سر اٹھا کر اپنے والدین کو دیکھا پھر کہا: "رات جا رہی ہے۔ شاید تین بج گئے یا چار بج رہے ہیں۔ آپ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔"

کلثوم نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا: "میں نہیں کھاؤں گی۔ میں اس وقت تک نہیں کھاؤں گی جب تک تُو عزت آبرو سے ٹھکانے نہیں لگے گی۔"

"امی! یہ آپ کی ضد ہے۔ آپ کو کھا لینا چاہیے۔ کتنے ہی پیارے آنکھوں کے تارے مر جاتے ہیں، ماں کے سوگ میں بھوک نہیں لگتی۔ پھر رفتہ رفتہ لگنے لگتی ہے۔"

"تم مرنے والوں کی بات کر رہی ہو۔ رضو مر گئی۔ اس کے اپنے ہوتے تو سوگ میں بھوکے رہتے۔ پھر رفتہ رفتہ انھیں بھوک لگنے لگتی۔ لیکن تم زندہ ہو۔ زندوں کا دکھ آنکھوں کے سامنے زندہ رہتا ہے۔ وہ کم نہیں ہونے پاتا۔"

"دکھ کم کرنے کا ایک راستہ ہے۔"

دونوں اپنی بیٹی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ بولی: "آپ اس سے سمجھوتہ کر لیں۔ وہ بہت اچھا ہے۔ اس نے آج تک مجھ پر کبھی میلی نظر نہیں ڈالی۔"

کلثوم اور امیر علی نے ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھا۔ نظروں ہی نظروں میں باتیں کیں۔ پھر امیر علی نے کہا: "مگر وہ ـــ وہ بنگالی ہے۔"

"نہیں، بہاری ہے۔"

"وہ دوغلا ہے۔ کبھی بہاری بنتا ہے کبھی بنگالی۔"

"ہر قوم کی تہذیب کو گلے لگانے والا، اِس زبان کے بھی اور اُس زبان کے بھی چٹخارے لینے والا انسان دوست ہوتا ہے۔"

کلثوم سر جھکا کر سوچنے لگی۔ امیر علی نے کہا: "جب ہم بیٹی پر کسی کا سایہ پڑنے سے پہلے اس کے مرنے کی تمنا کرتے ہیں تو ہم کیوں

نہ خسرو پر بھروسہ کرلیں؟"

کلثوم نے بیٹی کی طرف دیکھا۔ پھر فیصلہ کن انداز میں کہا "میں نہیں جانتی کہ آپ کس پر بھروسہ کریں گے اور کس پر نہیں، میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ جب تک ہم اس کا صحیح ٹھکانہ نہیں کریں گے یا پھر اسے موت نہیں آئے گی۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

"کہہ تو دیا خسرو سے بات ہو جائے گی۔"

"پہلے بات ہو جائے اس وقت تک ایک دانہ بھی میرے لیے حرام ہے۔"

رات گزر گئی۔ دوسری صبح اس نے چائے بھی نہیں پی۔ امیر علی نے کہا "جب تک خسرو سے کوئی معاملہ طے نہیں ہو گا۔ میں بھی نہیں کھاؤں گا۔"

دن کے دس بجے وہ فادر تھامس سے ملنے کے لیے گئے۔ فادر ایشیائی زبانوں سے واقف نہیں تھے۔ امیر علی انگریزی نہیں جانتے تھے۔ ایک ترجمان نے کہا "فادر کل شام کو خسرو سے ملنے گئے تھے۔ میں خود ان کے ساتھ تھا۔ وہاں آس پاس کے بنگالیوں نے بتایا۔ مکتی باہنی والے خسرو کے گھر میں آئے تھے۔ انھوں نے اس کے چچا اور چچا کے لڑکے کو گولی ماردی۔ بعد خسرو کو خوب مارنے پیٹنے کے بعد کہیں پکڑ کر لے گئے۔ تب سے وہ لاپتہ ہے۔"

خاص پور کے تقریباً سبھی لوگ نعیم الدین خسرو کو جانتے تھے۔ اگر اسے خاص پور کے کسی گھر میں، کسی دفتر میں یا جوٹ مل میں چھپا کر رکھا جاتا تو لوگ اسے ڈھونڈ نکالتے۔ محلے والوں کی درخواست پر پولیس والوں نے بھی اسے تلاش کیا تھا۔ بعد میں یقین سے کہہ دیا "خسرو خاص پور میں نہیں ہے۔ غنڈے اسے یہاں سے کہیں دور لے گئے ہیں۔"

غنڈوں کا دور دورہ تھا۔ نیا نیا جنم لینے والی بنگلہ دیشی حکومت بے دست و پا تھی۔ بی۔ ڈی۔ آر (بنگلہ دیش رائفلز) کا دائرہ عمل بہت محدود تھا۔ وہ ہر جگہ غنڈہ گردی اور افراتفری اور آئے دن کے ہنگاموں پر قابو نہیں پا سکتی تھی۔ پولیس والے بھی بے بس تھے۔ پھر مکتی باہنی نے پاکستان کو دو لخت کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔ اس لیے کوئی ان کے منہ نہیں لگتا تھا۔

خسرو کو ہوش آیا تو آنکھ کھلنے سے پہلے اسے تکلیف کا احساس ہوا۔ بے اختیار اس کے حلق سے کراہیں نکلنے لگیں۔ وہ اس قدر کمزور تھا کہ کراہتے ہوئے بھی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اس نے محسوس کیا وہ زمین پر نہیں ہے۔ کہیں خلا میں جھول رہا ہے۔ بہت آہستہ آہستہ ادھر سے ادھر جھول رہا ہے۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

کچھ نظر نہیں آیا۔ گہری تاریکی میں وہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کچھ نظر نہ آئے تو پہلے ہاتھوں سے ٹٹولا جاتا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھوں کو حرکت دی۔ اپنے آپ کو ٹٹولا۔ اس وقت تک پتہ چل گیا تھا کہ ٹانگیں اوپر ہیں اور سر نیچے۔ دونوں پاؤں رسیوں سے بندھے ہوئے ہیں اور وہ الٹا لٹک رہا ہے۔

وہ بدحواس سا ہو کر سوچنے لگا کیا کرے۔ اس کے ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ہاتھ بڑھا کر اپنی ٹانگوں کو پکڑ لیتا پھر کمر کے بل اٹھ کر پاؤں کی رسی تک پہنچ سکتا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس

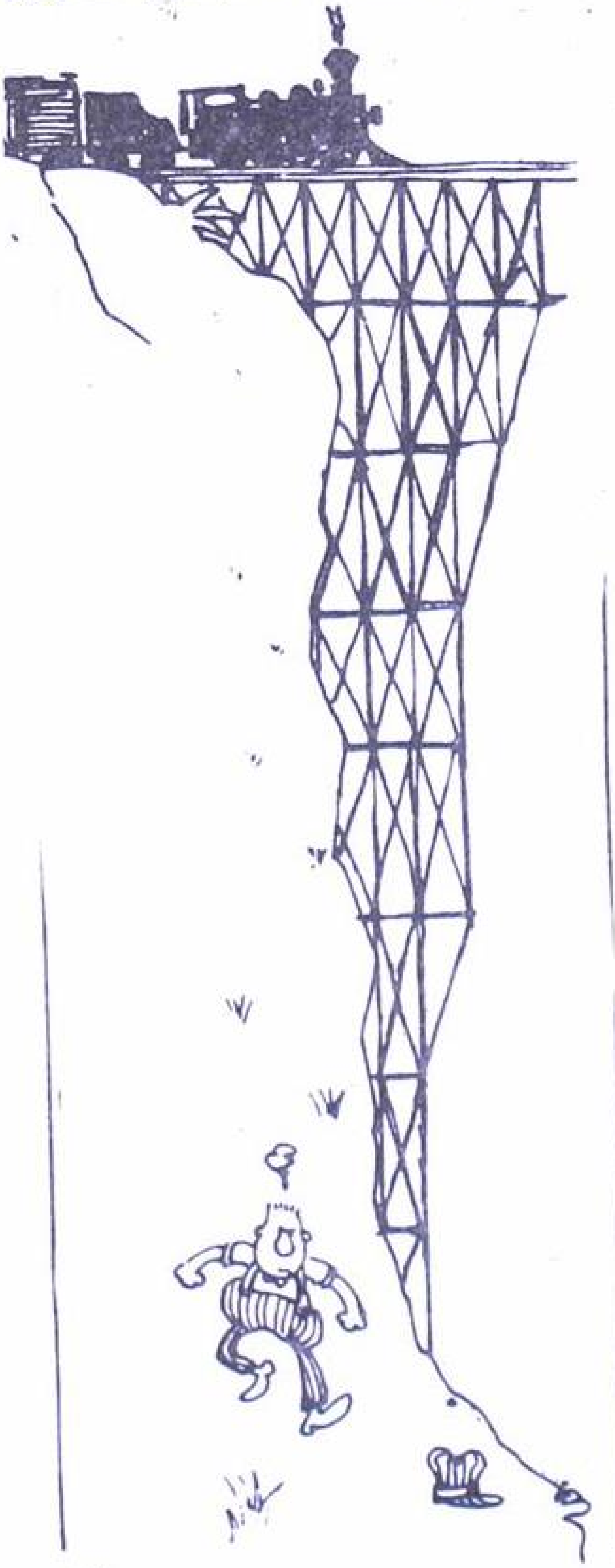

کی سب سے پہلی خواہش یہی تھی کہ وہ سیدھا ہو جائے۔ آدمی اگر شریف اور سیدھا نہ ہو تو آرام سے زندگی گزار لیتا ہے لیکن جسمانی طور پر سر کے بل الٹا رہ کر نہ تو سکون سے رہ سکتا ہے' نہ ہی زندگی گزار سکتا ہے۔

اس کا تمام جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ ظالموں نے بُری طرح پٹائی کی تھی ——— جوتوں سے گھونسوں سے ڈنڈوں سے اور رائفل کے کندوں سے خوب مارا تھا۔ وہ مارتے تھے اور پوچھتے جاتے تھے۔ "بتاؤ، دھن کہاں چھپا کر رکھا ہے؟"

وہ مار کھاتا جاتا تھا اور بولتا جاتا تھا "میرے پاس دولت نہیں ہے۔ میں نے کچھ نہیں چھپایا ہے۔"

"تم خالص پور میں آٹھ برس سے دکان داری کر رہے ہو، اکیلے رہتے ہو۔ تم نے خوب کمایا ہے اور خوب بچایا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ ہم نے تمہارے چچا کو گولی ماری ہے تو تمہیں بھی مار کر قصہ تمام کر دیں گے، نہیں۔ تمہیں اپنی کمائی کا ایک ایک پیسہ ہمارے سامنے لا کر رکھنا ہو گا۔ تبھی تمہاری جان چھوٹے گی۔"

اور اس کی جان نہیں چھوٹ رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ لوگ اُسے پکڑ کر خالص پور سے دو ندی کے پار دولت پور لے آئے تھے اور اسٹار جوٹ مل میں لا کر اس کی پٹائی کی تھی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور اب ہوش میں آنے کے بعد خود کو گہری تاریکی میں الٹا لٹکتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

اس کے پاس دولت تو نہیں تھی لیکن جو کچھ تھا وہ اس کے لیے دولت سے کچھ کم نہیں تھا۔ نقد انڈین کرنسی اٹھارہ ہزار روپے تھی۔ پاکستانی کوئی دس ہزار روپے کے قریب تھے۔ اس کے علاوہ پچیس بھری سونا تھا۔ اس نے یہ سب کچھ اپنی بڑو دیدی (بڑی بہن) کے پاس رکھ چھوڑا تھا۔ اگرچہ اس کی اپنی کوئی سگی بہن نہیں تھی۔ تلسی رام مارواڑی کی دھرم پتنی کو اس نے بڑی بہن بنایا تھا۔ تقریباً پانچ برس سے وہ بھائی بہن کے رشتے کو بڑی محبت سے نباہتے آ رہے تھے۔ ہندو بنیے ہوں یا کسی بھی ملک کا سرمایہ دار ہو۔ کوئی اپنا کاروباری بھید کسی کو نہیں بتاتا لیکن خسرو اور بڑو دیدی میں اتنی محبت تھی کہ وہ چپکے سے بتا دیا کرتی تھی۔

ملک کے سیاسی حالات بگڑنے لگے تو بڑو دیدی نے کہا۔ "تمہیں پتہ ہے۔ یہاں جتنے ہندو مارواڑی ہیں' وہ کماتے پاکستان میں ہیں اور دولت ہندوستان میں جمع کرتے ہیں۔ اب تمہارے جیجا جی مجھے اور بچوں کو ہندوستان بھیج رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے، یہاں جنگ چھڑنے والی ہے۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟"

"دیدی! آپ کو چھوڑ کر رہنے کا جی تو نہیں چاہتا لیکن مجھے اس زمین سے' یہاں کے لوگوں سے محبت ہو گئی ہے۔ ہم سب سمجھ رہے ہیں کہ کچھ ہونے والا ہے اور حالات کچھ زیادہ بگڑ ہی جائیں گے۔ یہ اچھا ہی ہے کہ آپ بچوں کے ساتھ جا رہی ہیں ——— حالات بہتر ہوئے تو ہم پھر ملیں گے۔"

بڑو دیدی نے کہا: "پچیس بھری سونا اور اٹھارہ ہزار روپے میں نے ہندوستان بھیج دیے ہیں۔ تمہارا وہ سب کچھ میرے پاس امانت رہے گا۔ کبھی تم اُدھر آؤ گے تو میں ایک ایک پیسہ ادا کر دوں گی۔ یہاں اپنے جیجا جی سے جب چاہو اپنی ضرورت کے مطابق رقم لے لینا۔"

خسرو نے کہا: "میرے پاس تقریباً دس ہزار روپے ہیں ——— یہ میرے لیے کافی ہیں۔ خدا نہ کرے کہ حالات بدتر ہوں۔ کبھی یہاں کی زمین میرے لیے تنگ ہوئی تو میں آپ کے پاس ضرور آؤں گا۔"

وہ گہری تاریکی میں الٹا لٹکتے ہوئے اپنی بڑو دیدی کو تصور میں دیکھ رہا تھا۔ اسے پچھلی تمام باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس نے مار کھانے کے دوران مکتی باہنی کے غنڈوں سے کہا تھا: "میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ تھا وہ تلسی رام مارواڑی کی دھرم پتنی ہندوستان لے گئی ہے۔ یقین نہ ہو تو تلسی رام کو بلا کر پوچھ لو۔"

ایک غنڈے نے اسے مارتے ہوئے کہا: "چالاک بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم کسی ہندو کے گھر جا کر نہ تو لوٹ مار کر سکتے ہیں، نہ بلیک میلنگ کے ذریعے ان سے رقم وصول کر سکتے ہیں۔ تلسی رام کو تمہاری بابت جا کر کہیں گے تو ہمیں کچھ حاصل نہیں ہو گا اور اگر تلسی رام سے تمہارے پہلے سے دوستانہ تعلقات ہوئے تو وہ تمہیں ہم سے چھڑا کر لے جائے گا۔"

اس کے پاس جو دس ہزار روپے تھے ان میں سے اس نے چار ہزار روپے اپنے پڑوسی سراج الاسلام کے پاس رکھے تھے۔ تقریباً چھ ہزار روپے گھر میں تھے جو مکتی باہنی کے غنڈوں کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ اب وہ باقی رقم بھی اگلوانا چاہتے تھے۔ اگر انہیں سب کچھ مل جاتا تو اسے زندہ نہ چھوڑتے۔ اب تک قتل کر چکے ہوتے۔ اس سے کچھ حاصل کرنے کی امید میں ہی اسے الٹا لٹکا رکھا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک تاریکی میں آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چیخ کر آواز دی: "ایکھانے کیو آچھے؟ آچھے کیو؟ (یہاں کوئی ہے؟ ہے کوئی؟)"

اس کی آواز تاریکی میں دور تک گونجتی گئی۔ مگر زیادہ دیر تک گونج نہ سکی۔ باہر سے موسلا دھار بارش کی آواز آ رہی تھی۔ اس کی آواز کے جواب میں کہیں قریب ہی کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ پھر کسی نے بہت زیادہ سہمے ہوئے انداز میں کہا: "ہم... میں ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ مجھے اپنے گھر

جانے دو۔"

خسرو چند لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "تمہاری زبان اور لہجے سے پتہ چلتا ہے کہ تم بہاری ہو۔"

"نہیں، میں یوپی کا رہنے والا ہوں۔"

"تم یوپی کے ہو یا سی پی کے، بہار کے ہو یا مدراس کے، پنجاب کے ہو یا گجرات کے۔ جو بھی مشرقی پاکستان میں آکر آباد ہو گیا یہاں کے بنگالی اسے بہاری کہنے لگے۔ اس لحاظ سے تم بہاری ہو۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر اس کے کراہنے . . . اور گھگھیانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو اور کہتے ہوئے ڈر رہا ہو۔ خسرو نے کہا۔ "میں دشمن نہیں ہوں۔ تمہاری طرح مظلوم ہوں۔ جب میں یہاں لایا گیا تو جوٹ مل کے اس بائلر روم میں اندر کوئی نہیں تھا۔ یہاں مجھ پر ظلم کیا گیا۔ پھر میں بے ہوش ہو گیا۔ شاید تمہیں میرے بعد لایا گیا ہے۔"

تاریکی سے آواز سنائی دی۔ "یہ لوگ مجھے کھلنا سے پکڑ لائے ہیں۔ جب میں یہاں پہنچا تو رات ہو گئی تھی۔ یہاں اتنا اندھیرا تھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے بہت مارا ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں، جیسے اندھا ہو گیا ہوں۔ کہیں سے ذرا روشنی نظر آجائے تو بینائی کا یقین ہو گا۔"

"کیا تمہارے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں؟"

"نہیں، انھوں نے مجھے یہاں دھکیل کر دروازے کو باہر سے بند کر دیا ہے۔ کہہ رہے تھے۔ میں بھاگنے کی کوشش کروں گا تو مجھے گولی مار دیں گے لہٰذا میرے باپ کے یہاں آنے تک یا ان کا مطالبہ پورا ہونے تک مجھے خاموشی سے رہنا ہے۔"

وہ ذرا چپ ہوا۔ پھر بولا۔ "میں عبداللہ ٹھیکیدار کا بیٹا سلیمان ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے، میرے باپ سے ایک لاکھ روپے طلب کریں گے۔ اگر مطالبہ پورا نہ ہوا تو مجھ کو مار ڈالیں گے۔"

"ان لوگوں نے مجھے اُلٹا لٹکا دیا ہے۔ میرے پاؤں میں رسّی بندھی ہوئی ہے اور یہ رسّی یقیناً اس راڈ سے منسلک ہے جو بائلر کے اوپر ہے۔ جوٹ مل کی چھت بہت اونچی ہے۔ وہ اتنی اونچائی پر مجھے باندھ نہیں سکتے تھے۔ تم کوشش کرو تو میرے پاس پہنچ سکتے ہو۔ مجھے رسیوں سے آزاد کر سکتے ہو۔"

وہ سہمے ہوئے انداز میں بولا۔ "میں تم سے ہمدردی کروں گا تو وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ ایسی آزادی کا کیا فائدہ کہ ہم یہاں سے بچ کر نہ نکل سکیں۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ ہم یہاں سے نہیں نکل سکیں گے۔ شاید جوٹ مل کے باہر وہ لوگ موجود ہوں لیکن میں کب تک الٹا لٹکا رہوں۔ دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا ہے جیسے کلیجہ منہ کو آرہا ہو۔ مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔"

پاکستانی قسم

عشق و محبت کی وہ جذباتی کہانی جس میں ہیرو پوری قوت سے ہیروئن کے منہ پر تھپڑ رسید کرتا ہے اور ہیروئن جوابی تھپڑ رسید کرنے کے بجائے آنکھوں میں آنسو بھر کر گانا گانے لگتی ہے۔

وہ لڑکا پہلے تو سہما رہا۔ پھر خسرو کی التجائیں سن کر اسے اندھیرے میں تلاش کرنے لگا لیکن وہ کیسے ڈھونڈ سکتا تھا۔ وہ اوپر لٹک رہا تھا اور یہ فرش پر چل رہا تھا، دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر راستہ ٹٹول رہا تھا۔ کہیں کسی چیز سے ٹکراتا تھا پھر راستہ بدل دیتا تھا۔

خسرو کی آواز سن کر قریب پہنچتا تھا لیکن وہ اوپر سے اور یہ نیچے سے ہاتھ بڑھا کر ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے تھے۔

دونوں ہی مار کھانے کے بعد نڈھال ہو گئے تھے، کمزور پڑ گئے تھے۔ ذرا دیر کوشش کرنے کے بعد تھک ہار کر اپنی اپنی جگہ رہ گئے۔

وہ رات آخر کسی طرح گزر ہی گئی۔ صبح کی روشنی میں اندر کا منظر دکھائی دینے لگا۔ خسرو نے اس لڑکے کو دیکھا۔ وہ کوئی چودہ پندرہ برس کا ہو گا، ایک طرف فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ خسرو کے آواز دینے سے چونک گیا۔ پھر بولا۔ "میں دیکھ سکتا ہوں۔ میں اندھا نہیں ہوں۔"

"مگر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے۔ میں کتنی دیر تک لٹکا رہوں گا۔ پلیز میری رسیاں کھولنے کی کوشش کرو۔"

اس لڑکے نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم کافی اونچائی پر ہو۔ یہ ایک آدمی کا کام نہیں ہے۔ اوپر چڑھ کر رسّی کھولوں گا تو وہ رسّی چھوٹی ہے۔ اسے پکڑ کر تمہارے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکوں گا۔ تم سر کے بل گر پڑو گے۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ خسرو اِدھر سے اُدھر جھولتے ہوئے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ شاید رہائی کی کوئی صورت نکل آئے مگر کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ دن کے گیارہ بجے چند گاڑیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ آوازیں سنتے ہی خسرو بنگالی زبان میں زور زور سے چیخنے لگا۔ "مجھے بچاؤ، میں بنگالی ہوں۔ مجھے خواہ مخواہ اپنا دشمن سمجھا جا رہا ہے۔ پلیز ہیلپ، ہیلپ . . . ."

تھوڑی دیر کے بعد بائلر روم کا بڑا سا دروازہ کھل گیا۔ خسرو نے الٹی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ بی ڈی آر کے مسلح جوانوں، مکتی باہنی کے مسلح غنڈوں کے ساتھ خالص پور کا تھانیدار انو تلسی رام

نظر آ رہے تھے۔ تلسی رام کو دیکھتے ہی خسرو نے چیخ کر کہا: "جیجا جی! میں یہاں ہوں۔ اوپر دیکھیں۔"

تلسی رام نے اوپر دیکھتے ہی چیخ کر کہا: "وہ دیکھو — ان بدمعاشوں نے اسے وہاں باندھ رکھا ہے۔"

مکتی باہنی کے ایک غنڈے نے کہا: "تلسی رام جی! ہم لوگوں کو بدمعاش مت بولو۔ ان بہاریوں نے بنگالیوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا۔ اب اس کا بدلہ لیا جا رہا ہے۔"

کچھ فوجی جوان آگے بڑھ کر خسرو کو آزاد کرا رہے تھے۔ تلسی رام نے غصے سے کہا: "بکواس مت کرو۔ تم لوگوں کو ہندوستان میں اس لیے ٹریننگ نہیں دی گئی۔ اس لیے یہ ہتھیار نہیں دیے گئے کہ تم ہمارے ہی آدمیوں کو مارنا اور ان کے ذریعے بلیک میل کرنا شروع کر دو۔"

تلسی رام نے خسرو سے پوچھا: "کیوں خسرو! تم نے ان لوگوں کو نہیں بتایا تھا کہ تم ہمارے آدمی ہو؟"

خسرو نے کہا: "میں ان سے بار بار کہتا رہا لیکن انھوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ ایک شخص کہہ رہا تھا کہ تلسی رام کے پاس جائیں گے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا بلکہ آپ مجھے یہاں سے چھڑا کر لے جائیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہی ہو رہا ہے۔"

وہ جوٹ مل کی چھت سے فرش پر پہنچ گیا۔ سیدھا بیٹھ کر اپنے سر کو تھام کر تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ تلسی رام نے قریب آ کر کہا: "تمھیں کیا ضرورت تھی ان بہاریوں سے ہمدردی کرنے کی۔ ان لوگوں کے پاس جاتے رہنے کی وجہ سے تم اس مصیبت میں گرفتار ہوئے ہو۔ یہ لوگ تم پر شبہ کرنے لگے ہیں۔"

خسرو نے فرش پر سے اٹھتے ہوئے پوچھا: "آپ اچھی طرح جانتے ہیں، میں پیدائشی طور پر بہاری ہوں۔ پھر آپ میری مدد کرنے کے لیے یہاں کیوں آئے؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم میری بہن کے منہ بولے بھائی ہو اور میں جانتا ہوں کہ تم ایک بہت اچھے انسان ہو۔"

"یعنی آپ میری محبت میں یہاں آئے ہیں۔ اسی طرح مجھے بھی اپنے بہاری بھائیوں سے محبت ہے۔ اگر میں ان سے ہمدردی کرتا ہوں تو کیا برا کرتا ہوں؟"

تلسی رام نے چند لمحوں تک اسے گھور کر دیکھا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھینچتے ہوئے لے گیا۔ ان لوگوں سے دور آ کر سرگوشی میں بولا: "میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں کبھی یہاں رہتا ہوں کبھی سرحد پار جاتا ہوں۔ اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو میرے ساتھ چلو۔ تمھاری دیدی تمھارے لیے بہت پریشان ہوگی۔"

"نہیں جیجا جی! میں اپنے لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

تلسی رام نے پھر اسے گھور کر دیکھا اور پوچھا: "کیا جو کچھ میں سن رہا ہوں۔ وہ درست ہے؟"

خسرو نے تعجب سے پوچھا: "کیا؟"

"یہی کہ تم کسی بہاری لڑکی سے محبت کر رہے ہو اور اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔"

خسرو نے خاموشی سے سر کو جھکا لیا۔ تلسی رام نے کہا۔ "تم نادانی کر رہے ہو۔ مکتی باہنی کے جوانوں نے تمھارے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ تمھارے محلے کے، پڑوس کے تمام لوگوں نے تمھاری حمایت کی۔ اس کے باوجود یہ تمھیں یہاں قتل کرنے لے آئے۔ میں جانتا ہوں، یہ لوگ بہاریوں کو قتل کرنے یا ان کے ذریعے ان کے رشتے داروں کو بلیک میل کرنے کے لیے کسی بھی خالی گودام یا جوٹ مل میں لے جاتے ہیں۔ جب خالص پور کے تھانیدار نے مجھے تمھارے متعلق بتایا تو میں بی ڈی آر کے جوانوں کو لے کر یہاں پہنچ گیا۔ کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ بی ڈی آر کے جوان اور مکتی باہنی کے جوان اپنے بنگالی بھائیوں کی بات نہیں مانتے ہیں لیکن مجھ ہندو کی بات مانتے ہیں۔ آخر کیوں؟"

خسرو نے کہا: "میں سمجھتا ہوں، یہ لوگ بھارتی حکومت کے احسان مند ہیں۔"

"جب میں کہیں چلا جاؤں گا تو تمھارا کیا ہوگا؟ کیا یہ تمھیں چھوڑ دیں گے؟ ہرگز نہیں۔ اسی لیے تمھیں سمجھا رہا ہوں —— ہندوستان نہیں جانا چاہتے تو کم از کم خالص پور چھوڑ کر ڈھاکہ چلے جاؤ۔ چٹاگانگ چلے جاؤ مگر یہاں نہ رہو۔"

خسرو نے سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر جگہ جگہ زخم کے نشان تھے۔ جسم پر بھی ایسے ہی زخم آئے تھے۔ چہرہ سوج گیا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ تلسی رام نے اسے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا: "میرے ساتھ آؤ۔ تمھیں مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔"

وہ آگے بڑھا۔ خسرو نے اس کے پیچھے چلنا چاہا۔ اسی وقت سر چکرانے لگا۔ بدن میں تھرتھراہٹ پیدا ہوگی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ پھر لڑکھڑا کر گر پڑا۔

* * *

کلثوم نے دودھ سے بھرا ہوا پیالہ زمین تارا کے سامنے رکھتے ہوئے کہا: "تارا! مائیں دودھ پلانے کے لیے ہوتی ہیں۔ آج میں زہر پلا رہی ہوں۔ نجات کا یہی ایک راستہ ہے۔ اسے پی لے۔"

نین تارا نے جھکی جھکی نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو اس کے باپ نے اس کی کٹورا جیسی سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر خوشی سے کہا تھا: "میری بیٹی کا نام نین تارا ہونا چاہیے۔"

وہی باپ اس وقت خیمے کے ایک گوشے میں لکڑی کے صندوق پر سر جھکائے یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اتنی خوبصورت آنکھوں والی بیٹی کا باپ بن کر اس نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہو۔

خیمے کے ایک طرف کا پلّہ اٹھا ہوا تھا۔ باہر دور تک بہت سے خیمے نظر آ رہے تھے۔ بہت سے خاندان ایسے تھے، جو کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر گرہستی کے سامان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں برتن مانجھ رہی تھیں، کھانا پکا رہی تھیں۔ بوڑھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بچے حالات سے بے خبر کھیلوں میں مصروف تھے۔ کچھ نوجوان ایسے بے حس اور بے پروا تھے کہ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ نوجوان لڑکیاں کسی شدید ضرورت کے تحت ہی خیمے سے باہر نظر آتی تھیں۔ ورنہ انھیں سختی سے خیمے کے اندر رکھا جاتا تھا۔ دوپہر کے دو بجے تھے جنیوا ریڈ کراس سوسائٹی کے کارکن ان کے درمیان راشن تقسیم کرتے پھر رہے تھے۔

نین تارا کے درمیان بھی کٹورے میں زہریلا راشن رکھا ہوا تھا۔ وہ رونے لگی۔ ماں نے پوچھا: "کیا عزت کی موت سے ڈر لگتا ہے؟"

"امی! موت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ زندہ رہنے والوں کو ڈر لگتا ہے۔ کوئی بھی ہوش مند صرف ایک بار ملنے والی زندگی کو یوں ہی ضائع نہیں کرتا۔"

"تو پھر ہوش مند بنی رہ۔ ہم تیرے سامنے بھوکے رہ کر جان دے دیں گے۔"

"مجھے زہر پلانے والی بات خیمے سے باہر جائے گی تو لوگ حیران رہ جائیں گے۔ کیا ایسا کبھی ہوا ہے کہ اولاد کو اپنے ہاتھ سے مارا گیا ہو؟"

"تو ابھی بچی ہے۔ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہیں۔ جب..... پاکستان بنا، تب بھی ہندو مسلم فسادات کے دوران کتنی ماؤں نے اپنی بیٹیوں کو عزت سے موت کی نیند سُلا دیا تھا۔"

امیر علی نے ایک گہری سانس لے کر شکست خوردہ لہجے میں کہا: "میں یقین سے کہتا ہوں۔ آج تم عزت سے جان دو گی اور ہم بھی مر جائیں گے تو دوسری لڑکیوں کے والدین سنجیدگی سے ہماری تائید کریں گے کہ عزت دینے سے جان دینا زیادہ بہتر ہے۔"

"ابا جان! اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ میری موت عزت کی موت کہلائے گی، کیا آپ میری لاش کی نمائش کریں گے؟"

امیر علی نے حیرانی سے پوچھا: "یہ کیسا سوال ہے؟"

"ہم بہاری لڑکیاں بدنام کی جا رہی ہیں۔ کیمپ میں یہی چرچا ہے کہ ہندوستان کے بدنام علاقوں میں لڑکیوں کو پہنچایا جا رہا ہے۔ میں مر جاؤں گی تو میرے متعلق بھی یہی باتیں ہوں گی۔ کیا آپ کے پاس کوئی کیمرہ ہے کہ میرے زہر پی کر مرنے کے دوران فلم تیار کریں گے اور دنیا والوں کے سامنے پیش کریں گے؟ کیا یہاں کوئی مؤرخ اپنے قلم سے ہمیں تاریخ کا ایک محترم حصہ بنا رہا ہے؟ کیا یہاں کوئی مرثیہ گو ہم پر مرثیہ لکھ رہا ہے؟ اگر یہ سب کچھ نہیں ہے تو ہم اس طرح جان کیوں دیں کہ ہمارے بعد ہماری بدنامی ہو۔ ہم اپنی جان و مال اور عزت کے دُشمنوں سے لڑتے ہوئے اور ان پر تھوکتے ہوئے کیوں نہ جان دیں؟"

"یہ بات سُننے سنانے میں اچھی لگتی ہے لیکن جن پر گزر رہی ہے، وہی اپنے صدمات کو اور اپنے اندیشوں کو زیادہ سمجھتے ہیں اور اس کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔"

"امی! کچھ بھی ہو۔ میں حرام موت نہیں مروں گی۔"

کلثوم اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ پہلے اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر سر ہلا کر کہا: "میں غلطی پر تھی۔ بھلا میں کون ہوتی ہوں، کسی کو مرنے کا مشورہ دینے والی۔ اپنی سگی اولاد سے بھی ہم اس کی توقع نہیں کر سکتے۔ عزت ہمیں پیاری ہے۔ ہم جان دیں گے۔"

اس نے پیالے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہا: "تم نہ پیو۔ یہ میرے لیے ہے۔"

نین تارا نے ماں کے ہاتھوں پہ ہاتھ رکھ دیے: "نہیں امی! زہر میرے لیے ہے تو آپ کے لیے بھی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے لیے مریں گے نہیں، زندہ رہیں گے۔"

"بے حیا زندگی تمھیں مبارک ہو۔ چھوڑ دو میرا ہاتھ۔"

"امی! صرف اندیشوں کے ڈر سے مرنا دانشمندی نہیں ہے۔"

وہ پیالے کو اپنی طرف کھینچنے لگیں۔ دودھ چھلکنے لگا۔ وہ غصے سے بولیں: "تو مجھے پینے نہیں دے گی تو کیا زبردستی کھانا بھی کھلا دے گی۔ میں کل سے بھوکی ہوں۔ اسی طرح بھوکی رہ کر مر جاؤں گی۔"

اس کی باتوں کے دوران نین تارا نے پیالے کو چھین لیا۔ دودھ

چھلک کر ادھر سے ادھر گرا۔ باقی جو رہ گیا، اسے کٹورے سمیت مٹی میں پھینک دیا۔ کلثوم پہلے تو سکتے کے عالم میں اسے دیکھتی رہی پھر تڑاخ سے اس کے رخسار پر طمانچہ رسید کر دیا۔ "ذلیل! کمینی! میں تیری بے حیائی کو خوب سمجھتی ہوں۔ تجھے یقین نہیں ہے کہ ان لوگوں نے خسرو کو کہیں لے جا کر مار ڈالا ہے، تو اس کا انتظار کر رہی ہے۔ میں کہتی ہوں، وہ مر چکا ہے۔ وہ مر چکا ہے۔ اگر نہیں مرا تو اللہ کرے اب مر جائے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی باہر سے شور سنائی دیا۔ لوگ کہہ رہے تھے "خسرو آ گیا۔ خسرو آ گیا۔" ایک چھوٹا سا بچہ دوڑتا ہوا خیمے میں آیا۔ پھر ہانپتے ہوئے بولا "تارا باجی! تارا باجی! آپ نے کہا تھا نا کہ خسرو بھائی آئیں گے تو آپ گڑ اور چنے کھلائیں گی۔"

تارا ایک دم سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس لمحے اسے ہوش نہ رہا کہ وہ ایک جوان لڑکی ہے اور اسے خسرو کی آمد پر والدین کے سامنے خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے لیکن بعض خوشیاں بے اختیار دھاوا بولتی ہیں۔ اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔ وہ دوڑتے ہوئے خیمے سے باہر آ گئی۔ یہ بھی بھول گئی کہ پردہ واجب ہے اور کیمپ کی لڑکیوں کو خاص طور پر چھپا کر رکھا جاتا ہے مگر یہ بھی سچ ہے، پھول کو گلدان میں قید کرو تب بھی خوشبو اڑنے سے باز نہیں آتی۔

کیمپ کے سارے ہی لوگ خیموں سے نکل آئے تھے جو لیٹے ہوئے تھے وہ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ جو بیٹھے ہوئے تھے اٹھ کر ادھر جا رہے تھے جدھر سے لوگ ایک چھوٹے سے جلوس کی شکل میں چلے آ رہے تھے۔ ان کے درمیان خسرو تھا۔ اسے دیکھتے ہی نین تارا کے قدم رک سے گئے۔ جہاں تھی، وہیں ٹھہر گئی۔ حالانکہ منہ زور ندی کی طرح بہنے نکلی تھی لیکن اتنے لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر پاؤں میں حیا کی زنجیر پڑ گئی۔

جو لوگ خسرو کو دشمن سمجھتے تھے، اس پر طرح طرح کے الزامات عائد کر رہے تھے۔ اب وہی اسے اپنے ساتھ لیے آ رہے تھے۔ دشمنی اچانک ختم ہو گئی تھی۔ دوستی اور ہمدردی کا جذبہ ظاہر ہو رہا تھا۔ خسرو کے ظاہری حلیے نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ بھی ان کی طرح مظلوم ہے اور وہ بھی مکتی باہنی کے غنڈوں کا شکار ہو چکا ہے۔

اس کے سر پر اور ہاتھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔۔ چہرے پر جا بجا زخموں کے نشان تھے۔ ان پر مرہم لگا ہوا تھا۔ آنکھیں پھولی ہوئی تھیں۔ چہرہ بھی سوج گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ ظالموں نے اسے کس بری طرح مارا ہے۔ قریب آ کر جب خسرو نے اسے دیکھا تو وہ شرما کر پلٹ گئی۔ فوراً ہی خیمے کے اندر چلی گئی۔ کلثوم اور امیر علی باہر آ گئے۔ خسرو نے کہا "ماں جبکہ میں نے آپ کی جو بات نہیں مانی تھی، وقت کی ایک ہی ٹھوکر نے منہ توڑ دی۔ میرا گھر جل چکا ہے۔ میری دکان تباہ ہو گئی ہے۔ وہ لوگ مجھے جان سے مار ڈالنا چاہتے تھے۔ تقدیر اچھی تھی اس لیے زندہ نظر آ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آ گئی ہے۔ بنگالی اگرچہ مہذب اور اچھے دوست ہیں لیکن نفرت کی آگ نے انہیں دشمن بنا دیا ہے۔ یہ دشمن مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

امیر علی نے آگے بڑھ کر کہا "تم میرے بیٹے ہو۔ انسان کا سب کچھ تباہ ہو جاتا ہے لیکن رشتے ختم نہیں ہوتے۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "آپ اپنا بوجھ مجھ پر ڈال دیں۔ نکاح کے بعد ہمیں یہ کیمپ چھوڑ دینا چاہیے۔ تلسی رام جی میری منہ بولی بہن کے پتی ہیں۔ ان کے ذریعے ہم سرحد پار کر سکتے ہیں۔ بہت سے لوگ نیپال پہنچ کر وہاں سے پاکستان جا رہے ہیں۔ ہم بھی یہی راستہ اختیار کریں گے۔"

نین تارا خیمے کے اندر بیٹھی سن رہی تھی۔ خوشی سے کھل رہی تھی اور شرما رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں کانوں میں ڈھولک کی طرح بج رہی تھیں۔ اگرچہ بے سروسامانی کے عالم میں شادیانے نہیں بجتے۔ تاہم اس کے خیالوں میں سکھیاں آ کر سہاگ کے گیت گا رہی تھیں۔ عصر کے بعد نکاح پڑھانے کا وقت مقرر ہو گیا۔ امیر علی کچھ انتظامات کرنے لگے اور انتظامات بھلا کیا کرنے تھے۔ زیادہ سے زیادہ دو چار براتیوں کو ایک ایک پیالی چائے پلائی جاتی۔ کلثوم خیمے کے اندر آئی تو اسے دیکھ کر نین تارا کھڑی ہو گئی، سر کو جھکا لیا۔ ماں کی آنکھوں میں گہری اداسی تھی وہ ممتا کی ماری آگے بڑھی پھر نین تارا سے لپٹ کر رونے لگی "ہائے میری بچی! ہم پر ایسا بھی وقت آنا تھا۔ نہ تیرے لیے جوڑا ہے نہ گہنے، نہ سہرا ہے نہ برات۔ کیا اسی دن کے لیے میں نے تجھے پالا تھا۔۔۔ دل میں کتنے ارمان تھے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ میرا خدا جانتا ہے مگر دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو رہا ہے۔ ابھی تو اپنی ہے۔ ابھی پرائی ہو جائے گی۔"

کیا حالات تھے، کیا جذبات تھے؛ حالات یہ تھے کہ ابھی ماں اپنے ہاتھوں سے بیٹی کو زہر پلا رہی تھی۔ جذبات یہ تھے کہ بیٹی کو سہاگن بنا کر رخصت کرتے ہوئے رو رہی تھی۔ بیٹی کو پرائے ہاتھوں میں دینے کا مطلب بھی تو یہی ہوتا ہے کہ اپنے آنگن سے اس کا انتقال کرا لیا جا رہا ہے۔ اس لمحے ماں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیٹی کی بدنصیبی پر رو رہی ہے یا اسے سہاگن بناتے وقت ممتا تڑپ رہی ہے۔

عصر کا وقت قریب تھا۔ اسے غسل کرایا گیا۔ اس کے پاس کوئی سرخ جوڑا نہیں تھا۔ صرف ایک گلابی لباس نیا سا تھا۔ اسے ہی پہنا دیا گیا۔ اس کی کنگھی چوٹی کی گئی۔ آنکھوں میں کاجل لگایا گیا۔

جو ہلکا پھلکا سا میک اپ ہو سکتا تھا، اس کے ذریعے اسے دلہن کا روپ دینے کی کوشش کی گئی۔ خسرو پاس والے ایک خیمے میں تھا۔ ٹھیک چار بجے مولانا وہاج الدین نکاح پڑھانے کے لیے تشریف لے آئے۔

وہ مولانا اور قاضی صاحب بھی کیمپ کے ہی ایک فرد تھے۔ ان کے زمانے میں حکومت کی طرف سے قاضی مقرر کیے گئے تھے۔ ان کے پاس حکومتِ پاکستان کا شائع شدہ نکاح نامہ اور پاکستانی حکومت کی طرف سے ریکارڈ رکھنے کے لیے نکاح کا رجسٹر موجود تھا۔ یہ گئے وقت کی بات ہو گئی تھی لیکن کیمپ کے سارے ہی لوگ ابھی پاکستانی تھے۔ دنیا کے تمام مسلمان شریعت کے مطابق نکاح پڑھاتے ہیں لیکن نکاح نامہ اپنے ملک کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے لہٰذا اس وقت بھی وہ پاکستانی نکاح نامے پر دولہا دلہن کا نام لکھ رہے تھے۔

جب نکاح نامے کی خانہ پُری ہو گئی تو ایک وکیل اور دو گواہ خیمے کے اندر آئے۔ مین تارا ایک چادر میں لپٹی، گھونگھٹ کے سائے میں سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ تینوں اس کے قریب بیٹھ گئے۔ وکیل نے کہا: "بیٹی کلمہ پڑھو۔"

وہ وکیل کے ساتھ ساتھ زیرِ لب کلمہ پڑھنے لگی۔ پھر اس سے پوچھا گیا: "بیٹی مین تارا! تمھارا نکاح شریعتِ محمدی کے مطابق نعیم الدین خسرو ولد خسرو زمان سے بعوض پانچ سو روپے مہر سکہ رائج الوقت پڑھایا جا رہا ہے۔ کیا تمھیں قبول ہے؟"

قبول تو ہوتا ہی ہے لیکن شرم آتی ہے اس لیے فوراً زبان نہیں کھلتی اور شرم نہ بھی آئے۔ پیا کے دیس جانے کی جلدی ہو، تب بھی ہاں کہنے میں ذرا دیر لگ جاتی ہے۔ دنیا والوں کے سامنے ذرا جھجکنا، شرمانا پڑتا ہے۔ آخر اس نے زیرِ لب کہہ دیا: "قبول ہے۔"

اور دو بار اس سے پوچھا گیا۔ دو بار اور اس نے کہا۔ پھر پاس بیٹھی ہوئی ماں، بیٹی سے لپٹ کر رونے لگی۔ وکیل نے مین تارا کے ہاتھ میں قلم پکڑا کر کہا: "بیٹی! یہاں دستخط کر دو۔"

دستخط ہو گئے۔ وکیل اور گواہ خیمے سے باہر آئے۔ باہر جو لوگ منتظر تھے، انھیں سلام کیا۔ سلام کرنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دلہن نے نکاح قبول کر لیا ہے۔ اب دولہا کی باری ہے لیکن وکیل اور گواہوں کو دولہا تک پہنچنا نصیب نہ ہوا۔ اچانک ہی گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ مختلف سمتوں سے عورتوں اور بچوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ نکاح پڑھنے والا وکیل تڑپ کر زمین پر گرا۔ پھر اس کے ہاتھ سے کاغذات چھوٹ گئے۔

خسرو کچھ لوگوں کے درمیان ایک چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا۔

گولیوں کی آواز سنتے ہی سب اُچھل پڑے تھے۔ خسرو نے دور پڑے ہوئے نکاح نامے کو دیکھا پھر اس کی طرف دوڑ لگائی لیکن وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک زبردست دھماکا ہوا۔ کسی نے ہینڈ گرینیڈ پھینکا تھا۔ فضا دھواں دھواں ہو گئی۔ قیامت کا شور بلند ہونے لگا۔ مرد، عورتیں اور بچے افراتفری کے عالم میں ادھر سے اُدھر بھاگنے لگے۔ ایسے وقت بدحواسی میں بھاگنے والوں کو موت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جو لوگ بھاگتے رہے۔ گولیاں کھا کر گرتے رہے۔

امیر علی بھی گرے۔ پھر زمین پر چاروں شانے چت ہو گئے۔ ان کی بوڑھی آنکھوں کے سامنے پاکستانی پرچم دکھائی دیا۔ کیمپ والوں نے ایک اونچے سے بانس پر اس پرچم کو لہرایا تھا۔ ان کی بوڑھی آنکھوں کے سامنے وہ پرچم دھندلانے لگا پھر دھندلا ہوتے ہوتے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے بعد ان کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

مکتی باہنی کے معنی ہیں نجات دلانے والی فوج۔ یہ فوج بین الاقوامی قوانین کی پابند نہیں تھی۔ وہ بنگلہ دیش کی زمین کو پاکستانیوں سے نجات دلانے کے لیے ایسے جارحانہ اقدامات کرتے تھے جو غنڈہ گردی کے زمرے میں آتے تھے۔ وہ بڑھ کر اس سوسائٹی کی حدود کو بھی پار کر گئے تھے۔ انھوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بیک وقت چاروں طرف سے حملہ کیا تھا۔

آگ کا ایک گولہ آ کر ایک خیمے پر گرا۔ کوئی اس آگ کو وہاں سے ہٹانے والا نہیں تھا۔ سب چیختے پھر رہے تھے یا زمین پہ ڈھلکتے ہوئے کسی طرف پناہ لینا چاہتے تھے۔ وہ خیمہ آگ کے شعلوں میں گھر گیا۔ اندر سے چیخنے کی آواز آنے لگی۔ اسی وقت

ایک کم سن لڑکا اپنی بوڑھی ماں کو گھسیٹ کر جاتے ہوئے خیمے سے باہر نکال کر لے جانے لگا۔ تھوڑی دور جاتے ہی ایک سنسناتی ہوئی گولی نے اس بچے کے قدم اکھاڑ دیے۔ وہ اچھل کر زمین پر گرا۔ پھر بوڑھی ماں کی آنکھوں کے سامنے تڑپنے لگا۔ ماں کی آنکھیں کھلی تھیں، کھلی رہ گئیں۔

پاس والے خیمے سے کسی عورت نے چیخ کر کہا: "ہائے کلثوم! تیرا سہاگ اجڑ گیا۔ امیر کو گولی لگ گئی ہے۔"

کلثوم نے ایک چیخ ماری۔ پھر تڑپ کر خیمے سے باہر جانے لگی۔ امیر علی کے لیے صرف بیوی ہی نہیں، بیٹی بھی تڑپ گئی تھی۔ وہ بھی ماں کے پیچھے دوڑتے ہوئے خیمے سے باہر نکلی۔ اسی لمحے خسرو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ کتنی ہی گولیاں ادھر ادھر سے گزر رہی تھیں ـــ کوئی تیز رفتار گولیوں کو دیکھ تو نہیں سکتا تھا مگر پیوست ہونے کے بعد اپنے اندر محسوس کر سکتا تھا۔ اسی وقت کلثوم کی آخری چیخ سنائی دی ـــ ہینڈ گرنیڈ کا دھماکا ہوا۔ بیٹی نے بس اتنا ہی دیکھا کہ ماں فضا میں اچھل گئی تھی۔ اس کے بعد دھواں اور صرف دھواں ہی رہ گیا۔ خسرو اسے کھینچتا ہوا خیمے کے اندر لے گیا۔ پھر لکڑی کے صندوق کے پاس دھکیل کر خود بھی اس کے پاس زمین پر گر پڑا۔

نین تارا کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی ـــ لگ رہا تھا جیسے آندھی چل رہی ہو۔ پہلے اس نے باپ کے مرنے کی خبر سنی۔ پھر اپنی آنکھوں سے ماں کے وجود کو دھواں دھواں ہوتے دیکھا۔ اب وہ مٹی پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے سامنے اس کا دولہا بھی تھا مگر یہ کیسی شادی تھی کہ دولہا دلہن زندہ تھے اور ماں باپ مر رہے تھے۔

خسرو نے اس کے ہاتھ کو تھام کر ذرا جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "وعدہ کرو، تم یہاں سے سر بھی نہیں اٹھاؤ گی۔ چپ چاپ پڑی رہو گی۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ رینگ کر جانا چاہتا تھا۔ نین تارا نے دونوں ہاتھوں سے اس کے بازو کو تھام لیا بلکہ جکڑ لیا۔ اتنی مضبوطی سے کہ اس کے ناخن بازو میں گڑنے لگے۔ وہ کچھ بول نہیں رہی تھی۔ قوتِ گویائی نے جیسے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ صرف اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں التجا کر رہی تھیں: "میرا اب کون رہ گیا ہے۔ بس یہی ایک بازو رہ گیا ہے جسے میں تھام رہی ہوں۔"

اس نے کہا: "مجھے جانے دو۔ بوڑھے اور جوان نہتے ہونے کے باوجود دشمنوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ان پر پتھر پھینک رہے ہیں۔ خیمے کے بانس نکال کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ کچھ مر رہے ہیں، کچھ دشمنوں سے ہتھیار چھین رہے ہیں۔ مجھے بھی جانے دو ـــ شاید ہم زندہ نہ رہ سکیں لیکن مریں گے تو دشمنوں سے لڑتے ہوئے۔"

اس نے بازو کو نہیں چھوڑا اور سختی سے جکڑ لیا۔ ایسے وقت وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ کچھ بول نہیں رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں دل میں اتر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد خسرو نے ذرا کان لگا کر سنا۔ فائرنگ کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ باہر مرنے والوں کا ماتم ہو رہا تھا۔ زخمیوں کی کراہیں اور چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دس منٹ تک چپ چاپ زمین پر لیٹے رہے۔ باہر کی آوازیں سنتے رہے۔ پھر اسی طرح اوندھے منہ زمین پر رینگتے ہوئے خیمے کے ایک سرے تک آئے اور وہاں سے سر نکال کر دیکھا۔

کیمپ والوں پر قیامت گزر رہی تھی۔ دور دور تک کتنے ہی خیمے جل چکے تھے۔ اب وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ معصوم بچے بچیاں اپنے ننھے ننھے پاؤں سے آگے بڑھتے ہوئے ڈگمگاتے ہوئے ادھر سے ادھر بھٹکتے ہوئے اپنے والدین کو تلاش کر رہے تھے۔ لاشوں کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ اپنی محبتوں کے پیارے پیارے رشتوں کو پکار رہے تھے۔ امی! ابو! خاموش کیوں ہو۔ صدا دو کہ ہم صدا دے رہے ہیں ؎

میں یہ کس کے نام لکھوں جو الم گزر رہے ہیں
میرے شہر جل رہے ہیں میرے لوگ مر رہے ہیں
کوئی غنچہ ہو کہ گل ہو، کوئی شاخ ہو شجر ہو
وہ ہوائے گلستاں ہے کہ سبھی بکھر رہے ہیں
کبھی رحمتیں تھیں نازل اسی خطۂ زمیں پر
وہی خطۂ زمیں ہے کہ عذاب اتر رہے ہیں
کوئی اور تو نہیں ہے پسِ خنجر آزمائی
ہمی قتل ہو رہے ہیں ہمی قتل کر رہے ہیں

بنگالی بھی مسلمان ہیں۔ بہاری بھی مسلمان ہیں۔ اس لحاظ سے مسلمان ہی قتل ہو رہے تھے اور مسلمان ہی قتل کر رہے تھے۔

نین تارا کبھی اپنے باپ کی لاش کے سامنے سر جھکا رہی تھی، کبھی چند قدم کے فاصلے پر ماں کی لاش کے پاس پہنچ کر رونا بھول جاتی تھی۔ جانے آنسو کہاں گم ہو گئے تھے۔ نہ آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے، نہ رونا چاہتی تھی۔ ایک صدمہ ہو تو آدمی رو کر دل کا غبار نکال لے، مگر صدمات بار بار گزریں۔ بار بار رشتوں کے بچھڑنے کا زخم لگتا ہے تو انسان کہاں تک روئے۔ وہ ایک بار باپ کے پاس گئی۔ دوسری بار ماں کے پاس آئی۔ پھر باپ کے پاس آنا چاہتی تھی کہ ان کے درمیان ہی چکرا کر گر پڑی۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ اسکول کے برآمدے میں ایک چٹائی کے بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس دور دور تک

بہت سی عورتیں، بچے اور زخمی مرد پڑے ہوئے تھے۔ رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ اسکول کے باہر اور برآمدے میں لالٹینوں کی روشنیاں تھیں۔ لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ان میں کچھ کھڑے ہوئے تھے، کچھ بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ دال بھات کھا رہے تھے اور کچھ غم چبا رہے تھے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسی وقت خسرو اس کے پاس آیا۔ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر اس نے آہستگی سے کہا: "جھیل تلاؤ کے پاس ایک بڑا سا گڑھا کھود کر تمام لاشوں کو ایک ساتھ دفن کر دیا گیا ہے۔ جس کے لیے جو کپڑا نصیب ہوا، اسی کو کفن کے طور پر لپیٹ دیا گیا۔ کیا کیا جائے، مجبوری ہے۔"

مین تارا خلا میں گھور رہی تھی۔ خسرو سمجھ رہا تھا کہ وہ روئے گی مگر اس کی آنکھیں خشک اور ویران تھیں۔ وہ راضی تھی۔ جو ہو چکا تھا، جو ہو رہا تھا اور جو ہونے والا تھا، وہ سب سے راضی تھی۔ جیسے عورت اپنے سسرال کے بدترین حالات سے راضی رہتی ہے۔

اس کیمپ میں ایسی فائرنگ اور ایسے زبردست دھماکے ہوئے تھے کہ دور دور تک اس کی خبر پہنچ گئی تھی۔ بی ڈی آر کے مسلح سپاہی آ گئے تھے۔ لوگوں کو اطمینان تھا کہ غنڈے حملہ نہیں کریں گے۔ خانس پور کے بنگالی کچھ تو تماشا دیکھنے آئے تھے، کچھ اپنے بہاری دوستوں سے ملنے اور ہمدردی کرنے آئے تھے۔ ان میں خسرو کا پڑوسی سراج الاسلام بھی تھا۔ سراج الاسلام نے کہا: "خسرو بھائی، تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ کہیں چلے جاؤ۔ جب حالات تمہارے موافق ہوں گے تو آ جانا۔"

"میں کہاں جاؤں، سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ جانے کے لیے تو بہت سی جگہ ہے لیکن میرے ساتھ اب میری دلہن بھی ہے۔"

"صبح سات بجے راکٹ لانچ یہاں سے جاتی ہے۔ اگر تم کسی طرح بھابی کو لے کر بھیری گھاٹ پہنچ جاؤ تو یہاں کے غنڈوں سے نجات مل جائے گی۔"

"میں کیسے جاؤں۔ غنڈوں نے یقیناً یہ سوچ رکھا ہوگا کہ کیمپ کے جو لوگ زندہ رہ گئے ہیں، ان میں سے کچھ بھاگنے کی کوشش کریں گے لہٰذا انھوں نے بھاگنے کے تمام راستے مسدود کر دیے ہوں گے۔ وہاں اپنے اپنے آدمی بٹھا دیے ہوں گے۔"

سراج الاسلام نے کہا: "آج صبح میں بھیری گھاٹ گیا تھا۔ وہاں میں نے کسی بھی مکتی باہنی کے آدمی کو نہیں دیکھا۔"

خسرو نے کچھ سوچنے کے بعد تائید میں سر ہلا کر کہا: "ہاں، مجھے یاد آ رہا ہے۔ یہ مکتی باہنی کے جوان آدھی رات تک سڑکوں اور گلیوں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ پھر لوٹے ہوئے مال کو تقسیم کرتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں۔ رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ اس کے بعد نشے کی حالت میں بے سُدھ ہو کر صبح تک سوتے پڑے رہتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ ہم بھیری گھاٹ تک کسی نہ کسی طرح پہنچ جائیں گے۔ تم ہمارے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

"یہ کیا پوچھ رہے ہو بھائی! تمہارے لیے تو جان بھی دے سکتے ہیں۔ تم برسوں تک ہمارے بہترین پڑوسی رہے ہو۔ حدیث کے الفاظ ہیں کہ تمہاری شرافت کا سب سے معتبر گواہ تمہارا پڑوسی ہوتا ہے اور میں تمہارا پڑوسی ہونے کے ناتے تمہاری شرافت کا گواہ ہوں۔ تمہارے کچھ ہزار روپے میرے پاس امانت کے طور پر ہیں۔ میں یہاں سے گھاٹ جاؤں گا اور تم دونوں کے لیے ٹکٹ لے کر رکھوں گا۔ مگر ایک بات ہے، بھابی نے شلوار اور قمیص پہن رکھی ہے۔ یہ بہاریوں اور پنجابیوں کا لباس ہے۔ کیا ان کے پاس ساری نہیں ہے؟"

خسرو نے مین تارا کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک خلا میں تک رہی تھی۔ شاید ان کی باتیں سُن رہی تھی مگر باتوں میں شریک نہیں تھی۔ اس نے سراج الاسلام کی اس بات کا بھی جواب نہیں دیا۔ خسرو نے جھینپ کر کہا: "یہ بہت دکھی ہیں۔ کچھ بولتی نہیں ہیں۔ کھایا بھی نہیں ہے۔ اتنا بڑا صدمہ گزرا ہے کہ . . ."

"میں سمجھتا ہوں لیکن چُپ رہنے سے، کچھ نہ بولنے سے، کھانا نہ کھانے سے، نیند پوری نہ کرنے سے کوئی بھی دکھ ہلکا نہیں ہوتا۔"

سراج الاسلام کچھ دیر تک سمجھاتا رہا، تسلیاں دیتا رہا پھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد خسرو نے کہا: "کچھ کھا لو۔"

وہ چُپ رہی پھر اس نے پوچھا: "کیا تم ساری پہنتی ہو؟ تمہارے پاس ساری ہے؟"

وہ پھر بھی چپ رہی۔ وہ بولا: "ہماری منزل انجانی ہے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکنا ہوگا۔ تمہاری یہی حالت رہی تو میرے لیے قدم قدم پر دُشواریاں پیدا ہوں گی۔"

وہ خلا میں تک رہی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا: "آخر کب تک خاموش رہو گی۔ کیا میری موجودگی گراں گزر رہی ہے۔ ہاں میں سمجھا، میری وجہ سے تم پر مصیبتیں نازل ہوئی ہیں۔ پہلے تم میرے نام سے بدنام ہوئیں۔ پھر شادی کا وقت آیا تو تمہارے ماں باپ ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے۔ میری محبت، میری موجودگی تمہارے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تم خاموش کیوں ہو۔ میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ میں تم سے کہیں دُور چلا جاؤں گا۔"

وہ اُٹھ کر جانا چاہتا تھا۔ پھر رُک گیا۔ مین تارا نے اس کی قمیص کا دامن پکڑ لیا تھا۔ کیسی پیاری ادا تھی۔ نہ بولتی تھی، نہ دیکھتی،

[illegible] جانے والے کو دامن پکڑ کر روک لیتی تھی۔ اتنی دیر بعد اس نے خسرو کو دیکھا۔ پھر اپنی نظریں جھکا لیں۔ خسرو نے کہا: "بولو، تارا! بولو، خاموش رہو گی تو دل میں دھواں بھرتا رہے گا۔ یہ تمھارے لیے اچھا نہیں ہے۔ تمھیں خوب چیخ چیخ کر رونا چاہیے یا بے تحاشہ بولنا چاہیے۔"

وہ چپ رہی، سر جھکائے بیٹھی رہی۔ خسرو نے کہا: "میں تمھارے خیمے کی طرف جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ آؤ۔ وہاں چل کر ساری پہن لو۔ ضروری نوعیت کا سامان ایک چھوٹی سی اٹیچی میں رکھ لو۔ ہم اس برآمدے میں سب لوگوں کے ساتھ رات گزاریں گے اور یہاں سے تقریباً چار بجے صبح روانہ ہو جائیں گے۔"

وہ اٹھ کر برآمدے کے زینے تک گیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سر جھکائے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ پھر چلنے لگا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے خیموں کی طرف جانے لگے۔ وہاں ابھی لوگ رات گزار رہے تھے۔ بی ڈی آر کے سپاہیوں کی موجودگی میں انھیں کسی حد تک اطمینان تھا۔ خسرو نے اپنی رفتار سست کر دی۔ مین تارا چلتے ہوئے اس کے برابر آ گئی۔ پھر وہ ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ایک خیمے سے ایک عورت نے انھیں جھانک کر دیکھا۔ اس نے ان سے تو کچھ نہیں کہا البتہ کچھ کہنے کے لیے پاس والے خیمے میں چلی گئی۔ مین تارا اپنے خیمے کے پاس آ کر رک گئی۔ اندر تو تاریکی تھی۔ شاید وہ تنہا اندر جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ خسرو نے جیب سے ماچس نکالی۔ پھر ایک تیلی جلا کر پہلے خود اندر گیا۔ پھر اس سے پوچھا: "لالٹین کہاں رکھی ہوئی ہے؟"

وہ لالٹین تلاش کرنے کے لیے خیمے کے اندر آ گئی— اس وقت تک تیلی بجھ گئی تھی۔ اس نے ڈبیہ سے دوسری تیلی نکالی۔ اسے سلگانے لگا لیکن وہ سلگ نہیں رہی تھی۔ شاید تیلی کا مسالہ سیل گیا تھا۔ اس نے دو چار بار کوشش کرنے کے بعد اس تیلی کو پھینک دیا۔ پھر تیسری نکالی۔ وہ سلگ گئی۔ ننھے سے شعلے نے خیمے کے اندر ہلکی سی روشنی پیدا کی۔ مین تارا نے لالٹین کو اٹھا کر اسے جلایا۔ پھر تیل کی ٹنکی کھول کر دیکھی۔ لالٹین کو الٹا کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لالٹین میں تیل نہیں ہے۔

وہ تیلی بھی بجھ گئی۔ اندھیرا چھا گیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر خسرو نے آہستگی سے کہا: "لالٹین جلانا کیا ضروری ہے۔ میں تیلی جلاتا ہوں، تم جلدی جلدی اپنا ضروری سامان نکال کر چھوٹی سی اٹیچی میں رکھ لو۔ اس کے بعد باہر جاؤں گا۔ تم ساری پہن لینا۔"

تیلی روشن ہو گئی۔ وہ لکڑی کے صندوق کے پاس گئی۔ پھر اسے کھول کر سامان نکالنے لگی۔ اس میں ماں بیٹی کے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ ماں کے کپڑے دیکھتے ہی دل سے ایک آہ نکلی۔ وہ تھوڑی دیر گم صم بیٹھی رہی پھر اس نے ماں کی ایک ساری کو اپنے سینے سے لگایا۔ اس کے بعد اس ساری میں اپنا منہ چھپا لیا۔ اسی وقت تیلی بجھ گئی۔

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر خسرو نے ایک اور تیلی نکالی۔ اسے سلگانا ہی چاہتا تھا کہ رک گیا۔ تاریکی اور خاموشی میں سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ رو رہی تھی۔ اس نے سوچا، اچھا ہے، ذرا کھل کر رو لے۔ دل کا غبار نکل جائے۔ روشنی میں شاید وہ جھجکتی ہے۔ کچھ بولتی بھی نہیں ہے۔

اس نے تیلی نہیں جلائی۔ چپ چاپ اندھیرے میں کھڑا رہا۔ ذرا دیر بعد سسکیاں بند ہو گئیں۔ پھر جیسے صدیوں کے بعد خسرو نے مین تارا کی آواز سنی۔ وہ بڑی آہستگی سے کہہ رہی تھی: "میں اندھیرے میں کپڑے کیسے نکالوں؟"

اس نے فوراً ہی تیلی روشن کر دی۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ جلدی جلدی کپڑے نکالنے لگی۔ خسرو نے کہا: "صرف دو چار جوڑے رکھو— ساڑیاں ہوں تو بہتر ہے۔"

اس نے چار ساڑیاں، پیٹی کوٹ اور بلاؤز وغیرہ نکالے۔ کچھ اور نکالنا چاہتی تھی کہ اسی وقت تیلی بجھ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک اور تیلی جلاتا، اندھیرے میں اس کی آواز سنائی دی: "تیلی نہ جلاؤ۔ میں ایسے ہی سامان نکال لوں گی۔"

خسرو چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے کہا: "تم اندھیرے میں بولتی ہو اور روشنی میں گونگی بن جاتی ہو۔ تارا! میں تمھارا ہوں۔ کیا مجھ سے شرماتی ہو؟ مجھے اجنبی سمجھتی ہو؟"

ایک سرد آہ سنائی دی۔ پھر اس نے کہا: "تمھارے سوا میرا کون رہ گیا ہے۔ تمھیں اجنبی سمجھوں گی تو کہاں جاؤں گی؟ کیسے جیوں گی؟"

"جینے کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ ایک اپنے آدمی پر اعتبار اور دوسرا حوصلہ۔"

وہ تھوڑی دیر تک چپ رہی۔ پھر بولی: "تم باہر جاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ سمجھ گیا کہ لباس بدلنا چاہتی ہے۔ اس نے اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر کہا: "یہ دیا سلائی رکھو۔ شاید تمھیں ضرورت پڑ جائے۔"

ادھر سے بھی اندھیرے میں ٹٹول کر ہاتھ بڑھایا گیا۔ پھر دونوں کے ہاتھ ٹکرا گئے۔ خسرو نے پہلے ایک ہاتھ سے اس کے ہاتھ کو تھام لیا، پھر دوسرے ہاتھ سے اس کی ہتھیلی پر دیا سلائی رکھ دی۔ وہ بڑی محبت سے بولا: "یہ ہاتھ میرے لیے ہے۔ میں

روشنی میں اس کے ساتھ ساتھ چلوں گا اور مصائب کے اندھیروں میں اسے تھام لیا کروں گا۔”

اس نے ہولے سے اس ہاتھ کو تھپک کر چھوڑ دیا۔ اندھیرے میں پلٹ کر خیمے سے باہر آگیا۔ باہر آتے ہی ٹھٹک گیا۔ کیوں کہ خیمے کے آس پاس کچھ لوگ نظر آرہے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ موسیٰ بھائی کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اس نے پوچھا: “یہاں کیا ہو رہا ہے؟”

خسرو نے جواب دیا: “نین تارا اپنا سامان لینے آئی ہے۔”

ایک نے پوچھا: “تم اس کے ساتھ خیمے میں کیا کر رہے تھے؟”

“میں روشنی دکھا رہا تھا۔”

“جھوٹ بول رہے ہو۔ ہم نے دو چار بار روشنی کی جھلک دیکھی پھر اندھیرا چھا گیا۔ اس کے بعد اندھیرا ہی رہا۔”

خسرو نے ناگواری سے کہا: “جو بات سمجھ میں نہ آئے، اسے اپنے طور پر آپ نہ سمجھیں۔ لالٹین میں تیل نہیں تھا۔ مجبوراً صرف تیلیاں جلا کر سامان تلاش کرنا پڑا۔ اسی لیے اتنی دیر ہو گئی ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔ اگر آپ جھوٹ سمجھ رہے ہیں تب بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔”

“بکواس مت کرو۔ تمہاری بیوی کیسے ہو گئی؟ نکاح پوری طرح پڑھایا نہیں گیا تھا۔”

ایک عورت نے کہا: “ہاں، میں تو خیمے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ دلہن نے قبول کر لیا تھا۔ کاغذ پر دستخط بھی کیے لیکن تم نے تو قبول نہیں کیا۔ تم نے دستخط بھی نہیں کیے۔ تمہارا نکاح نہیں پڑھایا گیا پھر شادی کیسے ہو گئی؟”

کسی اور نے کہا: “شادی ہوئی مگر آدھی ہوئی۔”

ایک بزرگ نے کہا: “شادی کبھی آدھی نہیں ہوتی مگر بے حیائی پوری ہو گئی۔”

خسرو نے کہا: “جناب! آپ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔”

ایک عورت نے موسیٰ بھائی کے ہاتھ سے لالٹین لے کر کہا: “میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔”

وہ تیزی سے چلتے ہوئے خیمے کے پاس آئی پھر جیسے ہی اندر داخل ہوئی، نین تارا کی چیخ سنائی دی۔ وہ عورت فوراً ہی پلٹ کر باہر آ گئی۔ ہاتھ اٹھا کر چیختے ہوئے بولی: “بے حیائی کی حد ہو گئی۔ یہاں ہماری بھی جوان بیٹیاں اور بہنیں ہیں۔ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے۔”

کسی نے پوچھا: “کیا ہوا؟”

“ہونا کیا ہے۔ میں جیسے ہی اندر گئی تو دیکھا، اس کے بدن پر کچھ نہیں ہے۔ وہ ساری پہن رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی چیخ مار کر چھپنے لگی۔ توبہ توبہ . . . .”

دوسرے بھی توبہ توبہ کرنے لگے۔ کوئی چھی چھی کہہ رہا تھا کوئی تھو تھو کر رہا تھا۔ ایک بزرگ نے کہا: “بات بڑھانے سے کیا فائدہ۔ جب شادی آدھی ہوئی ہے۔ لڑکی نے قبول کر لیا ہے تو لڑکے سے بھی قبول کرا دو۔ کہاں ہے وہ نکاح نامہ؟”

کسی نے کہا: “نکاح پڑھانے والے مولوی صاحب بے چارے ختم ہو گئے۔ ان کا رجسٹر اور دوسرے کاغذات پتہ نہیں کہاں گم ہو گئے۔ کسی کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ ان کے نکاح نامے کو کون سنبھالتا؟”

خسرو نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا: “خدا کے لیے آپ لوگ خاموش ہو جائیں۔ کچھ تو عقل سے کام لیں۔ اگر وہ نکاح نامہ ہوتا تو کیا اس وقت نکاح پڑھانا مناسب ہوتا؟ نین تارا پر قیامت گزر رہی ہے۔ ایک ہی وقت میں ماں اور باپ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ پھر بھی ایسے وقت نکاح پڑھانے کی بات کی جا رہی ہے۔”

ایک عورت نے ہاتھ نچا کر کہا: “کیا تم خیمے کے اندر اس کے ماں باپ کا سوگ منا رہے تھے؟”

“یہ میں جانتا ہوں، میرا خدا جانتا ہے۔ خدا کے لیے آپ اس بے چاری کو بدنام نہ کریں۔”

وہ سب طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ کسی نے کہا۔ “ہمیں کیا پڑی ہے کہ کسی کو بدنام کریں۔”

کسی نے کہا: “جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔”

خسرو نے کہا: “ہم سب بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ ہماری سماجی زندگی بھی ایک کیمپ تک محدود ہو گئی ہے۔ ہمارا کل کیا ہوگا، یہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ ہم میں سے کتنے لوگ جئیں گے، کتنے مریں گے۔ کیا کوئی جانتا ہے؟”

کوئی نہیں جانتا تھا۔ سب یوں خاموش تھے جیسے اس کی زبان سے اپنی اپنی تقدیر کا حال سننے والے ہوں۔ اس نے کہا۔ “ہماری اگلی سانس ہماری نہیں ہے۔ ان حالات میں بھی آپ

> اس بات پر گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہماری موجودہ نسل کا کیا ہوگا۔ موجودہ نسل کے بچے بڑے ہو جائیں گے اور اپنی نئی نسل کے بارے میں گھبرایا کریں گے کہ اس کا کیا ہوگا؟

دوسروں کے گھروں میں جھانکنا، کسی کی کمزوری تلاش کرنا اور کسی پر کیچڑ اچھالنا نہیں بھولتے۔ آدمی مرتے وقت اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے۔ توبہ کرتا ہے۔ کیا ہم یہ سوچ کر توبہ نہیں کر سکتے کہ ہمارا آخری وقت آگیا ہے؟"

لوگ پھر جھنجھنانے لگے۔ ایک قدآور جوان نے للکارنے کے انداز میں کہا: "تمام لوگ خیمے کے سامنے سے ہٹ جائیں۔"

سب نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی بھیڑ چھٹنے لگی۔ وہ خیمے کے سامنے سے ہٹنے لگے۔ ذرا دور چلے گئے۔ یہ وہی جوان تھا جس نے پچھلی رات رضو کو قبول کیا تھا۔ اس نے ریوالور کا رُخ خیمے کی طرف کرتے ہوئے حکم دیا۔

"نین تارا! باہر آجاؤ۔"

وہ ہاتھ میں اٹیچی لیے باہر آگئی۔ اس نے ساری پہن لی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ ٹھیک ریوالور کی زد میں تھی۔ دیکھنے والوں کو ریوالور اپنی طرف محسوس ہو رہا تھا۔ موت ایسی ہی ہوتی ہے۔ ڈھیڑی نظر کی طرح اپنی اپنی طرف دیکھتی ہوئی لگتی ہے۔ اس سرپھرے نوجوان کا کوئی ٹھیک نہیں تھا کہ وہ ریوالور کدھر گھما دیتا۔ اس نے ایک سرے سے دوسرے تک دیکھتے ہوئے کہا: "پچھلی رات رضو یہاں آئی تھی۔ ظالموں نے اسے پہلے ہی توڑ کر رکھ دیا تھا۔ جن لوگوں نے اسے توڑا، ان کا حساب کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ کیا آپ لوگوں نے کسی ظالم کا گریبان پکڑا تھا؟"

کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس نے کہا: "وہ بے چاری طوفانی بارش میں بھیگتی رہی۔ ایک ایک خیمے کے سامنے سے گزرتی رہی۔ کسی نے یہ نہیں کہا۔ رضو خیمے میں آجاؤ۔ رضو ہمارے ہاں پناہ لو۔ رضو تم ہماری بہن ہو، تم ہماری بیٹی ہو۔ وہ بے چاری تباہ ہو کر آئی تھی۔ تم لوگوں نے اسے تباہی کے لیے چھوڑ دیا۔ آپ پر الزام نہیں ہے کیوں کہ سب کو اپنا اپنا دُکھ بھاری ہے لیکن کسی کو بدنام کرتے وقت آپ اپنا دُکھ کیسے بھول جاتے ہیں؟ کیا یہ اپنے دُکھوں کا علاج ہے کہ اپنا غم ہلکا کرنے کے لیے چٹخارے لے لے کر دوسروں پر غم کے پہاڑ توڑے جائیں؟"

وہ ذرا چپ ہوا۔ غصے میں گہری گہری سانسیں لیتا رہا پھر بولا: "آج نین تارا کو سہارا مل رہا ہے اور آپ اس پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ اسے بھی توڑ دینا چاہتے ہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

اس نے نین تارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "تم خسرو کے ساتھ جاؤ۔ کسی نے تمہارا راستہ روکا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔"

خسرو نے تشکر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اس نوجوان کو دیکھا۔ اس نے تارا کے ہاتھ سے اٹیچی لے لی۔ اس کے ساتھ چلنے لگا۔

پھر لوگوں کی بھیڑ سے گزرتا ہوا اس نوجوان کے پاس آکر رک گیا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا: "ہتھیاروں سے وقتی طور پر دباؤ ڈالا جاسکتا ہے جیسا کہ بنگالیوں پر ڈالا گیا تھا۔ تم نے ہمارے لیے راستہ ہموار کیا۔ بہت بہت شکریہ لیکن ہمارے جانے کے بعد ان لوگوں سے معافی مانگ لینا کیوں کہ ہتھیار ہمیشہ نفرت پیدا کرتے ہیں۔ میرے دوست! کسی کو مارو تو محبت سے مارو۔"

وہ نین تارا کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ لوگ خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔ ان دونوں کو اسکول کی طرف جاتے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دُور جانے کے بعد نین تارا نے رُک کر کہا: "ریوالور دکھا کر لوگوں کی زبان بند کر دینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔"

خسرو نے حیرانی سے پوچھا: "کیسی حقیقت؟"

"یہی کہ میں نے نکاح قبول کیا ہے۔ تم نے نہیں کیا۔"

"دل میں صفائی اور ایمان ہونا چاہیے۔ میں ابھی تمہارے سامنے قبول کرتا ہوں۔"

"یہ بچوں کا کھیل اور جوانوں کا مشغلہ ہوتا تو سبھی چلتے پھرتے نکاح قبول کروا لیتے۔ میرا نکاح شرعی احکامات کے مطابق مکمل نہیں ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے تب شرع کے مطابق مکمل ہوگا لیکن ابھی تو چلو۔"

"میں آگے بڑھنے سے پہلے سوچ رہی ہوں، تمہارے ساتھ چلوں تو کس رشتے سے چلوں؟"

خسرو نے کچھ سوچا پھر کہا: "تم نے مجھے اپنی جان و مال کا اور عزت آبرو کا محافظ سمجھا۔ مجھ پر اعتماد کیا۔ تبھی قبول کیا جیسے قبول کیا ویسے اعتماد کرو۔ میرے ساتھ نئی زندگی کی ابتدا کرو۔ رہ گئی میری قبولیت کی بات تو ابھی یہ مناسب نہیں ہے۔ شام کو تمہارے والدین شہید ہوئے ہیں۔ چالیس دن کے بعد بھی جب تک سوگ مناتی رہو گی۔ شادی نہیں ہوگی۔ شادی کب ہوگی۔ یہ فیصلہ تم پر ہے۔"

نین تارا نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے اسے دیکھا پھر نظریں جھکا کر بولی: "تھوڑی دیر پہلے خیمے کی تاریکی میں تم نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا اور کہا تھا۔ یہ ہاتھ تمہارے لیے بنے تم روشنی میں اس کے ساتھ چلو گے اور مصائب کے اندھیروں میں اسے تھام لیا کرو گے۔"

پھر وہ سرد آہ بھر کر بولی: "لیکن جب تک نکاح قبول نہیں کرو گے۔ اس وقت تک مصائب کے اندھیروں میں بھی اپنا ہاتھ تمہیں نہیں دوں گی۔ جہاں جہاں حالات مجھے لے جائیں گے۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی لیکن یہ نہ بھولنا کہ میں آدھی سہاگن

ہوں۔ تمہارے نام سے ہوں مگر تمہارے لیے نہیں ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ اس کے آگے تاریکی ہی تاریکی تھی۔ وہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر وہ رُک گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا پھر پوچھا: "میرے ساتھ کیوں نہیں چل رہے ہو؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا: "شادی مکمل ہوتی تو میں شوہر کی حیثیت سے آگے چلتا۔ تم میرے پیچھے ہوتیں۔ ابھی میں تمہارا طلب گار ہوں۔ پیچھے آرہا ہوں۔"

کیا حسین جواب تھا۔ نین تارا کا دل محبت سے بھر گیا۔ اگر خسرو نہ ہوتا تو وہ صدمات سے مر جاتی۔ وہ پھر اسکول کی طرف جانے لگی۔ اس کے آگے بے شک اندھیرا تھا لیکن پیچھے یقین چلا آرہا تھا۔

اسکول کے برآمدے میں اسی طرح لوگوں کی بھیڑ تھی۔ عورتیں بھی تھیں، مرد بھی تھے۔ بچے بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے یا سو رہے تھے۔ نین تارا کی چٹائی خالی پڑی تھی۔ اس نے سرہانے اٹیچی رکھ دی۔ وہ اس اٹیچی کو تکیہ بنا کر سو سکتی تھی۔ نیند تو نہ آتی، ماں باپ کی یاد ستاتی رہتی لیکن ایک جگہ لیٹ کر کروٹیں بدل سکتی تھی۔

وہ چٹائی پر لیٹ نہ سکی۔ خسرو کی موجودگی سے جھجک رہی تھی۔ حالانکہ وہ اس سے دُور برآمدے کے زینے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ قریب آ کر بولا: "میں کھانے کے لیے کہتا ہوں۔ تم کھاتی نہیں ہو۔ اس کے لیے میں مجبور نہیں کر سکتا۔ تم پر ایسے صدمات گزرے ہیں کہ نوالہ حلق سے اتر نہیں سکتا لیکن سونا تو چاہیے۔ تم یقیناً میری موجودگی سے جھجک رہی ہو۔ ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں۔ آرام سے سونے کی کوشش کرو۔ میں صبح چار بجے آ کر جگاؤں گا۔"

وہ جانے لگا۔ نین تارا بیٹھی رہی، اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ خیال تھا کہ وہ چلا جائے گا۔ نظر نہیں آئے گا تو چادر اوڑھ کر لیٹ جائے گی۔ برآمدے میں دو چار لالٹینیں روشن تھیں، ان کی روشنی برآمدے سے زیادہ دُور نہیں جا رہی تھی۔ اس لیے وہ جلد ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جب وہ نظر نہیں آیا تو سہاگن کا دل دھک سے رہ گیا۔ یوں لگا جیسے اندھیرے نے اسے نگل لیا ہو۔ کیا محبوب وقت کی طرح آتا ہے۔ پھر نہ آنے کے لیے گزر جاتا ہے؟

اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لینے لگے۔ خسرو دیا نہیں تھا۔ وہ واپس آسکتا تھا لیکن حالات ایسے نہیں تھے۔ دشمن راستہ روک دیتے تھے۔ اس نے گھبرا کر دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وہ اندھیروں میں جھانکنے لگی۔ امید تھی، وہ واپس آئے گا۔ وہ نہ آئے تو چلو نظر ہی آنے لگے گا۔

اس سے ذرا فاصلے پر ایک عورت چٹائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے تارا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "میرے میاں کہہ رہے تھے۔ بھگتی باہنی والے خسرو کو لے گئے تھے۔ اسے الٹا لٹکا کر خوب مارا ہے۔ شاید جان سے مارنا چاہتے تھے۔"

یہ سنتے ہی وہ بے اختیار اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ تیزی سے چلتے ہوئے برآمدے کے زینے تک آئی۔ اس عورت نے پوچھا: "کہاں جا رہی ہو؟"

وہ زینے سے اتر کر سوچنے لگی۔ کہاں جائے؟ اسے کہاں ڈھونڈے؟ آگے تاریکی تھی۔ دور خیموں میں کچھ مدھم افسردہ روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ ایک طرف اسکول کی عمارت نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی۔ اس نے کیوں اسے جاتے وقت نہیں روکا تھا؟ اور ایسے حالات کیوں پیدا کیے کہ وہ جانے پر مجبور ہو گیا؟

وہ آگے بڑھی۔ پھر رُک گئی۔ اندھیرے میں ڈر لگ رہا تھا۔ اسے بچپن ہی سے ڈرنے کی عادت تھی۔ اندھیرا ہو تو اکیلی آنگن میں بھی نہیں جاتی تھی لیکن جوانی کے آنگن میں کتنا ہی اندھیرا ہو، جذبے بے دھڑک آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

ذوالقرنین

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ ذوالقرنین سکندرِ اعظم کا لقب تھا لیکن تاریخی لحاظ سے یہ صحیح نہیں ہے۔ ذوالقرنین دراصل ایران کے اُس بادشاہ کا لقب تھا جو تاریخ میں "CYRUS THE GREAT" کے نام سے مشہور ہوا۔ اُسے ایرانی اپنی زبان میں "کورش کبیر" کہتے ہیں۔ سائرس کی قبر شیراز کے نواح میں واقع ہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ سائرس پیغمبر بھی تھا۔ ذوالقرنین کے لقب کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ جو تاج پہنتا تھا اُس پر دو سینگ بنے ہوتے تھے۔ عربی میں قرن سینگ کے معنوں میں آتا ہے اور ذو کے معنی ہیں والا یعنی دو سینگوں والا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ آخر اپنے تاج پر دو سینگ کیوں بنواتا تھا؟ اُس نے "میڈیا" اور "لیڈیا" نامی دو سلطنتیں فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لی تھیں۔ اس طرح دو سینگ دراصل اس بات کی علامت تھے کہ وہ دو سلطنتوں کا مالک ہے۔

محمود جمال

وہ برآمدے میں روشنی سے آنکھیں ملا کر آئی تھی اس لیے تاریکی میں پہلے اچھی طرح نظر نہیں آیا۔ پھر ذرا فاصلے پر کوئی نظر آنے لگا۔ رات کی خاموشی میں اس کی دھیمی دھیمی سی آواز دل میں بجنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا: بڑی مشکل ہے۔ جب تمہارے پاس ہوتا ہوں تو تم پاس نہیں آتیں۔ دُور جاتا ہوں تو ڈھونڈنے چلی آتی ہو۔ تمہاری ادائیں کہہ رہی ہیں۔ آنچوے بدھے نیچھے چھبی اماشے۔ چیرو دن روبو اماری آشاتے (اپنے آنچل سے مجھے باندھ لائی ہو۔ سدا میری آرزوؤں میں رہوگی)"

اس نے شرما کر گردن جھکالی۔ وہاں سے گھوم کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پھر اپنی جگہ آگئی۔ چٹائی پر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد نظریں اُٹھا کر دیکھا تو وہ برآمدے کے زینے پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے نظریں جھکالیں۔ اسے دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ خسرو نے اپنی ایک ہتھیلی کو تکیہ بنا کر اس پر اپنا سر رکھتے ہوئے اشارے سے سمجھایا۔ "سو جاؤ"۔

وہ دیوار کی طرف گھوم سی۔ اپنے اوپر چادر ڈال کر لیٹ گئی۔

خسرو وہاں بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اطمینان کیا کہ وہ سو رہی ہے یا نہیں؟ واقعی تھکی ہوئی تھی، جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی۔ اسی لیے نیند اس پر غالب آگئی تھی۔ وہ برآمدے سے اُتر کر اسکول کے دائیں طرف آیا۔ وہاں ایک فوجی ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ ایک جوان ہاتھ میں اسٹین گن لیے ٹرک کے پاس ایک اونچے سے اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹرک کے پچھلے حصے میں شاید کچھ اور جوان بھی تھے جو اپنی نیند پوری کر رہے تھے۔ وہ بنگلہ دیش رائفلز سے تعلق رکھتے تھے۔ خسرو نے سوچا تھا، کسی بھارتی فوج کے جوان سے درخواست کرے گا اور اس کے ذریعے صبح چار بجے پھیری گھاٹ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا لیکن وہاں کوئی بھارتی سپاہی نظر نہیں آیا اور وہ بنگلہ دیش رائفلز کے بنگالی جوانوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ ریڈ کراس کے دفتر کی طرف جانے لگا۔ دفتر میں دور ہی سے روشنی نظر آرہی تھی۔ وہاں کچھ لوگ جاگ رہے تھے۔ سیکنڈ آفیسر جان اینگل ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر شراب سے بھرا ہوا ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ بوتل خالی تھی۔ بی ڈی آر کا کپتان ایک کرسی پر بیٹھا نشے کی حالت میں اونگھ رہا تھا۔ کبھی کبھی بڑبڑانے لگتا تھا۔ اس کے سامنے رکھا ہوا گلاس خالی ہو چکا تھا۔ اس کے ایک گوشے میں ایک جوان ملازم کی حیثیت سے کھڑا ہوا تھا۔ خسرو نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسے پہچان لیا۔ وہ طاہر علی تھا۔

پاکستان بننے کے بعد طاہر علی کے والدین کلکتہ سے آگئے تھے اس لیے وہ اُردو بھی اتنی اچھی طرح بولتا تھا جتنی کہ بنگالی زبان بول سکتا تھا۔ وہ وہاں کی کمیونسٹ پارٹی کا ایک معتبر کامریڈ تھا۔ جب چین اور روس کے درمیان گہرے تعلقات تھے تو مشرقی پاکستان میں ایک ہی کمیونسٹ پارٹی تھی۔ جب ان کے درمیان اختلاف ہوا تو یہ پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک ماسکو گروپ اور دوسرا پیکنگ گروپ کہلانے لگا۔ مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش بننے تک جو عوامل کارفرما رہے، ان میں پاکستان آرمی، بنگلہ دیش رائفلز، انڈین آرمی اور مکتی باہنی کے علاوہ ماسکو گروپ اور پیکنگ گروپ نے بہت اہم رول ادا کیے تھے۔ پاکستان اور چین ہمیشہ سے دوست رہے ہیں اس لیے وہاں چینی کمیونسٹ پارٹی یا پیکنگ گروپ کے لیڈر متین یا دوسرے تمام کامریڈ پاکستان کے مفاد میں کام کرتے رہے تھے۔ اس کے برعکس ماسکو گروپ کے لیڈر امونی سنگھ عرف مونی دا، مظفر اور اس کے تمام کامریڈز نے عوامی لیگ کا ساتھ دیا تھا اور اب بنگلہ دیش رائفلز، انڈین آرمی اور مکتی باہنی والوں کا ساتھ دے رہے تھے۔

خسرو اور طاہر علی کبھی کلاس فیلو تھے۔ پھر طاہر علی کھلنا چھوڑ کر ڈھاکہ چلا گیا۔ وہاں کامریڈ متین کے ساتھ کام کرنے لگا۔ پاکستان کی سلامتی کے لیے تین طرف محاذ سے جنگ ہوتی رہی تھی۔ ایک محاذ پاکستان آرمی کا تھا۔ دوسرے محاذ سے بہاری، دامے درمے سخنے پاک فوج کا ساتھ دیتے رہے تھے۔ تیسرے محاذ پر پیکنگ گروپ کے کامریڈ تھے جو انڈین آرمی کے خلاف پاکستان کا ساتھ دے رہے تھے۔ پاکستان آرمی کا انجام سب کے سامنے آچکا تھا... بہاری قوم مختلف کیمپوں میں قید ہو کر رہ گئی تھی لیکن پیکنگ گروپ کے کامریڈوں کا کیا انجام ہوا تھا، یہ خسرو کو معلوم نہیں تھا۔ اب طاہر علی سے معلوم ہو سکتا تھا۔

وہ دفتر کے دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ طاہر علی اسے دیکھتے ہی چونک گیا۔ اس نے جان اینگل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "سر! یہ نعیم الدین خسرو ہے۔ یہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے — ہم کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔ آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں۔ میرا تعلق کسی پارٹی سے، کسی سیاست سے نہیں ہے۔"

جان اینگل نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بی ڈی آر کے کپتان کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے اسے مخاطب کیا: "ہیلو، کپتان! یہ جوان اپنی بے گناہی کے ثبوت میں مسٹر خسرو کو پیش کر رہا ہے۔ کیا تم سن رہے ہو؟"

کپتان نشے کی زیادتی سے بڑبڑا کر رہ گیا۔ جان اینگل نے

)a staunen
: aber, wie
harf die
hneidet -
as . . . ?!"

اب تو آپ کو ثبوت مل گیا کہ ہماری کمپنی کی قینچی کتنی تیز ہے۔

◆ ◆ ◆

طاہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "یو مسٹر لکھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ موقع ہے کیمپ میں چلے جاؤ۔ تمھیں یہاں سے کوئی پکڑ کر نہیں لے جائے گا۔ کوئی تم سے سوالات نہیں کرے گا"

پھر اس نے خسرو سے پوچھا: "اینڈ یو مسٹر! تم اتنی رات کو یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

خسرو نے کہا: "میں سونا چاہتا ہوں۔ جگہ نہیں ہے۔ جگہ ملے گی تو بچھانے کے لیے کچھ نہیں ہے"

جان اینگل نے ایک گہری سانس لے کر کمرے کے گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ دیکھو، ایک کمبل پڑا ہوا ہے، اسے لے جاؤ۔ میں تو تم لوگوں کی ضرورتیں پوری کر دیتا ہوں۔ میری ضرورت پوری کرنے والا کوئی نہیں ہے"

اس نے شراب سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر کہا: "بس یہ آخری گلاس ہے۔ اس کے بعد بوتل خالی۔ کیا تم کہیں سے ولایتی شراب کا بندوبست کر سکتے ہو؟ میں تمھیں بہت سارے کمبل دوں گا۔ جو طلب کرو گے، وہ دوں گا"

ریڈ کراس سوسائٹی میں کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور بچھانے کا تمام سامان موجود تھا۔ علاج کے لیے دوائیں بھی تھیں۔ ڈاکٹر بھی تھے اور وہاں آ کر کام کرنے والے انگریز عورتوں اور مردوں کے لیے شراب کا تھوڑا سا کوٹہ بھی مقرر تھا جو باہر سے ان کے لیے آتا تھا لیکن وہ کوٹہ کم پڑتا تھا۔ بی ڈی آر کے بڑے بڑے آفیسر ولایتی شراب کی بھری ہوئی بوتلیں بھیک کے طور پر مانگ کر لے جاتے تھے اور ریڈ کراس والے صاحب لوگ انکار نہیں کر سکتے تھے۔

یوں تو پینے کے لیے وہاں بہت کچھ تھا۔ بنگال کی تاڑی بہت مشہور ہے۔ پینے کے بعد کھوپڑی گھوم کر رہ جاتی ہے اس کے علاوہ دیسی شراب تھی۔ بھارت سے بھی ہر کوالٹی کی شراب فروخت ہونے کے لیے آتی تھی لیکن بھارت کی بوتلوں میں شراب دیسی ہوتی تھی اور لیبل بدیسی ہوتا تھا۔ ریڈ کراس کے صاحب لوگوں کو ولایتی کا چسکا پڑا ہوا تھا اس لیے وہ دیسی کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

ان دنوں بنگلہ دیش کی نگری اندھیر اور راجہ چوپٹ تھا۔ سبھی قانون کے جامے سے باہر تھے۔ اس لیے درآمدات اور برآمدات کے لائسنس جاری کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کچھ مالدار بنگالیوں نے باہر سے ولایتی شراب منگا کر اپنی چاندی کرنی چاہی تھی لیکن ہندو تاجر یہ کب گوارا کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے مال کی کھپت کے لیے بنگلہ دیش بنانے میں ان کی مدد کی تھی اس لیے وہاں صرف ہندوستانی شراب آ سکتی تھی۔ ولایتی شراب ریڈ کراس کے کھاتے میں آیا کرتی تھی۔

خسرو نے سوچا: کاش، میرے پاس ایک ولایتی شراب کی بوتل ہوتی۔ میں اسے جان اینگل کو دے کر اس کے ذریعے بہ آسانی یہاں سے نکل سکتا تھا۔ نین تارا کو بحفاظت بھیری گھاٹ تک لے جا سکتا تھا"

اس نے کہا: "سوری مسٹر اینگل! ہم یہاں کیمپ میں محدود ہیں۔ کہیں جا نہیں سکتے۔ اگر کہیں آپ کے مطلب کی چیز ملتی ہو تو مجھے وہاں تک پہنچا دیں"

اس نے ہنستے ہوئے کہا: "اگر کہیں ملتی تو میرے ذرائع محدود نہیں ہیں۔ میں کسی سے بھی منگوا سکتا ہوں۔ تمھارا شکریہ"

"مسٹر اینگل! میں آپ کے کام نہ آ سکا۔ کیا آپ میرا ایک کام کر سکتے ہیں۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ یہاں سے بھیری گھاٹ تک جانا چاہتا ہوں۔ آپ چاہیں تو . . . . "

وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ بی ڈی آر کا جو کپتان نشے کی حالت میں سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک اس کا سر آہستہ آہستہ اٹھنے لگا۔ اس نے کن انکھیوں سے خسرو کو گھور کر دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو "میں نشے میں ضرور ہوں لیکن مرا نہیں ہوں۔ فرار ہونے کے منصوبے کو خوب سمجھ سکتا ہوں"

وہ دروازے سے پلٹ کر دفتر کے برآمدے میں آ گیا۔ حالات موافق نہیں تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نین تارا کو لے کر بھیری گھاٹ کیسے پہنچے۔ یہاں سب لوگ اسے پہچانتے تھے۔ اگر وہ کسی طرح ڈھاکہ پہنچ جاتا تو ایک بنگالی کی حیثیت سے نین تارا کے ساتھ آزادانہ زندگی گزار سکتا تھا۔

وہ سوچتے سوچتے چونک گیا۔ طاہر نے قریب آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ پھر اس نے کمبل بڑھاتے ہوئے کہا: "کیا تم نے شادی کر لی ہے۔ اگر کر لی ہے تو پہلے کمبل لے جاؤ۔ بھابی کو ضرورت ہوگی"

"وہ آرام سے سو رہی ہے۔ تم ڈھاکہ سے کب آئے ہو؟ کیسے آئے؟"

وہ باتیں کرتے ہوئے اسکول کے برآمدے کی طرف جانے لگے۔ طاہر علی نے کہا: "بڑی مصیبتوں سے آیا ہوں۔ میں کامریڈ متین کے ساتھ پاکسی برج سے چالیس میل دور اترائی گھاٹ کے محاذ پر لڑ رہا تھا۔ یار سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا سے کیا ہو گیا ہے بچارے کامریڈ متین کی حالت بڑی خراب ہے۔ وہ بُری طرح پھنس گیا ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے اس برآمدے میں آ گئے، جہاں عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے سبھی سو رہے تھے یا کچھ بیٹھے ہوئے تھے۔ مین تارا گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خسرو زینے پر کمبل بچھا کر طاہر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ طاہر دور تاریکی میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"کامریڈ متین کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ شاید تم اسے سُننا پسند کرو۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ماسکو گروپ اور پیکنگ گروپ ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کرنے لگے تھے۔ انھی دنوں کامریڈ متین کو ایک طالبہ سے محبت ہو گئی۔ اس کا نام ہے رابعہ خاتون۔ وہ بہت ہی ذہین اور معاملہ فہم لڑکی ہے۔ طلبا تنظیموں میں ایسی ہی لڑکیاں تیزی سے آگے بڑھتی ہیں۔ رابعہ خاتون جب سیکڑوں طلبہ کے مجمع میں تقریر کرتی تھی تو دشمنوں کو چُپ لگ جاتی تھی۔ ماسکو گروپ کے کتنے ہی کامریڈ نے کوششیں کیں کہ رابعہ خاتون ان کی طرف چلی آئے لیکن یہ صرف سیاست کا نہیں، دل کا بھی معاملہ تھا اور وہ متین سے متاثر ہو چکی تھی۔

کامریڈ متین نے ایک روز اس سے پوچھا: "ہم اپنی تحریک کے سلسلے میں کب تک جگہ جگہ بھٹکتے رہیں گے۔ ساتھ رہ کر بھی ایک دوسرے سے دُور رہیں گے۔ کیوں نہ شادی کر لی جائے؟"

رابعہ نے کہا: "دو سال بعد میری تعلیم مکمل ہو جائے گی۔ میرے گھر والوں کا ارادہ ہے کہ میں بیرسٹر بنوں۔ ان کا سپنا پورا ہوتے ہی ہم اپنا سپنا پورا کریں گے۔"

"دو سال بہت ہوتے ہیں؟"

"انتظار کرو تو بہت ہوتے ہیں۔ اپنے آدرش کے لیے چلتے رہو تو کم ہو جاتے ہیں۔"

"ہم کوئی دن، تاریخ تو مکمل کر لیں؟"

"چلو کر لیتے ہیں۔"

"لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ اس مقررہ دن ہم جہاں بھی ہوں گے۔ جتنے بھی مصروف ہوں گے۔ تمام مصروفیات کو چھوڑ کر آگ اور خون کے دریا سے بھی گزر کر ایک دوسرے سے ملیں گے اور نکاح پڑھوائیں گے۔"

وہ راضی ہو گئی۔ انھوں نے شادی کے لیے دو سال بعد جنوری کی پہلی تاریخ مقرر کی۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ وہ دن آنے سے پہلے کیا قیامت گزرنے والی ہے۔ ۲۳ رمارچ ۱۹۷۱ء سے پہلے ڈھاکہ کے ریس کورس میں شیخ مجیب الرحمٰن نے تقریباً چھ لاکھ بنگالیوں کے سامنے تقریر کی۔ اس تقریر میں مجیب الرحمٰن نے ایک نیا سلوگن دیا۔ وہ سلوگن تھا: "اے بارے سنگرام ساودھینتا سنگرام۔" (اب ہماری تحریک آزادی کی تحریک ہے)

مجیب الرحمٰن نے اس سلوگن کے ساتھ پہلی بار جے بنگلا کا نعرہ لگایا۔ عوامی لیگ کی ایک شاخ چھاترو لیگ (طلبا لیگ) کا جلسہ جہاں بھی ہوتا تھا وہ نعرہ لگاتے تھے: "امار بھاشا۔ تمار بھاشا۔ بنگلہ بھاشا، بنگلہ بھاشا (ہماری زبان۔ تمھاری زبان۔ بنگلہ زبان بنگلہ زبان)

پھر ان جلسوں میں بنگالی عوام سے پوچھا جاتا تھا: "ڈھاکہ، نا پنڈی؟" (ڈھاکہ چاہتے ہو یا پنڈی؟)

لوگ چیخ چیخ کر جواب دیتے تھے: "ڈھاکہ، ڈھاکہ"

۲۳ رمارچ ۱۹۷۱ء کو مجیب الرحمٰن کے حکم کے مطابق یوم پاکستان کے بجائے یوم مزاحمت منایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بنگلہ دیش کا جھنڈا بھی لہرایا گیا۔ اس شہر کے کسی بھی فرد میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنے گھر پر پاکستانی پرچم لہراتا۔ صرف محمد پور اور میرپور کے بہاریوں نے اپنے حب الوطنی کے ستارہ و ہلال کو گھر گھر لہرایا تھا۔

ایسٹ پاکستان رجمنٹ کے باغی کرنل عثمانی نے بیت المکرم کی شاندار مسجد کے سامنے فوجی پریڈ کا اہتمام کیا۔ اس فوجی پریڈ میں سیکڑوں سابق فوجی بنگالیوں نے شرکت کی اور سب نے بنگلہ دیش سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ بڑی اشتعال انگیز تقریریں کیں۔ ان حالات میں پاکستان آرمی کو بیرکوں سے باہر آنا پڑا۔ گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ کرنل عثمانی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ایسٹ پاکستان رائفلز کے بے شمار بنگالی فوجی سرحد پار چلے گئے۔ ان کے وہاں پہنچنے کے بعد ہی بھارت میں مکتی باہنی کی داغ بیل ڈالی گئی۔ انھیں چھاپہ مار طریقۂ جنگ کی تربیت دی گئی۔ دسمبر کی جنگ کے دوران کامریڈ متین اپنے لوگوں کے ساتھ پاکسی کی طرف چلا گیا۔ رابعہ سے جُدا ہو گیا۔ وہ ڈھاکہ میں تھی اور اسے متین کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔

۱۶ ردسمبر کو سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھی کامریڈ متین نے اترائی گھاٹ میں جنگ جاری رکھی۔ اگرچہ وہ ریڈیو کے ذریعے یہ بُری خبر سن چکا تھا۔ پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ بھلا خوش فہمی کسے نہ ہوتی؟ انھیں باوثوق ذرائع سے

معلوم ہو چکا تھا کہ امریکہ کا بحری بیڑہ خلیج بنگال میں مشرقی پاکستان کی سرحد سے کم و بیش ایک ہزار میل دور کھڑا ہوا ہے۔ پھر یہ کہ چین سے پاکستان کے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ بار بار یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ چینی حکومت صرف جنگی ہتھیار ہی نہیں اپنے جنگی سپاہی بھی فراہم کرے گی۔ پھر جانے کیا ہوا کہ تمام توقعات خاک میں مل گئیں۔ ہمارا کہیں سے رابطہ نہیں ہے۔ اس بازی کے پلٹ جانے کے اسباب بتانے والا کوئی نہیں ہے۔

بہرحال کامریڈ متین اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہو گیا۔ بھارتی سپاہی متین کو صورت شکل سے نہیں پہچانتے تھے۔ اگر پہچانتے تو اسی وقت گولی مار دیتے۔ عوامی لیگ کے لیڈر اور ماسکو گروپ کے کامریڈ بھی متین کو زندہ دیکھنا نہیں چاہتے تھے لیکن بات کچھ سے کچھ ہو گئی۔ جب متین کو ڈھاکہ سنٹرل جیل میں پہنچایا گیا تو یہ طے پایا کہ قیدیوں کی شناختی پریڈ ہونی چاہیے۔ خاص خاص آدمیوں کو پہچان کر انھیں عبرت ناک سزا دینے یا انھیں موت کے گھاٹ اتارنے کا ارادہ تھا۔ اس سے پہلے ہی کامریڈ متین کی محبوبہ نے پانسہ پلٹ دیا۔

وہ چھاترو فرنٹ کے طلبا و طالبات کا جلوس لے کر سنٹرل جیل کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ روزنامہ "اتفاق" اور "مارننگ نیوز" کے صحافی اور فوٹو گرافر وغیرہ بھی تھے۔ وہ ایک قانونی مشیر اور قاضی کو بھی ساتھ لائی تھی کیوں کہ وہ جنوری ۷۲ء کی پہلی تاریخ تھی۔ محبت کا وعدہ ٹل نہیں سکتا تھا۔ اپنے وعدے کے مطابق دلھن نکاح پڑھوانے آگئی تھی۔"

خسرو نے سر گھما کر بڑی محبت سے اور بڑے اعتماد سے یمین تارا کی طرف دیکھا۔ وہ سکون سے سو رہی تھی۔ محبت جب سوتی ہے تو اچھا ہے کہ سوتی رہے۔ جاگ جائے تو اپنا حق منوانے کے لیے زنداں تک پہنچ جاتی ہے۔

طاہر علی نے کہا: "رابعہ خاتون بہت ہی ذہین اور حاضر دماغ ہے۔ اس نے سوچا۔ اگر ان قیدیوں میں متین بھی ہوا تو دشمنوں کے انتقام سے نہیں بچ سکے گا۔ لہٰذا اخبارات کے ذریعے اس خبر کو اچھالنا چاہیے کہ متین زندہ ہے اور قیدی بنا کر لایا گیا ہے۔ اس طرح دشمنوں کے لیے دو باتیں دردِ سر بن جائیں۔ ایک تو یہ کہ عوامی لیگ کی ابتدائی کمزور سی حکومت طلبا و طالبات کی مخالفتیں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ جغرافیائی لحاظ سے جمہوریہ چین بنگلہ دیش کے سر پر تھا۔ بنگلہ دیشی حکمراں چین سے دوستی رکھتے یا نہ رکھتے مگر دشمنی نہیں کر سکتے تھے۔ پیکنگ گروپ کے کامریڈ متین کو مقدمہ چلائے بغیر سزا نہیں دے سکتے تھے اور واقعی رابعہ خاتون کی پلاننگ کے مطابق یہی ہوا۔ شناختی پریڈ سے پہلے ہی متین کی شناخت ہو گئی لیکن دشمن اسے پہچاننے کے بعد بھی ہلاک نہ کر سکے۔"

ہم عورتوں کے اکثریت پر سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ ہم افواہوں کو دُہراتے رہتے ہیں۔ مَیں سمجھتی ہوں کہ یہ سراسر زیادتی ہے کیونکہ ہم میں سے بہت سی عورتیں ایسی بھی ہیں جو افواہوں کو دہراتی نہیں۔ بلکہ ایجاد کرتی ہیں۔

خسرو نے مسکرا کر کہا: "محبت ایسی بھی ہوتی ہے۔ سیاسی چالیں چل کر محبوب کی موت کا رُخ پھیر دیتی ہے۔ کیا دونوں کی شادی ہو چکی ہے؟"

"قانوناً جیل میں نکاح نہیں پڑھایا جا سکتا لیکن وہاں پر قانون تھا کہاں؟ قانون وہی بنتا بگاڑتا تھا جو توڑ پھوڑ کرتا جاتا تھا۔ جو نیتا ایک جمِ غفیر لے کر مطالبہ کرتا تھا، کوئی اس کے مطالبے کو ٹھکرا نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا محبت کا مطالبہ بھی مان کر دونوں کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ رابعہ خاتون پھر قانونی اور سیاسی چالیں چلے گی اور متین کو سزائے موت سے بچا لے گی۔"

بنگلہ دیش کی زمین پر سبھی لوگ اپنی اور اپنوں کی جان بچانے کی فکر میں تھے۔ جو بہاری تھے، وہ بنگالیوں سے بچ کر رہنے کے لیے سرحد پار بھاگ رہے تھے یا کیمپ میں پناہ لے رہے تھے۔ جو لوگ اپنے ذاتی مکانوں میں رہ گئے تھے۔ وہ اپنی سلامتی کے لیے دشمنوں کو اپنے زندہ رہنے کا منہ مانگا ٹیکس ادا کرتے تھے۔ صرف بہاریوں کی ہی بات نہیں تھی۔ بہت سے بنگالی ایسے تھے جو مخالف پارٹیوں کے بنگالیوں سے بچ کر رہنے کی فکر کرتے رہتے تھے۔ جو شہر میں تھے ان کے لیے معقول روزگار نہیں تھا۔ جو دیہاتوں میں زندگی گزار رہے تھے، وہ پہلے بھی بدنصیب تھے۔ پہلے وہ دو وقت کھاتے تھے، ایک وقت فاقہ کرتے تھے۔ اب دو وقت فاقے کر رہے تھے، ایک وقت کا کھانا بڑی مشکلوں سے نصیب ہو رہا تھا کیوں کہ [illegible] اور دوسرے اسمگلر اناج کو سرحد پار بھیج رہے تھے۔ جہاں مسلسل اسمگلنگ، چور بازاری، لوٹ مار اور خون خرابے کی فضا قائم رہے وہاں سبھی کو اپنی اور اپنوں کی جان پیاری ہوتی ہے۔

خسرو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح نین تارا کو لے کر وہاں سے نکلے اور کس طرح ڈھاکہ پہنچ جائے۔ طاہر علی تھکا ہوا تھا، زینے پر لیٹ گیا۔ وہ بھی سوچتے سوچتے ایک ستون سے ٹیک لگا کر اپنی مرضی کے خلاف سو گیا۔ جب ذہنی پریشانیاں ہوں تو بندہ اپنی مرضی سے سو نہیں سکتا اور جسم تھکن سے چُور ہو تو اپنی مرضی سے جاگ نہیں سکتا۔ حیاتِ انسانی کا حساب کیا جائے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ عمرِ طبعی تک انسان اپنی مرضی سے زندہ رہتا ہے لیکن اپنی مرضی سے زندگی نہیں گزار سکتا۔

وہ حسبِ حال ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ نین تارا کا ہاتھ پکڑے دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا فرار کا راستہ بناتا جا رہا تھا۔ اچانک شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی۔ وہ چلتے چلتے رُک گیا۔ دیکھا سامنے رائل بنگال ٹائگر کھڑا ہوا تھا۔ دنیا کے تمام شکاری سندر بن کے شیروں کو رائل بنگال ٹائگر کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ عام شیروں کی طرح ہیبت ناک ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے دانتوں کو دیکھ کر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ شاید ان کی بڑی بڑی مونچھوں کے پیشِ نظر انسانوں نے مونچھیں رکھ کر شیروں کی طرح دہشت ناک بننا سیکھا ہے۔

رائل بنگال ٹائگر نے دھاڑتے ہوئے پوچھا: "کیا تم نین تارا سے محبت کرتے ہو؟"

خسرو نے جواب دیا: "ہاں، دل سے محبت کرتا ہوں، جان سے محبت کرتا ہوں۔ ایمان سے محبت کرتا ہوں۔"

"جب اتنی زیادہ محبت کرتے ہو تو بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ محبت کبھی بھاگتی نہیں ہے۔ سامنے دیواریں ہوں تو محبت دروازے بناتی جاتی ہے۔"

"میں تمہارے جیسے ہیبت ناک شیر کے سامنے نہ تو دروازہ بنا سکتا ہوں نہ راستہ۔"

"تم مجھ سے کیوں ڈرتے ہو؟"

"جب ہمارے شاہین ہمارے ساتھ تھے تو ڈر نہیں لگتا تھا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ شاہین کے پَر امریکہ سے امپورٹ کیے گئے تھے اور نوکیلے پنجے چین سے لائے گئے تھے۔ صرف شاہین کا حوصلہ اپنا تھا لیکن خالی حوصلہ کب تک ساتھ دیتا؟"

شیر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "جو حالت عین کی، وہی حالت غین کی، یہ دیکھو۔"

اس نے بڑے بڑے نوکیلے دانتوں کو منہ سے نکال کر سامنے رکھتے ہوئے کہا: "یہ روسی دانت اُدھار لیے گئے تھے اور اُدھار کے بعد ہمیشہ سود کے ساتھ واپسی ہوتی ہے۔ سوچتا ہوں، سود میں اپنے اصلی دانت کبھی نہ چلے جائیں۔"

پھر اس نے بڑی بڑی مونچھوں کو چہرے سے الگ کرتے ہوئے کہا: "یہ بھارت سے لائی گئی تھیں۔"

خسرو نے تعجب سے دیکھا۔ اب وہ رائل نہیں رہا تھا صرف بنگال ٹائیگر رہ گیا تھا۔ اب وہ برائے نام پنجے مار سکتا تھا مگر چبا نہیں سکتا تھا۔ مونچھوں پر تاؤ نہیں دے سکتا تھا۔ خسرو نے ہش کہہ کر یوں ہاتھ ہلایا جیسے مکھی اُڑا رہا ہو۔ پھر وہ نین تارا کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔ آگے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آواز دی: "خسرو! اے خسرو! تم یہاں ہو؟"

پھر کسی نے اس کے شانے کو جھنجھوڑا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ نہ شیر تھا نہ دشمن فوجی اور نہ ہی اس نے نین تارا کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ تلسی رام کہہ رہا تھا: "میں تمہیں خالص پور اور کھلنا شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔"

اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا: "آپ مجھے کیوں ڈھونڈ رہے ہیں؟"

"تمہاری بڑو دیدی نے تمہیں بلایا ہے۔"

"میں کہہ چکا ہوں۔ ہندوستان نہیں جاؤں گا۔"

"ارے بھئی وہ ہندوستان سے واپس آگئی ہے۔"

اس نے خوش ہو کر پوچھا: "میری دیدی آگئی ہیں۔ پھر تو میں چلوں گا۔ ابھی چلوں گا۔"

وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ اس نے سر گھما کر نین تارا کو دیکھا پھر کہا: "لیکن دیدی سے ملنے کے بعد واپس آجاؤں گا۔"

"تم تو ایک دم بوکا (بیوقوف) ہو۔ یہ سمجھ رہے ہو کہ تمہاری دیدی یہاں خالص پور میں ہے۔ نہیں وہ واپس ضرور آئی ہے۔ لیکن سید پور میں ہے تمہیں سید پور جانا ہوگا۔"

"میں نین تارا کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"آخر وہ کون لڑکی ہے۔ اس میں کیا دھرا ہے۔ کیوں اس کے لیے دیوانے ہو رہے ہو۔ جانتے ہو، میں تمہیں کہاں کہاں تلاش کرتا رہا۔ تمہارے گھر گیا تو وہاں ویرانی تھی پھر سوچا، شاید کھلنا گئے ہو۔ کھلنا کے الیکٹریکل گڈز کے تمام تاجروں سے تمہارے بارے میں پوچھا۔ تمہارا ان سے کاروباری تعلق ہے لیکن وہ بھی تمہارے متعلق کچھ نہ بتا سکے۔ میں پھر یہاں تمہارے گھر کی طرف آیا۔ تمہارے پڑوسی سے ملاقات ہو گئی۔ تب معلوم ہوا کہ مجنوں بن کر یہاں پہنچ گئے ہو۔ ارے تم اچھا کھاتے کماتے تھے، اب بھی تمہارے دن پھر جائیں گے۔ تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔"

خسرو نے سوچتی ہوئی نظروں سے تلسی رام کو دیکھا۔ دماغ میں بات آئی کہ مین تارا کو صرف ایک لڑکی کہے گا تو بات نہیں بنے گی۔ لہٰذا اس نے کہا۔ "جیجا جی! اس سے میری شادی ہو چکی ہے وہ میری بیوی ہے۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "یہاں آگ اور خون کا کھیل ہوتا رہتا ہے۔ کسی کو اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں ہوتا کہ وہ اگلے پل جیئے گا یا مرے گا اور ایسی حالت میں تم نے شادی بھی کر ڈالی۔"

"میں مجبور تھا۔ اسی آگ اور خون کے کھیل میں اس کے ماں باپ مارے گئے۔ اس کا کوئی نہیں تھا۔ مجھے ہی اس کا سہارا بننا تھا اور یہ میرے دل کی بات تھی اس لیے میں نے اسے اپنی شریکِ حیات بنا لیا۔"

"بھئی جب بنا لیا ہے تو وہ ہماری بھی عزت ہوئی.... تمہاری بڑو دیدی کو تو بڑی خوشی ہوگی۔ اسے بھی ساتھ لے چلو۔"

اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ طاہر علی نے کہا۔ "دوست یہ اچھا موقع ہے۔ بھابی کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ سید پور بہاریوں کی آبادی ہے۔ وہاں آرام سے رہو گے۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر مین تارا کے پاس آیا۔ شاید محبت کرنے والیاں نیند کی گہرائی میں بھی انتظار کرتی ہیں۔ کوئی آئے اور اپنے ہونٹوں پر اس کا نام سجا کر اسے پکارے تاکہ عشق کی بارگاہ تک پہنچے۔ حسن جانے پناہ تک پہنچے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ساڑی کو درست کرنے لگی۔ برآمدے کے باہر کھڑا ہوا تلسی رام ایک ٹک مین تارا کو دیکھ رہا تھا۔ ایسی حسین صورت ہے جیسے وہ صورت کسی سنگ تراش کی مورت ہو۔ اتنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کہ آنکھ اٹھا کر دیکھے تو دیکھنے والا جاگتی آنکھوں میں سپنا دیکھے اور سپنے میں اسے اپنا ہی اپنا دیکھے۔ کوئی اور اس کے پاس ہو تو کانٹا لگے۔

ادھر خسرو نے آہستگی سے کہا۔ "دیکھو، وہاں میرے ایک ہندو دوست کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کا نام تلسی رام گردال ہے۔ ان کی بیوی کو میں نے اپنی بڑی بہن بنایا ہے۔ اس رشتے سے یہ میرے جیجا جی ہیں۔ میں نے ان سے جھوٹ کہہ دیا ہے کہ ہماری شادی ہو چکی ہے۔"

"تم نے جھوٹ کیوں کہا؟"

"وہ مجھے اکیلے یہاں سے لے جانا چاہتے تھے۔ بھلا انہیں کیا پڑی ہے کہ کسی بہاری لڑکی کو ساتھ لے جائیں۔ جب میں نے رشتہ بتایا تو مجبور ہو گئے۔ کہنے لگے۔ میری عزت ان کی عزت ہے۔ لہٰذا اب وہ تمہاری عزت کریں گے۔"

"ہم کہاں جائیں گے؟"

"تم چلو، میں راستے میں بتا دوں گا۔ وہ دیکھو تلسی رام جی ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔"

مین تارا نے اُدھر دیکھا۔ تلسی رام سے آنکھیں چار ہوتے ہی اس نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ حیا اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ تلسی رام کا عجب حال تھا۔ ایک ذرا نظریں ملی تھیں۔ ایک ذرا بجلی کوندی تھی۔ ایک لمحے کی ملاقاتی نظر تھی لیکن قاتل کہلاتی نظر تھی۔ تلسی رام دھپ سے زینے پر بیٹھ گیا جیسے قتل ہو گیا ہو۔

بنگالیوں اور مارواڑیوں میں ایک قدرِ مشترک ہے۔ بنگالی غربت کی وجہ سے اور مارواڑی سرمائے کی بچت کے لیے مچھلیاں کھاتے ہیں کیوں کہ بنگال میں مچھلیاں سب سے زیادہ سستی ہوتی ہیں۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں مچھلی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے لیکن یہ لوگ صبح کے ناشتے میں بھی مچھلیاں کھاتے ہیں۔ کوئی مہمان آجائے تو شام کے ناشتے میں بھی مچھلیاں پیش کرتے ہیں۔ بیماری ہو تو اوشدھ (دوا) کے طور پر مچھلیوں کا تیل استعمال کرتے ہیں۔ بنگال کی آب و ہوا معتدل ہے لیکن مچھلی کی تاثیر گرم ہے۔ یہاں کی روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی کا ایک سبب مچھلیاں ہیں۔ یہ لوگ عورتوں کے معاملے میں نہایت ہی شائستہ اور معتدل ہیں لیکن یہی عورت اعصاب پر سوار ہو جائے

اُف یہ بیویاں

- ایک بیوی نے اپنے شوہر کو تیر کمان استعمال کر کے قتل کیا۔ کیونکہ اُسے اندیشہ تھا کہ اگر اُس نے پستول چلایا تو اُس کے ننھے بچے کی نیند خراب ہوگی!
- ایک شوہر کو اپنی مرہم پٹی کرانے ہسپتال جانا پڑا کیونکہ اُس نے اپنی بیوی کو مارا تھا۔

اُف یہ شوہر

- ایک صاحب بیوی کو سائیکل پر بٹھائے بازار سے گزر رہے تھے کہ سائیکل الٹ گئی اور دونوں گر پڑے۔ وہ صاحب فوراً اُٹھے اور سائیکل کو جھاڑنے پونچھنے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے بیوی کی طرف دیکھا تک نہیں۔

بیوی جو اُٹھی تو غصّے سے بولی "تمہیں مجھ سے زیادہ سائیکل پیاری ہے۔"

وہ بولے "اگر میں تمہیں اُٹھاتا تو لوگ کہتے کہ یہ زن مرید ہے۔"

مرسلہ: شمیم مصطفیٰ قریشی ۔ کراچی

تو یہ سوڈا واٹر گیس کی طرح بھڑکتے ہیں پھر دوسرے ہی لمحے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ جیسا کہ تلسی رام زینے پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر اس نے اٹھ کر دھوتی کی لانگھ سنبھالتے ہوئے کہا: "بھئی خسرو! جلدی کرو۔"

خسرو کا پڑوسی تلسی رام کی رہنمائی کرتا ہوا کیمپ تک آیا تھا اس نے خسرو کو کاغذ کا ایک چھوٹا سا بنڈل دیتے ہوئے کہا۔ "یہ چھ ہزار ٹاکا رکھ لو تمہارے ہیں۔"

پھر اس نے مین تارا کی طرف دو چھوٹی سی ڈبیہ بڑھاتے ہوئے کہا: "بھابی! اس میں سندور ہے اور اس میں ماتھے کے لیے بندیا رکھی ہوئی ہیں۔ جو بندیا پسند ہو۔ اپنے ماتھے پر لگا لیں اور مانگ میں سیندور بھر لیں۔"

برآمدے میں سونے والے اٹھ گئے تھے۔ عورتیں قریب آکر مین تارا اور خسرو سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟ مرد حضرات دور کھڑے ہوئے تلسی رام کو اور اس کے ساتھ ایک مسلح فوجی کو دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں مین تارا تیار ہو گئی۔ اس کی پیشانی پر سنہری بندیا جگمگا رہی تھی۔ ماتھے پر سیندور کی سرخی تھی۔ خسرو نے اس کی اٹیچی اٹھا لی۔ پھر وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے زینے کے پاس آئی تلسی رام نے اسے اپنے بالکل قریب دیکھا تو ذرا کانپتے ہوئے، ذرا ہچکچاتے ہوئے۔ ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "ہی ہی ہی ہی۔ یہ خسرو میرا سالا ہے۔ اس رشتے سے میں تم سے مسخری کرسکتا ہوں۔"

خسرو نے حیرانی سے پوچھا: "جیجا جی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اس بے چاری کے والدین کل ہی مارے گئے ہیں۔"

وہ سٹپٹا کر بولا: "بھئی چھما کرنا۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔ چلو چلتے ہیں۔"

وہ آگے بڑھ گیا۔ خسرو مین تارا کو ساتھ لے کر چلنے لگا۔ مسلح سپاہی ان کے پیچھے تھا۔ اسکول کی عمارت کے دائیں طرف پختہ سڑک پر ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ ایک طرف وہی فوجی ٹرک موجود تھا جسے خسرو نے پچھلی رات دیکھا تھا لیکن اب وہ فوجی اسے روک نہیں سکتے تھے۔ وہ ہندو بنیا گویا کہ حاکمِ وقت تھا۔ اس نے کمال ہنرمندی سے بی ڈی آر اور انڈین آرمی کے جوانوں کو اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا یقیناً کچھ رشوتیں دیتا ہوگا۔ کچھ چاپلوسی کرتا ہوگا اور کچھ بھارتی حکومت کو فائدہ پہنچاتا ہوگا۔ بات جو کچھ بھی رہی ہو۔ ان دنوں تلسی رام گروال کھلنا، خالص پور اور دولت پور کا بے تاج بادشاہ تھا۔

خسرو مین تارا کے ساتھ جیپ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

تلسی رام بھی خسرو کے پاس آکر بیٹھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور وہ بھیری گھاٹ کی طرف جانے لگے۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ پچھلے دنوں موسلا دھار بارش ہوتی رہی تھی۔ اس کے بعد بھی رم جھم جاری رہی لیکن اب بادلوں کو دیکھ کر پتہ چل رہا تھا کہ زبردست بارش ہونے والی ہے۔

چھ بجنے والے تھے لیکن سیاہ بدلیوں کے باعث چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر تلسی رام بار بار مین تارا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے میں نظر نہیں آتا لیکن آدمی جسے دیکھنا چاہتا ہے' اسے تاریکی میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ شاید اس لیے کہ حسن تاریکی میں اور زیادہ پرکشش ہو جاتا ہے۔

سڑکوں کے کنارے لیمپ پوسٹ تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں لیمپ روشن تھے۔ مین تارا جیسے نگاہوں کے سامنے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ کبھی دور تک تاریکی میں چھپی رہتی تھی۔ پھر کسی اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں نظر آتی تھی۔ اس کے بعد بجھ جاتی تھی۔ یہ غلط ہے کہ عورت ادائیں دکھاتی ہے تو مرد للچاتا ہے۔ اس وقت یہ درست تھا کہ وہ بے چاری چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ حالات جل رہے تھے' بجھ رہے تھے۔ اسے دکھا رہے تھے' چھپا رہے تھے۔ اسے لمحہ لمحہ پُراسرار بنا رہے تھے اور جو چیز اسرار بن جاتی ہے' وہ انکشاف کی ضد بن جاتی ہے۔

جیپ کار ریلوے اسٹیشن کے پاس آکر رک گئی۔ پلیٹ فارم کی پہلی لائن پر ایک ٹرین کھڑی ہوئی تھی۔ کھلنا ریلوے اسٹیشن اس لائن کا آخری اسٹیشن تھا۔ اس کے بعد دریا پڑتا تھا اور وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ہی بھیری گھاٹ تھا۔ وہ سب جیپ سے اتر کر پلیٹ فارم پر آگئے۔ زنانہ ڈبے میں کچھ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں مارواڑی عورتیں بھی تھیں۔

تلسی رام نے کہا: "تم مین تارا کو اس کمپارٹمنٹ میں بٹھا دو۔"

مین تارا نے خسرو کے پیچھے تقریباً چھپتے ہوئے کہا: "میں اکیلی نہیں بیٹھوں گی۔ تم بھی میرے ساتھ رہو۔"

تلسی رام نے کہا: "تم ان عورتوں کے درمیان محفوظ رہو گی۔ یہ میرے ایک دوست کی فیملی ہے۔ یہ تمام عورتیں تمہارا بہت خیال رکھیں گی۔"

خسرو نے کہا: "جیجا جی! یہ میرے ساتھ کسی کمپارٹمنٹ میں بیٹھے تو کیا حرج ہے؟"

"نادان نہ بنو۔ اگر تمہاری بیوی سے کوئی حماقت سرزد ہو جائے جس کی وجہ سے یہ ہماری سمجھی جائے تو سمجھ لو ہم کن کن

مشکلات میں گرفتار ہو جاؤ گے۔"

خسرو نے تائید میں سر ہلا کر کہا: "مین تارا! تم اس ڈبے میں بیٹھ جاؤ۔ چچا جی ہماری بھلائی کے لیے مشورہ دے رہے ہیں۔ میں قریب ہی کسی ڈبے میں بیٹھوں گا اور ہر اسٹیشن پر تمہاری خیریت معلوم کرتا رہوں گا۔"

اس نے سمجھا بجھا کر اسے زنانہ ڈبے میں سوار کرا دیا...

تلسی رام نے ہندو عورتوں کو مین تارا سے متعارف کرایا اور اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ پھر مین تارا کھڑکی سے سر نکال کر پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے خسرو سے باتیں کرنے لگی۔ تلسی رام کمپارٹمنٹ سے اتر کر پلیٹ فارم پر اس جگہ آیا جہاں چار مسلح سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ان سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ ایک سپاہی ٹرین کے پچھلے حصے کی طرف جانے لگا۔ تلسی رام نے خسرو کے قریب آ کر کہا: "اپنی بیوی سے اگلے اسٹیشن پر باتیں کر لینا۔ ٹرین چلنے کا وقت ہو رہا ہے۔ اب کام کی باتیں کرو۔ آؤ۔"

خسرو نے مین تارا کو پھر ایک بار تسلی دی۔ اگلے اسٹیشن پر آنے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد تلسی رام کے ساتھ چلتے ہوئے بولا: "آپ مجھ سے کس کام کی بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں کاروباری آدمی ہوں۔ تمہیں شانتا (ترویدی) کے پاس بھیج رہا ہوں تو اپنا کچھ فائدہ بھی دیکھتا ہوں۔ تم یہاں سے ہلی پہنچو گے۔ ہلی میں ایک مال گاڑی کا ڈبہ اس گاڑی سے اٹیچ کیا جائے گا۔ اس میں اناج کی بوریاں ہوں گی۔ ان بوریوں کے کاغذات تمہیں وہاں کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر سے مل جائیں گے۔ یہ کاغذات سنبھالو۔ ان میں تمہارا نام، پتہ اور حلیہ لکھا ہوا ہے۔ ان کاغذات کے مطابق تم اس مال گاڑی کے ڈبے کے مالک ہو گے۔ اس میں جتنا اناج ہو گا، وہ سب تمہارا ہو گا۔ تم اس کے مالک رہو گے۔ سید پور پہنچنے کے بعد شانتا (ترویدی) کا بھائی وہ تمام اناج اپنی تحویل میں لے لے گا۔ تم اس کے ساتھ اس اناج کو فروخت کرو گے اور آمدنی کے ایک ایک پیسے کا حساب لکھو گے۔"

خسرو نے پوچھا: "کیا ہلی اسٹیشن پہنچنے کے بعد اناج کا وہ واگن اس ٹرین سے لگے گا؟"

"ہاں، یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔"

"لیکن چچا جی! مشرقی پاکستان کے وقت ہلی اسٹیشن پاکستان میں تھا اور اس کی ریلوے لائن ہندوستان میں تھی۔ اب تو سب کچھ ہندوستان کے قبضے میں ہو گا۔ وہاں سے اناج لے جانے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ سارا اناج ہندوستان سے آ رہا ہے اور سید پور بھیجا جا رہا ہے۔"

"ہاں یہی بات ہے۔"

"لیکن ہندوستان میں خود اناج کی کمی ہے۔ کتنے ہی لوگ وہاں فاقے کرتے ہیں۔ پھر وہ اناج؟"

"بھئی تم آم کھاؤ، پیڑ نہ گنو۔"

"کیسے نہ گنوں۔ جو کام مجھ سے لیا جا رہا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہونا چاہئیں۔"

"تم کوئی نادان تو نہیں ہو۔ کیا اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے کہ ہندوستان سے اناج اسمگل کر کے سید پور پہنچایا جائے گا۔"

خسرو نے شدید حیرانی سے کہا: "لیکن آپ تو ہندوستان کے وفادار ہیں اور آپ وہاں کا اناج اسمگل کر رہے ہیں؟"

تلسی رام نے ہنستے ہوئے کہا: "تم ایک دم بوکا (بیوقوف) ہو۔ کیا انگریزوں کے ملک میں انگریز، مسلمانوں کے ملک میں مسلمان اور ہندوؤں کے ملک میں ہندو اسمگلر نہیں ہوتے، دین دھرم ایک الگ سی بات ہے۔ حب الوطنی کو پڑھے لکھے جذباتی انسانوں کے لیے رہنے دو۔ ہم صرف اپنا منافع دیکھتے ہیں۔ میں یہاں سے کلکتہ کی ملوں کے لیے پٹ سن بھیجتا ہوں۔ بھارتی ضرورت مندوں کے لیے چاول اسمگل کرتا ہوں لیکن وہاں سے گیہوں، چنا اور سستے قسم کے چاول اسمگل کراتا ہوں۔ یاد رکھو، اسمگلروں کی کوئی زمین نہیں ہوتی۔ کوئی وطن نہیں ہوتا، اس کے باوجود کتنے ہی ملکوں میں ان کا بنک بیلنس ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے سر پہ تاج نہیں پہنتے لیکن ہر ملک کے بادشاہ ہوتے ہیں اور وہ ہم ہیں۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے وہاں سے پلٹ کر پھر ٹرین کے اگلے حصے کی طرف جانے لگے۔ سگنل ڈاؤن ہو چکا تھا۔ ٹرین چلنے ہی والی تھی۔ خسرو تلسی رام کے ساتھ چلتا ہوا اس کمپارٹمنٹ کے سامنے سے گزرنے لگا جہاں مین تارا مارواڑی عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ کھڑکی سے اس کی پشت نظر آ رہی تھی اور وہ عورتوں سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ خسرو مطمئن ہو گیا۔ تلسی رام اسے لے کر ٹرین کے اگلے حصے کے ایک کمپارٹمنٹ کے پاس آیا۔ پھر اپنے آدمیوں سے کہنے لگا: "یہ نعیم الدین خسرو ہے۔ میں نے اپنے تمام ضروری کاغذات اسے دے دیے ہیں۔ اب اس کا حکم میرا حکم ہو گا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے ایک ایک بات سمجھاؤ کہ ہلی اسٹیشن پر کن لوگوں سے سابقہ پڑے گا اور ان لوگوں کو کس طرح ہینڈل کرنا ہو گا۔"

ان میں سے ایک نے کہا: "خسرو صاحب! آئیے، ہم کمپارٹمنٹ میں بیٹھ کر باتیں کریں۔"

خسرو نے کہا: "مگر چچا جی! آپ میری بھی تو کچھ سنیں۔ میں نے یہ دھندا پہلے کبھی نہیں کیا ہے اور نہ کبھی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ

مجھے کیوں خواہ مخواہ پھنسا رہے ہیں۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی تو میرے ساتھ آپ بھی ڈوب جائیں گے۔"

"میں کوئی کچا کھیل نہیں کھیلتا۔ تمھارا کام صرف یہی ہے کہ اس اناج کے ویگن کے ساتھ سید پور جاؤ۔ باقی کام میرے آدمی سنبھال لیں گے۔ میں چاہتا ہوں، سید پور پہنچ کر تمھاری آمدنی کا کوئی ذریعہ بنا رہے۔ تم میری طرف سے اس اناج کو فروخت کرو گے۔ جو بھی منافع ہوگا یا تنخواہ ہوگی وہ میں تمھیں ادا کروں گا اور میں کیا تمھاری بڑی دیدی تمھیں منہ مانگی رقم دے دیا کرے گی۔ بس جاؤ۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ آپ مجھ سے یہ کام کرائیں گے تو کیمپ چھوڑ کر یہاں نہ آتا۔ کیا آپ مجھے واپس کیمپ نہیں پہنچا سکتے؟"

"نادانی نہ کرو۔ میں تمھیں تمھاری بہن کے پاس پہنچاؤں گا اس کے بعد تم سے کوئی کام نہیں لوں گا۔ بھئی یہ سوچ کر جاؤ کہ تم کوئی اسمگلر نہیں ہو۔ تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ میرے آدمی سارا کام سنبھال لیں گے۔"

وہ طوعاً و کرہاً کمپارٹمنٹ کے اندر آ گیا۔ وہاں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہی اسمگلنگ کے سلسلے میں اس کی راہنمائی کرنے والے تھے۔ انھوں نے اسے اپنے درمیان بٹھا لیا اور باتیں کرنے لگے۔ تلسی رام اس کی طرف سے مطمئن ہو کر نین تارا کی طرف جانے لگا۔ اس وقت گھنٹی بج رہی تھی۔ ٹرین چلنے ہی والی تھی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا کمپارٹمنٹ کے پاس آیا پھر کھڑکی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "نین تارا! تمھارا خسرو ضد کر رہا ہے کہ تمھیں اپنے ساتھ رکھے گا۔ اپنی اٹیچی اٹھاؤ اور چلو۔ میں تمھیں اس کے کمپارٹمنٹ میں چھوڑ آؤں۔"

نین تارا یہی دعا مانگ رہی تھی۔ خسرو سے بچھڑ کر دل گھبرا رہا تھا اور اب خدا نے سن لی تھی۔ اس نے فوراً ہی اٹیچی اٹھائی، عورتوں کو مسکرا کر الوداعی نظروں سے دیکھا۔ پھر دروازہ کھول کر پلیٹ فارم پر آ گئی۔ تلسی رام نے ٹرین کے پچھلے حصے کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے کہا۔ "جلدی آؤ۔ گاڑی چلنے والی ہے۔"

وہ تیزی سے چلنے لگی۔ تلسی رام کے پیچھے تقریباً دوڑنے لگی۔ ایک فرسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ کر تلسی رام نے اس کا دروازہ کھولا۔ پہلے خود اندر گیا پھر بولا۔ "آ جاؤ۔" اس نے اٹیچی کو کمپارٹمنٹ کے اندر رکھا۔ پھر خود اندر آنے سے پہلے پوچھا۔ "وہ کہاں ہیں؟"

"وہ؟" تلسی رام نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر مسکرا کر بولا۔ "باتھ روم میں ہے۔ کیوں بھئی خسرو، تم موجود ہو؟"

اندر سے کھنکارنے کی آواز سنائی دی —— وہ کمپارٹمنٹ کے باہر تھی۔ کھنکارنے کی آواز اسے بھی سنائی دی لیکن اتنی دور سے اس نے آواز کے فرق کو نہیں سمجھا۔ زیادہ سوال بھی نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ ٹوائلٹ کے اندر سے کوئی بات نہیں کرتا۔ جواب میں صرف کھنکارتا ہی ہے۔ اس کے علاوہ ٹرین اب حرکت میں آ گئی تھی۔ وہ فوراً ہی زینے پر چڑھ کر کمپارٹمنٹ کے اندر آ گئی۔ وہ سنگل برتھ کا چھوٹا سا کمپارٹمنٹ تھا۔ نین تارا ٹوائلٹ کے دروازے کے پاس دیکھتے ہوئے سیٹ پر بیٹھ گئی۔ تلسی رام نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔ "باہر آ جاؤ۔ ٹرین چل رہی ہے۔"

ٹرین اب آہستہ آہستہ رفتار پکڑ رہی تھی۔ ٹوائلٹ کا دروازہ کھلا تو ایک مسلح سپاہی نظر آیا۔ وہ فوراً ہی وہاں سے نکل کر کمپارٹمنٹ کے کھلے ہوئے دروازے سے باہر گیا۔ پھر چھلانگ لگا کر ٹرین سے اتر گیا۔

نین تارا پہلے تو گم صم سی سوچتی رہ گئی کہ ٹوائلٹ سے خسرو کے بجائے یہ کون نکل آیا تھا۔ جب وہ چھلانگ لگا کر نکل گیا تو یہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ پھر گھبرا کر بولی۔ "یہ کون تھا؟ وہ کہاں ہیں؟"

تلسی رام نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ سپاہی تھا جو چلا گیا اور جب میں تمھارے ساتھ موجود ہوں تو اپنے وہ کو نہ پوچھو۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے کمپارٹمنٹ کے دروازے کو بند کر دیا۔ ٹرین اب پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی لیکن نین تارا کے لیے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا البتہ دو راستے تھے۔ یا تو زندہ رہنے کے لیے عزت کی قربانی دے یا پھر غنڈے سے بچنے کے لیے اپنے محبوب کو زور زور سے پکارے لیکن وہ کتنی زور سے چیخ سکتی تھی۔ اس کا محافظ ٹرین کے اگلے حصے میں تھا اور یہ پچھلے حصے میں تھی۔

اس لمحے یہ بات سمجھ میں آئی کہ دوڑ کر ٹوائلٹ میں جائے اور دروازے کو اندر سے بند کر دے۔ یہ سوچتے ہی وہ اُدھر دوڑی لیکن تلسی رام دروازے کے پاس کھڑا ہوا تھا اور ٹوائلٹ کا دروازہ بھی قریب ہی تھا۔ وہ اس دروازے کو چھوڑ کر اس دروازے کے آگے دیوار بن گیا۔ نین تارا پلٹ کر دوسرے دروازے کی طرف بھاگنے لگی۔ اسی وقت اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ اس کی چوٹی صیاد کے ہاتھ میں آ گئی تھی اور وہ ایک جھٹکے سے اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی ٹرین کھٹ کھٹا کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کی آواز سے دل کی دھڑکنوں میں بج رہی تھی۔

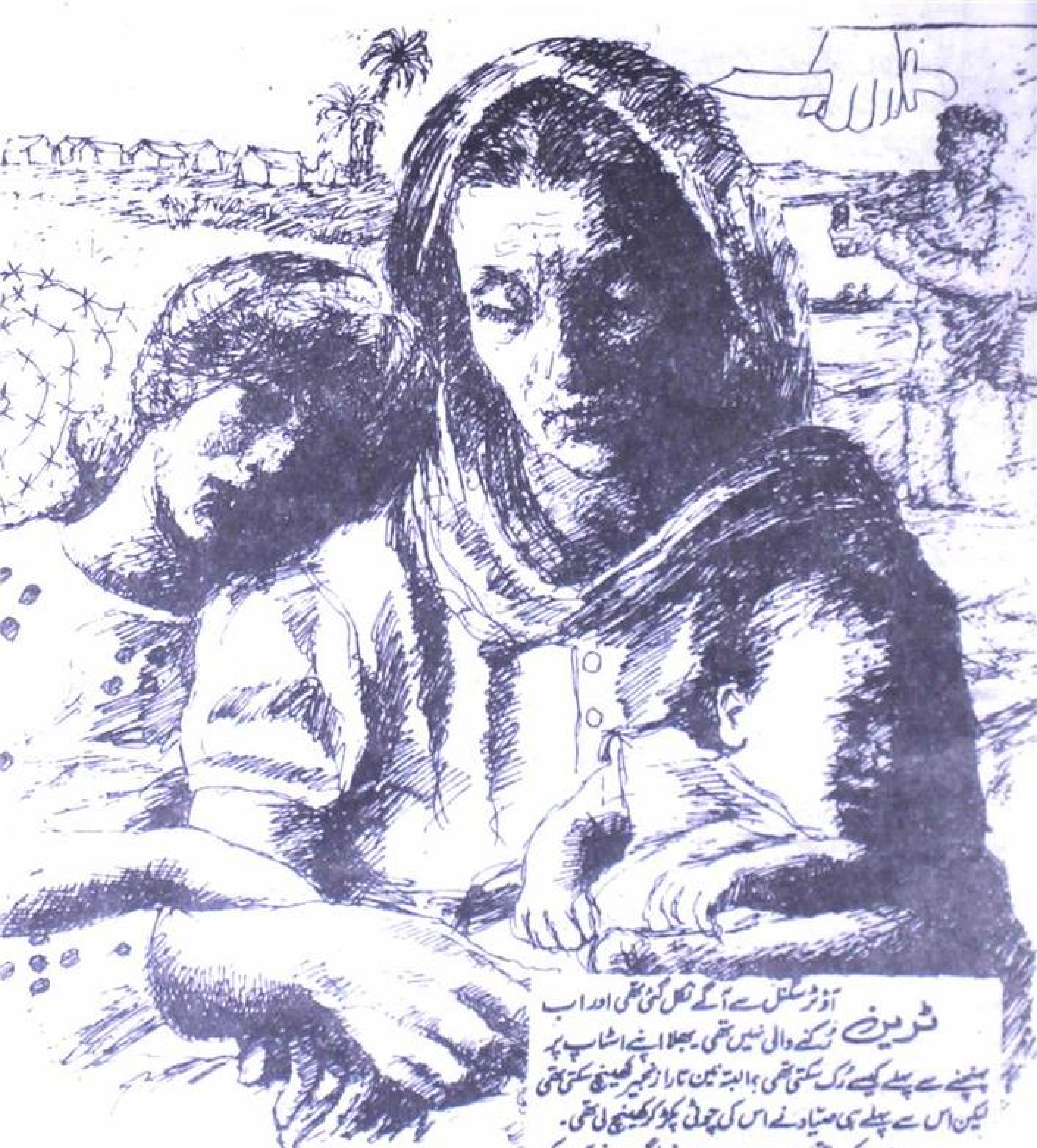

ٹرین آؤٹر سگنل سے آگے نکل گئی تھی اور اب رُکنے والی نہیں تھی۔ بھلا اپنے اسٹاپ پر پہنچنے سے پہلے کیسے رُک سکتی تھی؟ البتہ نین تارا زنجیر کھینچ سکتی تھی لیکن اس سے پہلے ہی صیاد نے اس کی چوٹی پکڑ کر کھینچ لی تھی۔

وہ اپنے نازک ہاتھوں سے اسے مارنے لگی۔ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ چیخ چیخ کر کہنے لگی: "مجھے چھوڑ دو۔ چھوڑ دو مجھے۔ اگر خسرو کو معلوم ہوگا تو وہ تمھیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

وہ بڑے پیٹ والا سیٹھ تھا۔ زیادہ چلنے پھرنے، بھاگنے دوڑنے یا پھرتی دکھانے والا آدمی نہیں تھا۔ دن بھر اپنی گدی پر بیٹھا رہتا تھا یا گاڑی میں گھومتا رہتا تھا۔ اس لیے وہ ذرا سی جدوجہد کے بعد ہانپنے لگا۔ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کہنے لگا: "میں لڑنے جھگڑنے والا آدمی نہیں ہوں۔ آرام سے میری باتیں سنو۔ نہیں تو میرے آدمی ایک اشارے پر خسرو کو گولی مار دیں گے۔"

وہ ایک دم سے سہم گئی۔ جدوجہد بھول گئی۔ جمنی رام نے پھر اسے نہیں چھیڑا۔ سمجھ گیا کہ چڑیا دام میں آگئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ پھڑپھڑائے گی۔ پھر تھک جائے گی۔ ہار مان جائے گی۔ وہ اسے سوچنے سمجھنے کی مہلت دے رہا تھا۔

نین تارا کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ پیچھے ہٹ رہی تھی جیسے منہ زور ہوائیں پیچھے دھکیل رہی ہوں لیکن جوانی سے زیادہ منہ زور کوئی نہیں ہوتا اور اسے جوانی کی ابتدا میں کیا ملا تھا؟ لے دے کر آدھا سہاگ۔ اور اس آدھے سہاگ کو بھی وہ ظالم چھین لینا چاہتا تھا۔

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے دروازے کے قریب دیوار سے لگ گئی۔

اس نے ذرا سر گھما کر کھلی ہوئی کھڑکی کو دیکھا۔ باہر دن نکل آیا تھا لیکن اندھیرا اندھیرا سا لگ رہا تھا۔ کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ بادل تلسی رام کی طرح گرج رہے تھے مگر ابھی برس نہیں رہے تھے۔

وہ چشم زدن میں دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا سکتی تھی لیکن ٹرین پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ چھلانگ لگاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ وہ بچپن ہی سے ڈرپوک تھی۔ اسے اپنے آپ سے بے انتہا محبت تھی اور جو لوگ اپنی ذات سے محبت کرتے ہیں اور اس دُنیا میں آخری سانس تک زندہ رہنا اپنا حق سمجھتے ہیں، وہ خودکشی نہیں کرتے۔

تلسی رام نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "تمہیں چھوڑ دوں گا تو تم خسرو کو میرا کچا چٹھا سُنا دو گی۔"

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں، مجھے چھوڑ دو۔ میں دیوتا سمان تمہاری پوجا کروں گی۔ باپ سمان تمہاری عزت کروں گی۔"

وہ چیخ کر بولا: "بکواس مت کرو۔ باپ ہوگا تمہارا کوئی اور۔ تمہارے باپ لوگوں کو اس وقت خیال نہیں آیا جب وہ ہندوؤں اور بنگالیوں کی بہو بیٹیوں کی عزت لوٹ رہے تھے۔ آج بھی ہماری عورتیں ہزاروں کی تعداد میں ایسی ہیں جو شرم سے اپنے لٹنے کی داستان کسی کو سُنا نہیں سکتیں۔ جب تم بھی اس کمپارٹمنٹ سے باہر جاؤ گی تو شرم سے خسرو کو کچھ نہیں بتا سکو گی۔ اس طرح خسرو اور اس کی جرو دیدی کے سامنے میرا مان رہ جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا لیکن ڈگمگا گیا۔ گرنے سے پہلے اوپری برتھ کو تھام کر سنبھل گیا۔ اس وقت گاڑی دائیں سے بائیں لرز رہی تھی کیونکہ پٹریاں بدل رہی تھیں۔ کھٹ کھٹا کھٹ، کا شور بلند ہو رہا تھا۔ مین تارا نے فوراً ہی دیوار کی طرف پلٹ کر اوپر کی جانب ہاتھ بڑھایا پھر زنجیر کو پکڑ کر پُوری قوت سے کھینچنے لگی۔

زنجیر ڈھیلی تھی کھنچتی ہوئی اس کے سر تک آگئی لیکن ٹرین کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صرف زنجیر ہی کی بات نہیں تھی۔ پچھلے ایک برس سے اس دیش میں اتنی توڑ پھوڑ ہوتی رہی تھی کہ ٹرین کے کمپارٹمنٹ صحیح سلامت نہیں رہے تھے۔ ٹوٹے ہوئے چھلکے ہوئے ڈبے تھے کسی کی کھڑکیاں نہیں، کسی کی نہیں تھیں کسی کا دروازہ پوری طرح کھلتا تھا اور کسی کا کھلتا ہی نہیں تھا۔ بنگلہ دیش کی سرحد کی طرح جو بہاریوں کے فرار کے لیے نہیں کھلتی تھی مگر وہی سرحد اسمگلروں کے لیے کھل جاتی تھی۔ ان دنوں بنگلہ دیش کی حالت ٹھیک اس کمپارٹمنٹ کی طرح تھی۔

مین تارا نے فوراً ہی دروازے کے ہینڈل کو پکڑ کر زور سے دبایا اور اسے کھولنے کی کوشش کی۔ پتہ چلا دروازہ جام ہے۔ وہ زور زور سے ہینڈل کو جھٹکے دینے لگی۔ اپنی پوری قوت سے دروازے کو پیٹنے لگی لیکن وہ فرار کے لیے نہیں کھل رہا تھا۔ یہ حماقت تھی۔ جب وہ خودکشی کرنا نہیں چاہتی تھی تو دروازہ کیوں کھول رہی تھی؟

وہ وہاں سے ہٹ کر دیوار سے لگ گئی۔ اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ دروازے کو کسی طرح کھولنا چاہیے۔ شاید کھلے ہوئے دروازے سے کوئی گزرتا ہوا اسٹیشن نظر آجائے اور وہ مدد کے لیے پکارے تو لوگ اس کی مظلومیت کو سمجھ لیں۔

وہ دیوار سے لگے ہی لگے دوسرے دروازے کی طرف جانا چاہتی تھی۔ کھڑکی کے باہر ایک اسٹیشن تیزی سے گزرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اسی وقت تلسی رام جھپٹ پڑا ...... وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ جھپٹنے والا دیوار سے آکر ٹکرا گیا۔ اس وقت تک وہ نامعلوم اسٹیشن گزر چکا تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتے ہوئے دوسرے دروازے تک آئی۔ اس کے ہینڈل کو پُوری قوت سے دبایا تو وہ کھل گیا۔ اس کے کھلتے ہی پھر ٹرین پٹریاں بدلنے لگی۔ وہ دروازے کے ساتھ ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے باتھ روم کے دروازے سے ٹکرا گئی۔ دروازہ پوری طرح کھل گیا تھا۔ اُدھر تلسی رام نے دیوار سے پلٹ کر اس پر جھپٹنا چاہا تھا۔ ٹرین اس طرح پٹریاں بدل رہی تھی۔ ڈبے اس طرح دائیں بائیں ہل رہے تھے کہ وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکا۔ تیزی سے آگے بڑھنے والا اپنے بڑے پیٹ کے باعث خود کو نہ روک سکا۔ اپنا بوجھ اس کے لیے مصیبت بن گیا۔ وہ کھلے ہوئے دروازے سے باہر گیا۔ اس کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی لیکن وہ ہینڈل کو پکڑ کر سنبھل چکا تھا لیکن یوں گرا ہوا تھا کہ آدھا کمپارٹمنٹ کے اندر تھا اور آدھا باہر۔

کھٹ کھٹا کھٹ۔ کھٹا کھٹ۔ کھٹ کھٹا کھٹ کی آواز گونجتی جا رہی تھی۔ جانے کتنی پٹریاں تھیں کہ ٹرین ایک سے دوسری پر جا رہی تھی۔ گرنے والے کو جھٹکے پر جھٹکے لگا رہی تھی۔ اس لمحے تلسی رام کی نگاہوں کے سامنے موت ناچ رہی تھی۔ معلوم ہو رہا تھا کہ زندگی کتنی قیمتی ہے اور موت کتنی ظالم۔

اس نے گرنے سے پہلے بے اختیار ہینڈل کو تھام تو لیا تھا لیکن اس کا سارا بدن تھرتھرا رہا تھا۔ جسم سے جان نکلی جا رہی تھی۔ دہشت ایسی طاری تھی کہ ہاتھوں سے ہینڈل چھوٹ رہا تھا۔ وہ چیخنے لگا: "بچاؤ، مجھے بچاؤ۔ مین تارا مجھے پکڑ لو۔ میں گر پڑوں گا۔"

بولتے ہی بولتے اس کے ہاتھوں سے ہینڈل چھوٹ گیا۔

ایک ساعت کے لیے جیسے وقت رُک گیا۔ نظارے گم ہو گئے۔ دُنیا جیسے فنا ہو گئی۔ دوسری ساعت میں پتہ چلا، ابھی وہ زندہ ہے۔ جس دروازے کے باہر وہ آدھا لٹک رہا تھا، مین تارا نے اس دروازے کو ایک جھٹکے سے بند کرنا چاہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دروازے اور چوکھٹ کے درمیان پھنس گیا۔ اسے موت نے

آدھا اور زندگی نے آدھا اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ابھی تقدیر نہ تو سزائے موت دے رہی تھی نہ ہی حیاتِ نو کا مژدہ سُنا رہی تھی۔

نمین تارا نے اسے اذیت پہنچانے کے لیے اور اس سے انتقام لینے کے لیے دروازے کو پوری قوت سے دبوچ رکھا تھا تاکہ وہ وہاں دب کر مر جائے۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں سے ہینڈل چھوٹ گیا ہے اور وہ فضا میں ہاتھ جھٹک رہا ہے۔ اِدھر سے اُدھر سہارے کے لیے کسی کو ڈھونڈ رہا ہے یعنی اب وہ دروازہ کھول دیتی تو وہ باہر کی طرف چلا جاتا۔

لیکن وہ دروازہ کھول نہ سکی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے کتنے ہی مردوں کو عورتوں کو بچوں کو بوڑھوں کو سسک سسک کر دم توڑتے دیکھا تھا۔ تڑپ تڑپ کر، گڑگڑا گڑگڑا کر انھیں رحم کی التجا کرتے سُنا تھا۔ زندگی کی بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی دروازے کے باہر تلسی رام آدھا موت کی گود میں تھا اور آدھا نمین تارا کے اختیار میں رہ کر زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

وہ یک بیک رونے لگی۔ وہ نہ خود مرنا چاہتی تھی نہ کسی کو مرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اگر کوئی اس سے کہتا کہ اپنا نفسیاتی تجزیہ کرو کیوں ایک دشمن کے لیے رو رہی ہو تو وہ اپنا تجزیہ آپ نہیں کر سکتی تھی۔ بہت کم لوگ نفسیاتی پیچیدگیوں کو سمجھ پاتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے۔ ایک شریف انسان دشمن سے ڈرتا ضرور ہے لیکن دشمن کو مرتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ مرنے کے دوران اس کے تڑپنے کا منظر دیکھتا ہے تو جیسے خود کو تڑپتا ہوا محسوس کرتا ہے اور شاید اس لمحے نمین تارا بھی خود کو تلسی رام کی جگہ تڑپتے ہوئے اور مرتے ہوئے دیکھ رہی تھی اس لیے اپنی موت پر آنسو بہا رہی تھی۔

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ تلسی رام کو بڑی مہلت ملی تھی۔ اس دوران اس نے دونوں ہاتھوں سے دونوں طرف کے ہینڈل کو تھام لیا تھا۔ اس کا چہرہ دروازے کی طرف تھا۔ کھڑکی کے پاس نمین تارا روتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں ہینڈل بڑی مضبوطی سے تھامے چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ پھر نمین تارا نے دروازے کو کھول دیا۔ وہ بڑی مشکلوں سے کراہتا ہوا تکلیف سے گھسٹتا ہوا اندر آ گیا لیکن وہاں سے اٹھ نہ سکا۔ وہیں دروازے کے پاس فرش پر سر جھکا کے بیٹھ گیا۔

وہ اس سے دور دوسرے دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ سانپ پھر سانپ ہوتا ہے۔ اس سے ڈر لگتا ہے۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیوں رو رہی ہے؟ اگر تلسی رام کی موت کا تماشا دیکھنا چاہتی تھی تو وہ اب زندہ سلامت تھا۔ اگر اپنی عزت کے لیے رو رہی تھی تو دشمن بے دست و پا شکست خوردہ انداز میں سر جھکائے فرش پر بیٹھا تھا۔ ہتھیار ڈالنے والا سپاہی کبھی حملہ نہیں کرتا۔ پھر وہ کیوں رو رہی تھی؟

آدمی کب روتا ہے؟ جب پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے۔ کانٹا نکل جائے تو خوش ہونا چاہیے لیکن وہ اور روتا ہے کیوں کہ دکھ کانٹا چبھنے کا نہیں ہوتا، دکھ اپنے ننگے پاؤں کا ہوتا ہے۔ پاؤں کب تک ننگے رہیں گے؟ کب تک سفر جاری رہے گا؟ اور حالات ایسے تھے کہ ہر قدم پر جوتے مارنے والے تھے۔ ننگے پاؤں کو جوتا پہنانے والا کوئی نہیں تھا۔

اس نے روتے روتے ذرا نظر اُٹھا کر تلسی رام کو دیکھا۔ وہ اسی جگہ فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اب اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ جیسے اس کے سامنے کوئی دیوی کھڑی ہو اور وہ اسے بڑی خاموشی سے پُوج رہا ہو۔ اس وقت گاڑی پٹریاں بدل رہی تھی۔ انسان بھی کتنی پٹریاں بدلتا رہتا ہے۔ ایک لمحہ پہلے کیا تھا۔ ایک لمحہ بعد کیا ہو جاتا ہے۔

گاڑی کی رفتار سست ہو رہی تھی۔ اب وہ کسی اسٹیشن پر رُکنے والی تھی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا: "میرے دھرم میں سانپ کو دودھ پلایا جاتا ہے مگر سانپ پھر سانپ ہی رہتا ہے۔ میں بھی سانپ تھا مگر تمھاری سمانتا نے مجھے آدمی بنا دیا۔ جو عورت سانپ کو انسان بنا دے وہ دیوی کا اوتار ہوتی ہے۔"

ایسا کہتے ہوئے وہ جھکتا چلا گیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے اپنے ماتھے کو زمین پر ٹیک دیا۔ نمین تارا کے سامنے جھک گیا۔ وہ اس سے بہت دور کھڑی تھی پھر بھی سامنے سے ہٹ گئی۔ انسان کو انسان کے سامنے سجدہ نہیں کرنا چاہیے لیکن یہ اس کے دھرم، اس کے عقیدے کی بات تھی اور وہ اپنے عقیدے کی آنکھ سے پتھر میں بھگوان کا اور کسی شریف زادی میں دیوی کا رُوپ دیکھ سکتا تھا۔ کوئی کسی کو کسی کے عقیدے سے نہیں روک سکتا۔ ہاں اس کے عقیدے سے ہٹ سکتا ہے۔ اس لیے وہ ہٹ گئی تھی۔

گاڑی رُک گئی۔ تیز رفتاری کا شور تھم گیا۔ وہ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ مسافروں کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ اتنا گہرا سناٹا چھا گیا تھا کہ وہ اپنے محبوب کی آہٹ سُن سکتی تھی۔ جسو نے وعدہ کیا تھا ہر اسٹیشن پر اس کی خیریت معلوم کرنے آئے گا۔ وہ چاہتی تو دروازہ کھول کر باہر نکل سکتی تھی لیکن اب تلسی رام سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اب تو آزمائش کی بات تھی کہ اس کا چاہنے والا اسے ڈھونڈنے آتا ہے یا نہیں؟

وہ آ رہا تھا۔ دور سے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ

دروازے کی کھڑکی سے سر نکال کر دیکھنے لگی۔ خسرو ایک کمپارٹمنٹ کے سامنے دور ہی سے کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے اسے پکار رہا تھا۔ پھر اس کمپارٹمنٹ سے آگے بڑھ کر دوسرے کمپارٹمنٹ کے سامنے بھی اسے آوازیں دینے لگا۔ اس کے بعد وہ تیسرے کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھنا چاہتا تھا پھر نین تارا پر نظر پڑ گئی۔ وہ دوڑتے ہوئے اُدھر آنے لگا۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ خسرو نے دروازے کی سیڑھی پر چڑھتے ہوئے کھڑکی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا: ”میں نے تمہیں ان مارواڑی عورتوں کے درمیان چھوڑا تھا۔ وہ عورتیں بتا رہی تھیں کہ جیجا جی تمہیں وہاں سے لے گئے تھے مگر...“

وہ کہتے رک گیا۔ اس کی نظر تلسی رام پر پڑ گئی۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے سر جھکائے اسی طرح فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اب اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے حیرانی سے پوچھا: ”جیجا جی! کیا ہو گیا، آپ اس طرح کیوں بیٹھے ہیں، کیوں رو رہے ہیں؟“ وہ حیرانی سے پوچھ رہا تھا اور بار بار دروازے کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہینڈل کو جھٹکے دے رہا تھا۔ اس سے پہلے نین تارا نے بھی فرار کے لیے اس دروازے کو کھولنا چاہا تھا لیکن وہ بند رہا۔ آخر وہ کھڑکی کے راستے اندر آ گیا۔ اسی وقت ٹرین چل پڑی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا تلسی رام کے پاس آ کر فرش پر دو زانو ہو گیا۔ اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا: ”کیا بات ہے؟“

وہ نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ ندامت سے سر جھکا رہا تھا۔ خسرو نے پھر پوچھا تو وہ کچھ کہنے لگا۔ اس کی آواز دھیمی تھی۔ گاڑی کی کھٹ کھٹا کھٹ کا شور بلند تھا۔ خسرو کان لگا کر سننے لگا۔ جو باتیں وہ سُن رہا تھا، وہ باتیں انگاروں کی طرح کانوں میں جل رہی تھیں۔ وہ کبھی ناگواری سے اسے دیکھتا تھا، کبھی ہمدردی اور محبت سے نین تارا کو دیکھنے لگتا تھا۔ کبھی یوں پہلو بدلنے اور مُٹھیاں بھینچنے لگتا تھا جیسے مر جائے گا یا سامنے والے کو مار ڈالے گا۔ پھر وہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا تھا، حالات سمجھاتے تھے کہ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں رکھنا چاہیے۔

وہ بڑی دیر تک اس کی باتیں سُنتا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھ کر نین تارا کو تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ وہ دوسرے دروازے کے پاس دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ کھڑکی کے باہر تیزی سے مناظر گزرتے جا رہے تھے۔ اس نے کہا: ”اس شخص کو جیجا جی کہنے کو دل نہیں چاہتا لیکن جو ندامت سے چُور ہو اُسے اور زیادہ شرمندہ نہیں کرنا چاہیے۔ جو لوگ نصیحتیں سُن کر راہِ راست پر آتے ہیں، وہ کبھی بھٹک بھی جاتے ہیں لیکن جو نادم ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں، وہ دوبارہ کبھی وہی غلطی نہیں کرتے۔“

وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ بھلا وہ کیا بول سکتی تھی۔ خسرو نے کہا: ”تم نے کمال کر دیا۔ دُشمن کو نئی زندگی دے کر دوست بنا لیا۔ تم نے حُسنِ سلوک کی ایسی بہترین مثال قائم کی ہے کہ جی چاہتا ہے۔ یعنی کہ میرا مطلب ہے، خوشی سے میرا دل مچل رہا ہے۔“

وہ منہ چھپا کر دیوار کی طرف گھوم گئی۔ خسرو نے ایک سرد آہ بھر کر کہا: ”مگر میں بہت دور کی سوچتا ہوں۔ جب کہ نزدیک رہ کر تمہارا ہاتھ بھی نہیں پکڑ سکتا۔ تم نے منع کیا ہے۔“

نین تارا کے سینے سے دبی دبی سی آہ نکلی۔ اس نے دل میں کہا: ”ہاں، میں نے منع کیا تھا۔ فیصلہ کیا تھا کہ مصائب کے اندھیروں میں بھی اپنا ہاتھ انھیں پکڑنے نہیں دوں گی۔ مگر سوچتی ہوں تو ہر لمحہ یہ ہاتھ ان کے قبضے میں نظر آتا ہے۔“

اپنا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں نظر آئے تو یہ محبت کی ابتدا ہوتی ہے اور وہی ہاتھ کسی کے قبضے میں نظر آئے تو محبت کی انتہا ہو جاتی ہے۔ وہ شرما گئی: ”توبہ ہے، یہ میں کیا سوچنے لگی ہوں۔ ابھی مجھ پر قیامت گزر رہی تھی۔ خسرو کے آتے ہی سب بھول گئی۔ بس یہی یاد رہ جاتے ہیں۔“

اس نے کہا: ”برتھ پر بیٹھ جاؤ۔ کب تک کھڑی رہو گی؟“

وہ مُنہ چھپائے کھڑی رہی۔ خسرو نے کہا: ”نہیں بیٹھو گی تو مجبوراً ہاتھ پکڑ کر بٹھانا ہو گا۔“

وہ جلدی سے سمٹ گئی۔ پھر اس سے کتراتے ہوئے آگے بڑھ کر تلسی رام کی طرف سے مُنہ پھیرتے ہوئے برتھ پر بیٹھ گئی۔ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رُکنے لگی تو تلسی رام نے فرش پر سے اُٹھ کر کہا: ”میں دوسرے کمپارٹمنٹ میں جا رہا ہوں۔ دلی تک تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تمام اناج تمہارے حوالے کرنے کے بعد واپس چلا جاؤں گا۔ تم دونوں اسی کمپارٹمنٹ میں رہو۔ ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ کوئی تم لوگوں کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

گاڑی رُک گئی۔ وہ کمپارٹمنٹ سے چلا گیا۔ خسرو نے دروازوں کو اندر سے بند کیا۔ کھڑکیاں بھی بند کر دیں۔ باہر کا منظر گم ہو گیا۔ صرف اتنا پتا چلا کہ ٹرین چلنے لگی ہے۔ وہ بڑی دیر تک اپنی اپنی جگہ چُپ رہے۔ پھر نین تارا نے کہا: ”تم رات بھر جاگتے رہے ہو، اب سو جاؤ۔“

”تم بھی سو جاؤ۔ یہ کمپارٹمنٹ اندر سے بند ہے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اوپری برتھ پر چلی جاؤ۔“

”مجھے اتنی سی جگہ میں سونا نہیں آتا۔ اوپر سے گر پڑوں گی۔“

”اچھا تو اس برتھ پر سو جاؤ۔ میں اوپر چلا جاتا ہوں۔“

وہ اوپر جا کر لیٹ گیا۔ نین تارا نے اٹیچی سے چادر نکالی۔ اٹیچی کو تکیے کے طور پر سرہانے رکھا پھر اوپر دیکھنے لگی۔ وہ بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے نظریں جھکا کر کہا: ”ایسے تو میں سو نہیں سکوں گی۔“

”اچھا وعدہ کرتا ہوں... نہیں دیکھوں گا۔ دوسری طرف مُنہ

پھیر کر سو رہا ہوں۔"

اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اب اس کی پشت نظر آ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اسے سو جانا چاہیے تھا لیکن نظریں بار بار اوپر جا رہی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے منہ پھیر کر سو جانے سے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مسافر نیند پوری کر رہا ہو اور اس مسافر سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ خسرو نے سر گھما کر دیکھے بغیر پوچھا "کیا تم سو رہی ہو؟"

"ہاں نہیں تو ...؟"

اپنے قریب اس کی آواز سنتے ہی وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اسے قریب دیکھ کر ذرا ذرا حیران ہوا، ذرا ذرا خوش ہوا۔ پھر اس نے پوچھا "تمھیں نیند کیوں نہیں آ رہی ہے؟"

"میں رات کو دیر تک سوتی رہی۔ تم بغیر تکیے کے سو رہے ہو۔ اپنے بازو کا سرہانہ بنا رکھا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولا "بازو کسی کا ہو اور سر اپنا ہو تو جلدی نیند آجاتی ہے۔"

وہ جلدی سے منہ پھیر کر برتھ کے دوسرے سرے پر چلی گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے جھک کر اپنی اٹیچی اٹھائی۔ پھر اسے خسرو کے سرہانے رکھ دیا "چلو اب لیٹ جاؤ۔"

وہ اٹیچی پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ نین تارا نے گھور کر کہا "پھر ادھر دیکھ رہے ہو۔ اُدھر منہ کر لو۔"

اس نے دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔ خسرو نے دوسری طرف منہ کرنے کے ایک منٹ بعد پوچھا "کیا تم لیٹ گئی ہو؟"

وہ کچھ نہ بولی۔ اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ اپنی نگاہوں کے بالکل سامنے اس کے وجود کو محبت اور گہری سنجیدگی سے دیکھتی رہی پھر دبے قدموں چلتے ہوئے اس کے سرہانے سے پائنتی پہنچی۔ اس کے زخمی پاؤں نظر آ رہے تھے۔ دونوں ٹخنوں کے پاس خون جما ہوا تھا۔ دشمنوں نے اسے اسی جگہ سے باندھ کر رات بھر الٹا لٹکائے رکھا تھا اور پتا نہیں کہاں کہاں زخم لگے ہوں گے جو لباس میں چھپے ہوئے تھے۔ افسوس رشتہ ادھورا تھا۔ وہ محبوب کے چھپے ہوئے زخموں کو شمار نہیں کر سکتی تھی۔

وہ اس کے پاؤں کی طرف آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھانے لگی۔ ہاتھ پاؤں کے قریب گیا۔ پھر وہ جھجک گئی۔ دل نے کہا "جھجکنے شرمانے سے کام نہیں چلے گا۔ وہ تھکا ہوا ہے۔ زخم کھایا ہوا ہے۔ اس کا بدن دکھ رہا ہوگا۔"

یہ سوچتے ہی وہ دونوں ہاتھوں سے اس کے پاؤں کو دابنے لگی۔ وہ چونک گیا۔ جی تو آیا، سر اٹھائے اور پلٹ کر دیکھے۔ پھر خیال آیا، وہ شرما جائے گی۔ اس کے قدموں کو چھوڑ کر دور ہو جائے گی ...

اس نے لیٹے ہی لیٹے کہا "یہ عجیب سی بات ہے۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ میں ہاتھ پکڑنا چاہتا ہوں۔ تم انکار کرتی ہو لیکن میرے پاؤں پکڑ رہی ہو۔"

وہ ذرا چُپ رہی۔ آہستہ آہستہ اس کے پاؤں کو دابتی رہی۔ پھر اس نے جواب دیا "میں نے آپ کو قبول کیا ہے۔ میں آپ کی خدمت کر سکتی ہوں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "نین تارا! جس طرح تمھارے والدین کی ہلاکت ہوئی وہ منظر تم کبھی بھلا نہ سکو گی۔ یہ صدمہ ساری زندگی رہے گا لیکن زندگی گزارنے کے لیے زندگی کی خوشیوں سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ چالیس دن کے بعد میں بھی تمھیں قبول کر لوں اور تمھیں اپنا لوں۔"

وہ کہہ رہا تھا اور تارا جلے ہوئے پاؤں دابتے ہوئے تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔ کتنے ہی خیموں کے درمیان اس کا باپ اسٹین گن کی گولیوں سے چھلنی ہو کر سبز پرچم کے سائے میں گر رہے تھے پھر منظر بدل گیا۔ ہینڈ گرنیڈ کا دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس کی اماں فضا میں اُچھل پڑیں۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ کچھ نظر نہیں آیا۔ فضا میں دھواں ہی دھواں بھر گیا تھا۔

نین تارا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ کبھی کبھی وہ سوچتی تھی، خسرو اس کے نصیب میں نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو نکاح قبول کرتے ہی دو دو موتیں کیوں ہو جاتیں؟ یوں تو اس کیمپ میں ایک ہی دن میں ہزاروں موتیں ہوئی تھیں لیکن دوسروں کے لیے صرف افسوس ہوتا ہے اور اپنوں کے لیے صدمہ۔ وہ صدمہ دل کی گہرائی میں تھا اور اسی گہرائی میں خسرو کا پیار بھی تھا۔ یعنی جہاں ماتم تھا وہیں پیار کی شہنائی بھی بجنا چاہتی تھی۔

ٹرین پوری رفتار کے ساتھ ایک پُل پر سے گزر رہی تھی۔ دریا اور پُل کے درمیان خلا سے آواز گونج رہی تھی "دن دنا دن۔ دن دنا دن" جیسے یہ آواز سمجھا رہی تھی۔ آنسوؤں سے محبوب کے قدموں کو دھوتے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آنسو بہتے رہتے ہیں۔ دریا بھی بہتا رہتا ہے اور بہتا رہتا ہے۔ اس پر سے محبت کا ایک پُل بنا کر گزر جانا چاہیے۔

◆

پاربتی پور کے ایک بازارِ حُسن میں سومنا اپنے گھر کے دروازے میں کھڑی تھی کہ اس کی نظر ایک شخص پر پڑی، وہ اس کے گھر کی طرف ہی آ رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں پھٹے پرانے جوتے تھے اور بدن پہ ایک پتلون اور میلی سی بشرٹ تھی، بال بکھرے ہوئے تھے، داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

وہ باہر کھڑے ہی کھڑے کھلے دروازے کے اندر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی جیسے کچھ سونگھ رہا ہو۔ پھر اس کی آنکھیں یوں چمکنے لگیں جیسے من کی مراد پانے والا ہو۔

سونا گھبرا کے اندر چلی گئی۔ وہ دروازے کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ سامنے ہی دوسرا دروازہ تھا۔ وہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اس دروازے سے ایک چولھا جلتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس پر ہانڈی چڑھی ہوئی تھی۔ سونا دوڑتے ہوئے وہاں گئی۔ پھر ساڑی کے آنچل سے گرم گرم ہانڈی کو چولھے پر سے اتار دیا۔ لکڑی پر لکڑی مارتے ہوئے آگ بجھائی اور باہر کھڑے ہوئے شخص کو نظر انداز کر کے غسل کرنے چلی گئی۔

غسل سے فارغ ہو کر اس نے آنگن کے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں وہ بجھا ہوا چولھا نظر آرہا تھا۔ ابھی تک وہاں تھوڑا سا دھواں اُٹھ رہا تھا لیکن چولھے کے پاس پکی ہوئی ہانڈی نہیں تھی۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے چولھے کے پاس آئی۔ آس پاس کہیں بھی ہانڈی نظر نہیں آرہی تھی۔ کیا وہ چور تھا؟ ہانڈی اُٹھا کر لے گیا ہے؟

وہ پھر دوڑتے ہوئے باہر ڈیوڑھی پر آئی۔ مگر اب وہ وہاں نہیں تھا۔ ہانڈی لے کر جا چکا تھا۔ اب کیسے نظر آتا لیکن وہ اسے دیکھنے نہیں آئی تھی۔ اپنی ڈیوڑھی سے لگ کر رونے آئی تھی اور وہ بے اختیار رونے لگی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اپنی ڈیوڑھی سے یوں لپٹ گئی تھی جیسے بدنصیبی کے گلے لگ کر رو رہی ہو۔

وہ ہانڈی اٹھا کر بھاگتا جا رہا تھا۔ چاند کبھی سیاہ بادلوں میں چھپ جاتا تھا۔ کبھی روشنی دکھاتا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا میٹر گیج لائن پر آگیا۔ وہ لائن رنگپور کی طرف سے آتی تھی۔ اس نے لائن کو عبور کیا۔ پھر اُدھر جانے لگا، جدھر لوکو شیڈ تھا۔ اتنی دُور آنے کے بعد وہ کہیں بھی بیٹھ کر کھا سکتا تھا۔ اپنی بھوک مٹا سکتا تھا لیکن کتے اس کے پیچھے بھونکتے چلے آرہے تھے۔ دوڑنے کے دوران وہ رُکتا تھا پھر کوئی پتھر اُٹھا کر ان کی طرف پھینکتا تھا۔ کتے وقتی طور پر پسپا ہو جاتے تھے۔ پھر اس کے بھاگنے پر اس کا پیچھا کرنے لگتے تھے۔ وہ تھک رہا تھا، نڈھال ہو رہا تھا۔ بھوک اور کمزوری کے باعث کہیں گر جانا چاہتا تھا۔

کوئی دور دور تک پوچھنے والا نہیں تھا کہ کون بھاگ رہا ہے؟ اور کتے کس کا پیچھا کر رہے ہیں؟ وہ چھوٹا سا شہر تقریباً ویران ہو چکا تھا۔ لوکو شیڈ کے قریب دور تک بانس کی کھپچیوں سے بنے ہوئے ریلوے کے کوارٹرز ویران پڑے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسی ایک کوارٹر کے اندر گھس جائے گا اور دروازے کو اندر سے بند کرے گا۔ پھر کتے نہیں آئیں گے۔ صرف کتوں کی بات نہیں تھی۔ اس ویرانے میں رات ہوتے ہی گیدڑ اپنی منحوس آواز سُنانے چلے آتے تھے اور اِکّا دُکّا۔۔۔ آدمی پر حملہ بھی کرتے تھے۔ خطرہ انسانوں سے بھی تھا، خطرہ جانوروں سے بھی تھا لیکن جانوروں سے کم تھا۔

وہ رُک گیا۔ بُری طرح ہانپنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اب تب میں گر پڑے گا۔ کھڑے رہنے کی سکت نہیں تھی۔ اس کے آگے پیچھے ریلوے لائن کا جال بچھا ہوا تھا۔ وہ اس وقت برِصغیر کے سب سے بڑے ریلوے یارڈ میں کھڑا ہوا تھا۔۔۔ پاربتی پور کا ریلوے یارڈ تقریباً چھ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک مال گاڑی اس کے سامنے سے شنٹنگ کرتے ہوئے جا رہی تھی۔ وہ ہانڈی اٹھائے کسی طرح ہانپتے کانپتے، لڑکھڑاتے ہوئے لائن کو پار کرتے ہوئے اس گاڑی کی طرف جانے لگا۔ مال گاڑی گزر رہی تھی۔ اس کے پہنچتے پہنچتے گاڑی کا آخری ڈبا آگیا۔ اس نے اس کے ساتھ دوڑ لگا دی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے پہلے ہانڈی رکھی۔ پھر اُچک کر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

ہاں وہ کوشش کر رہا تھا اور کوشش کبھی ناکام بھی ہوتی ہے۔ وہ ہاتھوں کے بَل لٹک کر اوپر چڑھنا چاہتا تھا لیکن طاقت جواب دے رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ ابھی تک ہانپنا کم نہیں ہوا تھا اور کم بخت کتوں نے تو جیسے رشتے داری سمجھ لیا تھا۔ وہ آخری ڈبے کے ساتھ ساتھ دوڑتے چلے آرہے تھے۔

اسے یقین ہو گیا کہ اب تب میں وہ گر پڑے گا اور گرے گا تو شاید اس ڈبے کے نیچے آجائے گا۔ اس نے آخری بار اُوپر کو اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اُٹھ نہ سکا۔ پھر اس نے آخری بار ہانڈی کی طرف دیکھا۔ خیال آیا کہ گرنے کے بعد شاید زندہ رہ سکے اور زندہ رہے گا تو پھر بھوک لگے گی۔ اس لیے اس نے گرتے گرتے ہانڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ گرتا یا ہاتھ ہانڈی کی طرف پہنچتا، کسی نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔

شنٹنگ کرنے والی گاڑی ایک لائن سے دوسری لائن پر جا رہی تھی۔ پٹریاں بدلنے والا لائن مین دو پٹریوں کے درمیان سگنل لائٹ لیے کھڑا ہوا تھا۔ لائٹ بھی مدھم تھی اور لائن مین بھی بوڑھا تھا۔ اتنی دور سے وہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا —— ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ سہارا ملتے ہی وہ زور لگا کر اُوپر چڑھنے لگا۔ کچھ ہاتھ پکڑنے والے نے بھی اپنا زور دکھایا۔ پھر وہ ڈبے کے اندر آکر گر پڑا۔

گاڑی چلی جا رہی تھی۔ اندر تاریکی تھی۔ ڈبے کے دونوں ہی طرف کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ کبھی چاندنی اندر آتی تھی۔ کبھی گم ہو جاتی تھی۔ چاند کی آنکھ مچولی کے دوران اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک قد آور شخص کو دیکھا۔ وہ کچھ فاصلے پر

کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ہانڈی کو اپنی طرف رکھتے ہوئے پوچھا تھی کے ؟ (تم کون ہو ؟)"

اس نے ہانڈی کی طرف لپکتے ہوئے کہا: "اے ٹا امار (یہ میری ہے۔) میں بھوکا ہوں۔"

اس نے ہانڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دوسرے نے اس کے ہاتھ پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا: "میں بھی بھوکا ہوں۔ پہلے میں کھاؤں گا۔ بچے گا تو تم کھاؤ گے۔"

کہنے والا تن کر کھڑا ہوا تھا۔ ہانڈی چور نے اچانک ہی اس کے گھٹنے کے پیچھے ایک زور کا ہاتھ مارا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اس کے قریب ہی گر پڑا۔ وہ دونوں جوان اور پھرتیلے تھے، کوئی کسی سے کم نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ ذرا سی زور آزمائی کے بعد ہی پتا چل گیا کہ انسان ہوں یا جانور، شدید بھوک کی حالت میں سب ہی درندے بن جاتے ہیں اور اپنی خوراک تک پہنچنے کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔

وہ لڑتے ہوئے اور لڑھکتے ہوئے ڈبے کے ایک گوشے کی طرف چلے گئے تھے۔ ایک نے کہا: "امار نام کولیم الدین بھجویا (میرا نام کلیم الدین بھجویاں ہے) جب میں چوری کر سکتا ہوں تو چھین کر کھانا بھی جانتا ہوں۔"

دوسرے نے اس کے منہ پر گھونسا رسید کرتے ہوئے کہا: "میرا نام سکندر حیات ہے۔ میں چوری کرنے والوں کا مال چھین کر کھانا جانتا ہوں۔"

کلیم الدین بھجویاں نے اسے دونوں ٹانگوں پر رکھ کر دوسری طرف اچھال دیا۔ سکندر کہیں اندھیرے میں جا کر گرا تھا لیکن پھر ہاتھوں اور پاؤں سے رینگتا ہوا، ٹٹولتا ہوا بھجویاں کے پاس پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے پر حملہ کرتے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ وہ دونوں ایک طرف لڑھک گئے۔ پھر جہاں گرے تھے، وہیں رہ گئے کیوں کہ ٹارچ کی روشنی باہر سے رینگتے ہوئے اندر آئی تھی۔

کوئی ڈبے کے باہر تھا۔ وہ دم سادھ کر آواز سننے لگے۔ قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ٹارچ کی روشنی گم ہو گئی تھی۔ کوئی ڈبے کے قریب سے گزر رہا تھا۔ پھر انھیں لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ یقیناً دو ویگنوں کے درمیان ٹائی راڈ کو کھولا جا رہا تھا۔ شنٹنگ کا یہ دستور ہوتا ہے کہ ہمیشہ آخری ڈبے کا ٹائی راڈ کھولا جاتا ہے تاکہ شنٹنگ کرنے والی گاڑی اس ڈبے کو آگے لے جا کر چھوڑ دے۔ پھر وہ ڈبا خود ہی ریلوے لائن پر دوڑتا ہوا کسی مال گاڑی سے جا کر مل جائے اور یہی ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ٹائی راڈ کو شاید کھول دیا گیا تھا۔

گاڑی پھر چلنے لگی تھی۔ ڈبا پھر اس کے ساتھ رینگ رہا تھا لیکن اب اس ڈبے کا بفر دوسرے ڈبے کے بفر سے بار بار ٹکراتا جا رہا تھا۔ شنٹنگ کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ سکندر حیات نے کہا۔

"میں مانتا ہوں۔ تم جی دار ہو۔"

"تم بھی مجھ سے کم نہیں ہو۔"

"اگر ہم لڑتے جھگڑتے رہے اور کوئی تیسرا آگیا تو وہ بھی حصے دار بن جائے گا۔"

"دو بلیوں کے لڑنے سے ہمیشہ بندر کا بھلا ہوتا ہے۔"

"کیوں نہ ہم سمجھوتا کر لیں۔"

کلیم الدین بھجویاں نے کہا: "میں پہلے ہی سمجھوتا کر سکتا تھا لیکن تم نے حاکم بن کر کہا کہ پہلے تم کھاؤ گے اور جھوٹا مجھے دو گے۔ بس مجھے غصہ آگیا۔"

"غصہ تھوک دو اور ہاتھ ملاؤ۔"

دونوں نے تاریکی میں ٹٹول کر مصافحہ کیا پھر وہاں سے رینگتے ہوئے اُدھر آئے جدھر انھوں نے ہانڈی رکھی تھی۔ ریلوے لائن سے دُور دور بجلی کے بلب کہیں ٹوٹے ہوئے تھے کہیں بجھے ہوئے

اگلا مصرعہ

غالب کی محفل جمی تھی۔ وہ کسی کام سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ ان کی غیر موجودگی میں ان کے ایک شاگرد نے ترنم میں جھوم کر ایک مصرعہ کہا:

شراب ریخ پہ ڈالی کباب شیشے میں

اس مہمل مصرعے پر سب چونک پڑے، ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ چاروں طرف سے لعنت ملامت شروع ہو گئی۔ مصرعہ کہنے والا بے چارہ گم صم سی فاختہ کی طرح ہر ایک کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں مرزا غالب واپس آ گئے۔ استاد کی عدالت میں شاگرد کا مقدمہ پیش ہوا۔ غالب سب کی سنتے رہے مگر خود خاموش رہے۔ جب تمام لوگ اپنی اپنی ہانک چکے تو غالب نے متانت سے کہا: "ارے بھئی آپ نے اگلا مصرعہ بھی تو سنا ہوتا۔ خیر اب مجھ سے سن لیجیے" اور گنگنا کر شعر مکمل کر دیا:

کسی کے کہنے سے ساقی کے ایسے ہوش اڑے
شراب ریخ پہ ڈالی کباب شیشے میں

● مرسلہ: ممتاز بیری، لاسی، گلبرگ، کراچی

تھے اور کہیں کہیں روشن نظر آتے تھے۔ دھماکے کے بعد شہروں میں، قصبوں میں، دیہاتوں میں ہر جگہ تباہی آئی تھی۔ کہیں کوئی چیز سلامت نہیں رہی تھی۔ جاندار اور بے جان دونوں ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ وہ دونوں رینگتے ہوئے ہانڈی کو تلاش کر رہے تھے اور تاریکی میں وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

اچانک اس ویگن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ دونوں اوندھے منہ گر پڑے۔ اب وہ مال گاڑی کا ڈبا شنٹنگ کرنے والی گاڑی سے الگ ہو گیا تھا اور تنہا ریلوے لائن پر دوڑتا جا رہا تھا۔ آگے جا کر بجلی کے ایک بلب نے روشنی دکھائی۔ دونوں طرف کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ انھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ہانڈی غائب تھی۔

کیسے غائب ہو گئی؟ وہاں کوئی تیسرا نہیں آیا تھا اور ہانڈی اس ڈبے کے وسط میں رکھی ہوئی تھی۔ یہ بھی سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ جھٹکا لگنے سے وہ لڑھک کر باہر چلی گئی ہوگی اور اگر لڑھکتی تو ہانڈی کا کھانا وہاں گرا ہوا نظر آتا لیکن نہ کھانا گرا تھا، نہ ہانڈی تھی۔ پھر وہ کہاں چلی گئی؟ سکندر نے پوچھا: "کیا لڑتے وقت تم ہانڈی سے ٹکرائے تھے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ کیا تم ٹکرائے تھے؟"

"میں بھی نہیں ٹکرایا تھا۔ جب ہماری ٹکر نہیں لگی۔ ہماری ٹھوکر نہیں لگی۔ وہ ہانڈی کہیں گری نہیں تو پھر کہاں چلی گئی؟"

وہ سوچنے لگے۔ بلب کی روشنی کا انتظار کرنے لگے۔ گاڑی کسی روشنی کے سامنے سے گزرتی تو وہ ایک بار پھر غور سے دیکھ سکتے تھے۔ روشنی میں ویگن کے اندر دور تک دکھائی دیتا تھا۔ پھر بھی ویگن کا کچھ حصہ تاریک رہتا تھا۔ ذرا دیر بعد روشنی قریب آنے لگی۔ وہ دونوں طرف کے ایک ایک دروازے کے پاس جا کر دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور گھور گھور کر ویگن کے اندر دیکھنے لگے۔ روشنی قریب آتی گئی۔ ویگن کا اندرونی حصہ کچھ روشن ہوتا گیا۔ کم از کم وہ حصہ تو بالکل ہی روشن ہو گیا جہاں انھوں نے ہانڈی رکھی تھی اور جہاں سے ان کی لڑائی کا آغاز ہوا تھا۔ لڑائی ختم ہو چکی تھی مگر ہانڈی گم ہو چکی تھی۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔

مال گاڑی کا وہ ڈبا روشنی کے سامنے سے گزر گیا۔ گزرتی ہوئی روشنی میں دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر کلیم الدین بھویاں نے پوچھا: "کیا تم بھوت پریت پر یقین رکھتے ہو؟"

سکندر نے جواب دیا: "میں بھوکے پیٹ کسی پر یقین نہیں کرتا۔ تم یہ نہ کہنا کہ ہمارے کھانے کی ہانڈی کوئی بھوت اٹھا کر لے گیا ہے۔ بھوک صرف انسانوں کو لگتی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں کے علاوہ اس ڈبے کے اندر کوئی تیسرا بھی ہے۔"

کسی اور کی موجودگی کا امکان ہے یا نہیں۔ وہ اس مسئلے پر غور کرنے لگے۔ پھر کلیم الدین بھویاں نے کہا: "جب میں یہاں آیا تو مجھ سے پہلے تم موجود تھے۔ اب تم ہی بتا سکتے ہو کہ تم سے پہلے یہاں کوئی موجود تھا اور اب بھی موجود ہے یا نہیں؟"

سکندر تھوڑی دیر تک چپ رہا۔ پھر اس نے کہا: "جب میں یہاں پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں چپ چاپ اس ڈبے کے اندر بیٹھ گیا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ بھوک بھی لگ رہی تھی اور نڈھال بھی تھا۔ یہاں پہنچتے ہی بے دم سا ہو کر گر پڑا۔ میری آنکھ کب لگ گئی۔ مجھے پتہ نہ چلا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب یہ ڈبا شنٹنگ کرنے والی گاڑی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔"

"جب تم اندھیرا ہونے کے بعد یہاں آئے تھے تو تاریکی میں کسی کو کیسے دیکھ سکتے تھے؟"

"میں نے کہا نا۔ میں تھکا ہوا تھا۔ کسی کی موجودگی کی طرف میرا دھیان نہیں گیا۔"

"اب ہمیں دھیان دینا چاہیے۔"

یہ کہہ کر اس نے آہستگی سے پکارا: "کوئی ہے۔ اے کھنے کیوا اچھے؟ (یہاں کوئی ہے؟)"

سکندر نے کہا: "اگر کوئی ہے تو ہمارا دوست بن جائے۔"

بھویاں نے کہا: "اگر کھانا بچا ہو تو ہمیں کچھ دے دو۔ ہمارے پاس آ جاؤ یا ہماری بات کا جواب دو۔ ہم تمھیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

وہ دونوں باری باری بولتے رہے۔ پھر چپ ہو گئے۔ اس کے بعد سکندر نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا: "ہم دیواروں سے باتیں کر رہے ہیں۔ یہاں کوئی ہو تو جواب دے۔"

"سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ ہانڈی کیسے غائب ہو گئی؟"

"ہماری بدنصیبی اسے لے گئی۔ بھئی اب تو یہی سمجھنا ہوگا کہ ہانڈی لڑھک کر باہر گر گئی ہے۔"

"میں نہیں مان سکتا۔ ہانڈی ذرا بھی لڑھکتی تو اس میں سے کھانا ضرور گرتا۔"

وہ جھنجلا کر بولا: "ہانڈی گر گئی ہو یا غائب ہو گئی ہو، دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ہم بھوکے رہیں گے۔"

وہ چپ رہے۔ اس کے بعد بولنے کے لیے کچھ نہ رہا۔ اس ڈبے کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا ایک نمبر پلیٹ فارم کی لائن پر جا رہا تھا۔ آگے ایک مال گاڑی کھڑی تھی۔ وہ اس مال گاڑی سے جا کر لگ گیا۔ دونوں پھر دم سادھ کر بیٹھ

گئے۔ ایک پورٹر اس ڈبے کو ٹائی راڈ کے ذریعے مال گاڑی سے منسلک کر رہا تھا۔

پلیٹ فارم پر ویرانی تھی۔ مسافر ٹرینیں بھولے بھٹکے وہاں سے گزرتی تھیں کسی گاڑی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا اور مسافر ایسا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے کہ آدھی رات کو پلیٹ فارم پر ٹھہر کر کسی گاڑی کا انتظار کرتے۔ سب کو اپنی جان و مال کا خطرہ تھا۔ ایک گڈز کلرک نے جماہی لیتے ہوئے کہا: "ایک بج رہا ہے میں سونے جا رہا ہوں۔"

ایک قلی نے کہا: "اپنی گھوم کو رین (آپ سو جائیے) ہم بھی تھک گئے ہیں۔ ان ڈبوں میں کل صبح مال چڑھائیں گے۔"

وہ دونوں تاریکی میں بیٹھے ہوئے ان کی باتیں سنتے رہے۔ اتنا اطمینان ہو گیا کہ وہ آج کی رات وہاں چھپ کر گزار سکتے ہیں مگر چھپ کر کیوں؟ وہ کس سے ڈر رہے تھے؟ کس سے چھپ رہے تھے؟ جب کہ وہ اپنی بھاشا اور اپنے لب و لہجے کے مطابق ایک دوسرے کو بنگالی سمجھ رہے تھے۔ بنگلہ دیش میں بنگالی کو بنگالی سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے سے یہ نہیں پوچھ سکتے تھے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور وہاں ویگن کے اندھیرے میں کیوں چھپ کر رہنا چاہتا ہے؟

آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ آس پاس گہرا سناٹا چھا گیا۔ دور پلیٹ فارم کے ایک حصے میں چند قلی سو رہے تھے۔ کبھی کبھی واچ اینڈ وارڈ کی سیٹی سنائی دیتی تھی جو رات کے سناٹے میں دور تک گونجتی تھی۔ پھر وہی سکوت طاری ہو جاتا تھا۔

ایسے ہی سکوت کے عالم میں وہ دونوں چونک گئے۔ کان لگا کر سننے لگے۔ اسی ویگن کے اندر کسی کے گہرے گہرے سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پہلے تو انھیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ پھر ایک نے دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ سرگوشی میں پوچھا: "کیا تم کچھ سن رہے ہو؟"

"ہاں، یہاں کوئی ہے۔ ہمیں پہلے ہی اُدھر جا کر دیکھنا چاہیے تھا۔ جدھر سے یہ آواز آ رہی ہے۔"

"واقعی ہم اُدھر نہیں گئے۔ لوٹتے ہوئے دوسری طرف گئے تھے۔ اب کیا خیال ہے؟"

اس نے کہا: "بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار ہو سکتا ہے۔"

وہ سوچنے لگے۔ پھر سکندر نے کہا: "اگر ہتھیار ہوتا تو وہ اتنی دیر تک خاموش نہ رہتا۔ ہم پر حملہ کرتا۔"

کلیم الدین بھوئیاں نے اس بات پر ذرا غور کیا۔ پھر انکار میں سر ہلا کر کہا: "ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس ریوالور ہو اور اس میں ایک ہی گولی رہ گئی ہو۔ اس نے سوچا ہو۔ ایک گولی سے ہم دونوں کو ہلاک نہیں کر سکتا لہٰذا خاموشی بہتر ہے۔"

"ہاں، ایسا ہو سکتا ہے لیکن ہمیں ڈرنا نہیں چاہیے بیشک اس کے پاس ریوالور ہو سکتا ہے۔ اس میں ایک گولی بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کی سانسیں بتا رہی ہیں کہ وہ گہری نیند میں ہے۔"

"کیا ہم اسے دوست بننے کی پھر دعوت دیں؟"

"پاگل ہوئے ہو۔ اگر ہم نے آواز دی تو یہ آواز پلیٹ فارم تک جائے گی۔ وہ قلی یہاں سے بہت دور ہیں لیکن کسی وقت بھی واچ اینڈ وارڈ یہاں سے گزر سکتا ہے۔"

وہ پھر سوچ میں پڑ گئے۔ ایک نے کہا: "اس طرح یہاں سہمے بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ یقیناً اسی نے ہماری ہانڈی چرائی ہے۔ کچھ تو ہانڈی میں بچا ہو گا۔"

"اچھی بات ہے۔ ہم رینگتے ہوئے وہاں تک جائیں گے۔ آہستگی سے اسے ٹٹولیں گے۔ جیسے ہی پتا چلے گا کہ اس کا سر کدھر ہے، فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیں گے تاکہ وہ نیند سے بیدار ہوتے ہی چیخنا نہ شروع کر دے۔"

وہ اپنی اس تدبیر پر عمل کرنے لگے۔ دونوں ہاتھ پاؤں سے آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے ویگن کے اس حصے کی طرف جانے لگے جہاں سے انھیں سانسوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو کر رینگ رہے تھے تاکہ کسی اہم موقعے پر سرگوشی کر سکیں۔ قریب رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے ہاتھ ایک ساتھ ہانڈی سے ٹکرائے۔ وہ وہیں ٹھٹک گئے۔

دوسرے ہی لمحے دونوں کے ہاتھ ایک ساتھ ہانڈی کے اندر گئے لیکن ایک ساتھ باہر نہ نکل سکے کیونکہ دونوں کی مٹھیوں میں بھات بھرا ہوا تھا اور جب مٹھیاں بند ہوں تو دو ہاتھ ایک

نو بیاھتا

بیوی نے شوہر سے کہا۔ "آخر تم اپنے دوستوں سے یہ کیوں کہا کرتے ہو کہ تم نے مجھ سے صرف اس لیے شادی کی ہے کہ میں بہترین کھانا پکانا جانتی ہوں حالانکہ تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ایک آلو تک نہیں اُبال سکتی۔"

شوہر نے جواب دیا: "کم سے کم تم سے شادی کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تو مجھے کرنا ہی چاہیے۔"

ساتھ باہر نہیں نکل سکتے۔ کلیم الدین بھویاں نے سرگوشی میں کہا۔ "پہلے مجھے نکالنے دو۔"

سکندر نے کہا: "ہم نے پھر جھگڑا کیا تو اس کھانے سے بھی جائیں گے۔ پہلے تم ہی کھاؤ۔"

اس نے اپنی مٹھی کھول دی اور ہاتھ باہر نکال لیا۔ پھر اس نے ہاتھ ڈالا تو ہانڈی میں صرف اس کا ہاتھ تھا۔ اس نے بھات کو مٹھی میں لے کر نکالا اور اسے اپنے منہ میں بھر کر جلدی جلدی چبانے لگا۔ انھیں کھانے سے پہلے اس تیسرے شخص کو دریافت کرنا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون تھا؟ کیا تھا؟ وہ جو کوئی بھی تھا، انھیں کھانے کے دوران نقصان پہنچا سکتا تھا لیکن وہ جو انسان کی فطرت میں تجسس بھرا ہوتا ہے وہ تجسس زندگی کے ہر لمحے میں رہ سکتا ہے لیکن بھوک کے وقت مر جاتا ہے۔ پردے کے پیچھے کوئی حسن چھپا ہو یا اندھیرے میں کوئی دشمن جان لینے والا ہو تب بھی اس کی پروا نہیں ہوتی، صرف پیٹ بھرنے کی فکر ہوتی ہے۔

جب انھوں نے ہانڈی میں ہاتھ ڈالا تھا تو وہ آدھی رہ گئی تھی۔ تیسرے چور نے آدھی ہانڈی چھوڑ دی تھی۔ دونوں کی بھوک تو نہ مٹی لیکن تسلی ہو گئی۔ انھوں نے کھانے کے بعد ڈکار لی۔ جھوٹے ہاتھ کو اپنے بدن کے کپڑے سے پونچھا۔ پھر اس آواز کو قریب سے سننے لگے۔ پتہ نہیں اسے کتنی گہری نیند آ گئی تھی کہ قریب بیٹھے ڈکار لینے کے باوجود اس کی آنکھ نہ کھلی۔

پھر دونوں کے ہاتھ آگے بڑھے۔ بھویاں کا ہاتھ سونے والی ہستی پر پہنچا تو وہ ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ اس نے ایک سانس لیتی ہوئی عورت کو چھو لیا تھا۔ اُدھر سکندر کا ہاتھ آگے بڑھا تو سر سے ٹکرایا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ اندازے کے مطابق اس کے منہ پر رکھ دیا بلکہ پوری قوت سے دبا دیا۔ سونے والی ایک دم سے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن دونوں نے اسے دبوچ لیا تھا۔

عورت، تنہائی، رات، تاریکی سب ایک ساتھ ایک جگہ ہوں تو آدمی کی نیت کو بہکنے میں دیر نہیں لگتی لیکن اس وقت ان دونوں کا مقصد صرف اتنا تھا کہ وہ شور نہ مچائے۔ اس کی آواز دوکین کے باہر تک نہ جائے۔ پھر سکندر نے سرگوشی میں کہا: "دیکھو، چلانا چھوڑ دو۔ ہم پہ بھروسہ کرو۔"

بھویاں نے کہا: "ہم تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تم کون ہو؟"

اس سے کوئی سوال پوچھنا سراسر حماقت تھی کیوں کہ سکندر نے منہ کو دبا رکھا تھا۔ بھلا جواب کیا دیتی۔ البتہ اس کا مچلنا ذرا کم ہو گیا تھا۔ وہ صرف کسمسا رہی تھی۔ یقیناً کوئی بھی عورت کسی اجنبی ہاتھ کو اپنے بدن پر برداشت نہیں کر سکتی۔ سکندر نے سرگوشی میں کہا: "اگر تم چپ چاپ بیٹھی رہیں تو میں تمھارے منہ پر سے ہاتھ ہٹا دوں گا۔ ہم تمھیں ہاتھ نہیں لگائیں گے۔"

وہ بالکل شانت ہو گئی۔ انھوں نے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔ اسے آزاد چھوڑ دیا۔ پھر بھویاں نے پوچھا: "تم کون ہو؟"

جواب میں خاموشی تھی۔ سکندر نے بھی یہی سوال کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے بڑی نرمی سے سرگوشی میں سمجھایا: "ہمیں اپنا دوست سمجھو۔ اگر تم کسی سے خوف زدہ ہو تو ہم اس سے نجات دلا سکتے ہیں۔ تمھارا ساتھ دے سکتے ہیں۔ تمھارے کام آ سکتے ہیں۔ ہمیں آزما کر دیکھو۔"

بھویاں نے کہا: "اور تمھیں ہم پر بھروسہ کرنا ہی ہو گا۔ یہ ایسا دور ہے کہ مرد بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے۔ تم تو عورت ہو۔ تمھیں مرد کے سہارے کی ضرورت ہے۔ بولو تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ تمھارا نام کیا ہے؟"

اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ تاریکی خاموش تھی۔ سکندر نے چڑ کر کہا: "میں نے تمھیں خاموش رہنے کی تاکید کی تھی تاکہ شور نہ مچاؤ لیکن خاموش رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم سے بھی نہ بولو۔"

اس نے جیسے نہ بولنے کی قسم کھا لی تھی۔ کوئی جواب نہیں دے رہی تھی۔ بھویاں نے پوچھا: "اے بھائی سکندر! کیا یہاں تھوڑی دیر پہلے کوئی عورت تھی؟ کیا سچ مچ ہم نے کسی کو یہاں پر ہاتھ لگایا تھا؟"

سکندر نے کہا: "بے شک ہمارے قریب ایک عورت ہے۔"

"وہ اندھیرے میں غائب ہو گئی ہے اور ہم خواہ مخواہ ایک دوسرے سے باتیں کیے جا رہے ہیں۔"

"نہیں بھئی۔ وہ موجود ہے۔ آؤ پھر چھو کر دیکھتے ہیں۔"

ان کے ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی ایک عورت کی گونگی سی آواز سنائی دی۔ وہ جیسے بولنا چاہتی تھی لیکن بول نہیں سکتی تھی۔ سکندر نے پوچھا: "کیا تم گونگی ہو؟" پھر اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا: "لعنت ہے۔ اگر تم گونگی ہو تو میری بات کا جواب کیسے دو گی؟"

کلیم الدین بھویاں نے کہا: "یہ بکواس ہے۔ میں بنگالی عورتوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ ہماری بھاشا نہیں جانتیں اس لیے گونگی بن جاتی ہیں تاکہ ہم انھیں بنگالی سمجھ کر چھوڑ دیا کریں۔"

سکندر نے پوچھا: "اسے نہیں چھوڑو گے تو کیا کرو گے؟"

"ہاں، یہاں کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شور مچائے گی تو پکڑے جائیں گے۔"

"بہت خوب، تم بنگالی ہو۔ پھر تمھیں کون پکڑ سکتا ہے؟ کون تمھیں نقصان پہنچا سکتا ہے؟ آخر تم نے کون سا جرم کیا ہے کہ چھپتے پھر رہے ہو؟ پہلے اپنے آپ کو دیکھو۔ پھر کسی کو نقصان پہنچانے

کے متعلق سوچنا:

"سکندر! تم ایک بہاری عورت کی طرفداری کر رہے ہو؟"

"میں تمھارے سوال کا جواب بعد میں دوں گا۔ پہلے تم بتاؤ، کیوں چھپتے پھر رہے ہو۔ جب کہ تم ایک بنگالی ہو اور بنگالیوں کو یہاں کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نہیں بتاؤں گا۔"

"تو پھر اس عورت کا بھی اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس کے معاملے میں نہ پڑو۔ ڈبے کے اُدھر چلے جاؤ۔"

"بہت خوب۔ میں اُدھر جاؤں اور تم اِدھر اس کے ساتھ رہو۔"

"بکواس کرنے سے بہتر ہے، اپنے متعلق کچھ بتا دو۔ نہیں بتاؤ گے تو میں تم سے جھگڑا کروں گا پھر آواز باہر تک جائے گی۔ تمام قلی اِدھر آئیں گے۔ شاید بی۔ ڈی۔ آر والے اور پولیس والے بھی اِدھر چلے آئیں۔"

وہ چپ رہا جیسے تاریکی میں خود کو چھپا رہا ہو۔ ویسے اس تاریکی میں وہ تینوں اپنی اپنی جگہ راز کی طرح تھے۔ سکندر نے پوچھا "کیا خیال ہے، ہو جائیں دو دو ہاتھ؟"

"تم بھی اس ویگن میں آ کر چھپے ہوئے تھے۔ تمھیں بھی کسی سے خطرہ ہے جب کہ تم خود بنگالی ہو۔ کیا باہر سے جو لوگ آئیں گے، وہ تمھیں گرفتار نہیں کریں گے؟"

سکندر نے کہا: "مجھے کوئی گرفتار نہیں کرے گا۔ میں نے وہ جرم کیا ہے جو بنگالیوں کو پسند ہے۔ سنو! میں بنیادی طور پر بہاری ہوں۔ چونکہ میرا بچپن کلکتہ میں گزرا ہے اس لیے بنگالی روانی سے بولتا ہوں۔ کوئی تمیز نہیں کر سکتا کہ میں کون ہوں۔ جب یہاں پاکستانی حکومت تھی اور بہاریوں کا بول بالا تھا تو میں بہاری بن کر رہتا تھا۔ مجھے ایک بہاری لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ بہت ہی سیدھی سادی، نہایت ہی نیک سیرت لڑکی تھی۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ میں اس کا پیچھا نہ کروں۔ سیدھی طرح اس کے والدین سے اس کا ہاتھ مانگ لوں۔ میں اس سے بہت متاثر تھا لیکن جب اس کے والدین کے پاس گیا تو انھوں نے ذات برادری کا مسئلہ اٹھایا۔ وہ لوگ سیّد تھے۔ میں اپنے باپ دادا کے متعلق زیادہ نہیں جانتا تھا۔ بچپن سے جوانی تک پتا نہیں کیسے میری پرورش ہوئی۔ کیسے میں نے تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی اور اپنا چھوٹا سا کاروبار کرنے لگا۔ انھوں نے جب میرے خاندان کے متعلق پوچھا تو میں نے کہا "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرے والدین کا تعلق دربھنگا سے تھا اور میرے دادا کلکتہ میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ میں مسلمان ہوں؟"

سکندر ذرا دیر کے لیے چپ ہوا۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا: "لڑکی کے والدین نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا۔ اگر آپ میری کوئی بات نہیں مانتے تو اپنی بیٹی کی مرضی معلوم کر لیں۔ اگر میری حمایت میں فیصلہ ہو گا تو مجھے میرا حق ملنا چاہیے۔"

لیکن انھوں نے لڑکی کی مرضی معلوم کرنے کے باوجود مجھے میرا حق نہیں دیا۔ دراصل نفرت اور دشمنی یہیں سے شروع ہوتی ہے کہ حق دار کو حق نہ دیا جائے اور اسے دھتکار دیا جائے۔ عوامی لیگ نے بھاری اکثریت سے اپنا حق ثابت کیا تھا۔ وہ حق چھیننے کی کوشش کی گئی تو نفرت کا جو لاوا دبا ہوا تھا۔ پھوٹ پڑا۔ میں بھی انتقام کی آگ میں پکنے لگا۔ بنگالی تو کہلاتا ہی تھا۔ مکتی باہنی والوں سے مل گیا۔

مکتی باہنی والوں کے جوان تین باتیں پوچھتے تھے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ کن بہاریوں نے بنگالیوں کو اور ہندوؤں کو قتل کیا تھا اور انھیں لوٹا تھا؟ دوسری بات یہ کہ کون بہاری سب سے زیادہ مالدار ہے؟ تیسری بات یہ کہ کس کے ہاں خوب صورت اور جوان لڑکیاں ہیں۔ ان دنوں مجھے پتا چلا تھا کہ زیبی مر چکی ہے۔"

بھویاں نے پوچھا: "کون زیبی؟"

"وہی لڑکی جس سے میں محبت کرتا تھا۔ وہ بیمار تھی اور اسی بیماری میں مر گئی۔ اب اس گھر میں زیبی کی چھوٹی بہن اور اس کے والدین رہ گئے تھے۔ میں نے مکتی باہنی کے ایک گروپ لیڈر سے کہا: "میں تمھیں ایسے مکان میں لے جاؤں گا جہاں نقد دولت اور سونے چاندی کے زیورات ملیں گے۔"

گروپ لیڈر نے کہا: "تم جو حصہ مانگو گے، وہ ہم دیں گے۔ چلو......"

میں نے انھیں زیبی کے مکان میں پہنچا دیا۔ اس کے والدین دروازے کھڑکیوں کو اندر سے بند کیے سہمے بیٹھے تھے۔ مسلح جوانوں نے دروازے کو توڑ دیا۔ ہم سب اس مکان میں داخل ہوئے تو وہ بوڑھا اپنی بوڑھی بیوی اور ایک لڑکی کے ساتھ پلنگ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ وہیں سے گڑگڑا کر کہنے لگا: "ہمیں چھوڑ دو۔ ہم سے جو رقم چاہو لے لو۔ مگر ہمیں جان سے نہ مارو۔"

میں نے نفرت سے کہا: "بڈھے! پلنگ کے نیچے سے نکل اور دیکھ میں وہی ہوں جس نے بڑی شرافت سے تیری بیٹی کا ہاتھ مانگا تھا۔ میں ایک شریفانہ زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن تو نے مجھے اپنا دشمن بنا لیا۔"

وہ پلنگ کے نیچے سے پھر گڑگڑانے لگا: "میں نے بڑی غلطی کی۔ مجھے معاف کر دو۔ میں اپنی بیٹی کی شادی تم سے کر دوں گا۔"

"بڑے میاں! کیسے کرو گے؟ تم تو سیّد ہو اور میرے خاندان کا کوئی پتا نہیں ہے۔ کیا تمھاری ذات برادری والے آ کر تمھیں بچا سکتے ہیں اور کیا میں تمھاری چھوٹی بیٹی سے شادی کروں گا۔ ہرگز نہیں

میں جسے چاہتا تھا وہ تو بیمار ہو کر سسک سسک کر مر گئی۔ مجھے تمہارے گھر کے سارے حالات معلوم ہیں۔"

بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی: "بیٹا! تم غلطی پر ہو۔ ہماری چھوٹی بیٹی بیمار رہ کر مر گئی تھی۔ زیبی زندہ ہے۔"

اس کے ساتھ ہی زیبی پلنگ کے نیچے سے نکل کر کھڑی ہو گئی۔ میری طرف دیکھ کر بولی: "یوں سمجھو کہ زیبی مرنے کے بعد اپنے ماں باپ کے تحفظ کے لیے آئی ہے۔ کیا تم میرے بدلے انھیں معاف کر سکتے ہو؟"

اس وقت تک مکتی باہنی کے جوانوں نے ..... بوڑھے اور بوڑھی کو ٹانگوں سے پکڑ کر پلنگ کے باہر کھینچ لیا تھا۔ بڑھیا ایک گٹھری سے لپٹی ہوئی تھی۔ ایک جوان نے اس کی گٹھری چھین لی۔ اسے کھولا تو نوٹوں کی گڈیاں اور سونے چاندی کے زیورات کا ڈھیر نظر آیا۔ میں نے لیڈر سے کہا: "تمہارے مطلب کی چیز سامنے پڑی ہے۔ یہ ساری دولت سمیٹ کر لے جاؤ اور ان لوگوں کو چھوڑ دو۔"

مکتی باہنی کے ایک جوان نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ دیکھو۔ ایوب خان کی تصویر۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ یہ لوگ پاکستانی فوج کے ہمدرد ہیں۔ انہی لوگوں کی وجہ سے ہم لوگوں پر مصیبتیں نازل ہوتی رہی ہیں۔ ہم انھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ رہ گئی یہ لڑکی اسے تم چاہتے ہو۔ یہ تمہاری ہے۔ اسے لے جاؤ۔"

زیبی نے چیخ کر کہا: "سکندر! مجھے چاہتے ہو تو میرے ابو کو، میری امی کو بچاؤ۔"

وہ لوگ اس کے والدین کو گھسیٹ کر آنگن میں لے جا رہے تھے۔ میں نے گروپ لیڈر سے التجا کی: "پلیز۔ انھیں چھوڑ دو۔"

"ہم کیسے چھوڑ دیں؟ یہ ہماری چوبیس سال سے بنگال کی زمین پہ ہیں۔ یہ چوبیس سال سے بنگالی کسانوں کی محنت کا چاول کھا رہے ہیں۔ بنگال کا پانی پی رہے ہیں۔ چوبیس سال سے بنگال کی ہوا میں سانس لے رہے ہیں لیکن انھوں نے کبھی بنگالیوں کو دوست بنائے رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ اپنے آپ کو ہم سے برتر سمجھتے رہے۔ ان کی نشوونما بنگال میں ہوتی رہی لیکن ان کا ذہن پاکستانی رہا۔"

یہ کہتے ہی اس نے چیخ کر حکم دیا: "فائر۔" دوسرے ہی لمحے تڑ تڑ گولیاں چلنے کی آواز گونجی پھر ...... بوڑھے اور بوڑھی کی لاشیں آنگن کے فرش پر گر پڑیں۔ زیبی کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ جہاں تھی وہیں ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔ اگر اس کے پیچھے سہارے کے لیے دیوار نہ ہوتی تو شاید گر پڑتی۔ مکتی باہنی کے جوانوں نے تمام نقد رقم اور زیورات کو سمیٹا۔ گٹھری باندھی۔ پھر گروپ لیڈر نے میرے شانے کو تھپ تھپا کر کہا: "ہم نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ مال ہم لے جا رہے ہیں۔ لڑکی تمہارے لیے چھوڑ دی ہے۔"

وہ چلے گئے۔ میرے لیے میری پسند کی دلہن چھوڑ گئے۔ ایسی دلہن جس کی طرف میں دیکھنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ شرم سے گردن جھکی جا رہی تھی۔ اس کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ہی میں زمین میں دھنستا جا رہا تھا۔ ہم یہ کیا کرتے ہیں۔ نفرت اور دشمنی میں اندھے کیوں ہو جاتے ہیں؟ انتقام کے جوش میں اپنے آپ پر قابو کیوں نہیں رکھتے؟ اگر میں ذرا صبر سے کام لیتا تو بہتر ہوتا۔ زیبی کا ووٹ مجھے حاصل ہو گیا تھا۔ میں جیت میں تھا۔ بےشک اس کے والدین نے اسے میرے اختیار میں نہیں دیا تھا لیکن وہ زیبی کے دماغ پر کسی دوسرے کو بھی مسلط نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر میری تھی۔ میری ہی رہتی۔

لیکن اب؟ اب زیبی کا وہ آنگن بنگلہ دیش کی طرح اُجڑ گیا تھا۔ اب وہ کسی دشمن کو مجھ جیسے بدترین دوست پر ترجیح دے سکتی تھی۔ مجھے گالیاں دے سکتی تھی۔ مجھے نظروں سے دور ہو جانے کے لیے کہہ سکتی تھی۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا تھا۔ اچانک وہ چیخ مار کر روتے ہوئے، دوڑتے ہوئے فرش پر گر کر کبھی ماں سے اور کبھی باپ سے لپٹ لپٹ کر رونے لگی۔

میں ایک مجرم کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ مجھے کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ میں اس سے کیا کہوں؟ دلجوئی کروں مگر کس زبان سے؟ دشمن جو جان لیتے ہیں وہ آرام جاں کیسے بن سکتے ہیں۔ میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ وہ روتی رہی۔ فریاد کرتی رہی۔ میں سنتا رہا۔ بہت دیر بعد جب اس کی آواز تھکنے لگی۔ وہ نڈھال سی ہونے لگی تو میں نے بڑی ندامت سے کہا: "زیبی مجھے معاف کر دو۔"

میری یہ بات جیسے تازیانہ تھی۔ وہ ایک دم سے چونک کر پلٹ گئی۔ مجھے یوں دیکھا جیسے اب تک میری موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ احساس ہوا تو وہ شدید نفرت سے دیکھنے لگی۔ میں اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ نظریں جھکا کر بولا: "تم مجھے جتنی سزا دینا چاہو دو۔ میں اُف نہیں کروں گا۔ بس خدا کے لیے ایک بار معاف کر دو۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آ گئی۔ بالکل سامنے پہنچ گئی۔ مجھے ذرا سی اُمید نظر آئی۔ شاید وہ مجھے معاف کر دے گی اور اسے معاف کر دینا چاہیے۔ کیوں کہ اس کا اب اس سرزمین پر کوئی نہیں رہا تھا۔ میں ہی اس کا سہارا بن سکتا تھا۔ میں نے بڑے یقین سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جیسے ہی سر اٹھایا اس نے آخ تھو کر کے مجھ پر تھوک دیا۔ میں نے ہڑبڑا کر اپنے چہرے کو ادھر اُدھر سے چھو کر دیکھا۔ تھوک کہاں ہے؟ وہاں نہیں تھا۔ میں نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ دونوں شانوں کو دونوں ہاتھوں سے ٹٹولا۔

کہاں ہے تھوک؟ تھوک کہاں ہے؟

تھوک ضروری نہیں ہے۔ صرف 'تھو' کہہ دینا کافی ہے۔ ایک حساس آدمی کو اوپر سے گرانا ضروری نہیں ہے۔ نظروں سے گرا دینا کافی ہے۔ میں خواہ مخواہ بوکھلاہٹ میں اپنے چہرے کو ٹٹولنے لگا تھا۔ اس نے میرے چہرے پر نہیں، میرے ضمیر کے منہ پر تھوکا تھا۔

وہ یکبارگی پلٹ کر دوڑتے ہوئے باورچی خانے میں گئی۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ آگے بڑھ کر بھی کیا کر سکتا تھا۔ کیا اسے پھر تھوکنے کے لیے بلاتا؟ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے اس کے وحشیانہ قہقہے سنائی دیے پھر باورچی خانے کی کھڑکی سے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آئے۔ میں دوڑتا ہوا کھڑکی کے پاس گیا۔ تب پتا چلا، اس نے اپنے بدن پر مٹی کا تیل چھڑکنے کے بعد آگ لگا لی تھی۔ وہ جل رہی تھی اور دیوانہ وار قہقہے لگا رہی تھی۔ میں دروازے کو پیٹنے لگا۔ دھکے مارنے لگا۔ بار بار چیخ کر اسے سمجھانے لگا کہ وہ پانی سے بھری ہوئی بالٹی اپنے اوپر انڈیل لے۔ آگ بجھ جائے گی۔ اسے خودکشی نہیں کرنا چاہیے۔

دروازہ مضبوط تھا لیکن میرے جوش اور جذبے نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔ جب میں ٹوٹے ہوئے دروازے سے گزر کر اندر گھسا تو قصہ تمام ہو رہا تھا۔ وہ فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ بالکل سیاہ پڑ گئی تھی۔ شعلوں نے اسے کوئلے کا ایک مجسمہ بنا دیا تھا۔ تاہم بڑی سخت جان تھی۔ ابھی تک سانس لے رہی تھی۔ ہُمک رہی تھی۔ کبھی ایک جھٹکا کھاتی تھی۔ پھر چپ ہو جاتی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دم نکل رہا ہو مگر نکل نہیں رہا تھا۔ میں تیزی سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ پھر میں نے فرش پر گھٹنے ٹیک کر اسے مخاطب کیا: "زیبی! زیبی! یہ تم نے کیا کیا؟"

اس کی آنکھوں کے پپوٹے ذرا لرزنے لگے۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے پہلے تو یوں دیکھا جیسے پہچان نہیں رہی ہو۔ پھر اچانک اس کی آنکھوں سے نفرت ظاہر ہونے لگی۔ گویا اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اچانک ہی اس کے پورے وجود کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اس نے اپنی آخری تمام قوتیں صرف کر کے اپنے چہرے کو ایک ذرا سا اٹھایا۔ میری طرف دیکھا پھر اپنے ہونٹ سکیڑ لیے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا اٹھا ہوا سر فرش سے لگ گیا پھر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔

وہ مر گئی۔ مرنے کے بعد کوئی کسی سے محبت کا اظہار کر سکتا ہے نہ نفرت کا اور نہ ہی کسی کرب کا لیکن اس کے دونوں ہونٹ ابھی تک اسی طرح یوں سکڑے ہوئے تھے جیسے موت کے کرب سے کہہ رہے ہوں 'اُف' یا محبت سے دعا پڑھ کر اپنے پیارے پر پھونک رہے ہوں 'فُو' یا پھر نفرت سے تھوک رہے ہوں: تھو!

* * *

مال گاڑی کے ڈبے کے اندر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سکندر کا سر جھکا ہوا تھا۔ اسی تاریکی میں کلیم الدین بھوئیاں بھی خاموش بیٹھا انتظار کر رہا تھا، شاید سکندر کچھ اور بولے گا۔ ۔ ۔ ۔ ان دونوں کے علاوہ وہ تیسری ہستی بھی وہاں موجود تھی مگر تاریکی میں نظر نہیں آ رہی تھی۔

کلیم الدین بھوئیاں نے کہا: "تمہاری روداد سننے کے بعد میرا دل کہتا ہے، اب تم کسی سے نفرت نہیں کرو گے۔ کسی کو دشمن سمجھ کر انتقام نہیں لو گے۔"

"وقت کی ایک ٹھوکر کے بعد انسان کو سنبھل جانا چاہیے جو نہیں سنبھلتے، وہ آخری سانس تک ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں، تم جو کہو گے وہ میرے سینے میں راز رہے گا مگر تم اپنے متعلق کچھ نہ چھپاؤ۔ مجھے بتاؤ۔ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟"

اس نے کہا: "ابھی تھوڑی دیر پہلے تم سے لڑنے کے دوران میں نے جوش میں آ کر اپنا نام بتا دیا کہ میں کلیم الدین بھوئیاں ہوں — حالانکہ اب سے پہلے میں نے کسی کو اپنا صحیح نام نہیں بتایا۔ میری داستان بس اتنی ہے کہ میں بنگالی ہوں اور بنگالیوں سے ڈرتا پھر رہا ہوں۔ تم جانتے ہو۔ بہت سے بنگالی پاکستان کے وفادار تھے۔ میرے بابا دیناج پور سٹی کورٹ کے جج تھے — پاکستان کے وفادار تھے اور یہی وفاداری وہاں کے بنگالیوں کو کھٹکتی تھی۔ میں نے اور میرے بھائی بہنوں نے بابا کو بہتیرا سمجھایا، ہم بنگالی ہیں۔ ہمیں بنگالیوں کا ساتھ دینا چاہیے۔ ان کے ایک سیاسی دوست نے کتنے ہی بنگالی تاجروں، ریلوے کے اور سیمی گورنمنٹ کے بنگالی ٹھیکیداروں کے ساتھ مل کر ایک تنظیم بنائی تھی۔ اس کا نام 'پیپلز کمیٹی فار ایوب' تھا۔ جب ایوب خان کا دور گزر گیا تو یہ لوگ یحییٰ خان کے وفادار ہو گئے۔ ہنگامے کے دوران جب بھی بنگالی طلبا کو موقع ملتا تھا وہ ان کے دفتر پر پتھراؤ کرتے تھے اور ہم سب کو دلال کہتے تھے — پاکستان کے ذمے دار افسران نے ہمارے لیے حفاظتی اقدامات کیے لیکن وقتی طور پر اقدامات کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہتھیار ڈالنے سے پہلے یہ تو سوچ لینا چاہیے تھا کہ ان کے وفاداروں پر کیا گزرے گی؟ سوچو تو یوں سمجھ میں آتا ہے جیسے یہ سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہوا ہے۔ ہم وفاداروں کے دل جلے ہوئے ہیں۔ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یقیناً یہ پوری پلاننگ تھی۔ اسی لیے انھوں نے چند بڑے وفاداروں کو پہلے ہی بلا کر انھیں تحفظ دے دیا۔ باقی ہم سب لوگوں کو اپنی زمین اور اپنی قوم سے غداری کی عبرت ناک سزا پانے کے لیے چھوڑ دیا؟"

کلیم الدین بھویاں چند لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر اس نے وگن کی تاریکی میں گھورتے ہوئے کہا: "ہم کیا ہیں؟ ہم دھوبی کے کتے ہیں، نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ میری قوم کے ہی لوگوں نے میرے گھر کے ایک ایک مرد، ایک ایک عورت اور ایک ایک بچے کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ میں اس وقت دیناج پور میں نہیں تھا اس لیے زندہ سلامت نظر آرہا ہوں لیکن چھپتا پھر رہا ہوں۔ ایک بہت بڑے جج کا بیٹا ہوں اس لیے دیناج پور کے بے شمار بنگالی مجھے جانتے ہیں۔ پھر میری تصویریں مکتی باہنی کے جوانوں کو دی گئی ہیں۔ میرا حلیہ بھی بتایا گیا ہے۔ وہ مجھے جہاں دیکھیں گے وہیں گولی مار دیں گے۔"

وہ دھیرے سے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا: "میں ایک بہت بڑے جج کا بیٹا ہوں اور آج میں نے ایک ماگی (طوائف) کے گھر سے کھانے کی ہانڈی چرائی ہے۔ آج میری کوئی سماجی حیثیت نہیں ہے۔ آج میں چوری نہ کرتا تو دشمنوں کے ہاتھوں مرنے سے پہلے بھوکا مر جاتا۔ ان حالات میں زندگی کتنی پیاری لگتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اس پیاری سی، عزیز سی چیز کو کیسے بچا کر رکھیں۔ نہ بنگالی دوست، نہ بہاری دوست۔ مجھے سبھی سے نفرت ہے۔ اب میں اپنے وطن کا نام سننا نہیں چاہتا۔ میرے سارے گھر والے اسی نام پر قربان ہو گئے مگر ہمیں کیا ملا۔ بے شک قربانی، صلہ نہیں مانگتی لیکن جن کے لیے ہم نے قربانیاں دیں وہ ہمیں منجدھار میں چھوڑ کر چلے جائیں اور پلٹ کر ہماری خبر نہ لیں اور ہمارے آگے صرف موت ہی موت نظر آئے اور امید کی ایک ہلکی سی بھی کرن نہ ہو کہ ہمیں چھوڑ کر جانے والے پھر آ کر اس حصے کو پاکستان بنائیں گے یا اُدھر والے پاکستان میں ہمیں پناہ دینے کے لیے بلائیں گے تو پھر ہم کس مقصد کے لیے جان دیں؟ جب کوئی مقصد نہ ہو، کوئی منزل نہ ہو اور جان جاتی رہے تو ایسی موت حرام موت کہلاتی ہے۔ اسے قربانی کا فخریہ نام دے کر ہمیں بہلایا نہیں جا سکتا۔"

سکندر نے کہا: "تم نے اپنی آنکھوں سے اپنے گھر کی جوان عورتوں کو بے عزت ہوتے اور مرتے دیکھا۔ اب یقیناً تمھاری نظروں میں دوسروں کی بہو بیٹیوں کا احترام ہونا چاہیے پھر تم اس عورت کو بہاری سمجھ کر دشمنی پر کیوں اُتر آئے تھے؟"

کلیم الدین بھویاں نے تاریکی میں اُدھر دیکھا۔ جدھر اس عورت کی موجودگی کی توقع تھی۔ وہ دونوں کو نظر نہیں آرہی تھی لیکن یقین تھا کہ موجود ہے۔ وہ بولا: "بے شک میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے گھر کی عورتوں کو بے عزت ہوتے دیکھا لیکن اس سے کوئی سبق حاصل نہیں ہوتا بلکہ انتقام کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ دل اور دماغ میں لاوا پکتا رہتا ہے کہ ان مغربی پاکستان والوں اور بہاریوں سے وفا کی، بہت بڑا جرم کیا۔ پنجابی پاکستان چلے گئے۔ بہاری سید پور ڈھاکہ اور دوسرے بڑے شہروں میں اپنے کیمپ بنا کر اپنی سلامتی کی کوششیں کر رہے ہیں یا سرحد پار بھاگ رہے ہیں لیکن ہم بنگالی کہاں جائیں؟ اگر یہاں رہتے ہیں تو بنگلہ دیش کے غدار کہلاتے ہیں۔ پاکستان پہنچیں گے تو گیہوں کے ساتھ جیسے گھن پس جاتا ہے، ویسے ہی دوسرے بنگالیوں کی طرح ہمیں بھی پاکستان کا غدار کہا جائے گا۔ اِدھر بھی غدار اُدھر بھی غدار ٹھہرے۔ ہمارا کوئی نام نہیں ہے۔ کوئی مقام نہیں ہے۔ پھر ہم کسی بہاری یا بنگالی عورت سے ہمدردی کیوں کریں؟ جس گھر میں مجھے چوری کرنے کا موقع ملتا ہے۔ میں چوری کر کے بھاگ جاتا ہوں۔ جس گھر کی کوئی عورت ہاتھ آتی ہے، میں اسے نہیں چھوڑتا۔ مجھے ایسے وقت یوں لگتا ہے جیسے میں ساری دنیا سے انتقام لے رہا ہوں۔ کل ایوب اور سہروردی میرے آئیڈیل تھے۔ آج چنگیز خان اور ہلاکو میرے ہیرو ہیں۔"

وہ دونوں تھوڑی دیر تک چپ رہے پھر بھویاں نے کہا۔ "ہماری جان ہم پر بھاری ہے۔ ہمیں کسی عورت سے ہمدردی کر کے کون سا ثواب کمانا ہے۔"

"تم نے ابھی پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے اس لیے چربی چڑھ گئی ہے۔ بہتر ہے تم اپنے راستے چلے جاؤ ورنہ میں تمھاری پٹائی شروع کر دوں گا۔"

بھویاں نے پوچھا: "کیا تھوڑی دیر پہلے کا مقابلہ بھول گئے۔ میں تم سے کسی طرح کم نہیں ہوں۔"

"تم بھی یہ بھول رہے ہو کہ ہمارے درمیان جھگڑا ہو گا تو باہر والے پکڑنے کے لیے آجائیں گے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ مجھے کوئی گرفتار نہیں کر سکتا لیکن کسی بھی بنگالی نے تمھیں ایک جج کے بیٹے کی حیثیت سے پہچان لیا تو؟"

بھویاں نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "اسی لیے چھپتا پھر رہا ہوں۔ واقعی تمھاری مخالفت کروں گا تو نقصان اٹھاؤں گا۔ آؤ ہم سمجھوتا کر لیں۔ لیکن یہ ہے کہاں۔ یہ تو کچھ بولتی نہیں ہے۔ اپنی موجودگی کا بھی احساس نہیں دلاتی ہے۔"

سکندر نے کہا: "ہاں، اسے کچھ بولتے رہنا چاہیے اور بول نہ سکے تو زور زور سے سانس لینا چاہیے یا پہلو بدلنا چاہیے۔ تاریکی میں جب تک کوئی چیز اِدھر سے اُدھر نہ ہو، اس کے وجود کا یقین نہیں ہوتا۔ اے! تم خاموش کب تک رہو گی؟ کچھ تو بولو۔ یا پھر اپنا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں دو۔ ہم تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

وہ دونوں کان لگا کر سننے لگے۔ انتظار کرنے لگے جیسے وہ خود کو ان کے حوالے کرنے والی ہو۔ دونوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ وقت کو گزرتے ہوئے دیکھنے کے لیے گھڑی نہ ہو۔ سننے کے لیے وقت کی ٹک ٹک نہ ہو تو دل کی دھک دھک تاتی

ہے کہ سانسیں بیت رہی ہیں۔ انتظار ختم ہوگیا۔ تاریکی میں اس کی موجودگی کا سراغ ملنے لگا۔ ایک طویل سانس سنائی دی جیسے اس نے ناک سے سانس لی ہو اور منہ کھول کر دیر تک سانس گھونٹتی رہی ہو تاکہ وہ دیر تک اس کی آواز سن لیں۔

سکندر نے کہا: "تمھاری آواز سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم بول نہیں سکتی ہو لیکن سن سکتی ہو۔ سمجھ سکتی ہو اور تم نے ہم دونوں کی پوری ہسٹری سن لی ہے۔ یقیناً تمھیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہم بھی دشمنوں کے مارے ہیں۔ تمھیں نہیں ماریں گے۔ آؤ ہم سے دوستی کرلو۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد کوئی ملائم سی چیز سکندر کے گھٹنے سے ٹکرائی۔ تاریکی کا ہاتھ اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے اس ہاتھ کو پکڑ لیا۔ وہ ہتھیلی نرم تھی، گرم تھی اور صحت مند بھی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں آنے کے بعد خود کو نہیں چھڑا رہی تھی۔ یعنی اعتماد قائم ہوگیا تھا۔

سکندر نے اس ہتھیلی کی پشت کو محبت سے تھپتھپاتے ہوئے کلیم الدین بھویاں کو مخاطب کیا: "یہ مجھ سے دوستی کررہی ہے۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا ہے۔"

اندھیرے سے کلیم الدین بھویاں کی آواز سنائی دی: "یہ مجھ سے بھی دوستی کررہی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے۔"

"یہ ہم دونوں کا سہارا چاہتی ہے۔"

"عورت کو کسی ایک سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"تم ایک رشتے کے متعلق کیوں سوچتے ہو۔ ہم انسانوں کے درمیان اور بھی تو معزز رشتے ہوتے ہیں۔"

کلیم الدین بھویاں نے کہا: "رشتے کی بات سے یاد آیا کہ اگر ہم اس بوگی سے نکلیں گے، دن کا وقت ہوگا اور کسی نے ہمیں اس عورت کے ساتھ دیکھ لیا تو پہلا سوال یہی ہوگا کہ یہ ہماری کون ہے؟"

"بے شک سبھی یہ سوال کریں گے۔"

بھویاں نے کہا: "پہلے ہی سے رشتہ طے ہوجانا چاہیے۔ ایسا کرتے ہیں، کوئی پوچھے گا تو میں کہوں گا، یہ میری گھروالی ہے اور تم اس کے بھائی ہو۔"

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں اپنی ہسٹری سنا چکا ہوں۔ میں نے زینی کے ساتھ جو ظلم کیا۔ ناانصافی کی، اس کی تلافی کے لیے بے چین رہتا ہوں۔ اگر میں اس عورت کا سہارا بن جاؤں گا اور اسے اس کی منزل تک پہنچا دوں گا یا ہمیشہ اس کے کام آتا رہوں گا تو تلافی ہوجائے گی لہٰذا میں اسے اپنی گھروالی بتاؤں گا اور تم اس کے بھائی بن جاؤ۔"

کلیم الدین بھویاں نے غصے سے مٹھی بھینچ کر کہا: "اے تم مجھے کھل کر گالی نہیں دے رہے ہو لیکن رشتہ بنا کر سالا کہہ رہے ہو۔"

"یہ گالی پہلے تم نے دی ہے۔"

ہم لوگ کچھ عجیب سے ہیں۔ اپنے معبود کو مخاطب کرنا ہو تو ادب و لحاظ کی انتہا کرتے ہوئے 'تُو' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں لیکن کوئی شخص ہمیں 'تُو' کہہ دے تو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ بہن کا رشتہ مقدس ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنی ماں جائی ہو تو اس رشتے کے تقدس سے خود کو کسی کا سالا تسلیم کرلیتے ہیں لیکن کوئی عورت مالِ غنیمت کے طور پر ملے تو اس کے رشتے سے وہی لفظ سالا ایک گالی بن جاتا ہے۔ کلیم الدین بھویاں نے کہا: "اس طرح ہم پھر جھگڑنے لگیں گے۔ کوئی صلح کا راستہ نکالنا چاہیے۔"

"تمھی جھگڑا شروع کرتے ہو۔ تمھی صلح کا راستہ نکالو۔"

"ایک تدبیر ہے۔ اگر یہ بہاری ہوئی تو تمھاری ہوئی اور بنگالی ہوئی تو میری۔"

"اس ڈبے سے نکلنے سے پہلے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بنگالی ہے یا بہاری۔ کیوں کہ باہر نکلتے ہی جواب طلبی ہوسکتی ہے۔"

بھویاں نے گہری سانس لے کر کہا: "باہر نکلنے کے خیال سے ہی ڈر لگتا ہے۔ اگر یہ بنگالی ہوئی تو میں اسے لے کر جے پورہاٹ چلا جاؤں گا۔ وہاں مجھے کوئی نہیں پہچانے گا۔"

"ہم کیسے معلوم کریں، یہ کون ہے؟"

ان دونوں کے ہاتھوں میں اس کا ایک ایک ہاتھ تھا۔ ہاتھ کسی بھی شخصیت کا پہلا تعارف ہوتا ہے، جیسے آئیے ہاتھ ملائیے۔ میں فلاں ہوں، اور ہاتھ محبت کا پہلا معانقہ ہوتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ محبت پاؤں کو چھو کر شروع ہوئی ہو۔ ہر محبت کرنے والا پہلے ہاتھ پکڑتا ہے...... ان دونوں میں سے ایک کے ہاتھ میں بہاری سرحد تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں بنگال کی سرحد اور دونوں کو اندھیرے میں یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس صوبے سے تعلق رکھتی ہے اور انھیں کہاں لے جائے گی۔

سکندر نے اس کے ہاتھ کو ذرا محبت سے دباتے ہوئے کہا: "تم ہماری باتیں سمجھ رہی ہو۔ ہماری مشکل آسان کرو۔ اگر تعلیم یافتہ ہو تو اپنی انگلی سے ہماری ہتھیلی پر لکھو۔ تم کون ہو؟"

کلیم الدین بھویاں نے کہا: "بنگالی ہو تو بنگلہ بھاشا میں اور بہاری ہو تو اردو میں لکھو۔"

ادھر بھویاں نے اس کے ہاتھ کو اپنی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھا، ادھر سکندر نے بھی اس کی انگلی کو اپنی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا: "لکھو۔"

دو مختلف سمت، مختلف ہتھیلیوں پر اس کی دو انگلیاں

ٹھہری ہوئی تھیں جیسے سوچ رہی ہوں کیا لکھے؟ پھر ذرا سوچنے کے بعد اس نے دونوں ہتھیلیوں پر صفر کا نشان بنا دیا۔ بھویاں نے کہا۔

"ارے اس نے تو میری ہتھیلی پر انگریزی کا 'او' بنایا ہے۔ بھلا 'او' سے کیا ہو سکتا ہے؟"

سکندر نے کہا: "او نہیں 'زیرو' بنایا ہے یعنی یہ لکھنا نہیں جانتی ہے۔ ان پڑھ ہے۔"

"میرا خیال ہے یہ اپنے آپ کو چھپا رہی ہے۔"

"نہیں۔ اس کی مجبوری ہے۔ یہ بتا نہیں سکتی ہے۔"

"ایک سیدھا سا راستہ ہے۔ یہ سمجھ رہی ہے کہ میں بنگالی ہوں اور تم بہاری۔ لہٰذا یہ ہم میں سے کسی کا ہاتھ پکڑے اور کسی کا چھوڑ دے۔ اس طرح پتہ چل جائے گا۔ اس کا ووٹ کس کے حق میں ہے۔"

"یہ عمدہ آئیڈیا ہے۔ تم سن رہی ہو نا۔ چلو ایک کا ہاتھ پکڑے رہو اور دوسرے کا چھوڑ دو۔"

وہ چپ ہو گئے۔ انتظار کرنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد کلیم الدین بھویاں نے خوش ہو کر کہا: "اس نے میرے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔"

"اس نے میرے ہاتھ کو بھی مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"تمہاری بے یقینی سچ کو جھوٹ نہیں بنا سکتی۔ اس کی حرکتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ واقعی ان پڑھ ہے۔ یا پھر اپنی اصلیت بتانا نہیں چاہتی۔ کسی ایک کا ہاتھ تھامنے کے لیے کہا گیا تو اس نے دونوں کا ہاتھ تھام رکھا ہے یعنی یہ دونوں کو دوست بنائے رکھنا چاہتی ہے۔ دونوں کا سہارا چاہتی ہے۔"

"اسے اب اندھیرے سے نکال کر لے جانا ہی ہو گا۔ اس کی اصلیت معلوم کرنا ضروری ہے۔"

"لیکن ہم کہاں جائیں گے؟"

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کلیم الدین بھویاں نے کہا: "اسے کھلے ہوئے دروازے کے پاس لے جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ دور کی روشنی مدھم ہے مگر اس کی جھلک تو نظر آئے گی۔ اس کے لباس سے، اس کے سراپے سے کسی حد تک شناخت ہو سکتی ہے۔"

یہی مناسب تھا۔ جلد از جلد اس کے متعلق معلوم کرنا ضروری تھا۔ کوئی وہاں پہنچ جاتا اور ان کے متعلق پوچھتا تو وہ منہ دیکھتے رہ جاتے۔ وہ دونوں ویگن کے کھلے ہوئے دروازوں کے پاس آ گئے۔ ایک نے پلیٹ فارم کی طرف دیکھا۔ وہاں پہلے جیسی ویرانی تھی۔ دوسری طرف بھی دو نمبر کا پلیٹ فارم تھا لیکن بیچ میں دو پٹریاں تھیں۔ وہاں سے دیکھے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔

وہ دونوں ویگن کے اس حصے کی طرف پلٹ گئے جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر ایک نے سرگوشی میں کہا: "اٹھو، ادھر یہاں آؤ۔"

وہ شاید اُٹھنے والی تھی۔ شاید آنے والی تھی۔ اپنی جھلک دکھانے والی تھی۔ اتنی دیر سے وہ بغیر دیکھے ہوئے اس کے دیوانے بنے ہوئے تھے۔ حسن جب تک پردے کے پیچھے یا تاریکی میں چھپا رہتا ہے، پُراسرار رہتا ہے اور جب تک پُراسرار رہتا ہے، تب تک تصور میں حسین جلوے لٹاتا رہتا ہے۔

وہ یقیناً آنے ہی والی تھی۔ اچانک رات کے گہرے سناٹے میں ٹھائیں سے فائرنگ کی آواز گونجی اور وہ چیخ مار کر دھم سے ویگن کے فرش پر گر پڑی۔ — وہ تاریکی میں تھی، تاریکی میں رہ گئی۔

وہ دونوں سہمے ہوئے انداز میں دروازے سے سرک گئے۔ کھلے ہوئے دروازے کے باہر قلیوں کا اور دوسرے لوگوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ قریب ہی پلیٹ فارم پر بھاری بھرکم فوجی بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ ایک بنگالی حاکمانہ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ "گولی چلانے کی کیا ضرورت تھی؟"

دو مسلح سپاہی قلیوں کے ایک سردار کو پکڑ کر لے آئے تھے۔ ایک سپاہی نے کہا: "سر! یہ بڑے مزے سے گہری نیند سو رہے تھے۔ انھیں آوازیں دے کر جھنجھوڑ کر اٹھانے میں دیر لگتی۔ بندوق کی ایک ہی گولی نے سب کو ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔"

"آفیسر نے سردار قلی کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا: "شالا ڈیوٹی چھیڑے گھوم کورتے چھو۔ اے ٹرین ڈیو ٹائمے جادے نہ ہوسے تمار چام اچھی لے دیبو (سالے ڈیوٹی چھوڑ کر سوتے ہو۔ اگر یہ گاڑی وقت پر نہیں جائے گی تو تمہاری کھال کھینچ دی جائے گی)۔"

دوسری طرف اس گڈز کلرک کی پٹائی ہو رہی تھی جو سونے کے لیے چلا گیا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا: "معاف کورے دین۔ (معاف کر دیجیے)۔ میں ابھی اس ویگن کو لوڈ کرا دیتا ہوں۔"

اس بار آفیسر نے انگریزی میں پوچھا: "ہاؤ مینی ویگنز آر لیفٹ؟ (اور کتنے ویگن رہ گئے ہیں؟)۔"

کلرک نے جواب دیا: "دس از دی لاسٹ ون (یہی آخری ویگن ہے جو آدھے گھنٹے کے اندر لوڈ ہو جائے گی...... باسمتی چاول کی صرف دو سو بوریاں ہیں۔"

اس کے بعد ہی جیسے قلیوں میں تیزی آ گئی۔ سب بوریاں اٹھا کر اسی ویگن کی طرف آنے لگے۔ وہ دونوں بھی ایک گوشے میں دبک گئے تھے۔ چاول کی بوریاں یکے بعد دیگرے ویگن کے فرش پر آ کر دھما دھم گرتی جا رہی تھیں۔ دو قلی اندر آ گئے تھے اور اندر آنے والی بوریوں کو کھینچ کر اُدھر لاد رہے تھے جدھر وہ دونوں اَن دیکھی عورت کے سامنے ڈھال بن گئے تھے۔ پوزیشن یہ تھی کہ وہ ایک گوشے میں چپکی کھڑی تھی۔ اس کے آگے وہ دونوں کھڑے ہوئے تھے،

تاکہ بوریاں آئیں تو انھیں روک لیں۔

اور وہ ان بوریوں کو روک رہے تھے۔ قلی یہ سمجھ رہے تھے کہ ویگن کا آخری حصہ وہی ہے، جہاں بوریاں رُک رہی ہیں۔ اندھیرے میں اس لیے بھی نظر نہیں آیا کہ وہ روشنی سے ہٹ کر کام کر رہے تھے۔

بیس پچیس بوریوں کے بعد ہی انھیں اطمینان ہو گیا۔ اب خطرہ نہیں تھا۔ وہ آسانی سے چھپ گئے تھے۔ باقی بوریاں ان بوریوں کے آگے رکھی جا رہی تھیں۔ ان کی طرف نہیں آ رہی تھیں اور نہ ہی قلی اُدھر آ رہے تھے۔ اس بات کا بھی خدشہ نہیں تھا کہ بوریاں ایک کے اوپر ایک اسٹیک کی جائیں گی تو وہ چھت تک پہنچ جائیں گی۔ اس طرح حبس ہو گا۔ سانس رُکے گی۔ وہ پہلے ہی گن چکے تھے کہ صرف دو سو بوریاں ہیں اور اتنے بڑے ویگن میں زیادہ سے زیادہ پچیس پچاس بوریاں اوپر نیچے ہو جاتیں۔ چھپنے والوں کے لیے یوں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ آزادی سے سانس لے سکتے تھے اور ان بوریوں پر چڑھ کر اِدھر سے اُدھر جا سکتے تھے۔ لیکن لوڈنگ کے بعد اس ویگن کے دونوں دروازے باہر سے بند ہونے والے تھے اور یہ دروازے اسی جگہ کھلتے جہاں یہ مال اُتارا جانے والا تھا۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ اس مال کے ساتھ کہاں اتارے جائیں گے۔ وہ مال گاڑی اس وقت ہارڈنگ لائن پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا رُخ ہلی سے درسنا یا پھر کھلنا تھا۔ اگر وہ مال بنگلہ دیش کے اندر کسی شہر میں اُتارا جاتا تو وہ سرکاری ہوتا اور اگر ہلی یا درسنا کی طرف لے جایا جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اسمگلنگ ہو رہا ہے۔ بہرحال چاول بازار میں پہنچے یا چور بازار میں۔ آخرکار چولھے تک پہنچتا ہے اور ان جیالوں کو تقدیر پتا نہیں کس چولھے میں جھونکنے والی تھی۔

○

خسرو کو یوں لگا جیسے وہ کسی بہت گہرے کھڈ میں گرتا جا رہا ہے۔ اس نے ایک دم سے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ جہاں لیٹا ہوا تھا وہیں تڑپ کر رہ گیا۔ دراصل دماغ کی گہرائی میں یہ بات اتر گئی تھی کہ کوئی آدمی کو قتل کر رہا ہے۔ گولی مار رہا ہے۔ دریا میں پھینک رہا ہے یا بلندی سے کھڈ میں لڑھکا رہا ہے۔ شکست خوردہ قوم کے لوگ اکثر ایسے ہی خواب دیکھتے ہیں ——— پھر چونک چونک کر بیدار ہوتے ہیں۔ بیدار ہوتے ہیں اور سہم سہم کر سوچتے رہ جاتے ہیں۔

خسرو سہم جانے والوں میں سے نہیں تھا۔ پھر بھی آنکھ کھلی تو ایک ذرا پریشان ہو کر دماغ نے پوچھا۔ میں کہاں ہوں۔ دوسرے لمحے اطمینان ہوا۔ وہ کسی گہرے کھڈ میں نہیں بلکہ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے اوپری برتھ پر لیٹا ہوا تھا۔ گاڑی تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ باہر زوردار بارش اور گرجتے ہوئے بادلوں کا شور سُنائی دے رہا تھا۔ اس کے دل میں بھی نین تارا کے نام سے شور اُٹھنے لگا۔

اس نے کروٹ بدل کر نیچے کی طرف دیکھا۔ وہ نیچے والی برتھ پر سو رہی تھی۔ شاید اس نے سونے سے پہلے اپنے منہ کو چادر سے ڈھانپ لیا ہو گا تاکہ نیند کے دوران پردہ رہے لیکن اب وہ چادر مُنہ پر سے ہٹ گئی تھی۔ کیسے ہٹ گئی تھی؟ کوئی ہٹانے والا نہیں تھا اور کوئی حیا والی نیند کی حالت میں بھی اپنے رُخ سے نقاب نہیں ہٹاتی۔ خود ہٹ جائے تو اپنے دل کو سمجھاتی ہے سو

اچھا ہوا کہ بات ہواؤں کے سر گئی
وہ رُخ تو خود کھُلا تھا جو زیرِ نقاب تھا

اچھا ہوا کہ وہ نیند کی ماتی نیند میں تھی۔ جی بھر کر دیکھنے کا موقع تھا۔ بعد میں حسرت نہ رہتی۔ وہ دیکھتا رہا۔ سفر کی دُشواریوں کو بھولتا رہا۔ ایک حسین، دلنواز ہمسفر ہو تو محبت بڑھتی جاتی ہے اور راستے سمٹتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے بازو کا سرہانہ بنائے سر جھکائے اسے دیکھ رہا تھا پھر ایسی آواز آنے لگی جیسے گاڑی پل پر سے گزر رہی ہو۔ اس نے سوچا، کوئی چھوٹا سا پل ہو گا لیکن وہ دیر تک اس پُل پر سے گزرتی رہی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہے اور وہ پاکسی کا دریا ہے۔

بیس منٹ کے بعد گاڑی ایشرڈی کے پلیٹ فارم پر رک گئی۔ ایشرڈی جنکشن پر کبھی مسافروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ دن رات چہل پہل رہتی تھی۔ کبھی کوئی گاڑی آ رہی ہے۔ کبھی کوئی گاڑی جا رہی ہے۔ تمام پلیٹ فارم پر ہاکروں، خوانچہ فروشوں، چائے اور بوتل والوں کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں اور اب وہی ایشرڈی جنکشن تھا کہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بارش تھم گئی تھی۔ پھر بھی جیسے لوگ وہاں بستے نہیں تھے۔ کبھی کبھی قدموں کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔

ذرا دیر بعد اچانک ہی کسی نے باہر سے دروازے کو پیٹنا شروع کیا۔ نین تارا ایک دم سے گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ خسرو نے کہا: میں اوپر موجود ہوں۔ تم فکر نہ کرو:

یہ کہتے ہی وہ اوپری برتھ سے کود کر نیچے آ گیا۔ وہ اپنی ساڑی درست کر رہی تھی۔ خسرو دروازے سے چپک کر باہر کی آوازیں سُننے لگا۔ بنگلہ دیش میں سبھی بنگلہ بھاشا بولتے تھے۔ کوئی اُردو بولنے والا نہیں رہا تھا۔ باہر کوئی کہہ رہا تھا: اس کمپارٹمنٹ میں مالدار اسامی ہے۔ دروازہ نہیں کھلے گا تو توڑ دو:

کسی کی آواز سُنائی دی: بھدرو، یہ دروازہ نہ تو کھلے گا نہ ہی توڑا جائے گا۔ اس میں تلسی رام جی کے رشتے دار ہیں:

"ہم کسی تلسی رام کو نہیں جانتے۔"

"نہیں جانتے ہو تو اب جان لو۔" کسی کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی فوجی بوٹوں کے بجنے کی آوازیں آنے لگیں جیسے سب اٹینشن ہو رہے ہوں۔ پھر وہی بھاری بھرکم آواز سنائی دی: "تم لوگوں کو ہزار بار سمجھایا جا چکا ہے۔ آپس میں جھگڑنا نہیں چاہیے۔ جب تم لوگوں نے دیکھ لیا کہ اس کمپارٹمنٹ کی حفاظت بی۔ ڈی۔ آر کے جوان کر رہے ہیں تو یہاں دروازہ توڑنے کیوں آئے ہو۔ جاؤ یہاں سے۔"

تین تارا ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ خسرو نے پاس آ کر کہا: "ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری حفاظت کے لیے بنگلہ فوجی موجود ہیں۔"

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ پھر تلسی رام کی آواز آئی: "خسرو! دروازہ کھولو۔ میں آیا ہوں۔ کچھ کھانے کے لیے لایا ہوں۔"

خسرو نے دروازے کے پاس آ کر اسے کھول دیا۔ تلسی رام نیچے کھڑا ہوا تھا۔ ریلوے کینٹین کا ایک ملازم ایک بڑی سی ٹرے میں کھانا، پانی کا جگ اور گلاس وغیرہ لے کر آیا تھا۔ خسرو نے اس سے ٹرے لے لی۔ اسے لا کر برتھ پر رکھا۔ پھر دروازہ بند کرنے کے لیے پلٹ کر اُدھر گیا تو دور تک نظریں دوڑائیں۔ ذرا دور مکتی باہنی کے چار جوان کھڑے ہوئے اسی کمپارٹمنٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ خسرو سے آنکھیں ملیں تو وہ غصے سے گھورنے لگے۔

تلسی رام نے خسرو کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے مکتی باہنی کے جوانوں کو دیکھا۔ پھر پلٹ کر کہا: "تم فکر نہ کرو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمھارے ساتھ والے اگلے ڈبے میں دو سپاہیوں کے ساتھ سفر کر رہا ہوں اور اس پیچھے والے ڈبے میں بھی دو مسلح سپاہی ہیں۔ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

خسرو دروازہ بند کرنے لگا تو تلسی رام نے کہا: "اور ہاں جب گاڑی چل پڑے تو کھڑکیاں کھول لینا۔ تازہ ہوا ملتی رہے گی۔ جاؤ اب پیٹ بھر کر کھاؤ اور آرام کرو۔"

"چچا جی! کیا وقت ہوا ہے؟"

"ایک بج کر پچیس منٹ ہوئے ہیں۔"

خسرو نے حیرانی سے پوچھا: "ہم صبح سے سفر کر رہے ہیں اور ابھی تک ایشوردی پہنچے ہیں۔ کیا گاڑی کہیں دیر تک رک گئی تھی؟"

"کبھی کسی اسٹیشن پر رک جاتی ہے تو سگنل نہیں ملتا اور کبھی سگنل ملتا ہے تو راستے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ چلو کوئی بات نہیں۔ رینگتے رینگتے ہی سہی۔ اندھیرا ہونے سے پہلے ہم ملی پہنچ جائیں گے۔"

خسرو نے دروازے کو بند کر دیا۔ دور کھڑے ہوئے مکتی باہنی کے جوان اسے دیکھ رہے تھے۔ دروازہ بند ہونے کے بعد ایک نے کہا: "یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ اس کمپارٹمنٹ میں تلسی رام کے رشتے دار ہیں۔ اگر رشتے دار ہیں تو اس رشتے دار کا نام خسرو کیسے ہے۔ خسرو تو مسلمان کا نام ہوتا ہے اور یہ بڑی توند والا مارواڑی ہے۔"

ایک نے کہا: "منٹو دادا! کیا آپ نے دیکھا تھا کمپارٹمنٹ میں ایک عورت چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔ ضرور بہاری عورت ہے اور خسرو بھی بہاری ہے۔ مالدار ہے۔ یقیناً اپنے ساتھ بھاری رقم لے کر جا رہا ہے۔"

دوسرے ساتھی نے کہا: "ہاں، منٹو دادا! میں نے دیکھا ہے۔ اس نیچے والی برتھ پر ایک چھوٹی سی اٹیچی رکھی ہوئی تھی۔ اسی میں مال ہو گا۔"

منٹو دادا نے تائید میں سر ہلا کر کہا: "اگر یہ دونوں بہاری ہیں اور اپنے ساتھ مال لے کر جا رہے ہیں تو یقیناً سید پور جا رہے ہیں۔ اُتر بنگال میں سید پور کے علاوہ ان بہاریوں کو کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔"

"تو پھر کیا ارادہ ہے؟"

منٹو دادا نے اپنی اسٹین گن سنبھالی۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا اس فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں آیا جس میں بنگلہ دیش رائفلز کے مسلح جوان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں ان کا افسر بھی تھا۔ وہ اپنے جوانوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ منٹو دادا کو دیکھ کر رک گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کمپارٹمنٹ کے اندر آتے ہوئے بولا: "سر! ہم آپ کو اپنا بڑا مان کر آپ کی عزت کرتے ہیں۔ آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں لیکن ہمیں اپنے ایک سوال کا جواب چاہیے۔"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ ہم نے یہ دیش کس لیے آزاد کرایا؟ کیا ہم پاکستانیوں کو استحصال کرنے والا نہیں کہتے تھے۔ ہم ان کے خلاف آوازیں اٹھاتے تھے کہ وہ بنگالیوں کو لوٹ رہے ہیں۔"

افسر نے تائید میں سر ہلا کر کہا: "بے شک۔ یہ درست تھا اور انھیں استحصال کی سزا مل چکی ہے۔"

"آپ نے انھیں سزا دی لیکن ان کی جگہ ہندو مارواڑیوں اور فوجیوں کو ہم پر مسلط کر دیا۔ یہ جب چاہتے ہیں، یہاں کا مال اِدھر سے اُدھر پہنچا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ جن بہاریوں نے ہماری بہو بیٹیوں کی عزتیں لوٹیں، ہمارے بنگالی بھائیوں کو ہلاک کیا۔ یہ ہندو مارواڑی انھیں کبھی سرحد پار لے جا کر حفاظت سے چھوڑ دیتے ہیں، کبھی انھیں سید پور یا ڈھاکہ کے محمد پور اور میرپور میں پہنچا دیتے ہیں۔ ہم تو جیسے

پہلے تھے ویسے ہی اب ہیں۔ پہلے بھی استحصال ہوتا تھا، اب بھی ہو رہا ہے۔ کیا فرق پڑ گیا آزادی سے؟"

افسر نے کہا: "تم مکتی باہنی کے جوانوں کو صرف لڑنا اور ہتھیار کو استعمال کرنا سکھایا گیا ہے۔ تم لوگ سیاست کو نہیں سمجھتے۔ جب پاکستان بنا تو ہمارے پوربو بنگال کی حیثیت کلکتہ کی بندرگاہ کے بغیر ایسی ہی تھی جیسے روح کے بغیر جسم ہوتا ہے۔ تقسیم بنگال کے بعد جب حکومت پاکستان نے بھارتی حکومت سے کلکتہ کی بندرگاہ کو چند ماہ کے لیے عارضی طور پر استعمال کرنے کی اجازت طلب کی تو سردار پٹیل نے جواب دیا۔ چند ماہ تو کیا چند دنوں کے لیے بھی کلکتہ کی بندرگاہ نہیں دی جائے گی اور آج دیکھ لو، ہم نے بنگلہ دیش بناتے ہی کلکتہ کی بندرگاہ اپنے تجارتی مقاصد کے لیے حاصل کر لی ہے۔ انھیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

منٹو دادا نے طنزیہ انداز میں کہا: "جی ہاں، یہاں سے کلکتہ تک راستہ صاف ہے مگر ہمارے لیے نہیں بلکہ ہندو تاجروں اور اسمگلروں کے لیے۔"

افسر نے ڈانٹ کر کہا: "بکواس مت کرو۔"

"سر! آپ اپنے عہدے کے بل پر ہمیں خاموش رہنے پر مجبور کر سکتے ہیں لیکن ہم وہی بنگالی ہیں، جنھوں نے پاکستان آرمی کے سامنے بھی اپنی زبان بند نہیں کی۔ آپ تو پھر بھی ہمارے دیش کے ہیں۔ آپ صاف صاف سن لیجیے۔ ہم مکتی باہنی کے جوانوں کو آپ لوگوں نے شہروں میں پھیلا دیا تاکہ ہم گنے چنے بہاریوں کو لوٹیں اور انھیں مارتے رہیں، اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہیں اور ادھر آپ لوگ سرحدی علاقوں میں ہندو اسمگلروں کے ذریعے دولت کماتے رہیں۔ کیا یہ ہندو تلسی رام جن بہاریوں کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ ان کے پاس ابھی خاصی رقم نہیں ہے۔ کیا یہ ہندو بنیا کوئی سامان یہاں سے وہاں اسمگل نہیں کر رہا ہے اور اس کے پیچھے آپ خود کتنی دولت سمیٹ رہے ہیں۔ یہ ہم جانتے ہیں۔ ہم نادان نہیں ہیں۔"

افسر کا ہاتھ اپنے ہولسٹر پر گیا جیسے ریوالور نکال کر ابھی منٹو دادا کو شوٹ کر دے گا۔ وہ غصے سے اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ پھر وہ اچانک ہی نرم پڑ گیا۔ اس نے آہستگی سے کہا: "بیٹھو، اطمینان سے باتیں کرو۔"

وہ بیٹھ گیا۔ افسر اس کے سامنے والی برتھ پر بیٹھتے ہوئے بولا: "حکومت کرنے والوں کی الگ الگ سرحدیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح کاروبار کرنے والوں کی اپنی الگ خاص منڈیاں ہوا کرتی ہیں اور اسی کو منفی انداز میں کہا جائے تو جرائم پیشہ لوگوں کے بھی علاقے الگ الگ ہوتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ مکتی باہنی کے جوان دلیر ہیں۔ اور بنگلہ دیش بنانے میں انھوں نے بہت اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کے باوجود فوجی اعتبار سے مکتی باہنی طفلِ مکتب ہیں۔ ابھی نوآموز ہیں۔ اسی لیے ہم نے تم لوگوں کو بنگلہ دیش کا اندرونی علاقہ دیا ہے تاکہ شہروں میں رہو اور خاص خاص بندرگاہوں اور دریائی راستوں پر ڈیوٹی دیتے رہو۔ تمھاری ڈیوٹی کے دوران ہم نے کبھی حساب طلب نہیں کیا کہ تم کس سے کتنا لوٹتے ہو۔ کتنی دولت سمیٹ رہے ہو لیکن آج تم لالچ میں اندھے ہو کر ہمارے معاملات میں مداخلت کرنے آئے ہو۔ ہم سرحدوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ سرحدوں پر فی الحال انڈین آرمی بھی ہے۔ ہندو بنیے بھی ہیں، اسمگلر اور بہت سے جرائم پیشہ لوگ بھی ہیں۔ ہم ان سے نمٹ رہے ہیں۔ بیشک ان لوگوں سے ہمارا کچھ لین دین ہے لیکن ہم اپنے دیش کو ان کے ہاتھوں نہیں بیچ رہے ہیں۔"

منٹو دادا نے کہا: "آپ میں اور ہم میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ ہم بنگلہ دیش کے دشمن بہاریوں سے کچھ چھین کر حاصل کرتے ہیں لیکن آپ سرحدوں پر انڈین آرمی، ہندو تاجروں اور اسمگلروں کے لیے راستے ہموار کر رہے ہیں۔ ان راستوں سے بنگلہ دیش میں ہندو سامراجی قوتیں پھل پھول رہی ہیں۔"

افسر نے کہا: "یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ ہم انڈین گورنمنٹ کو بھی اپنے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دیں گے لیکن یہ اتنی جلدی نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ذرا وقت لگے گا۔ ابھی انھوں نے ہم پر احسان کیا ہے۔ ہم ان کا احسان مان رہے ہیں۔ بہرحال بات سیاست کی نہیں ہے۔ یہاں تم لالچ کے تحت تقریر کرنے بیٹھے ہو۔ کوئی سیاسی لیڈر تقریر کے دوران یہ نہیں کہتا کہ اسے اقتدار کا لالچ ہے۔ وہ صرف ملک اور قوم کی باتیں کرتا ہے۔ اسی طرح تم آئے ہو کسی اور مقصد سے لیکن بحث یوں کر رہے ہو جیسے بنگلہ دیش کا سارا درد تمھارے ہی جگر میں ہے۔

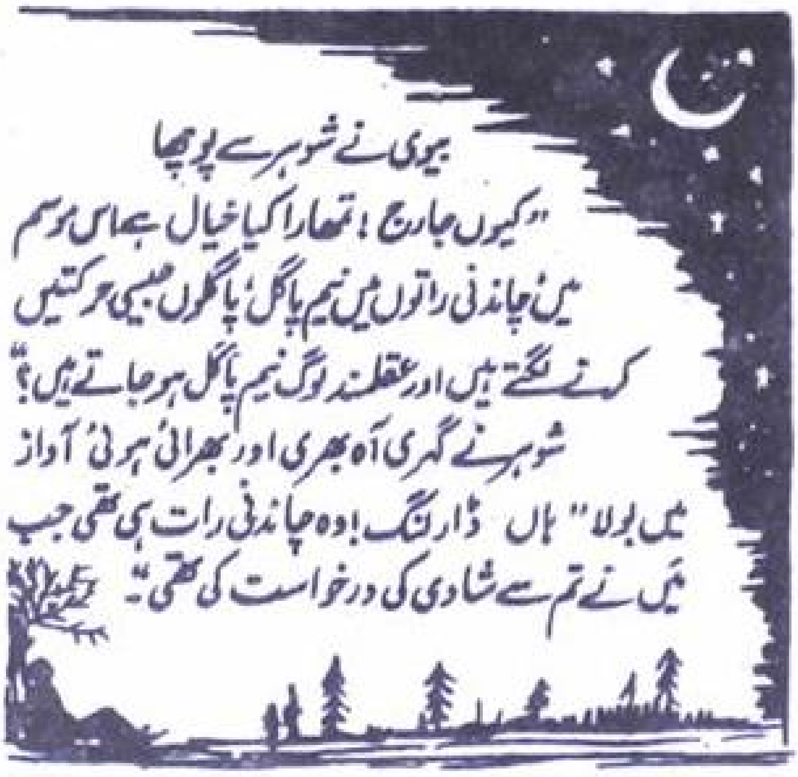

بیوی نے شوہر سے پوچھا

"کیوں جارج! تمھارا کیا خیال ہے اس موسم میں چاندنی راتوں میں نیم پاگل، پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگتے ہیں اور عقلمند لوگ نیم پاگل ہو جاتے ہیں؟"

شوہر نے گہری آہ بھری اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "ہاں ڈارلنگ! وہ چاندنی رات ہی تھی جب میں نے تم سے شادی کی درخواست کی تھی۔"

کام کی بات کرو۔ کیا چاہتے ہو؟"

"ہم بہاری کے ایک بچے کو بھی زندہ چھوڑنا نہیں چاہتے اور فرسٹ کلاس کے اس کمپارٹمنٹ میں تلسی رام کے رشتے دار نہیں بلکہ بہاری ہیں۔"

"وہ بہاری نہیں بنگالی ہیں۔ اس کا نام خسرو زماں ہے۔ خالص پور میں اس کی الیکٹریکل گڈز کی دکان تھی۔ تلسی رام کے گھر والوں سے خسرو کے گہرے مراسم ہیں۔ وہ تلسی رام کی دھرم پتنی سے ملنے سید پور جا رہا ہے۔"

منٹو دادا نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا: "آپ مجھے نادان سمجھ رہے ہیں۔ اگر خسرو بنگالی ہے تو اس کے لیے اتنا سخت پہرہ کیوں ہے۔ اس کے کمپارٹمنٹ کے آگے والے کمپارٹمنٹ میں بی ڈی آر کے دو مسلح جوان ہیں اور پیچھے والے کمپارٹمنٹ میں بھی دو مسلح جوان اس کی حفاظت کے لیے موجود ہیں۔ کیوں؟ تاکہ آگے پیچھے کہیں سے ان پر کوئی حملہ نہ کر سکے۔ آخر ان کے لیے کون سا خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے؟"

آفیسر غصے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر تحکمانہ انداز میں بولا۔ "اسٹینڈ اَپ اینڈ اٹینشن۔"

اس کا حکم سنتے ہی منٹو دادا اور اس کے ساتھی ایک دم سے اٹینشن ہو گئے۔ آفیسر نے پوچھا: "تم لوگ بنگلہ دیش اور بنگلہ دیش کی آرمی کے تابع فرمان ہو؟"

اس نے بدستور اٹینشن رہ کر کہا: "یس سر! وی آر لوئیل ٹو اَور بنگلہ دیش اینڈ اوبی ڈینٹ ٹو بنگلہ دیش آرمی (جی ہاں جناب، ہم بنگلہ دیش کے وفادار ہیں اور بنگلہ دیش آرمی کے تابع فرمان ہیں)"

آفیسر نے کہا: "تمہارے پاس بھارت کے ہتھیار ہیں لیکن یہ ہتھیار ہمارا اعتماد بحال رکھنے کے لیے تمہیں دیے گئے ہیں۔"

"یس سر! ہم نے اب تک آپ کا اعتماد بحال رکھا ہے اور آئندہ بھی رکھیں گے۔"

"تم سب شناختی کارڈ کے بغیر کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ جب تک ہم وہ کارڈ جاری نہ کریں نہ کوئی تمہیں مکتی باہنی کا سپاہی کہے گا اور نہ ہی تمہیں ہتھیار رکھنے کی اجازت دی جائے گی۔"

"یس سر! یہ سب باتیں ہم جانتے ہیں۔"

"جانتے ہو پھر بھی اپنے دیش کے فوجی افسر سے بحث کرنے آئے ہو۔ ابھی میں چاہوں تو تمہارے شناختی کارڈ واپس لے سکتا ہوں۔ یہ ہتھیار اُتروا سکتا ہوں۔ پھر تم لوگوں کی حیثیت کیا رہ جائے گی؟ محض بنگلہ دیش کے عام باشندے کہلاؤ گے۔ تمہارا کہیں رعب اور دبدبہ نہیں رہے گا۔ یہ جو اتنی شان سے سینہ تان کر چلتے ہو تو میرے ایک مخالفانہ حکم کے بعد تمہاری گردنیں جھک جائیں گی۔ بولو کیا چاہتے ہو؟"

منٹو دادا اور اس کے ساتھیوں نے سر جھکا لیے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر بی ڈی آر کا وہ آفیسر کسی ہندو بنیے یا پھر اسمگلروں کا ساتھ دے رہا تھا تو اس کے خلاف سیاسی میدان میں آواز اٹھائی جا سکتی تھی اور اس کے خلاف ایک لفظ بھی بولنے سے پہلے اپنا ہتھیار رکھ دینا پڑتا۔ اپنا شناختی کارڈ واپس کرنا پڑتا۔ ہتھیاروں سمیت بغاوت کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پیچھے انڈین آرمی تھی۔ جو اُن سے ہتھیار چھین سکتی تھی یا اپنے ہتھیاروں سے انھیں خاک میں ملا سکتی تھی۔

آفیسر نے ان کی بے بسی پر مسکرا کر کہا: "اس بار میں معاف کرتا ہوں۔ آئندہ یاد رکھنا۔ جوش میں آنے سے آدمی ہوش کی باتیں بھول جاتا ہے۔ اب جاؤ یہاں سے۔" پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "جے بانگلہ۔"

منٹو دادا اور اس کے ساتھیوں نے فوجی انداز میں ایڑیاں بجا کر کہا: "جے بانگلہ۔" پھر وہ اباؤٹ ٹرن ہو کر یکے بعد دیگرے اس کمپارٹمنٹ سے باہر نکل گئے۔ منٹو دادا اسٹین گن کاندھے سے لٹکائے سینہ تان کر پلیٹ فارم پر چلتا ہوا اس کمپارٹمنٹ سے دُور ہونے لگا۔ اس کے ساتھی پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ وہ سب انجن کے قریب جا کر رُک گئے۔ منٹو دادا سوچنے کے انداز میں دُور خلا میں تک رہا تھا۔ ایک ساتھی نے پوچھا: "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ ہمیں اپنی توہین کا احساس ہو رہا ہے۔"

منٹو دادا نے ناگواری سے کہا: "احساس ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ بعض حالات میں صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ اتنا تو ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ وہ خسرو کو سید پور پہنچا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک عورت ہے اور ایک اٹیچی ہے اور سید پور یہاں سے بہت دور ہے۔ گاڑیاں کسی کسی اسٹیشن پر گھنٹوں رُک جاتی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ گاڑی شاید آدھی رات کو سید پور پہنچے گی۔"

وہ ٹہلنے اور سوچنے کے انداز میں اس بورڈ کی طرف گیا جس پر اُردو، بنگلہ اور انگریزی زبان میں ایشرڈی لکھا ہوا تھا۔ جس جگہ اُردو زبان میں لکھا گیا تھا اس جگہ گوبر کے اُپلے تھاپ دیے گئے تھے۔ منٹو دادا نے وہاں سے پلٹ کر کہا: "ہم بنگلہ دیش کے وفادار ہیں اور اپنی فوج کے تابع فرمان ہیں۔ ہمارے آفیسر نے جو کچھ کہا ہے۔ ہم اس پر عمل کریں گے اور اس کی مرضی کے خلاف ان بہاریوں کو نہیں چھیڑیں گے لیکن۔۔۔"

وہ کہتے کہتے ذرا رُک گیا۔ پھر اس نے کہا: "لیکن یہاں سب لالچ کے بندے ہیں۔ یہ آفیسر یقیناً وہیں تک جائے گا جہاں تک اس کی اندھی کمائی ہوگی اور ایسے افسروں کی اندھی کمائی ہلی بارڈر

تک ہوتی ہے۔ اس کے بعد گاڑی آگے نکلے گی تو.....“

وہ کہتے کہتے پھر رک گیا۔ پھر اس نے کہا: ”تم پہلے اپنے باقی ساتھیوں کو کمپارٹمنٹ میں جمع کرو۔ ہم وہاں بیٹھ کر پلاننگ کریں گے۔

وہ عورت اور وہ ایجنسی ہماری ہے اور ہماری رہے گی۔“

انجن کے پیچھے والی بوگی میں انھوں نے اپنے لیے ایک کمپارٹمنٹ مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ سب اُدھر جانے لگے۔ پلیٹ فارم پر گھنٹی بج رہی تھی۔ انجن سیٹی بجا رہا تھا۔ گاڑی چلنے ہی والی تھی۔ آگے بہت لمبا سفر تھا لیکن سفر کے اختتام سے پہلے وہ گاڑی موت کے کسی اسٹیشن پر رکنے والی تھی یا روکی جانے والی تھی۔

نیلم تارا نے پچھلے دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ والدین کی موت کے بعد بھوک اُڑ گئی تھی۔ خسرو نے اسے سمجھا منا کر کھلا دیا۔ زندہ رہنا ہو تو کھانے پینے سونے اور جاگنے کی ضرورتوں کے آگے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ کھانے کے بعد ریلوے کینٹین کا بیرا آیا تھا۔ کھانے کے برتن لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد ہی گاڑی چل پڑی۔ جب اس کی رفتار تیز ہونے لگی تو خسرو نے کہا: ”میں کھڑکیاں کھول دیتا ہوں۔“

وہ سہم کر بولی: ”نہیں، مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”اب کس بات کا ڈر ہے۔ گاڑی تیز رفتاری سے چل رہی ہے۔ کوئی اندر نہیں آسکتا۔ پھر آگے پیچھے کے ڈبوں میں ہمارے محافظ موجود ہیں۔“

”یہ محافظ آخر کہاں تک ساتھ دیں گے؟“

”سید پور تک۔“

”اس کے بعد؟“

اس نے ہنستے ہوئے کہا: ”تم اس کے بعد کا پوچھ رہی ہو۔ یہاں تو ایک پل کے بعد کیا ہونے والا ہے، اس کی خبر نہیں ہے۔“

”یہی میں کہنا چاہتی ہوں۔ سامان سو برس کا ہوتا ہے اور پل کی خبر نہیں ہوتی۔ یہ محافظ بھلا کب تک ساتھ دیں گے۔ کہیں باہر سے ایک گولی سنسناتی ہوئی آئے گی اور میں اس کے آگے سوچتی ہوں تو کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ خدا نہ کرے تمھیں کچھ ہو جائے تو میرا کیا ہوگا۔ تم میرے سائبان ہو۔ میری چار دیواری ہو۔ میری شرم ہو اور میرا لباس ہو۔ سپاہی ہتھیار ڈال دیں تو وطن پرایا ہو جاتا ہے۔ مرد ہتھیار ڈال دے تو عورت پرائی ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے پرائے ہاتھوں میں نہیں جانے دو گے۔ آخری سانسوں تک میری حفاظت کرتے رہو گے۔ مجھے صرف تم پر بھروسہ ہے۔ میں تمھاری سلامتی چاہتی ہوں۔ اس لیے کھڑکی نہ کھولو۔“

خسرو برتھ کے ایک سرے پر بیٹھ گیا۔ دوسرے سرے پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ درمیان میں کافی فاصلہ تھا۔ کافی جگہ تھی۔ اس سے زیادہ دل میں جگہ تھی لیکن دل میں خسرو کے نام کا ریزرویشن تھا۔

ابھی تو وہ سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی چور نظروں سے درمیانی خلا کو حسرت سے دیکھتا تھا۔ اُدھر وہ بھی کن انکھیوں سے خالی جگہ کو دیکھتی تھی لیکن پیار بھرے اندیشوں سے دیکھتی تھی کہ وہ کہیں اِدھر نہ چلا آئے۔ وہ آئے گا تو ناراض ہو جائے گی۔ نہیں آئے گا تو بے چینی بڑھ جائے گی۔ عجیب مشکل تھی۔

وہ دونوں اسی طرح اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ ایک اسٹیشن گزر گیا۔ پھر دوسرا اسٹیشن بھی گزرنے لگا۔ خسرو نے دھیرے سے ہنستے ہوئے کہا: ”ہم بھی عجیب ہیں۔ چپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ کچھ بولنا چاہیے۔“

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ دوسرے اسٹیشن پر گاڑی رک گئی تھی۔ خسرو نے بات بدلتے ہوئے کہا: ”یہ تو میں پوچھنا ہی بھول گیا، تم بنگلہ کس حد تک جانتی ہو۔ کیا بول سکتی ہو؟“

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔

”کیا پڑھ سکتی ہو؟ لکھ سکتی ہو؟“

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ زبان سے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ خسرو نے بنگالی زبان میں کہا: ”گاڑی ای اسٹیشن پر رکی ہوئی ہے۔ ہمیں ایسے وقت بنگلہ ہی بولنا چاہیے ... تاکہ کوئی دشمن کمپارٹمنٹ کے قریب سے گزرتا ہو اور کان لگا کر سننا چاہتا ہو تو اسے بنگلہ سنائی دے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟“

اس نے تائید میں سر ہلایا۔ وہ مسکرا کر بولا: ”بھئی سر ہلانے سے کام نہیں چلے گا۔ میں تمھاری زبان سے بنگلہ بھاشا سننا چاہتا ہوں۔ کچھ تو بولو۔“

وہ آہستگی سے بولی: ”آمی ایٹی بھاشا بُجھتے پاری۔ ٹھیک کورے بولتے پاری نا۔ (میں یہ زبان سمجھ لیتی ہوں لیکن اچھی طرح بول نہیں سکتی)۔“

خسرو نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا: ”تم تو فرسٹ کلاس بول رہی ہو۔ ذرا سی کسر ہے۔ میرے ساتھ بولتی رہو گی تو جلد ہی ثابت کر دو گی کہ عورت ہر زبان میں بے تحاشا بول سکتی ہے۔“

نیلم تارا کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گئی۔ اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کا غم بھاری تھا۔ یہ غم ہلکے سے آنے والی چند مسکراہٹوں پر بھی جھاڑو پھیر دیتا تھا۔ اس نے کہا: ”نیلم تارا! جذبہ غم کا ہو یا خوشی کا، بے اختیار ہوتا ہے۔ جب تم بے اختیار رو سکتی ہو تو بے اختیار مسکرانا بھی چاہیے۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے دن رات روتے روتے زندگی گزار دی ہو۔ بار بار ماتم کرنے والے بھی انسانی فرائض کو سمجھتے ہیں۔ اگر وہ سینہ

پیٹ کر اپنوں کے لیے روتے ہیں تو دوسروں کی خاطر مسکرا لیتے بھی ہیں۔“

کبھی کبھی سمجھانے کا اُلٹا اثر ہوتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ ماں باپ بُری طرح یاد آ رہے تھے۔ مسکراہٹ جو ایک ساعت کے لیے اس کے ہونٹوں پہ آئی تھی اب اس کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ یوں بھی خوشی کمزور ہوتی ہے کیونکہ تانیث ہوتی ہے اور غم تذکیر کی صورت اس پر غالب آجاتا ہے۔

وہ پانچ بجے ہلی پہنچ گئے۔ کمپارٹمنٹ کی کھڑکیاں اور دروازے اسی طرح بند تھے۔ تلسی رام نے آ کر دستک دی: ”خسرو! دروازہ کھولو۔ میں تمھارا بھائی ہوں۔“

اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہلی اسٹیشن ہمیشہ کی طرح ویران ہوگا۔ اس لیے کہ وہ سرحدی اسٹیشن تھا۔ وہاں آبادی تو برائے نام ہوا کرتی تھی۔ امن کے زمانے میں وہاں پاکستانی یا ہندوستانی فوج کے سپاہی کبھی کبھی نظر آتے تھے۔ وہاں سے ذرا دور غیر آباد علاقے میں سرحدی جھڑپیں کبھی کبھی ہوتی رہتی تھیں لیکن ہلی اسٹیشن کے آس پاس کبھی فائرنگ کا تبادلہ نہیں ہوا۔ اس کے باوجود سرحدی اسٹیشن محفوظ نہیں سمجھا جاتا۔ کوئی نادان بھی پانی پت کے میدان میں اپنا گھر بنانا پسند نہیں کرے گا۔ اس لیے وہ اسٹیشن تقریباً ویران رہا کرتا تھا۔

لیکن خسرو نے دروازہ کھول کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہاں ایسی چہل پہل تھی جیسے میلہ لگا ہو۔ میلہ عورتوں اور بچوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ان دنوں لوٹ مار اور خون خرابے کے سلسلے میں ایسی وحشت پھیلی ہوئی تھی کہ عورتیں اور بچے گھروں سے نکلتے ہوئے ڈرتے تھے، لیکن وہاں عورتیں بھی نظر آ رہی تھیں اور بچے بھی تھے۔ زیادہ تر ہندو عورتیں تھیں۔ کہیں کہیں بنگالی عورتیں بھی نظر آجاتی تھیں۔ مردوں میں مسلمان بنگالی کم تھے۔ ہندو بنگالی اپنے دھوتی کے پہناوے سے یا گفتگو سے پہچانے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ ہندو تاجروں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ کیونکہ اس لائن سے شمال کی طرف سلی گوڑی، جلپائی گوڑی اور دارجلنگ تک جانے کا راستہ نہایت آسان اور مختصر تھا۔ ہندو تاجر دوسرے کاروباریوں سے ملنے اور اس بات کا جائزہ لینے کے لیے وہاں آتے تھے کہ بنگلہ دیش میں ان کے کس مال کی کھپت زیادہ ہو سکتی ہے۔ اگرچہ ابھی کاروبار کے لیے حالات سازگار نہیں تھے لیکن مستقبل میں بڑے ہی روشن امکانات تھے۔

تلسی رام نے کہا: ”آؤ، پلیٹ فارم پر اُتر آؤ۔ یہاں کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یوں سمجھو کہ اب بنگلہ دیش میں نہیں، ہندوستان میں ہو۔ یہاں ہمارا راج ہے۔“

خسرو نے پلٹ کر نین تارا سے کہا: ”آؤ، ہم ذرا کھلی فضا میں سانس لیں۔“

”میں باہر [illegible] جاؤں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے اور میں تمھیں بھی نہیں جانے دوں گی۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو۔ جیجا جی اپنے کام سے مجھے یہاں لائے ہیں۔ ابھی ان کے ساتھ جانا ضروری ہے۔ میں تمھیں یہاں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟“

نین تارا نے سر جھکا کر چند لمحوں تک سوچا۔ پھر اٹیچی کی طرف دیکھا۔ خسرو نے کہا: ”اسے یہیں رہنے دو۔ دروازہ بند رہے گا۔ کوئی مسافر اس کمپارٹمنٹ میں نہیں آئے گا۔“

وہ بولی: ”اس اٹیچی میں میری ماں اور ابو کی کچھ تصویریں ہیں۔ ان کی کچھ یادیں ہیں۔ میں اسے ساتھ لے کر چلوں گی۔“

خسرو نے اٹیچی اٹھالی۔ نین تارا اس کے پیچھے چلتے ہوئے باہر پلیٹ فارم پر آ گئی۔ پلیٹ فارم کے پیچھے دور تک بازار لگا ہوا تھا۔ غریب بنگالی مسلمان بنگلہ دیش کے مشہور پھل انناس اور کٹھل وغیرہ فروخت کرنے لاتے تھے۔ اگرچہ مغربی بنگال میں مچھلیاں کثرت سے پائی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود مسلمان ماہی گیر دریائی مچھلی اور جھینگے سستے داموں بیچنے کے لیے لاتے تھے۔ ہندوستانی خریداروں کو تانت کی لنگیاں اور نرسنگھ ڈی کی ساڑیاں بھی سستے داموں مل جاتی تھیں۔ گویا کہ وہاں ایک سرحدی باڑہ مارکیٹ بن گئی تھی۔

صرف اتنا ہی نہیں، اسٹیٹ ایجنسی کے طور پر کئی دفاتر قائم ہو گئے تھے۔ بنگلہ دیش سے متعلق ہندوستانی تاجروں اور دوسرے ضرورت مندوں کو معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔ دیناج پور، رنگ پور، لال منیر ہاٹ، ستاہار، ایشوڈی اور بنگلہ دیش کے دوسرے شہروں سے بہاری بھاگ کر سید پور یا ڈھاکہ کی طرف گئے تھے یا سرحد پار چلے گئے تھے۔ ان تمام شہروں میں بہاریوں کے بے شمار مکانات خالی پڑے ہوئے تھے۔ وہاں اسٹیٹ ایجنسی میں ہندوستانی ضرورت مندوں کو ہر مکان کا محلِ وقوع اور دوسری تفصیلات بتائی جاتی تھیں اور یقین دلایا جاتا تھا کہ معمولی سی رقم کے عوض وہ مکان ان کے حوالے کیے جا سکتے ہیں اور ایسے بہت سے جعلی بنگالی تھے جو بنگلہ دیش میں اپنا کاروبار جمانے، وہاں کی زمینیں خریدنے یا آمدنی کے دوسرے ذرائع پیدا کرنے کے لیے یہاں رہائش اختیار کرنا چاہتے تھے اور انھیں اپنی مرضی کے مطابق نہایت سستے مکانات مل رہے تھے۔

نین تارا اور خسرو تلسی رام کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ منٹو دادا اور اس کے ساتھی دُور کھڑے انھیں دیکھ رہے تھے لیکن انھوں نے ان کا تعاقب نہیں کیا۔ وہ بی ڈی آر کے آفیسر اور دوسرے مسلح سپاہیوں کو دیکھ رہے تھے۔ بی ڈی آر کا آفیسر ایک انڈین آرمی کے افسر سے مصافحہ کرتے ہوئے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

ایک ساتھی نے آہستگی سے پوچھا: "منٹو دادا! آپ نے اس لڑکی کو دیکھا ہے؟"

"کون سی لڑکی؟"

"وہی جو خسرو کے ساتھ چادر میں لپٹی جا رہی تھی۔"

دوسرے نے کہا: "میں نے دیکھا ہے۔ غضب کا حسن ہے۔ آئی ایم شیور اور اُوپر سے بیوٹی شیش ہوئے گیچے۔ (میں یقین سے کہتا ہوں۔ اس پر حسن ختم ہو گیا ہے۔)"

منٹو دادا نے گمبھیر لہجے میں کہا: "اٹیچی کو دیکھو۔ لڑکی کو نہ دیکھو۔ دولت پاس ہو تو عورت قدم قدم پر مل جاتی ہے۔"

ایک نے کہا: "ہمیں دوسرے پہلو سے اس لڑکی کو دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔ اس نے ماتھے پر ٹیکہ اور مانگ میں سیندور لگایا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟"

منٹو دادا نے سوچتی ہوئی نظروں سے اپنے ساتھی کو دیکھ کر پوچھا: "کیا ہو سکتا ہے؟"

"یہی تو سمجھنے کی بات ہے۔ تلسی رام الیشر ڈی کے اسٹیشن پر کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ اس کے رشتے دار ہیں لیکن بعد میں خسرو مسلمان ثابت ہوا۔ اب جو لڑکی اس کے ساتھ ہے وہ ہندو نظر آتی ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ ہماری بنگالی عورتیں بھی ماتھے پر ٹیکہ اور مانگ میں سیندور لگاتی ہیں۔"

"اگر ہماری بنگالی عورتیں ایسا کرتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خسرو کے ساتھ ایک بنگالی عورت ہے۔ کیوں ہے؟ کس رشتے سے ہے؟ اور وہ ہماری کسی عورت کو اپنے ساتھ کیوں لے جا رہا ہے؟"

منٹو دادا نے غصے سے تیور بدل کر کہا: "اگر اس کے ساتھ بنگالی لڑکی ہوئی تو میں اسے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔"

"ہمیں ابھی جا کر پوچھنا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی کہیں گے کہ یہ بنگالی نہیں ہے، ہندو لڑکی ہے۔ پھر بھی یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہندو لڑکی ایک مسلمان لڑکے کے ساتھ تنہا کپارٹمنٹ میں کیسے سفر کر رہی ہے؟ کس رشتے سے سفر کر رہی ہے؟"

"ہم اپنے طور پر ٹیڑھے سوالات کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے پاس سیدھے اور کھرے جوابات ہوں۔ ادھر بی ڈی آر کے آفیسر نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اس کپارٹمنٹ کو خالی کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ لوگ یہاں سے آگے نہیں جائیں گے۔ خسرو آگے سفر کرے گا یا نہیں، یہ معلوم کرنا ہے۔ اگر وہ اس لڑکی اور اٹیچی کے ساتھ یہیں سے آگے جائے گا تو ہمارے لیے راستہ صاف ہے۔ لہٰذا خسرو کے متعلق معلوم کرو۔"

اس کے ساتھی جانے لگے۔ ان کا رُخ اسی طرف تھا جدھر نین تارا اور خسرو تلسی رام کے ساتھ گئے تھے۔ وہ تینوں اسٹیشن سے ذرا دور، مال گودام میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے آس پاس اور بہت سے لوگ تھے۔ وہ سب تلسی رام کے آدمی تھے۔ ان میں سے ایک وہی بی ڈی آر کا آفیسر تھا۔ وہاں جو کچھ ہو رہا تھا۔ انڈین آرمی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ہو رہا تھا۔ گودام کے آس پاس تلسی رام کے آدمی موجود تھے۔ اگر کوئی ہندوستانی آفیسر اُدھر آتا تو تلسی رام کو فوراً اطلاع دی جاتی۔

مال بابو نے اپنی ناک پر عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے سارا کام کر دیا ہے۔ آپ لوگ چنتا نہ کریں۔"

ایک آفیسر نے کہا: "ہمیں ہر طرف کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ہم یہی دیکھنا چاہتے تھے کہ یہاں سے ویگن کا مال جدھر جائے گا۔ وہاں ڈلیوری کس طرح لی جائے گی۔"

بوڑھے مال بابو نے ایک بڑا سا رجسٹر کھولتے ہوئے کہا۔ "دیکھیے تلسی رام جی کے نام سے یہاں دو ویگن جا رہے ہیں۔ ایک ویگن سید پور کے لیے بک ہوا ہے اور دوسرا جلپائی گوڑی کے لیے۔ ریلوے کھاتے کے مطابق جلپائی گوڑی جانے والے ویگن میں ڈیڑھ سو بوری آٹا، ڈیڑھ سو بوری چنا اور پچاس بوری ستو ہے۔ سید پور جانے والے ویگن میں تلسی رام جی کے گھر کے لیے فرنیچر ہے۔"

ایک آفیسر نے پوچھا: "فرنیچر زیادہ سے زیادہ کتنا ہو گا؟ کیا کسی کو شبہ نہیں ہو گا کہ اس کے لیے ایک ویگن بک کرایا گیا ہے؟"

تلسی رام نے مسکراتے ہوئے کہا: "آپ اطمینان رکھیں۔ سات کمروں کا فرنیچر ہے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ کتنا ہو سکتا ہے۔ بڑی مشکل سے اس ویگن میں سمایا ہے۔"

آفیسر نے مطمئن ہو کر مال بابو سے پوچھا: "لیکن راشن والا ویگن سید پور کیسے پہنچے گا؟"

اس نے جواب دیا: "مال کی بلٹی دو طرح کی بنائی گئی ہے۔ ایک بلٹی کے مطابق اناج جلپائی گوڑی جا رہا ہے۔ یہ دونوں ویگنوں کی بلٹیاں ٹرین کے گارڈ کو دے دی گئی ہیں۔ اب ہندوستانی جاسوس یا انڈین آرمی کا کوئی بھی آفیسر گارڈ کے پاس جا کر کاغذات کی چیکنگ کرے گا تو اسے یہی سمجھ میں آئے گا کہ ہندوستان کا اناج ہندوستان جلپائی گوڑی میں پہنچایا جا رہا ہے۔"

مال بابو نے ایک فائل سے چار عدد کاغذات نکال کر آفیسر کو دکھاتے ہوئے کہا: "اصل بلٹی یہ ہے۔ اس کے مطابق اناج سید پور پہنچے گا اور فرنیچر والا ویگن جلپائی گوڑی چلا جائے گا۔ ہر ویگن کے دروازے پر ایک ٹیگ سلپ لٹکی رہتی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ کس بلٹی نمبر کے مطابق وہ ویگن کہاں پہنچایا جانے والا ہے۔ ہلی بارڈر سے آگے جانے کے بعد جلپائی گوڑی کا ٹیگ

سلپ نکال کر سید پور والی ویگن میں لگا دی جائے گی اور سید پور والی ٹیگ سلپ نکال کر جلپائی گوڑی والی ویگن میں لگا دی جائے گی۔ ٹرین کا گارڈ ہمارا آدمی ہے۔ آگے جانے کے بعد اس کے پاس جو بلٹیاں ہیں وہ انھیں ضائع کر دے گا۔ ہمارے آدمی اسے یہ بلٹیاں دے دیں گے۔"

"کیا جلپائی گوڑی پہنچنے کے بعد کوئی نہیں پوچھے گا کہ اناج والا ویگن وہاں کیوں نہیں پہنچا؟"

"کوئی کیوں پوچھے گا؟ بلٹی کے مطابق جو مال ویگن میں آ رہا ہے وہی وصول کیا جائے گا۔"

تلسی رام نے کہا۔ "اور وصول کرنے والے میرے ہی آدمی ہیں۔" —

خسرو اپنا سر کھجاتے ہوئے سوچنے لگا۔ "واقعی جیجا جی درست کہہ رہے تھے۔ اسمگلروں کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ کوئی زمین نہیں ہوتی ہے۔ وہ تاج نہیں پہنتے۔ پھر بھی ہر ملک کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ ہر ملک میں ان کا بینک بیلنس ہوتا ہے۔ وہ کھل جا سم سم کا راز جانتے ہیں اس لیے ہر ملک کی سرحدیں ان کے لیے کھل جاتی ہیں۔"

اسمگلنگ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو جسمانی مشقت کے ذریعے دوسرے ذہنی چالبازی کے ذریعے۔ جسمانی مشقت کے ذریعے وہ اسمگلنگ ہوتی ہے جس کے دوران اسمگلر جان کی بازی لگاتے ہیں۔ بحری راستے سے یا خشکی کے راستے سے سرحدی پہرے داروں کی نظریں بچا کر یا ان سے مقابلہ کرتے ہوئے، فائرنگ کا تبادلہ کرتے ہوئے جان جوکھم میں ڈال کر اپنا مال ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہیں۔ دوسری اسمگلنگ وہ ہے جس میں جسمانی مشقت کرنے کی اور جان جوکھم میں ڈالنے کی قطعی ضرورت نہیں پڑتی۔ تلسی رام کی پلاننگ کے مطابق مال بڑی آسانی سے اسمگل ہو رہا تھا اور وہ بھی انڈین آرمی کے سامنے ہو رہا تھا۔ وہاں ہندوستانی جاسوس بھی ہوں گے لیکن کوئی تلسی رام اگروال کی چالوں کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔

وہ تمام معاملات کو آپس میں اچھی طرح سمجھنے کے بعد ایک ہوٹل کے سامنے پہنچے۔ وہاں ناشتہ کرنے اور چائے پینے کا ارادہ تھا لیکن مین تارا۔۔۔ مردوں کے درمیان بیٹھ کر کھانے کی عادی نہیں تھی۔ اس نے اعتراض کیا۔ تلسی رام نے کہا۔ "تم اور خسرو اپنے کمپارٹمنٹ میں جا کر بیٹھو۔ وہاں تم لوگوں کے لیے چائے کا سامان پہنچ جائے گا۔"

ان کے ساتھ دو مسلح سپاہیوں کی ڈیوٹی لگائی گئی۔ وہ اپنے کمپارٹمنٹ میں آ گئے۔ مین تارا نے پوچھا۔ "کیا ان اسمگلروں کا ساتھ دینا اچھی بات ہے؟"

خسرو نے جواب دیا۔ "اسمگلنگ ہم نہیں کر رہے ہیں۔ میرا کام سید پور پہنچنے کے بعد شروع ہوگا۔ وہ تمام مال فروخت کرنے اور اس کا حساب رکھنے کی ذمے داری مجھ پر ہے۔"

"پھر بھی وہ اسمگل کیا ہوا اناج ہوگا۔"

"تمھاری بات درست ہے لیکن دوسرے پہلو پر بھی غور کرو۔ ان دنوں سید پور کے بہاری اناج کے ایک ایک دانے کے لیے ترس رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے ستو اور چنے کھا کر گزارا کر رہے ہیں۔ کسی کو یہ بھی نصیب نہیں ہو رہا ہے۔ اگر یہ مال جائز یا ناجائز طریقے سے وہاں پہنچ جائے اور ہمارے ذریعے پہنچ جائے تو ہم لاکھوں اردو بولنے والوں کی جانیں بچا سکتے ہیں۔"

ہندوستان تقسیم ہوا تو ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی مملکت پاکستان وجود میں آ گئی لیکن ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہندوستان میں اردو سکڑتی گئی۔ اردو بولنے والے پاکستان میں سمٹ آئے۔ جو ہندوستان میں رہ گئے، انھوں نے حتی الامکان اس زبان کو زندہ رکھنے کی کوششیں کیں لیکن ہندی کو سرکاری اور عوامی اکثریت کی حمایت حاصل رہی۔ جس کے نتیجے میں آج ہندی کا بول بالا ہے اور اردو کے لکھنے پڑھنے والے دن بدن کم ہوتے جا رہے ہیں۔

یہی حال مشرقی پاکستان کا ہوا۔ اگرچہ یہاں اردو کو سرکاری حمایت حاصل تھی لیکن بنگلہ بھاشا بولنے والے کروڑوں کی تعداد میں تھے اور کروڑوں کا فیصلہ یہ تھا کہ اردو زبان کے ذریعے بنگلہ بھاشا کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ بنگالی قوم جب کسی سے نفرت کرتی ہے تو ابتدا میں اس کے احتجاج کا طریقہ دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہر قوم کے شریف آدمی طوائفوں سے نفرت کرتے ہیں ان سے نفرت کا اظہار مختلف انداز میں ہوتا ہے لیکن حکومت برطانیہ کے دور سے بنگال میں اور خصوصاً ڈھاکہ میں طوائفوں کو ننگے پاؤں رکھا جاتا ہے۔ انھیں اپنے گھر

"یہ الکحل اور صرف الکحل ہے جو تمھاری موجودہ خراب حالت کی ذمے دار ہے۔" ڈاکٹر نے مریض سے کہا۔

"بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب!" مریض نے جواب دیا۔ "آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے میری خراب حالت کی ذمے داری مجھ پر عائد نہیں کی ہے۔"

سے یا اپنے بازار سے جوتے، چپلیں یا سینڈلیں پہن کر باہر شاہراہوں پر یا عام پبلک میں آنے کی اجازت نہیں ملتی۔ عام گزرگاہوں میں، دیگر تفریحی مقامات میں یا مختلف تقریبات میں دور ہی سے شریف عورتوں اور طوائفوں کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے۔ طوائفوں کو بھرپور سنگھار کرنے، اچھے سے اچھا لباس پہننے کی اجازت ہے۔ بس ان کے ننگے پاؤں، ان کے پیشے کا منہ بولتا اشتہار بن جاتے ہیں۔

رقص کے فن میں مور کا رقص بہت مقبول ہے۔ مور اپنے سر سے خوشنما پروں تک بہت ہی خوب صورت نظر آتا ہے لیکن اس کے بھدے پاؤں یہ درس دیتے ہیں کہ وہ حسن پر غرور نہ کرے۔ بنگال کی لانبی زلفوں والی سانولی سلونی طوائفیں اپنے سر سے لباس کی حد تک نہایت خوب صورت اور پرکشش ہوتی ہیں لیکن ان کے ننگے پاؤں درس دیتے ہیں کہ وہ محض اپنی خوب صورتی پر ناز نہ کریں۔ ان کی کوئی سماجی حیثیت نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح بنگالی بھاشا کی حمایت میں شہید ہونے والے طلبہ طالبات اور سیاسی کارکنوں کی یاد میں جب بھی یوم احتجاج منایا جاتا ہے تو ڈھاکہ کے شہریوں کو وارننگ دی جاتی ہے۔ کوئی اپنے گھر سے جوتے چپلیں پہن کر باہر نہ نکلے۔ ان کی وارننگ کا اثر بہت کم ہوتا تھا۔ اس کے باوجود اچھی خاصی تعداد میں اس روز بنگالی ننگے پاؤں گھومتے تھے اور یہ ظاہر کرتے تھے کہ مشرقی پاکستان کے پاؤں ننگے ہیں۔ ہمارے بغیر تمہاری سیاسی حیثیت تو ہو سکتی ہے لیکن کوئی سماجی اہمیت نہیں ہو سکتی۔ یہ پاؤں ننگے ہیں۔ بھدے ہیں اور ایک دن مور ناچتے ناچتے اپنے پاؤں کی طرف سر جھکا لے گا۔

بہر حال ۱۹۴۷ء میں اردو ہندوستان سے نکلی اور ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش سے بھی نکل گئی۔ بنگلہ دیش میں اردو کو اپنی جان سے لگائے رکھنے والے اب بھی لاکھوں افراد موجود تھے لیکن ان کا مستقبل کیا ہوگا؟ وہ زندہ رہیں گے یا اپنی زبان کے ساتھ مر جائیں گے؟ اس کی پیشگوئی ابھی تک کسی بھی ماہر نجومی نے نہیں کی تھی۔ ویسے تاریخ کے اوراق بھی پیشگوئی کرتے ہیں بشرطیکہ ان اوراق کے آئینے میں کوئی مستقبل کو پڑھنا جانتا ہو۔

منٹو دادا اشٹین گن کو شانے سے لٹکائے سنتان کرشنا بھابانس کی چار دیواری میں پہنچا۔ وہ ایک چھوٹا سا دفتر تھا۔ ٹوٹی ہوئی سی میز اور پرانی کرسیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہاں دو چار ہندو تاجر بیٹھے ہوئے تھے۔ کتنی باتوں کے لوگ دور ہی سے اپنے حلیے کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں۔ دفتر کے ایک آدمی نے پوچھا۔

"ہیلو کیا بات ہے؟"

منٹو دادا نے کہا: "کچھ نہیں۔ میں ذرا دیکھنے آیا ہوں کہ یہاں کیا دھندا چل رہا ہے۔ بنگلہ دیش کی زمین ہماری ہے۔ یہاں کے مکانات ہمارے ہیں لیکن تم لوگ یہاں بیٹھ کر اسٹیٹ ایجنسی چلا رہے ہو۔ اچھی خاصی رقمیں لے کر ان زمینوں کو فروخت کر رہے ہو، جنھیں بہاری چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔"

ایک ہندو نے کہا: "بھئی ایسا تو ہوتا ہے۔ جب بھی دو ملکوں کے درمیان لڑائی ہوتی ہے اور ان ملکوں کے لوگ سرحد پار ادھر ادھر جاتے ہیں تو ان کی چھوڑی ہوئی زمین جائداد کا حشر یہی ہوتا ہے۔"

دوسرے ہندو نے کہا: "۱۹۴۷ء میں تمہارے بنگلہ دیش سے کتنے ہندو بنگالی اپنے مکانات اور اپنی زمینیں چھوڑ کر مغربی بنگال کی طرف چلے گئے تھے۔ ان کی جائداد بھی اسی طرح فروخت کی گئی تھی۔ لوگوں نے لاکھوں روپے کمائے۔ وہی مسلمان تاجر جنھوں نے ہندوؤں کی زمینیں خریدی تھیں آج وہ انھیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ آج ان کی زمینوں کا سودا ہم کر رہے ہیں۔ کیا برا کر رہے ہیں۔ وہی کر رہے ہیں جو تاریخ انسانوں سے کراتی آ رہی ہے۔"

منٹو دادا نے اشٹین گن کے دستے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا: "ہم بنگالی تاریخ کے دھارے کو موڑنا بھی جانتے ہیں۔ مغربی پاکستان نے جو استحصال کیا، وہی ہندوستانی بھی کریں گے تو ہم اس بات کی اجازت نہیں دیں گے۔

"ہم سے دوستی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم لوگ احسان جتاؤ اور احسان کے بدلے ہماری زمینیں خریدنا اور ان پر قابض ہونا شروع کر دو۔"

ایک ہندو نے کہا: "ذرا عقل سے سوچو۔ تمہارے ہاں کون سا ایسا بنگالی مسلمان ہے جو ملک گیر پیمانے پر تانت کا یا جوٹ کا کاروبار کرتا ہو۔ جوٹ سن کی تمام ملیں بند پڑی ہیں اور پتا نہیں کتنے برسوں تک بند پڑی رہیں گی۔ مشینوں کو زنگ لگ رہا ہے۔ ایسے میں اگر ہندو تاجروں نے سرمایہ نہ لگایا تو بنگلہ دیش ہمیشہ دوسروں کی طرح خام مال درآمد کرتا رہے گا۔ یہاں انڈسٹری قائم کرنے کے لیے اتنے سرمائے کی ضرورت ہے جتنا کسی بنگالی مسلمان کے پاس نہیں ہے۔ اب تم عقل سے سوچو اور عقل سے فیصلہ کرو۔ کیا اپنے دیش میں انڈسٹری قائم کرنا نہیں چاہتے؟ رہ گئی یہ بات کہ سرمایہ کس کا لگ رہا ہے تو یہ بات اپنے حکمرانوں پر چھوڑ دو۔" تم تو صرف اور صرف اپنی بنگالی قوم کو دشمن

سے نجات دلاؤ۔ تم لوگوں نے ہماری مدد سے یہ کام کر دکھایا۔ اب تمہارا کام ہماری مسلمانوں کا محاسبہ کرنا ہے۔ ہم تو دوست ہیں۔ ہمارے سرمایہ لگانے یا زمینیں خریدنے پر تمہاری حکومت کو اعتراض ہوگا تو ہم دوستانہ انداز میں واپس چلے جائیں گے۔"

اس کی باتیں پوری ہونے سے پہلے پلیٹ فارم پر گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ منٹو دادا وہاں سے پلٹ کر پلیٹ فارم پر آیا۔ سفر کرنے والے گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں رخصت کرنے والے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ان سے باتیں کر رہے تھے۔ خسرو پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا تلسی رام سے گفتگو کر رہا تھا اور کھڑکی کے پاس نین تارا نظر آ رہی تھی۔ منٹو دادا اسے دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ اگرچہ وہ دور تھی۔ اس کے حسن کو تفصیل سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا لیکن ستارے بھی وہ بہت دور ہوتے ہیں اور انھیں دیکھ کر کہنا پڑتا ہے۔ ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار ہاؤ آئی ونڈر وھاٹ یو آر؟

منٹو دادا کے خشک سیاسی اور انقلابی دماغ میں یہ بات آئی: یہ ستارہ اتنی دور سے اتنا روشن ہے۔ میں حیران ہوں۔ قریب سے اس کے حسن کا عالم کیا ہوگا؟

ادھر تلسی رام خسرو سے کہہ رہا تھا: "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آگے کے اور پیچھے کے کمپارٹمنٹ میں اسی طرح دو دو مسلح سپاہی تم لوگوں کی حفاظت کے لیے موجود رہیں گے۔"

خسرو نے کہا: "لیکن چچا جی! وہ بی ڈی آر کا آفیسر اپنے سپاہیوں کے ساتھ یہاں اتر گیا ہے۔ مکتی باہنی والے ہمیں آگے جا کر پریشان نہ کریں۔"

"ان کی کیا مجال ہے کہ تمہیں ہاتھ بھی لگا سکیں۔ گاڑی آگے جائے گی تو چوکائی اسٹیشن پر بھوانی پور اور پاربتی پور کے اسٹیشن پر بی ڈی آر کے سپاہی موجود ہوں گے۔"

انجن نے سیٹی بجائی۔ منٹو دادا دوڑتا ہوا اسی بوگی کے آخری ڈبے کی طرف جانے لگا جس میں خسرو اور نین تارا سفر کر رہے تھے۔ خسرو نے ادھر دیکھتے ہوئے کہا: "وہ دیکھیے، مکتی باہنی کا لیڈر اسی بوگی کے آخری ڈبے میں سوار ہو رہا ہے۔"

تلسی رام نے پچھلے کمپارٹمنٹ کے سپاہی سے پوچھا: "کیا تم نے مکتی باہنی کے اس جوان کو دیکھا ہے؟"

"سیٹھ جی! سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ ان میں سے کوئی غنڈہ اس کمپارٹمنٹ کی طرف نہیں آ سکے گا... یہ صحیح سلامت سید پور پہنچیں گے۔"

گاڑی چل پڑی۔ اس وقت تک اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ہلی اسٹیشن سے نکلتے ہی بجلی کی روشنیاں گم ہو گئیں۔ جنگل کی تاریکی نے اس گاڑی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تاریکی بڑی بندہ پرور ہوتی ہے۔ غربت اور افلاس کو چھپا لیتی ہے۔ تاریکی مہربان بھی ہوتی ہے۔ محبت کرنے والوں کو چھپ کر ملنے کے مواقع فراہم کرتی ہے اور تاریکی بڑی سازشی بھی ہوتی ہے۔ جرائم کو پھلنے پھولنے میں مدد دیتی ہے۔ اس بوگی کے آخری ڈبے میں منٹو دادا کے سات ساتھی بیٹھے ہوئے منصوبہ بندی کر چکے تھے اور اب عمل کرنے کی دیر تھی۔

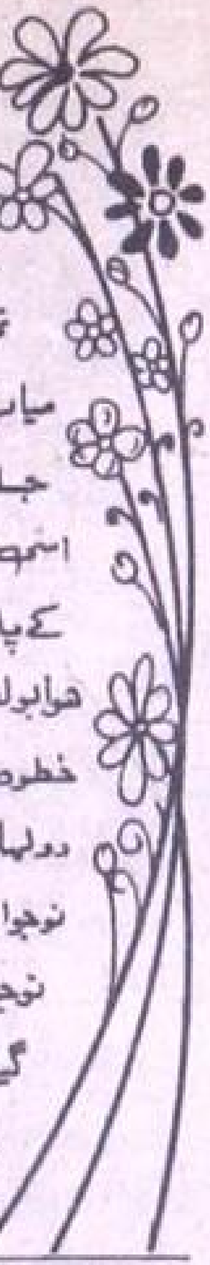

دولہا میاں دوستوں کے نرغے میں سہرا باندھے بیٹھے تھے۔ نکاح پڑھایا جا چکا تھا۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہو رہی تھیں اور خیال تھا کہ کسی بھی لمحے دولہا میاں کو رسمِ مصحف کے لیے گھر میں بلایا جائے گا۔

اسی اثنا میں ایک نوجوان لڑکا دولہا میاں کے پاس پہنچا اور ان کے کان میں سرگوشی کرتا ہوا بولا: "کیا آپ کے پاس اپنی بیوی کے عشقیہ خطوط موجود ہیں؟"

دولہا میاں نے کچھ حیرانی اور پریشانی سے اس نوجوان کی طرف سر ہلاتے ہوئے دیکھا: "نہیں"

نوجوان ان کے کان پر تھوڑا سا اور جھک گیا اور بولا: "خریدنا پسند کریں گے؟ میرے پاس آپ کی بیوی کے دس بارہ خطوط ہیں"

گاڑی تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ منٹو دادا نے ایک جگہ بیٹھے بیٹھے کہا: "آگے پانچ بی بی کا اسٹیشن ہے۔ پانچ بی بی کے علاقے میں بجلی نہیں ہے۔ وہاں اسٹیشن پر لالٹین کی روشنی ہوگی۔ اندھیرے میں کوئی یہ دیکھنے نہیں آئے گا کہ بوگیوں کے درمیان کیا ہو رہا ہے۔ اسد اللہ اور مجنوں دادا! تم دونوں اس بوگی کے اگلے حصے میں جاؤ گے۔ اور ٹائی راڈ کے پیچ کو ذرا ڈھیلا کر دو گے۔ اس کے دو طرفہ ویکیوم کو اس حد تک لوز کر دو گے کہ گاڑی چلنے کے دوران انھیں کھولنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے۔"

دو جوان مجنوں دادا کے سینے پر ایک بڑے سے بیگ کو باندھ رہے تھے۔ اس بیگ میں مختلف سائز کے پانے، پیچ کس، آری اور ہتھوڑے وغیرہ موجود تھے۔ منٹو دادا نے کہا: "دو بوگیوں کے درمیان دو زینے ہیں۔ اسد اللہ تم اگلی بوگی کے زینے پر رہو گے۔ مجنوں دادا ہماری بوگی کے زینے سے لگے رہیں گے۔ جب ٹائی راڈ کھل جائے

گا تو تیز رفتار گاڑی کے ساتھ اسد اللہ چلا جائے گا اور ہم گاڑی کے کٹے ہوئے اس حصے کے ساتھ جنگل میں رہ جائیں گے۔"

⁂

نین تارا ٹوائلٹ سے باہر آ کر دروازے کو بند کرنے لگی۔ خسرو نے کہا: "میں سمجھ رہا تھا، شاید تم لباس تبدیل کرو گی۔ باتھ روم میں پانی آ رہا ہو تو غسل کر لو۔"

"پانی تو آ رہا ہے لیکن کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ آتے آتے رُک بھی سکتا ہے۔"

اس نے مسکرا کر کہا: "اکثر ایسا ہوتا ہے۔ بدن میں صابن لگا کر شاور کھولو تو پانی غائب۔"

وہ برتھ کے آخری سرے پر آ کر بیٹھ گئی۔ کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند تھے۔ خسرو نے کہا: "بڑو دیدی تمھیں دیکھیں گی تو بہت خوش ہوں گی۔ گلے سے لگائیں گی اور تمھیں آشیرواد دیں گی۔"

"کہاں ہیں تمھاری بڑو دیدی؟"

"حیرت ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ ہم سید پور اُنھی کے پاس جا رہے ہیں۔"

"یہ تو میں جانتی ہوں کہ ہم ان کے پاس سید پور جا رہے ہیں۔ کیا واقعی ہم سید پور پہنچ جائیں گے؟"

خسرو نے تعجب سے اسے دیکھا۔ پھر پوچھا: "تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں خود نہیں جانتی، کیا کہہ رہی ہوں مگر میرا دل گھبرا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ ہماری محبت کا پہلا اور زندگی کا آخری سفر ہو۔"

گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی تھی۔ وہ رُکنے والی تھی۔ خسرو، نین تارا کے جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی وہ بولی: "یہ گاڑی کیوں رُک رہی ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"حوصلہ رکھو۔ کیا ابھی تم نے محسوس نہیں کیا ہے۔ گاڑی پٹریاں بدل رہی تھی۔ یقیناً کسی اسٹیشن پر رُکنے والی ہے۔"

پھر گاڑی رُک گئی۔ گہرا سناٹا چھا گیا۔ خسرو نے آہستگی سے بنگلہ بھاشا میں کہا: "یاد ہے نا۔ گاڑی کہیں بھی رُکے تو تم اسی زبان میں گفتگو کرو گی۔"

نین تارا نے اثبات میں سر ہلایا۔ خسرو وہاں سے اُٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ پھر دروازے کی کھڑکی کے پاس جھک کر، کان لگا کر باہر کی آوازیں سننے لگا۔ باہر سے جھینگروں کے بولنے اور مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔

وہ چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ اسٹیشن کے دو ملازم دُور ایک جگہ نظر آ رہے تھے۔ صرف ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اسی لیے یہاں سے وہاں تک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اسد اللہ اور مجنوں دادا ٹہلنے کے انداز میں پلیٹ فارم پر سے گزرتے ہوئے بوگی کے اگلے حصے کی طرف جا رہے تھے۔ نین تارا اور خسرو کی حفاظت کرنے والے سپاہی گاڑی رُکنے سے پہلے ہی اپنے اپنے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر آ گئے تھے تاکہ کوئی فرسٹ کلاس کے ڈبے میں گھسنے نہ پائے۔

اسد اللہ اور مجنوں دادا آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے بہت آگے نکل گئے۔ پھر ایک کمپارٹمنٹ میں سوار ہو کر اس کے دوسرے دروازے سے دوسری طرف اُتر گئے۔ وہاں اور گہری تاریکی تھی۔ وہ چھپتے ہوئے تقریباً دوڑتے ہوئے دو بوگیوں کے درمیان آ گئے۔ اُدھر انھیں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ انھوں نے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا۔

نین تارا نے آہستگی سے پوچھا: "کوئی اسٹیشن ہے؟"

خسرو نے اثبات میں سر ہلا کر کہا: "ہاں۔ ابھی ہمارے کمپارٹمنٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔ میں آواز سے اندازہ کر سکتا ہوں۔ ان کے پاؤں تلے بجری بچھی ہوئی تھی۔ یقیناً کسی اسٹیشن کا پلیٹ فارم ہے۔"

وہ مطمئن ہو کر برتھ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پوچھا: "تم مایوس کیوں ہو۔ ہم یقیناً سید پور پہنچیں گے۔"

وہ بند دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ "دماغ میں عجیب عجیب سے خیالات آتے ہیں۔ یوں تو سبھی کو ایک دن مرنا ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی مگر یہ جو رہ رہ کر دہشت پیدا ہوتی ہے۔ موت آتے آتے رُک جاتی ہے اور زندگی دلاسے نہیں دیتی تو ایک عجیب طرح کا اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ بس یہی دُعا کرتی ہوں کہ اِس پار یا اُس پار ہو جائے یا تو زندگی کی ضمانت مل جائے یا موت آنا ہو تو ایک دفعہ میں ہی آ جائے۔"

گاڑی کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ وہ بیٹھے بیٹھے برتھ کی پُشت سے ٹکرا گئی پھر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ گاڑی چل پڑی تھی۔ اسد اللہ اور مجنوں دادا الگ الگ زینے پر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ اسد اللہ اگلی بوگی کے زینے پر تھا اور مجنوں دادا پچھلی بوگی کے زینے پر۔ گاڑی اسٹیشن چھوڑ کر آگے پٹریاں بدلتے ہوئے مین لائن پر جانے والی تھی۔ پٹریاں بدلنے کے دوران وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے اس لیے چپ چاپ کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر جیسے ہی ٹرین مین لائن پر پہنچی اور آؤٹر سگنل کراس کرنے لگی تو وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ اچانک فرسٹ کلاس کی بوگی کو ایک زبردست جھٹکا پہنچا۔ اس کے ساتھ

ہی کمپارٹمنٹ میں تاریکی چھا گئی۔ نین تارا کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔ اس نے گھبرا کر پوچھا: "یہ کیا ہو گیا؟"

اُدھر دو بوگیوں کے درمیان ٹائی راڈ کھل گیا تھا۔ مجنوں دادا کو اس بات کا صحیح اندازہ نہیں تھا کہ جب تیز رفتار ٹرین کی دو بوگیاں اچانک الگ ہوں گی تو پچھلی بوگی کو کیسا زبردست جھٹکا پہنچے گا۔ چونکہ اسے صحیح اندازہ نہیں تھا اس لیے ٹائی راڈ کے کھلتے ہی وہ غیر متوقع جھٹکے کو برداشت نہ کر سکا۔ زینے پر سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ ایک چیخ مار کر لائن کے درمیان گر پڑا۔ ٹرین آگے دوڑی چلی جا رہی تھی لیکن کٹی ہوئی بوگی کی رفتار بھی کچھ کم نہیں تھی۔ اس کے رُکنے میں ابھی دیر تھی۔ اس سے پہلے ہی مجنوں دادا اس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

اسداللہ اگلی بوگی کے زینے سے لگا، اب تک مجنوں دادا کو ٹارچ کی روشنی دکھاتا رہا تھا اور وہ اسی روشنی میں کام کرتا رہا تھا۔ اب وہی روشنی اپنے ایک ساتھی کے حرام موت مرنے کا تماشا دکھا رہی تھی۔ اس نے منہ پھیر کر آنکھیں بند کر لیں، ٹارچ کو بجھا دیا۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ تیز رفتاری سے دوڑنے والی ٹرین اسے اپنے باقی ساتھیوں سے دُور لے جا رہی تھی۔

اِدھر وہ دونوں تاریک کمپارٹمنٹ میں بیٹھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ گاڑی رُکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی جب کہ وہ گاڑی نہیں رہی تھی۔ اس کا کٹا ہوا حصہ تھا۔ پسنجر کی دو بوگیاں اور مال گاڑی کے چھ ویگن اس سے منسلک تھے جس میں سے دو ویگن تلسی رام کے تھے۔ باقی چار دوسرے تاجروں کے ہوں گے لیکن اب ان ویگنوں کا تمام مال اور باقی ماندہ مسافر نہ اِدھر کے رہے تھے نہ اُدھر کے۔ بیچ جنگل میں ٹرین کا کٹا ہوا حصہ رُک گیا تھا۔ باہر سے جھینگروں کے بولنے اور مینڈکوں کے ٹرانے کے سوا کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

دونوں کمپارٹمنٹ کے سپاہی دونوں طرف کے دروازوں پر آ گئے تھے اور ٹارچ کی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ انھیں پتا چل گیا کہ ٹرین سے ان کی بوگی کٹ گئی ہے۔ اسی وقت منٹو دادا نے کہیں اندھیرے سے چیخ کر کہا: "ٹارچ بجھا دو۔ ورنہ ہم روشنی کی سمت فائر کریں گے۔"

فوراً ہی تمام ٹارچ بجھ گئیں۔ پھر منٹو دادا کی آواز سنائی دی۔ "یہ ہم نے دوستانہ جذبے کے تحت مشورہ دیا تھا۔ ورنہ ہم چاہتے تو فائرنگ شروع کر دیتے۔ ہم مکتی باہنی کے لوگ ہیں اور تم بی ڈی آر کے سپاہی ہو۔ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اگر جھگڑے کا کوئی سبب ہو تو اسے ختم کر دینا چاہیے۔ ہم بی ڈی آر کے جوانوں سے درخواست کرتے ہیں کہ خسرو اور اس لڑکی کی حفاظت سے ہاتھ اُٹھا لیں۔ اپنے اپنے کمپارٹمنٹ سے اتر کر پچھلی بوگی کے کسی کمپارٹمنٹ میں چلے جائیں۔"

خسرو دروازے کے پاس جھکا ہوا وہ باتیں سن رہا تھا۔ تاریکی میں نین تارا نظر نہیں آ رہی تھی لیکن وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ کس قدر سہمی ہوئی ہو گی۔ پھر اسے بی ڈی آر کے ایک سپاہی کی آواز سنائی دی۔ وہ چیخ کر کہہ رہا تھا: "ہم اپنی ڈیوٹی کے پابند ہیں۔ تم لوگوں نے اس بوگی کو ٹرین سے کاٹ کر اچھا نہیں کیا۔ یہ سراسر اپنی فوج کی مخالفت ہے۔"

منٹو دادا نے جواباً چیخ کر کہا: "یہ فوج سے مخالفت نہیں بلکہ فوج کے ایک آفیسر سے مخالفت ہے۔ وہ ایسے ہندو تاجروں اور بہاریوں کا ساتھ دے رہا ہے جو ہمارے دشمن ہیں۔ ہم دیش بھگتی کے نام پر تم سے درخواست کرتے ہیں، ہمارا ساتھ دو۔"

"ہم نے کہہ دیا۔ ڈیوٹی از ڈیوٹی۔ ہم خسرو کو بحفاظت سید پور تک پہنچا کر دم لیں گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی تھائیں سے فائر کی آواز سنائی دی۔ نین تارا کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ خسرو نے سرگوشی میں کہا: "فرش پر بیٹھ جاؤ۔"

وہ نیچے بیٹھ گئی پھر اسے محسوس ہوا جیسے خسرو اس کے قریب آ رہا ہے۔ قریب سے ہی اس کی آواز سنائی دی: "تم کہاں ہو؟"

نین تارا نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کا ہاتھ خسرو سے ٹکرایا۔ اس نے کہا: "مجھ پر بھروسہ کرو۔ جب تک میری سانس رہے گی۔ میں کسی دشمن کو تمہارے قریب نہیں آنے دوں گا۔"

وہ اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولی: "تمہارے

پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ ایک چاقو تک نہیں ہے۔ تم کیا کر سکو گے؟"

"میں نہیں جانتا کہ ہماری تقدیر میں کیا لکھا ہے لیکن اتنا جانتا ہوں، وہ ہتھیاروں کو آزمائیں گے۔ میں اپنے حوصلوں کو آزماؤں گا۔"

تڑتڑاہٹ فائرنگ کی مسلسل آوازیں آنے لگیں۔ خسرو نے مین تارا کو اپنی طرف کھینچا پھر اسے لے کر فرش پر لیٹ گیا۔ ٹھیک اسی وقت کھڑ[illegible] کی آواز سنائی دی۔ کھڑکی کے المونیم شیلڈ سے کوئی گولی [illegible] ٹکرائی تھی۔ پھر ان کے قریب ہی جیسے کوئی چھوٹا سا پتھر آ کر گرا ہو۔ اندھیرے میں وہ دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن اندازہ کر سکتے تھے۔ وہ ایک گولی تھی۔ کھڑکی سے ٹکرا کر اندر گھسنے کے دوران اس بلٹ کی قوت پرواز نے دم توڑ دیا تھا۔

وہ خوف کے مارے خسرو کی پناہ میں چھپ گئی تھی، سمٹ گئی تھی۔ اس وقت سب کچھ بھول گئی تھی۔ بس اتنا یاد تھا کہ موت قریب آ رہی ہے اور بچنے کے لیے صرف ایک خسرو کی دیوار ہے اور وہ اس دیوار میں خود کو انارکلی کی طرح چن رہی تھی۔

باہر کسی کی چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ کی آوازیں بند ہو گئیں۔ اب صرف مینڈک ٹرا رہے تھے۔ پتہ نہیں دوست مارا گیا تھا یا دشمن؟ وہ دونوں کمپارٹمنٹ کی تاریکی میں یوں پڑے تھے جیسے قبر کی تاریکی میں ہوں اور چاروں طرف موت کا سناٹا ہو۔ زندگی کہیں نام کو نہ ہو۔

اچانک پھر فائرنگ شروع ہو گئی۔ دوسری تیسری چیخیں سنائی دیں۔ اس کے بعد پھر سناٹا چھا گیا۔ چند لمحوں بعد منشو دادا کی آواز سنائی دی۔ وہ گرج کر کہہ رہا تھا: "خسرو! باہر نکلو..... تمہارے تین محافظ مارے گئے ہیں۔ چوتھے نے ہتھیار پھینک دیا ہے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ چپ چاپ نکل آؤ، ورنہ ہم دروازہ توڑنا بھی جانتے ہیں۔"

خسرو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مین تارا نے چیخ مار کر کہا: "نہیں۔ نہیں میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔"

وہ اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اپنے چہرے کو اس کے پاؤں پر رگڑنے لگی: "نہیں خسرو! ہم جئیں گے ایک ساتھ، مریں گے ایک ساتھ۔ وہ دروازہ توڑتے ہیں، توڑنے دو۔ آتے ہیں آنے دو۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔"

باہر سے قہقہے سنائی دیے۔ پھر کسی نے کہا: "یہ ماگی اردو بول رہی ہے۔ یقیناً بہاری ہے۔ آخر ہمارا اندازہ درست نکلا۔"

خسرو نے اسے اچھی طرح سمجھایا تھا کہ وہ بنگالی میں گفتگو کیا کرے لیکن خوشی کے، غم کے یا دہشت کے بے اختیاری رد عمل میں اپنی مادری زبان کے الفاظ ہی منہ سے نکلتے ہیں۔ اس نے غلطی نہیں کی تھی۔ اپنی زبان سے جذبے کا اظہار کیا تھا۔ بعض غلطیاں محبت کے مارے سرزد ہو جاتی ہیں۔

ٹھائیں ٹھائیں کی آواز کے ساتھ دو گولیاں دو طرف کی کھڑکیوں سے آ کر لگیں۔ اس کے بعد تڑتڑاہٹ کی مسلسل آوازیں سنائی دیں۔ اسٹین گنوں کی ننھی ننھی گولیاں کمپارٹمنٹ کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر بج رہی تھیں۔ موت چیلنج کر رہی تھی۔ پوچھ رہی تھی۔ بتاؤ فرار کا راستہ کہاں ہے؟

* * *

وہ اجنبی، گمنام اور گونگی عورت، سکندر اور کلیم الدین بھوتیا کے درمیان کھڑی ہوئی تھی۔ ان تینوں کے سامنے چاول کی بوریاں قد آدم اونچائی تک رکھی ہوئی تھیں۔ اس ویگن کے اندر بوریاں لا کر رکھنے والے قلیوں کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ دو سو بوریاں لاد دی گئی ہیں۔ اب پچیس فاضل بوریاں رکھی جا رہی ہیں۔

اس وقت دن کا اجالا اچھی طرح پھیل چکا تھا۔ سکندر اور کلیم الدین بھوتیاں اسی روشنی کے منتظر تھے۔ روشنی ہوتی ہے تو لوگ دنیا کو دیکھتے ہیں۔ وہ دونوں نور کی پہلی کرن کے ساتھ اپنی اجنبی ساتھی کو دیکھنا اور سمجھنا چاہتے تھے۔ اور اب انہیں وہ صاف طور سے نظر آ رہی تھی۔

اس کے چہرے، بدن اور لباس پر جا بجا کیچڑ چپکی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے بارش میں بھیگتی ہوئی، کیچڑ اور دلدلوں سے گزرتی ہوئی وہاں تک پہنچی ہو۔ وہ چہرہ کیچڑ میں ہونے کے باوجود کنول کی طرح اجلا تھا۔ دونوں اسے سر سے پاؤں تک ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون ہو سکتی ہے۔ اس کا اونچا پورا قد بتا رہا تھا جیسے وہ پنجاب کی ہو۔ سیاہ زلفیں لانبی اور گھنی گویا بنگال کی تھیں اور چہرے کے چمکتے دمکتے نقوش بتا رہے تھے کہ وہ بہاری ہے۔ وہ اچھی، صحت مند، بھرے بھرے جسم کی دوشیزہ تھی لیکن اس کی آنکھوں کی دہشت اور اس کے دیکھنے کے انداز میں جو کرب چھپا ہوا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دشمنوں نے اس کو جی بھر کے لوٹا ہے۔ اس کے کپڑوں پہ کہیں کہیں خون کے دھبے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ سکندر اور کلیم الدین بھوتیاں کے دماغ میں کئی طرح کے سوالات مچل رہے تھے لیکن وہ پوچھ نہیں سکتے تھے۔ چاول کی بوریوں کے اس پار قلی اپنے کام میں مصروف تھے۔

اور پوچھنے کا فائدہ بھی کیا ہوتا؟ جواب دینے والی تو گونگی تھی۔ آخر سکندر سے نہ رہا گیا۔ اس نے اشارے سے پوچھا: "کیا

تم گونگی ہو؟"

اس دوشیزہ نے پہلے سکندر کو دیکھا۔ پھر کلیم الدین بھویاں کی جانب نظر کی۔ بھویاں نے بھی اشارے سے سکندر کے اسی سوال کو دہرایا: "کیا تم گونگی ہو؟"

تب اس دوشیزہ کی آنکھیں اچانک ہی بھیگ گئیں۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو آنسوؤں کے قطرے اس کے کیچڑ بھرے رخساروں پر ڈھلکنے لگے۔ اس کے بعد اس نے بڑی آہستگی سے [illegible] گلابی ہونٹوں کو کھول دیا۔ آہستہ آہستہ منہ پوری [illegible] ان دونوں نے ذرا جھک کر اس کے کھلے ہوئے منہ [illegible] زبان کٹی ہوئی تھی۔

کسی [illegible] تھی یا کاٹی گئی تھی۔ انسان طرح طرح کی بولیاں بولتا ہے۔ جانے وہ مینا کون سی بولی بولتی تھی جسے سننا گوارا نہ کیا گیا۔ ایسا ہوتا ہے کہ دلوں پر اور دماغوں پر پہرے بٹھائے جاتے ہیں۔ لکھنے والے کا قلم پکڑا جاتا ہے۔ بولنے والے کا منہ بند کیا جاتا ہے لیکن یہ غیر انسانی سنسرشپ تھی کہ ایک عورت کی زبان کاٹ کر پھینک دی گئی تھی۔

سکندر حیات اور کلیم الدین بھویاں اس کے کھلے ہوئے منہ کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انھوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ دونوں کے دماغ میں ایک ہی بات آئی۔ خدایا! اس کی تو زبان ہی نہیں ہے تو یہ بہاری ہوئی نہ بنگالی۔ سارا جھگڑا تو زبان ہی کا ہے۔ دونوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے کس طرح ہمدردی کریں۔ ہمدردی کے لیے دو بول ہی بولنے پڑتے ہیں۔ اور وہاں کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ سکندر نے بڑی خاموشی سے اپنا ہاتھ اس دوشیزہ کے سر پہ رکھ دیا۔ کلیم الدین بھویاں نے اس کے ایک ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر ہمدردی سے ہولے سے دبایا۔ بس اتنی ہی ہمدردی کی جا سکتی تھی۔

دن کے گیارہ بج گئے۔ وہ مال گاڑی اسی طرح پلیٹ فارم پر کھڑی رہی۔ ان دنوں ٹیلیفون کے تار جگہ جگہ کٹے ہوئے تھے۔ ان کی مرمت کرنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ رابطہ قائم کرنے کے لیے کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ بہت کم بنگالی ایسے تھے جو ٹیلیگراف کی تیکنک کو سمجھتے تھے۔ خاص خاص ریلوے اسٹیشنوں پر ہندوستانی ٹیلیگراف آفس کے کارکن آ کر کام کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ٹرین کو اگلے اسٹیشن تک پہنچنے کے لیے گھنٹوں لگ جاتے تھے۔

دن کے ایک بجے وہ مال گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی۔ ویگن کے دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے۔ دو مسلح سپاہی وہاں موجود تھے۔ جس مہاجن کا مال اس ڈبے میں جا رہا تھا، وہ مہاجن بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ دو مزدور تھے۔ مہاجن کہہ رہا تھا: "ان پچیس بوریوں میں دھان اور دھان کے چھلکے اور بھوسا ہے۔ ایسا کرو۔ پہلے ایک بوری کھولو۔ ان میں سے دھان اور بھوسی کے چار حصے کرو اور ایک ایک حصہ چاول کی ایک ایک بوری میں ملاتے جاؤ۔ کیا سمجھے؟"

چاول کی ایک بوری پر مہاجن کا منیم بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سر ہلا کر کہا: "سمجھ گیا۔ یہ پچیس بوریاں ہیں۔ ان کے دھان اور چھلکے باسمتی چاول کی دو سو بوریوں میں ملائے جائیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ باسمتی چاول کی پچیس بوریاں اور نکل آئیں گی۔ یعنی یہاں مال چڑھاتے وقت دو سو بوریاں تھیں لیکن جہاں مال اتارا جائے گا وہاں دو سو پچیس بوریاں بن جائیں گی۔ پچیس بوریوں کا منافع الگ۔ بالکل کھرا۔"

سیٹھ نے کہا: "ہاں، یہی سمجھنے کی بات ہے۔ جنتا ہمیں گالیاں دیتی ہے کہ ہم کھانے کی چیزوں میں ملاوٹ کرتے ہیں۔ اب کون انھیں سمجھائے کہ ہم جو سپاہیوں کو، افسروں کو، مال بابو کو، گاڑی والوں کو رشوت دیتے ہیں۔ مال اِدھر سے اُدھر پہنچانے میں ہمارے ہزاروں روپے خرچ ہوتے ہیں تو یہ نقصان ہم کہاں سے پورا کریں گے۔ آخر بھوسی چھلکے ملا کر ہی تو پورا کر سکتے ہیں نا۔ کیا سمجھے؟"

دو مزدور ملاوٹ کا کام شروع کر چکے تھے۔ منیم جی نے کہا: "جی، میں تو سب سمجھ گیا لیکن ہلی پہنچنے تک دو سو بوریوں میں ملاوٹ کا کام نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے بڑا سمے لگے گا۔"

"چنتا مت کرو۔ میں اگلے اسٹیشن پر گاڑی کو کم از کم دو گھنٹے کے لیے رکوا دوں گا۔ یہ تو اپنے ہاتھ میں ہے۔"

اگلا اسٹیشن گیارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ گاڑی رُک رُک کر چلتی رہی۔ تقریباً ڈھائی بجے وہ بھوانی پور پہنچے۔ وہ تینوں اسی طرح چاول کی بوریوں کے پیچھے بیٹھے تھے۔ کبھی کھڑے ہو جاتے تھے لیکن وہاں اتنی جگہ نہیں تھی کہ پاؤں پھیلا کر لیٹ سکتے یا بیٹھ سکتے۔ ان میں سے کسی ایک کے پاؤں پھیلانے کی گنجائش نکل سکتی تھی۔ سو اس گونگی کے لیے گنجائش نکال دی گئی۔

وہ بیٹھ گئی تھی لیکن بہت پریشان تھی۔ اپنے اجنبی ساتھیوں کو اپنی پریشانی بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر بولنا آتا تو بھی نہ بول سکتی۔ ویسے سکندر حیات اور کلیم الدین بھویاں بھی کم پریشان نہیں تھے۔ آخر وہ سب انسان ہی تھے۔ جانور تو نہیں تھے کہ جس جگہ کھاتے اسی جگہ غلاظت بھی برداشت کر لیتے۔ وہ تلملا رہے تھے۔ کسی طرح وہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔

برداشت کی انتہا ہو رہی تھی۔ اگر گاڑی چلتی ہوتی تو وہ

مارنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے لیکن وہ اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ کام جاری تھا۔ ایک مزدور نے کہا: "سیٹھ صاحب! بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانا ہو جائے۔"

مینم جی نے کہا: "ارے مرتے کیوں ہو۔ جب دیکھو کھانا، کھانا۔ آدمی کا پیٹ لے کر پیدا ہو گئے ہو۔ اپنے پیٹ کو چاول کی بوری تو نہ بناؤ۔ جب گاڑی چل پڑے گی تو تمہارے لیے کھانا آجائے گا۔"

اس گاڑی کو پانچ بجے لائن کلیئر ملی۔ مہاجن نے کہا۔ "مینم جی! میں گارڈ کے ڈبے میں جا رہا ہوں۔ اگلے اسٹیشن پر آؤں گا۔ کام ذرا جلدی کراؤ۔ ملی پہنچنے تک دو سو پچیس بوریاں ہو جانا چاہئیں۔"

وہ گارڈ کے ڈبے کی طرف جانے لگا۔ ان دنوں گارڈ کا ڈبہ مال گاڑی کے آخر میں نہیں لگتا تھا۔ چوری، ڈکیتی اور آئے دن قتل کی وارداتوں سے سب سہمے ہوئے تھے۔ اس لیے گارڈ کا ڈبہ انجن کے ساتھ لگایا جاتا تھا۔

گاڑی چلنے سے پہلے ہی اس آخری ویگن میں کھانا پہنچا دیا گیا۔ کھانے کی اشتہا انگیز بو ان کے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی اور اب وہ کچھ کر گزرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ بوریوں میں ملاوٹ ہو رہی تھی اور وہ بوریاں آہستہ آہستہ ان کے سامنے سے سرکتی جا رہی تھیں۔ تقریباً ساٹھ ستر بوریاں رہ گئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں انھیں بھی ہٹایا جاتا تو وہ ظاہر ہو جاتے۔

گاڑی چل پڑی تھی۔ انھوں نے تھوڑی دیر تک انتظار کیا پھر آہستگی سے بوریوں پر چڑھنے لگے۔ گاڑی کا شور اتنا تھا کہ ان کی آہٹ سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ یوں بھی آخری ڈبہ بہت زیادہ جھٹکے کھاتا ہے اور بہت زیادہ شور مچاتا ہے۔ انھوں نے بوری پر چڑھتے ہی دیکھا۔ دو مسلح سپاہی چاول کی ایک بوری پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی پشت نظر آ رہی تھی۔ ان کے سامنے کام کرنے والے دو مزدوروں کا رخ ان کی طرف تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ مزدور سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتے۔ انھوں نے بوری پر سے بیک وقت چھلانگ لگائی۔ ایک ساتھ دونوں مسلح سپاہیوں پر آ کر گرے۔ کلیم الدین بھویاں نے ایک سپاہی کی گردن اپنے بازو میں جکڑ لی تھی۔ سکندر حیات ایسا نہ کر سکا۔ وہ سپاہی اس سے الجھ گیا تھا۔ دونوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔ سکندر اس کوشش میں تھا کہ وہ اپنی اسٹین گن استعمال نہ کر سکے۔ اس لیے لڑنے کے دوران اس کی اسٹین گن کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ پھر وہ دونوں ویگن کے فرش پر لڑھکتے ہوئے دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ اسی وقت سکندر نے سپاہی کو دونوں ٹانگوں پر رکھ کر پوری قوت سے اچھال دیا۔ سپاہی کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ ڈبے کے باہر اپنی موت سے ملنے جا چکا تھا۔

وہ بوریوں کے پیچھے سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ زندگی اور موت کے درمیان کتنی ہی وحشیانہ جنگیں دیکھ چکی تھی۔ اس بار اس کی ہمدردیاں اپنے اجنبی ساتھیوں کے لیے تھیں۔ وہ کچھ بول نہیں سکتی تھی لیکن دل ہی دل میں ان کی ہی سلامتی کے لیے اور سامنے رکھے ہوئے کھانے تک پہنچنے کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔

دوسری طرف وہ دونوں مزدور سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ اگرچہ وہ بنگالی تھے لیکن سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بنگال میں کیا ہو رہا تھا، اس سے ان کی دلچسپی اتنی ہی تھی کہ مزدوری کے مواقع کم، اجرت کم اور اشیائے ضرورت کے نرخ بڑھ رہے تھے۔ وہ بے چارے دن رات محنت کرنا۔ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنا جانتے تھے۔ کسی کے لڑائی جھگڑے سے نہ تو انھیں کوئی سروکار تھا اور نہ ہی لڑنا جانتے تھے۔ اس لیے چپ چاپ تماشا دیکھ رہے تھے۔ مینم بھی ایک جگہ سہما ہوا سا کانپ رہا تھا۔ سکندر حیات نے اسٹین گن لے کر ڈبے کے باہر دیکھا۔ جو سپاہی باہر جا کر گرا تھا وہ ایک چھوٹے سے پل کی ریلنگ سے ٹکرایا تھا اور ٹکرانے کا انجام موت ہی تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر اسٹین گن دوسرے سپاہی کی طرف کرتے ہوئے کہا: "ہتھیار پھینک دو، ورنہ گولی مار دوں گا۔"

اس نے ہتھیار پھینک دیا۔ کلیم الدین بھویاں نے اسے چھوڑ کر اس کی اسٹین گن اٹھالی۔ پھر انھیں حکم دیا: "تم سب ادھر کونے میں چلے جاؤ۔ جلدی کرو۔"

وہ فوراً ہی حکم کی تعمیل کرنے لگے۔ دو مزدور، ایک سپاہی اور مینم جی چاروں ایک کونے میں جا کر دبک گئے۔ سکندر نے بوریوں پر چڑھ کر گونگی کی طرف ہاتھ بڑھایا: "آؤ، یہ کھانا ہمارے لیے ہے۔"

گونگی نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ پھر وہ بوریوں پر چڑھ کر دوسری طرف اتر کر کھانے کے پاس آئی اور ان کا انتظار کیے بغیر کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ وہ دونوں بھی اس سے پیچھے نہیں رہے۔ مینم، سپاہی اور دونوں مزدور انھیں یوں حیرت سے دیکھ رہے تھے، جیسے بھوکے جانوروں کو دیکھ رہے ہوں۔ آدھا کھانا ان کے منہ میں جا رہا تھا۔ آدھا نیچے گر رہا تھا مگر وہ کھائے جا رہے تھے۔ اچھی طرح چبائے بغیر نگلتے جا رہے تھے۔

کھانے کے دوران کلیم الدین بھویاں کے حلق میں مچھلی کا کانٹا اٹک گیا۔ وہ آخ آخ کرنے لگا۔ پھر اس نے کھلے ہوئے دروازے کی

طرف منہ کرکے "تھو" کہتے ہوئے تھوک دیا۔

اس کے "تھو" کہتے ہی ایک دم سے سکندر بڑبڑا گیا۔ جلدی سے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ گونگی اسے حیرانی سے دیکھنے لگی۔ پچھلی رات کی سنی ہوئی داستان یاد آگئی۔ سکندر کے منہ میں لقمہ بھرا ہوا تھا۔ وہ چبانا بھول گیا تھا۔ ایک ٹک سامنے خلا میں تک رہا تھا۔ اسے زیبی نظر آرہی تھی اور جیسے اسی نے تھوڑی دیر پہلے آخ تھو کہا ہو۔

کلیم الدین بھوریاں کھلے ہوئے دروازے کے پاس سے پھر کھانے کی طرف پلٹ گیا۔ اس نے ایک لقمہ منہ میں دبایا پھر سکندر کی طرف دیکھ کر حیرانی سے پوچھا: "اے! تم ایسے چپ چاپ کیا بیٹھے ہو؟ وہاں کیا تک رہے ہو؟"

سکندر چپ رہا۔ بھوریاں نے اسے جھنجوڑا تو وہ چونک گیا پھر جلدی سے لقمہ چباتے ہوئے، بڑی مشکل سے نگلتے ہوئے بولا: "دیکھو دوست! آئندہ میرے سامنے منہ پھیر کر بھی نہ تھوکنا۔ میں کیا بتاؤں، مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ میرے دماغ کو زبردست جھٹکا پہنچتا ہے۔ ہاتھ پاؤں سے جیسے جان نکل جاتی ہے۔"

کلیم الدین بھوریاں اور گونگی نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر سر جھکا کر کھانے لگے۔ دو چار لقمے نگلنے کے بعد بھوریاں نے کہا۔ "غنڈے بدمعاش طرح طرح کی واردات کرتے ہیں، قتل بھی کرتے ہیں مگر انھیں ذرا بھی شرمندگی نہیں ہوتی۔ ہم پڑھے لکھے شریف آدمیوں کے لیے بڑی مصیبت ہے۔ کوئی جرم سرزد ہو جائے تو اپنے ہی اندر سزا ملتی رہتی ہے۔"

گونگی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر وہ بڑی مجبور تھی۔ کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ اسے کچھ دلاسا نہیں دے سکتی تھی۔ بھوریاں نے کہا: "میرا مشورہ ہے تم زیبی جیسی لڑکیوں کے کام آتے رہو۔ یقیناً تمھارے دماغ کا بوجھ کچھ ہلکا ہوگا۔ مجھے یقین ہے پھر تمھارے ضمیر کے منہ پر کسی کا تھوک نہیں پہنچے گا۔"

انھوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ پانی پیا۔ کھانے اور پینے کے بعد جیسے نشہ طاری ہونے لگا۔ اس لمحے انھیں اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ان کے ساتھ ایک عورت ہے۔ جب تک پیٹ نہ بھرے دنیا خوب صورت نظر نہیں آتی۔ جب دنیا خوب صورت نظر آتی ہے تب سمجھ میں آتا ہے کہ کائنات میں رنگ عورت ہی کے وجود سے ہے۔

وہ گندی تھی۔ میلے چکٹ کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ منہ پر اور جسم پر جگہ جگہ کیچڑ کے دھبے تھے۔ اس کے باوجود وہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ دور کونے میں دبکے ہوئے مینم جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "آپ سیدھے سادے شریف لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ شاید بھوک سے مجبور ہو گئے تھے۔ جبھی ہم سے کہا ہوتا۔ اگلے اسٹیشن پر آپ کے

بشکریہ فاطمہ کے عزیز

چند پسندیدہ شعور مند

میری ہیئر ڈریسر، میری پڑوسن، میری والدہ، میرے دندان ساز اور سفر میں کبھی کبھار میری نشست کے برابر بیٹھنے والی خواتین کے سوا کسی کو میری مشکلات کا علم نہیں ہے۔

[illegible]

تعلیم ایک صلاحیت کا نام ہے اس کی بدولت تم اپنے آپے سے نکلے بغیر اور خود اعتمادی کھوئے بغیر مخاطب کی ہر بات سُن سکتے ہو۔

رابرٹ فراسٹ

فطرت یہ نہیں چاہتی کہ ہم مکمل بن جائیں، صرف یہ چاہتی ہے کہ ہماری نشوونما ہوتی رہے۔

جوشوا لوتھ لائبمن

شہرت، بخارات کے مانند ہوتی ہے، مقبولیت کو ایک حادثہ کہنا چاہیے، دولت کو بہت جلد پر لگ جاتے ہیں۔ بس ایک چیز رہنے والی ہے۔ کردار۔

ہوریس گریلے

بعض لوگوں کے لیے کانوں کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے سننا بھی ضروری ہوتا ہے۔

[illegible]

انسان کے جسم میں ضمیر سب سے زیادہ جگہ گھیرتا ہے۔

[illegible]

"سال" وہ کچھ سکھاتے ہیں جن سے "دن" واقف تک نہیں ہوتے۔

رالف والڈو ایمرسن

یادداشت ساحل پر چلنے والے ایک بچے کے مانند ہوتی ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بچہ کون سا ننھا سا پتھر اٹھا کر اپنی پسند کے خزانے میں جمع کرے گا۔

[illegible]

انسان کے ساتھ ایک بڑی مشکل ہے۔ پیچیدہ حقیقتیں یاد نہیں کر پاتا اور سہل حقیقتیں آسانی سے فراموش کر دیتا ہے۔

پیسے اور کھانا منگوا دیں گے۔"

اس کی بات سنتے ہی دونوں چونک گئے۔ اگلے اسٹیشن کی بات پر یاد آیا کہ وہاں پکڑے جائیں گے۔ یہ سوچنے کے دوران ہی گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں تھی۔ گاڑی ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن کے درمیان کئی بار رکتی تھی۔ کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی تھی۔ اس وقت بھی ایک چھوٹا سا پل مرمت طلب تھا۔ گاڑی اس پر سے رینگتے ہوئے گزر رہی تھی۔ سکندر نے فوراً ہی دروازے کے پاس پہنچ کر کہا: "یہی موقع ہے۔ آؤ..... اتر چلیں۔"

یہ کہتے ہی اس نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ پھر ڈبے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بھویاں بھی نیچے اتر آیا۔ پھر وہ دونوں ہاتھ بڑھا کر گونگی سے کہنے لگے: "آؤ ہمت کرو۔ ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ ہم تمھیں گرنے نہیں دیں گے۔"

بھویاں نے سپاہی اور منیم جی کو دیکھتے ہوئے کہا: "ہم اترنے کے بعد بھی دور تک اس ڈبے کو دیکھتے رہیں گے۔ اگر کسی نے دروازے سے جھانکنے یا چیخنے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دیں گے۔"

گونگی دونوں ہاتھ بڑھا کر دونوں کا سہارا لیتے ہوئے نیچے اتر آئی۔ وہ اسے سہارا دیتے رہے اور خالی خالی نظروں سے جانے والی گاڑی کو دیکھتے رہے۔ مال گاڑی کا آخری ڈبہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ دروازے سے باہر جھانک کر انھیں دیکھ سکتے۔

جب وہ گاڑی بہت دور نکل گئی تو گونگی نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑایا پھر دوڑتے ہوئے ایک جھاڑی کے پیچھے جانے لگی۔ انھوں نے اس کا تعاقب نہیں کیا بلکہ خود دوسری جھاڑیوں کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ اس وقت اندھیرا چھا رہا تھا۔ دن کی آخری روشنی بھی دم توڑ رہی تھی۔ جا بجا کیچڑ، دلدل اور پانی نظر آتا تھا۔ کھیتوں میں کہیں گھٹنوں تک اور کہیں کمر تک پانی کھڑا ہوا تھا۔ جھینگروں کے بولنے اور مینڈکوں کے ٹرٹرانے کی آوازیں دور دور تک گونج رہی تھیں۔

وہ تینوں پھر ریلوے لائن کے پاس آ گئے۔ سکندر نے کہا۔ "ہمیں اسی طرف جانا چاہیے جہاں مال گاڑی گئی ہے۔ اگر لوگ ہمیں تلاش کرنے آئیں گے تو ہم کھیتوں میں چھپ جائیں گے۔"

کلیم الدین بھویاں نے کہا: "ٹھیک ہے۔ ہمیں ان کی توقع کے خلاف آگے جانا چاہیے لیکن یہ ریلوے لائن چھوڑ کر۔"

گونگی ریلوے لائن پر چلنے لگی۔ وہ دونوں اس کے پیچھے چلتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ ایک نے کہا: "ہم ریلوے لائن چھوڑ کر جائیں گے تو کھیتوں میں پانی بھرا ہوا ہے۔ بڑی مشکل ہے۔ جب تک کوئی خطرہ نہ ہو، اس لائن کے ساتھ ہی چلتے رہنا چاہیے۔"

"اگر کسی ٹرالی یا گاڑی کی آواز سنائی دے گی یا روشنی دکھائی دے گی تو ہم لائن چھوڑ کر کھیتوں میں چلے جائیں گے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے گونگی کے برابر آ گئے۔ اس کے دونوں طرف چلنے لگے۔ سکندر نے کہا: "تم بول نہیں سکتیں لیکن کچھ معلوم تو ہونا چاہیے کہ کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ اور تمھیں کہاں پہنچایا جائے؟"

کلیم الدین بھویاں نے کہا: "تم فکر نہ کرو۔ جے پور ہاٹ میں میرے رشتے دار ہیں۔ میں اسے وہاں لے جاؤں گا۔"

"تم کیوں لے جاؤ گے۔ یہ بنگالی نہیں ہے۔"

"بہاری بھی نہیں ہے۔"

"یہ دیکھنے میں بہاری لگتی ہے۔ زیبی کچھ کچھ ایسی ہی تھی۔"

"تم نے زیبی کے ساتھ جو کچھ کیا ہے۔ اب اس کی تلافی کرو اس لڑکی کو اس کی مرضی کے مطابق میرے پاس چھوڑ دو۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ تمھارے ساتھ جانے پر راضی ہے؟"

"یہ بول نہیں سکتی ہے مگر رضامندی ظاہر کر سکتی ہے۔ ابھی پوچھ لیتے ہیں۔"

وہ چلتے چلتے رک گئی۔ دونوں کو گھورنے لگی۔ اس وقت اندھیرا چھا چکا تھا لیکن اس کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ ناراض ہو کر انھیں دیکھ رہی ہے۔ دونوں نے اپنا اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ پھر سکندر نے کہا: "تم جس کے ساتھ رہنا چاہتی ہو، اس کا ہاتھ پکڑ لو۔"

وہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر اس نے دونوں کے ہاتھوں کو اپنے سامنے سے جھٹک دیا۔ پاؤں پٹخ کر آگے بڑھ گئی۔ یوں جانے لگی جیسے ان میں سے کسی کی ضرورت نہ ہو۔ وہ اپنی بے زبان اداؤں سے انھیں سمجھا رہی تھی کہ اس اندھیری ہیبت ناک رات میں تنہا کہیں بھٹک جائے گی لیکن خود غرض لوگوں کا سہارا نہیں لے گی۔

وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے دونوں طرف پھر گئے۔ ایک نے کہا: "تم تو ناراض ہو گئی ہو۔"

دوسرے نے کہا: "ہم تمھیں اس ویرانے میں تنہا نہیں چھوڑیں گے اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچائیں گے۔"

وہ چپ چاپ چلتی رہی۔ تھوڑی دور جا کر ایک نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ اس دیش میں تعصب کی فضا بڑی گرم ہے۔ ہم تعلیم یافتہ اور حساس دل رکھنے والے بھی یہ چاہتے ہیں کہ جو چیز جہاں کی ہے وہیں پہنچائی جائے۔ اگر بنگالی ہے تو بنگالیوں میں جائے اور بہاری ہے تو بہاریوں کے درمیان محفوظ رہے۔"

وہ سنتی رہی اور چلتی رہی۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے

کے بعد انھیں انجن کی روشنی نظر آئی مگر وہ روشنی دوسری طرف تھی یعنی وہی مال گاڑی ایک اسٹیشن پر پہنچ کر رُکی ہوئی تھی۔ انھوں نے لائن چھوڑ دی اور ایک لمبا چکر کاٹ کر اسٹیشن سے آگے جانے لگے تھے۔

ان کے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ راستہ دشوار گزار تھا۔ کہیں کہیں گھٹنوں تک پانی تھا اور کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کیچڑ نہ ہو۔ وہ کہیں پھسلتے ہوئے، کہیں سنبھلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ گونگی نے دونوں کے ہاتھ تھام لیے تھا۔ اُدھر اسٹیشن میں یقیناً اس بات کا پتا چل گیا ہوگا کہ آخری ویگن میں کیا کچھ ہو چکا ہے مگر وہاں کیا ہو رہا تھا۔ وہ کس طرح کی جوابی کارروائی کرنا چاہتے تھے اس بات سے وہ تینوں بے خبر تھے اور آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

آؤٹر سگنل کے پاس پہنچ کر وہ پھر ریلوے لائن پر آ گئے۔ انجن کی روشنی وہاں تک نہیں آ رہی تھی۔ راستہ سیدھا اور صاف تھا۔ وہ کیچڑ پانی سے محفوظ ہو گئے تھے۔ اس لیے اب تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ مال گاڑی اسی اسٹیشن پر رُک رہ گئی تھی۔ اس مہاجن کو اچھا موقع مل گیا تھا جتنی دیر وہ لگا سکتا تھا اتنی دیر میں اس کی باقی بوریوں میں ملاوٹ ہو سکتی تھی۔

تقریباً پانچ میل تک چلتے رہنے کے بعد انھیں سامنے سے ایک ٹرین آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ فوراً ہی ریلوے لائن چھوڑ کر دور چلے گئے۔ ایک جھاڑی کے پیچھے جا کر چھپ گئے۔ وہ پسنجر ٹرین تھی۔ اس میں بیٹھے ہوئے مسافر نظر آ رہے تھے۔ گاڑی جلد ہی ان کے سامنے سے گزر گئی۔ وہ بہت ہی مختصر سی ٹرین تھی اور یہ وہی ٹرین تھی جس کا آخری حصہ اس سے الگ کر دیا گیا تھا۔

اس کے گزرنے کے بعد وہ پھر جھاڑیوں سے نکل آئے۔ ریلوے لائن پر چلنے لگے۔ سکندر نے کہا: "یہ درست ہے کہ تم ہم دونوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہو کسی کا دل دُکھانا نہیں چاہتیں۔ لیکن کچھ تباؤ تو سہی کہ کون ہو؟"

کلیم الدین بھویاں نے کہا: "چلو اپنا نام بتا سکتی ہو تو بتا دو۔"

وہ تھوڑی دور تک چپ چاپ چلتی رہی پھر اس کے مُنہ سے کچھ عجیب سی آوازیں نکلیں۔ وہ توجہ سے سننے لگے۔ وہ کہہ رہی تھی: "میں۔ ڑا۔ ڑاپ۔ اوڑما ہے۔"

اس کی کٹی ہوئی زبان سے 'ڑ' کا حرف زیادہ ادا ہوتا تھا۔ اور جہاں ہونٹوں کے ملنے سے حرف ادا ہوتے تھے وہ سمجھ میں آ جاتے تھے۔ اس کے باوجود اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ سکندر نے چلتے چلتے پوچھا: "پھر بولو۔ کیا کہہ رہی ہو؟"

اس نے پھر اسی انداز میں اپنی بات دُہرائی کلیم الدین بھویاں نے کہا: "یہ اپنا نام بتا رہی ہے۔"

"مگر کیا نام بتا رہی ہو۔ بھئی تم اتنی لمبی بات نہ بولو۔ صرف نام بتاؤ۔"

اس نے کہا: "اوڑما۔"

"بھلا یہ کوئی نام ہے۔ اَڑما کیا ہوتا ہے؟"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ کوئی ایسا نام جس کے آخر میں ما آتا ہو۔"

پھر سکندر نے پوچھا: "تمھارا نام نجمہ ہے؟"

گونگی نے انکار میں سر ہلایا۔ کلیم الدین بھویاں نے کچھ سوچ کر پوچھا: "تمھارا نام سلمہ ہے؟"

گونگی نے پھر انکار میں سر ہلایا۔ وہ دونوں قدم قدم اس کے ساتھ بڑھتے رہے اور سوچ سوچ کر ایک ایک نام ادا کرتے رہے۔ فاطمہ، ناظمہ، صائمہ۔ پھر کلیم الدین بھویاں نے جھنجلا کر کہا: "بھئی اور ایسا کون سا نام ہے جس کے آخر میں ما آتا ہے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم تمھیں ماں کہنے لگیں۔"

سکندر نے کچھ سوچ کر کہا: "یہ اپنے آپ کو اوڑما کہہ رہی ہے لہٰذا اوڑما کے وزن پر کوئی نام تلاش کرنا چاہیے۔ اس کا نام اوسے شروع ہوتا ہے اور ما پر ختم ہوتا ہے۔"

وہ تینوں چلتے چلتے ٹھٹک گئے اس نام پر غور کرنا بھول گئے کیوں کہ سامنے ہی ذرا دور ٹارچ کی کچھ روشنیاں جھلکتی ہوئی دکھائی دیں۔ اِدھر سے اُدھر گزرنے والی روشنیوں میں پسنجر ٹرین کی دو بوگیاں اور مال گاڑی کے کچھ ڈبے نظر آ گئے۔ پھر اچانک ہی فائرنگ شروع ہو گئی۔ وہ گونگی کو لائن سے اتار کر ایک طرف لے گئے۔ ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے جا کر دُبک گئے۔ آوازیں سننے لگے۔ کسی کے کچھ بولنے کی آواز سُنائی دے رہی تھی لیکن وہ بات فائرنگ کی آواز کے ساتھ گڈمڈ ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا۔

تاریکی گہری تاریکی کمپارٹمنٹ کے اندر ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ زرین تارا خسرو کے قدموں سے لپٹ کر رو رہی تھی: "نہیں میں تمھیں نہیں جانے دوں گی۔ ہم جئیں گے ایک ساتھ، مریں گے ایک ساتھ۔"

باہر سے قہقہے سنائی دیے: "اچھا تو یہ ہماری بھاشا بول رہی ہے۔"

منٹو دادا نے چیخ کر کہا: "خسرو! اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس لڑکی اور اٹیچی کے ساتھ باہر آ جاؤ۔ ہم دونوں کو جان سے نہیں ماریں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔ جلدی کرو، ورنہ اگلے پچھلے اسٹیشن سے لوگ آ جائیں گے۔"

خسرو وقت ضائع کرنا چاہتا تھا۔ اسی انتظار میں تھا کہ کہیں

سے کوئی مدد آ پہنچے۔ اسی لیے وہ نین تارا کے ساتھ چپ چاپ بیٹھا رہا تھا۔ اسی وقت ہٹا ئیں سے پھر ایک گولی چلی اور کھڑکی سے اس کے ٹکرانے کی آواز سُنائی دی۔ خسرو نے تاریکی میں اندھے کی طرح دیکھتے ہوئے کہا: "نین تارا! یاد ہے تم نے کہا تھا، تم میرے ساتھ ساتھ چلتی رہو گی لیکن مصائب کے اندھیروں میں بھی اپنا ہاتھ مجھے نہیں پکڑنے دو گی۔ اب شاید یہ ہماری زندگی کا آخری اندھیرا ہے۔"

وہ تڑپ کر آگے بڑھی اور اندھیرے میں اس پر ڈھال بن کر بولی: "کوئی گولی آئے گی تو پہلے مجھے لگے گی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی جیسے کمپارٹمنٹ میں زلزلہ آ گیا۔ دونوں طرف سے کھڑکیوں کو توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ان سے دروازے نہیں کھل رہے تھے۔ اس لیے وہ کھڑکیوں پر غصّہ اتار رہے تھے . . . . . . خسرو نے نین تارا کو سمجھایا۔ "یہاں زمین پر چپ چاپ لیٹی رہو۔ اپنی جگہ سے نہ ہلنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اس نے ہاتھ پکڑ کر کہا: "نہیں خسرو! نہ جاؤ۔ میرے پاس آؤ۔"

وہ اس کے ہاتھ کو تھپک کر اپنے ہاتھ کو چھڑاتے ہوئے بولا: "میں مرد ہوں۔ بزدلوں کی طرح مرنا نہیں چاہتا۔ زندگی کے لیے لڑتے رہنا ہمارا تمھارا فرض ہے۔"

وہ فرش پر رینگتے ہوئے دروازے کے قریب آ گیا۔ اسی وقت کھڑکی میں شگاف پڑ گیا۔ رائفل کی ایک نال گھستی ہوئی اندر آ گئی۔ خسرو نے فوراً ہی ایک ہاتھ سے اس نال کو اوپر کی طرف اُٹھا دیا۔ "ٹھائیں" سے گولی چلی، جو چھت کی طرف گئی۔ لیکن نین تارا کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکل گئی: "بچاؤ۔ خدا کے لیے ہمیں بچاؤ۔ اتنی بڑی دُنیا میں کسی کو تو خدا کا خوف ہو گا۔ کوئی تو آ کر ہماری مدد کرے۔ بچاؤ خدا کے لیے بچاؤ۔"

وہ کمپارٹمنٹ کے فرش پر جنونی انداز میں ہاتھ مار رہی تھی۔ ایک بار پھر گولی چلی۔ ایک بار پھر وہ ہذیانی انداز میں چیخ پڑی۔ "بچا . . . او . . . . او . . . او . . . ."

اس کی چیخ بندوق کی گولی کی طرح سنسناتی ہوئی سکندر تک پہنچی: "بچاؤ . . . . بچاؤ . . . . بچاؤ . . . ." اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ چشم زدن میں زیبی نگاہوں کے سامنے چیخنے لگی۔

قد آدم شعلے بھڑک رہے تھے۔ زیبی سر تا پا جل رہی تھی۔ دیوانہ وار قہقہے لگا رہی تھی: "ہا ہا ہا۔ مجھے جلاؤ۔ نفرت کے شعلوں میں جلاؤ۔"

سکندر ایک دم سے تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ زیبی شعلوں میں گھری ہوئی چیخ رہی تھی: "میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے بچاؤ . . . بچاؤ . . . بچاؤ . . . ."

وہ دوڑتے ہوئے چیخنے لگا: "زیبی! میں آ رہا ہوں۔ اس بار تم نہیں جلو گی۔ تم نہیں مرو گی۔"

وہ جنون کی حالت میں دوڑتا ہوا، اسٹین گن سے فائرنگ کرتا ہوا کمپارٹمنٹ کے قریب پہنچنے لگا۔ تڑتڑاتڑ کی آواز کے ساتھ کتنی ہی چیخیں سُنائی دیں۔ اس کے بعد چند لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا۔ جیسے وہاں کوئی زندہ نہ ہو۔ سب اپنے انجام کو پہنچ گئے ہوں۔ اس کی اچانک فائرنگ نے بہتوں کو موت کی نیند سُلا دیا تھا۔

لیکن ابھی زندگی کے آثار تھے۔ اندھیرے میں ریلوے لائن کے پاس آواز سُنائی دی۔ اس نے گھوم کر اُدھر فائرنگ کی لیکن وہ دھوکہ تھا۔ کسی نے ریلوے لائن کے پاس ایک پتھر پھینک کر اس کی توجہ ہٹائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دشمن نے گولی چلائی۔ سکندر کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ وہ لڑکھڑا کر ذرا پیچھے گیا۔ گولی کا زخم ناقابلِ برداشت تھا۔ پھر بھی اس نے اسٹین گن کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کی۔ شاید وہ فائر بھی کرتا لیکن دوسری گولی اس کے سینے میں اُتر گئی۔

ہاتھ سے اسٹین گن چھُوٹ گئی۔ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ ڈگمگانے لگا جیسے پاؤں رکھنے کے لیے سچ مچ زمین نہ مل رہی ہو۔ پھر وہ پیچھے کی طرف جا کر گر پڑا۔ فائرنگ کے بعد جو سناٹا چھا جاتا ہے، وہ موت سے زیادہ ہیبت ناک لگتا ہے۔ وہی سناٹا کتنی ہی دیر تک چھایا رہا۔

پھر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ بھاری بھرکم فوجی بوٹوں کی آواز تھی۔ کوئی اس کی طرف آ رہا تھا مگر سنبھل سنبھل کر آ رہا تھا جیسے خوف زدہ ہو۔ پھر اس نے دور ہی سے ٹارچ روشن کی۔ اس کی روشنی میں سکندر نظر آیا۔

وہ سنگ میل سے ٹیک لگا کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ اس کا ہاتھ سینے پر تھا اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی اور قریب آئی، اور وضاحت سے معلوم ہوا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کا سینہ لہو سے تر ہو رہا تھا۔

طویل خاموشی کے بعد منّو دادا کی آواز سُنائی دی۔ وہ حقارت سے کہہ رہا تھا: "سوّر پر باچا مورے گیچھے۔ آخ تھو . . . ."

بے شک آدمی مر گیا تھا۔ ضمیر پوری طرح نہیں مرا تھا۔ اس کے مُردہ ہاتھ میں اچانک ہی جانے کہاں سے جان آئی۔ وہ ہاتھ چہرے تک پہنچا۔ پھر چہرے کو پونچھتے پونچھتے موت کی گود میں ڈھلک گیا۔

"اے خاکِ آدم! تیرے ضمیر کو سلام"

اچانک بارش ہونے لگی۔ مسلسل ٹرانے والے مینڈک تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ جھینگروں کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ اس ویرانے میں چاروں طرف گہری تاریکی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دو بوگیوں کے مختلف کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے مسافر مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے سب سہمے ہوئے تھے جیسے انھیں برسوں سے، مدتوں سے بولنا نہ آتا ہو۔

منشو دادا نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے پھر ایک بار سکندر حیات کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا لاش پھر حرکت کر سکتی ہے۔ لیکن اب وہ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا تھا۔ پھر اس نے ٹارچ کی روشنی کو دوسری طرف پھینکا۔ اِدھر اُدھر کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ لاشیں منشو دادا کے ساتھیوں کی تھیں۔ سکندر حیات نے ایک ہی برسٹ میں کتنوں کو مار گرایا تھا۔

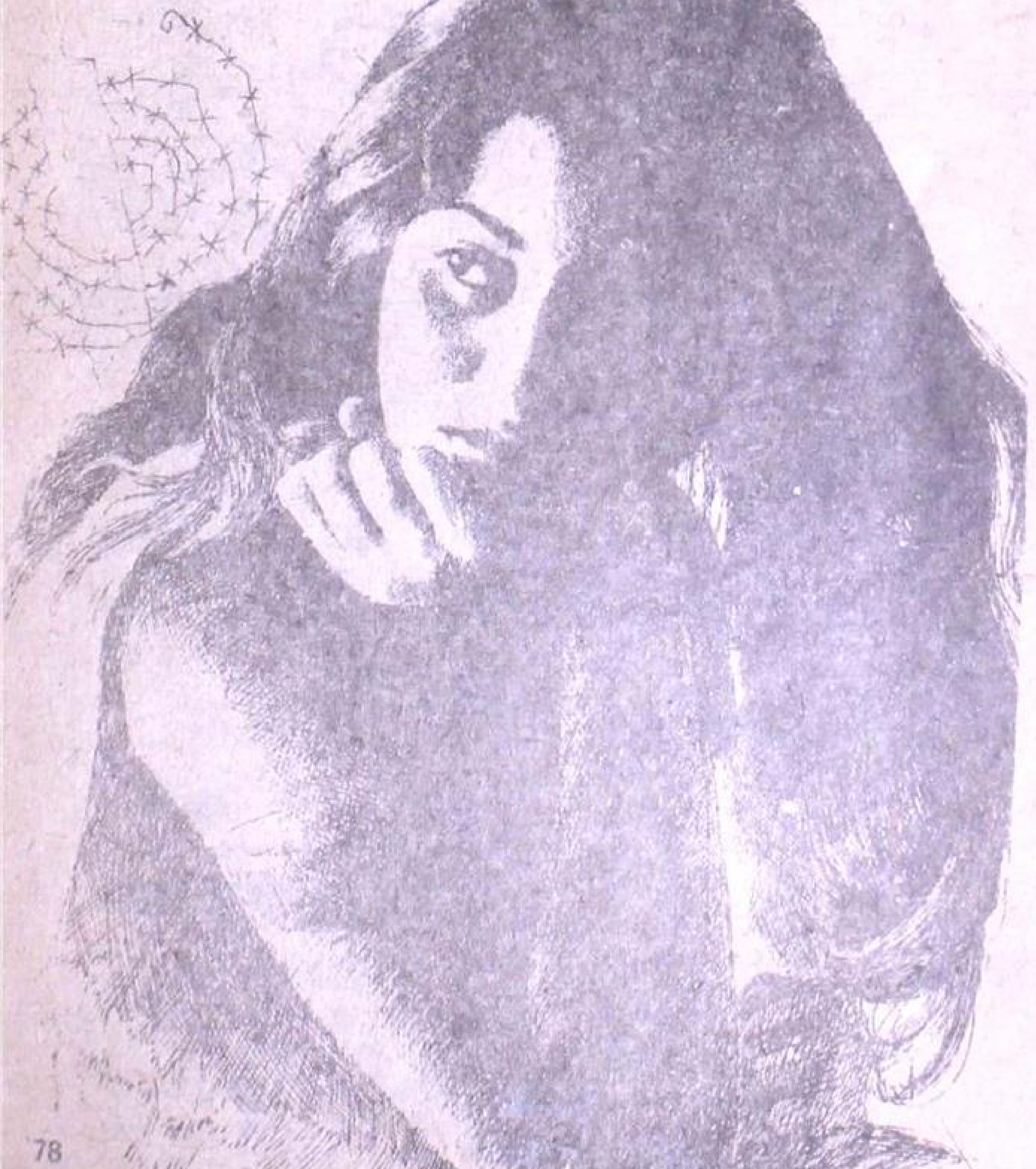

اس نے پھر نفرت سے سکندر حیات کو گالی دی۔ اسے خیال آیا۔ اس کے دو ساتھی گاڑی کے دوسری طرف گئے تھے۔ تاکہ خسرو کے کمپارٹمنٹ کے دوسرے دروازے کو کھول سکیں۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی: "جاوید! تمی کوتھائے؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے دوسرے ساتھی کو آواز دی: "وکرم! تمی جواب دؤ۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہوا۔ کان لگا کر سننے لگا۔ اسے اپنے ساتھیوں میں نہ تو جاوید کی آواز سنائی دی۔ نہ ہی وکرم نے جواب دیا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ چاروں طرف گھوم کر ٹارچ روشن کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ دوستوں میں سے کوئی نہیں رہا تھا۔ ویسے دشمن بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ پھر فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے سامنے آگیا۔ زور سے چیخ کر بولا: "خسرو! تماکے لاسٹ وارننگ دیتے چھی۔ دارجا کھلے داؤ (خسرو تمھیں آخری وارننگ دے رہا ہوں دروازہ کھول دو)۔"

فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی کھڑکی کے شگاف میں ایک رائفل پھنسی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس کے ایک ساتھی نے رائفل سے سنگین لگا لگا کر کھڑکی میں اس حد تک سوراخ کر دیا تھا کہ اس کے اندر رائفل کی نالی ڈال کر فائر کر سکے اور اس کے ساتھی نے فائر کیا تھا لیکن اچانک باہر سے مخالفانہ فائرنگ کی زد میں آکر گر پڑا تھا۔ رائفل وہیں اٹکی رہ گئی تھی۔ منشو دادا نے ذرا دیر اپنی بات کے جواب کا انتظار کیا۔ پھر تڑاتڑ فائرنگ شروع کر دی۔ اسٹین گن سے نکلی ہوئی گولیاں کمپارٹمنٹ کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔

پھر فائرنگ بند ہو گئی۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ غصے سے ہانپنے لگا۔ ذرا دیر بعد اس نے کان لگا کر سنا کسی عورت کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پہلے یہ سمجھ میں آیا کہ کمپارٹمنٹ کے اندر خسرو کے ساتھ والی وہ حسین لڑکی رو رہی ہے۔ شاید اسے گولی لگی ہو۔ پھر وہ چونک گیا۔ رونے کی آواز کمپارٹمنٹ کے اندر سے نہیں بلکہ کھلی فضا سے آ رہی تھی۔ اسی سگنل کی طرف سے جہاں وہ لاش پڑی ہوئی تھی۔ منشو دادا نے فوراً ہی ٹارچ روشن کر کے دیکھا۔ وہاں سگنل کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس نے سکندر کے سر کو اپنے سینے پر رکھ لیا کبھی ممتا بھرے انداز میں اسے سہلا رہی تھی اور کبھی یوں چوم رہی تھی جیسے بیٹے کی لاش کو آخری بوسہ دے رہی ہو۔ پھر وہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر زور زور سے کہنے لگی: "آمیاں لے کیا ہوٹا ہے۔ محبت کرنے والے ٹاڈا کرنے والے سزا کیوں پاتے ہیں (اللہ میاں یہ کیا ہو رہا ہے محبت کرنے والے، توبہ کرنے والے سزا کیوں پاتے ہیں؟)"

منشو دادا ایک ہاتھ میں اسٹین گن اور دوسرے میں ٹارچ پکڑے ہوئے شدید حیرانی سے اس عورت کی بولی سن رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایسی بھاشا سننے میں آئی تھی۔ وہ سوچنے لگا آخر یہ کون سی زبان بول رہی ہے؟ بارش کا زور کم ہو گیا تھا۔ وہ ماتم کرنے والی بھیگ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ اس نے ذرا آگے بڑھ کر ڈانٹتے ہوئے پوچھا: "اے تمی کی بولتے چھو؟ (اے تم کیا بول رہی ہو؟) یہ کس دیش کی بھاشا ہے؟"

اس کی بات ختم ہوتے ہی پیچھے سے آواز سنائی دی۔ "ہالٹ۔ ذرا بھی حرکت کی تو ابھی زمین پر تڑپتے ہوئے نظر آؤ گے۔"

منشو دادا جیسا تھا، ویسا ہی ساکت رہ گیا پھر حکم دیا گیا۔ "اپنی اسٹین گن ایک طرف پھینک دو۔"

وہ ہچکچانے لگا۔ سختی سے کہا گیا: "اب تم نے حکم کی تعمیل نہ کی تو گولی چل جائے گی۔"

اس نے فوراً ہی اسٹین گن کو پھینکتے ہوئے کہا: "تم بنگالی بھاشا بول رہے ہو۔ اپنے ہی آدمی ہو پھر یہ دشمنی کیسی؟"

"تم نے ٹھیک سمجھا۔ میں بنگالی ہوں۔ میرا نام کلیم الدین بھویاں ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو گھر کے ہوتے ہیں نہ گھاٹ کے۔ میں ان بہت سے بنگالیوں میں سے ایک ہوں، جنھوں نے حکومت پاکستان سے وفاداری کی۔ میرے والد سلیم الدین بھویاں ایک معزز جج تھے۔ حکومت پاکستان کے قوانین کا احترام کرتے تھے۔ حکمراں چلے گئے۔ ہم حرام موت مرنے کے لیے رہ گئے ہیں۔"

منشو دادا نے مسکرا کر کہا: "پھر تو تم قابل رحم ہو۔ میں تمھیں نیا دوست، اپنا بھائی کہتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ٹارچ کی روشنی کے ساتھ پلٹنا چاہتا تھا۔ کلیم الدین بھویاں نے ڈانٹ کر کہا: "خبردار! اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔ ٹارچ کی روشنی زمین کی طرف رکھو اور میری طرف گھوم جاؤ۔ یاد رہے روشنی جیسے ہی میرے منہ پر آئے گی میں فائر کر دوں گا۔"

اس نے چپ چاپ حکم کی تعمیل کی۔ ٹارچ کی روشنی کو زمین پر رکھا۔ اس کی طرف گھوم کر دیکھا۔ کلیم الدین جو سگنل کی چھتری پر بیٹھا ہوا تھا۔ بجلی کے ایک آہنی پائپ سے ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھوں میں اسٹین گن تھی اور اس کا رخ ٹارچ والے کی طرف تھا۔ اس نے کہا: "ابھی تم اس عورت سے پوچھ رہے تھے کہ وہ کس دیش کی بھاشا بول رہی ہے؟ کیا تم اس کی کہی ہوئی زبان نہیں سمجھ سکتے؟ اگر ہم میں سے

کوئی نہیں سمجھ سکتا تو پھر یہ زبان اس کے منہ میں کس نے رکھی ؟ یہ زبان جانوروں کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتی سمجھ میں نہیں آتا ہم انسان کیا ہیں ؟ ہم طوطے مینا کو بولنا سکھاتے ہیں اور کبھی بولنے والی مینا کی زبان کاٹ کر پھینک دیتے ہیں۔ ہم آخر کیا ہیں ؟"

" ہاں۔ یہ بات بڑی افسوسناک ہے لیکن دوست ! ہم نے تو اس کی زبان نہیں کاٹی ہے "

بھوتیاں نے چیخ کر کہا " ہم نے کاٹی ہے۔ ہم سب نے کاٹی ہے جس کے پاس ہتھیار ہے، اس نے کاٹی ہے۔ میں کہتا ہوں۔ تمام لوگوں سے ہتھیار چھین لو۔ کسی کے پاس ایک چاقو تک نہ رہے تو آدمی کتنا لڑے گا ؟ ــــ لڑے گا تو کتے کی طرح بھونکے گا یا بلی کی طرح پنجے مارے گا پھر صبر کر کے رہ جائے گا۔ یہ ظلم، یہ غیر انسانی سلوک تو کسی کے ساتھ نہیں ہو سکے گا "

" تم درست کہتے ہو۔ کیا میں اپنی گن اٹھا لوں ؟"

" ویسے ہی کھڑے رہو۔ تم نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ عورت جس کے لیے رو رہی ہے۔ وہ اس کا کون ہے ؟"

" جانے بھی دو۔ وقت ضائع ہو رہا ہے۔ یہاں اگلے یا پچھلے اسٹیشن سے لوگ آجائیں گے "

" آنے دو پہلے سن لو۔ جس کو تم نے گولی ماری ہے۔ وہ میرا چند لمحوں کا ساتھی رہا ہے لیکن جیسے صدیوں سے ہمارا ساتھ رہا تھا۔ میں چلتی ہوئی مال گاڑی سے گرنے والا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر ڈبے کے اندر کھینچ لیا۔ میری جان بچائی۔ اس کا قرض مجھ پر ہے۔ تم بتاؤ کیا مجھے وہ قرض نہیں اتارنا چاہیے ؟"

منٹو دادا نے تھوک نگلتے ہوئے کہا " ہاں اگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ تمہارا محسن رہ چکا ہے "

" اگر معلوم ہوتا تو میرے محسن کے ہاتھوں راضی خوشی گولی کھا کر یہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ لیٹ جاتے ؟ بکواس مت کرو۔ میں جو کہہ رہا ہوں سنو۔ یہ جو عورت ہمارے سامنے رو رہی ہے۔ اس سے ہمارا خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ مجھے اور سکندر کو یہ اچانک ایسے مل گئی جیسے راستے میں روپے سے بھری تھیلی مل جائے۔ ہم نے اسے جوا سے کا مال سمجھ لیا۔ میں اسے بنگال کہہ کر اپنانا چاہتا تھا اور سکندر اسے بہاری سمجھ کر اپنی ملکیت بنانا چاہتا تھا لیکن یہ دونوں سے راضی تھی۔ عورت ایک سے راضی ہو تو محبوبہ۔ دو چار سے راضی ہو تو بہن اور سبھی سے راضی ہو تو ماں کہلاتی ہے۔ وہ دیکھو جو عورت ہمارے تنازعہ کا باعث تھی۔ وہ ہم میں سے ایک پر ماں کی طرح آنسو بہا رہی ہے "

خسرو نے اپنے کمپارٹمنٹ کے دروازے کو آہستگی سے ذرا کھول دیا تھا۔ اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ سارے دشمن مارے گئے ہیں۔ صرف منٹو دادا کی آواز آ رہی تھی لیکن اب اس کی آواز میں رعب اور دبدبہ نہیں تھا۔ وہ بھوتیاں کے سامنے مجبور اور بے بس ہو گیا تھا۔ خسرو کے جی میں آیا کہ بھوتیاں کو دوستانہ انداز میں مخاطب کرے۔ وہ اسے آواز دینا چاہتا تھا۔ پھر رک گیا۔ کیونکہ کمپارٹمنٹ کے نیچے ریلوے لائن کے پاس ایک ہلکی سی آواز سنائی دی تھی جیسے کوئی چیز حرکت کر رہی ہو۔

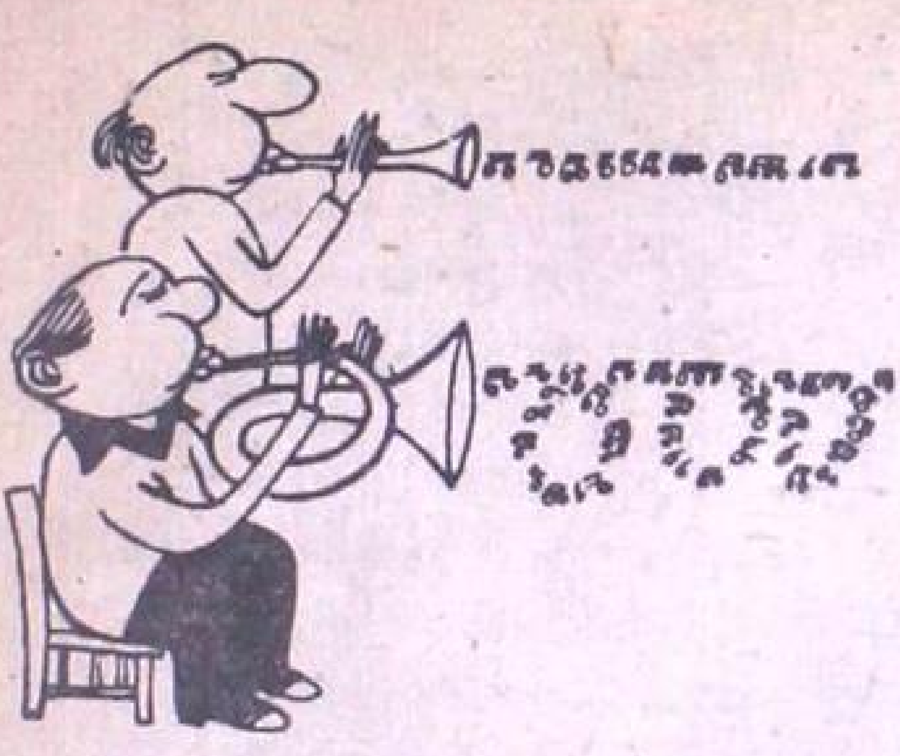

اس نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پوری توجہ سے دیکھا۔ کوئی سایہ سا ــــ ٹرین کے نیچے سے نکل رہا تھا۔ پہلے وہ رینگ کر باہر آیا پھر آہستگی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ــــ اس کے ہاتھ میں ہتھیار تھا۔ اس نے اُدھر ایک قدم بڑھایا جدھر سے کلیم الدین بھوتیاں کی آواز آ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ منٹو دادا کا آدمی تھا اور بھوتیاں پر پیچھے سے حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن ایک قدم بڑھنے کے بعد پھر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

سوچنا کیا تھا۔ اس کے منٹو دادا کی جان خطرے میں تھی کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اس لیے اس نے دوسرا قدم بڑھایا۔ اسی لمحے خسرو نے یکبارگی اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس طرح کہ اس کے دونوں بازو اس کی گرفت میں رہیں تاکہ وہ ہتھیار کو استعمال نہ کر سکے۔ صحیح پلاننگ کے ساتھ صحیح وقت پر عمل کیا جائے تو ناکامی نہیں ہوتی خسرو اس سے لپٹ کر ایک طرف گرتا ہوا ڈھلان سے لڑھکتا ہوا پانی میں چلا گیا۔

کلیم الدین بھوتیاں نے لڑنے جھگڑنے کی آواز سن کر فوراً ہی اسٹین گن کا رخ اُدھر کیا۔ بھوتیاں کے پینترا بدلتے ہی منٹو دادا نے اپنی اسٹین گن کی طرف چھلانگ لگائی۔ پینترا بدلنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ تڑ تڑ تڑ کی مسلسل فائرنگ ہونے لگی۔

اس کے ساتھ ہی منشوداد کی چیخیں گونجنے لگیں۔ وہ گولیوں کی زد میں آکر ذرا دور لڑھکتا ہوا گیا پھر زمین پر گر کر ساکت ہو گیا

دوسری طرف سے خسرو نے لڑتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"بھٹویاں! ادھر فائر نہ کرنا۔ میں دشمن سے نمٹ لوں گا۔"

کلیم الدین بھٹویاں نے ٹارچ زمین پر سے اٹھالی۔ اسے لے کر ٹرین کے نیچے آیا۔ پھر ایک آہنی پہیے کے پیچھے چھپ کر ٹارچ کی روشنی ادھر پھینکی۔ اس روشنی میں دو قد آور نوجوان لڑتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان میں سے خسرو کون تھا؟ یہ کلیم الدین بھٹویاں نہیں جانتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔

خسرو سے لڑنے والا کسی طرح کم نہیں تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں میں آخری آدمی تھا جو اپنی زندگی کے لیے لڑ رہا تھا۔ اس لیے مر جانا چاہتا تھا یا مار ڈالنا چاہتا تھا۔ جس وقت خسرو نے اس پر چھلانگ لگائی تھی، اسی وقت اس کے ہاتھ سے ہتھیار نکل گیا تھا۔ ورنہ اتنی دیر تک ہاتھا پائی نہ ہوتی۔

خسرو کو بھی نین تارا کے ساتھ ایک نئی زندگی ملی تھی۔ اتنے سارے دشمنوں میں گھر جانے کے بعد بچنے کی امید نہیں تھی۔ اب امید ہو چلی تھی۔ وہ بھی اپنی جان کی بازی لگا رہا تھا۔ دونوں میں کبھی مکے بازی ہو رہی تھی۔ کبھی کشتی کا داؤ آزمایا جا رہا تھا۔ کیچڑ اور پانی میں لت پت ہو رہے تھے۔ کبھی اٹھ رہے تھے کبھی گر رہے تھے۔ پھر کلیم الدین بھٹویاں نے للکار کر کہا: "رک جاؤ۔ ورنہ میں گولی چلاؤں گا۔"

خسرو رک گیا لیکن دوسرے نے دھمکی سنتے ہی کھیتوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ ٹارچ کی روشنی جہاں تک جا رہی تھی وہاں تک وہ گرتا پڑتا بھاگتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وہ روشنی کی حد سے آگے نکل گیا۔ تاریکی میں گم ہو گیا۔ اس نے ٹارچ روشن رکھی تاکہ بھاگنے والا دہشت میں مبتلا رہے اور روشنی کی طرف واپس نہ آئے۔

کمپارٹمنٹ کے کھلے ہوئے دروازے پر نین تارا کھڑی ہوئی تھی اور روشنی میں خسرو کو اپنی طرف آتے دیکھ رہی تھی۔ وہ بارش میں بھیگ رہا تھا اور اپنے کپڑوں سے کیچڑ کو صاف کرتا آ رہا تھا۔ بارش میں غسل بھی ہو رہا تھا۔ پھر ٹارچ کی روشنی ادھر سے سرک گئی تیزی سے رینگتے ہوئے گونگی تک پہنچ گئی۔ نین تارا بہت دیر سے گونگی کے متعلق بھٹویاں کی زبان سے سنتی رہی تھی۔ اسے ٹارچ کی روشنی میں دیکھتے ہی کمپارٹمنٹ سے باہر آگئی۔ سیڑھی سے اتر کر ادھر بھاگی۔ کلیم الدین بھٹویاں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر ایک لڑکی کو دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔

اس نے ٹارچ کی روشنی میں اسے گونگی تک پہنچا دیا۔

نین تارا اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ گونگی کے آنسو تھم گئے تھے۔ وہ سکندر کی لاش کے سرہانے سوگوار بیٹھی ہوئی تھی۔

نین تارا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "بہن! میں تمہارے دکھ کو سمجھتی ہوں۔ اس لیے کہ میں بھی دکھ ہی دکھ اٹھاتی آ رہی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ تم بہت دیر سے بھیگ رہی ہو۔"

کچھ مسافر اپنے اپنے کمپارٹمنٹ سے باہر آگئے تھے۔ جو کچھ ہو رہا تھا، اس پر تبصرے کر رہے تھے۔ کلیم الدین بھٹویاں اور خسرو کی تعریفیں کر رہے تھے جس محافظ سپاہی نے ہتھیار پھینکا تھا، وہ اپنی صفائی میں بیان دے رہا تھا۔ خسرو نے کہا: "کوئی بات نہیں حالات بڑے بڑوں کو مجبور کر دیتے ہیں۔ جب ملکوں کی فوجیں ہتھیار ڈال دیتی ہیں تو تم ویسے بھی ایک تنہا سپاہی تھے، بھلا کیا کر سکتے تھے؟"

نین تارا گونگی کو اپنے کمپارٹمنٹ میں لے آئی۔ وہاں اور زیادہ تاریکی تھی لیکن جانتی تھی کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر برتھ پر بٹھاتے ہوئے کہا: "یہاں بیٹھو اور مجھے کسی طرح بتاؤ کہ تم کون ہو؟ کہاں جانا چاہتی ہو؟ یہاں ان لوگوں کے ساتھ کہاں سے آ رہی تھیں؟"

اس نے جواب میں وہی "ڑ" والی بولی شروع کی۔ مجبور تھی۔ کٹی ہوئی زبان سے ڑ کا حرف زیادہ ادا ہوتا تھا۔ سنتے وقت یوں لگتا تھا جیسے خالی ہانڈی میں چھوٹے چھوٹے پتھر ڈال کر اسے ہلایا جا رہا ہے اور گڑ بڑ گڑ بڑ سی آواز سنائی دے رہی ہے۔

نین تارا نے گہری ہمدردی سے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ پھر اس ہاتھ کو اپنے سینے سے لگا کر بولی: "آہ! کس ظالم نے تمہاری زبان چھین لی ہے۔ تم ایسی بدنصیب ہو کہ اپنا دکھڑا بھی نہیں رو سکتیں۔ کیا تم لکھنا پڑھنا جانتی ہو؟"

گونگی نے انکار میں سر ہلایا لیکن تاریکی میں اس کا انکار دکھائی نہیں دیا۔ باہر اچانک لوگوں میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ دور سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ ٹرین کا جو اگلا حصہ کٹ کر اگلے اسٹیشن تک پہنچ گیا تھا۔ وہ واپس آ رہا تھا۔ کتنے ہی کمپارٹمنٹ کے کھلے ہوئے دروازے اور کھڑکیوں سے ٹارچ کی روشنیاں پھینکی جا رہی تھی۔ ان روشنیوں میں مسلح فوجی نظر آ رہے تھے۔ ذرا قریب پہنچنے پر للکار کر کہا گیا: "خبردار! اگر یہاں مجرمانہ کارروائی جاری ہے تو حکم دیا جاتا ہے، ہتھیار پھینک دیے جائیں۔"

وہ گاڑی قریب آکر رک گئی۔ لوگوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر

یقین دلایا کہ اب یہاں کوئی غنڈہ بدمعاش نہیں رہا ہے۔ فوجی گاڑی سے اتر کر ان کی طرف آئے پھر ان کے بیانات سننے لگے۔ اس دوران گاڑی کو کٹے ہوئے حصے سے جوڑا جا رہا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام کمپارٹمنٹ روشن ہوگئے۔

نین تارا نے پہلے اسے ٹارچ کی روشنی میں سرسری طور پر دیکھا تھا۔ کمپارٹمنٹ روشن ہوتے ہی اسے تفصیل سے دیکھا پھر بولی ”معلوم ہوتا ہے کئی دنوں سے تمھیں غسل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ دیکھو تو کیسی حالت ہوگئی ہے۔ کپڑے بھی پہننے کے قابل نہیں رہے۔ میرے پاس ساڑی، پیٹی کوٹ اور بلاؤز ہے۔ تمھارا بدن مجھ سے بھاری ہے مگر کام چل جائے گا۔“

اس نے اپنی اٹیچی کھولی پھر اس میں سے ساڑی، پیٹی کوٹ اور بلاؤز نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”اسے لے کر غسل خانے میں چلی جاؤ۔ خوب اچھی طرح رگڑ رگڑ کر بدن صاف کرو۔ اگلے اسٹیشن پر تمھیں گرما گرم چائے پلاؤں گی۔ کیا تم نے کچھ کھایا ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کپڑے لے کر وہاں سے اٹھ گئی۔ ٹوائلٹ کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ اسی وقت باہر کچھ شور سنائی دیا۔ لوگ اونچی آواز میں کچھ بول رہے تھے۔ نین تارا نے کھڑکی کے پاس آکر دیکھا۔ معلوم ہوا، وہ لوگ کسی کو تلاش کر رہے ہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا۔
”ابھی تو وہ یہاں تھا۔“

دوسرے نے کہا ”ہاں، جب یہ گاڑی آکر ہماری بوگی سے لگی، اس وقت میں نے بھی دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ دکھائی نہیں دیا۔“

خسرو نے کہا ”تعجب ہے۔ وہ ہمارا محسن تھا۔ مجرم نہیں تھا۔ پھر کہاں چھپ گیا؟“

کچھ لوگ مسلح فوجیوں کے ساتھ ٹرین کے آس پاس آگے پیچھے، ذرا دور تک جا کر اسے تلاش کر رہے تھے لیکن وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

کلیم الدین بھوتیاں دوڑتے دوڑتے تھک گیا۔ نڈھال سا ہو کر ذرا آہستہ چلنے لگا۔ کہیں کیچڑ، کہیں گھٹنے تک پانی اور کہیں گہرے گڑھے تھے۔ وہ گرتا تھا۔ سنبھلتا تھا۔ اٹھتا تھا پھر بھاگنے لگتا تھا۔ وہ کبھی بھاگتے ہوئے، کبھی چلتے ہوئے ٹرین سے بہت دور چلا آیا۔ اندھیرے میں نہ اسے ٹرین نظر آ رہی تھی اور نہ وہاں کے مسافر اسے دیکھ سکتے تھے۔ البتہ کمپارٹمنٹ کی روشنیاں جگنو کی طرح ننھی ننھی سی نظر آ رہی تھیں۔ وہ تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔

اس کی تقدیر میں بھاگتے رہنا، چھپتے رہنا لکھا ہوا تھا۔ جب اس ٹرین کا اگلا حصہ اپنے پچھلے کٹے ہوئے حصے سے لگنے کے لیے واپس آ رہا تھا۔ تبھی وہ سمجھ گیا تھا کہ بی ڈی آر کے مسلح سپاہی بھی آ رہے ہوں گے۔ دیناج پور سے کر یہاں تک جتنے بھی بی ڈی آر اور مکتی باہنی کے جوان تھے، ان سے ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ پہچان نہ لیا جائے۔ کلیم الدین بھوتیاں جیسے جج کے فیملی ممبران کو بہت سے لوگ جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ پوری فیملی حکومتِ پاکستان کی وفادار رہی تھی۔ انھوں نے بنگالیوں کی ”سادھینتا سنگرام“ (آزادی کی تحریک) کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اس لیے غدار ٹھہرائے گئے تھے اور اب بھوتیاں کو اس کی سزا مل رہی تھی۔ جب تک وہ بنگلہ دیش کے اس شمالی حصے سے نکل کر ڈھاکا یا چٹاگانگ کی طرف نہ چلا جاتا، اس وقت تک پہچان لیے جانے کا دھڑکا لگا رہتا۔

اگر زندگی خالی، ویران اور بے کیف ہو تو مرنے سے ڈر نہیں لگتا اور اسی زندگی میں ذرا سی رنگینی پیدا ہو جائے، کہیں سے محبت کا ایک پھول کھلنے لگے تو مر کے بھی زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اس وقت وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ لیکن تاریکی میں اس کے سامنے گونگی کا چہرہ روشن تھا۔ کیسی پرکشش تھی۔ معلوم ہوتا تھا، زندگی ایک گونگے حسن کے روپ میں اسے للچانے اور حسنِ حیات کے لیے لڑتے رہنے کا حوصلہ دینے آئی تھی۔

ہاں، آئی تھی لیکن وہ اس سے بچھڑ کر دور چلا آیا تھا اور نہ جانے کتنی دور جانا تھا۔ اس کے دل سے ایک آہ نکلی۔ اس نے زیرِ لب کہا ”شاید کل ایسا ہی کوئی وقت تھا، جب وہ ملی تھی صرف چوبیس گھنٹے کا ساتھ رہا۔ میری ہمسفر! تم کون تھیں؟ کیا تھیں؟ کہاں سے آئی تھیں؟ اور اب آکر میرے دل سے کیوں نہیں جا رہی ہو؟“

اس نے سر اٹھا کر سوچا۔ اس کا نام کیا تھا۔ ہاں اس نے بتایا تھا ”اوڑما“ پتا نہیں یہ کیا نام ہے۔ سمجھ میں تو نہیں آیا مگر یہ نام بھی دل میں دھڑکتا ہے۔ نام کوئی سا ہو۔ سمجھ میں آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ اگر وہ نام محبت کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو زبان کاٹنے کے بعد بھی خوشبو کی طرح حواس پہ چھا جاتا ہے۔ پھول کی پتی پتی کاٹی جا سکتی ہے۔ لیکن آج تک خوشبو کو کوئی نہ کاٹ سکا۔

وہ تھکن سے چور ہو کر وہاں بیٹھا تھا پھر محبت سے

چکنا چور ہو کر وہاں سے اٹھ گیا۔ اس نے حسرت بھری نظروں سے دور ٹرین کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد سر جھکا کر دوسری طرف گھوم گیا۔ بوجھل قدموں سے جانے لگا۔ اس کے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ اس کے باوجود وہ اندھیرے کا مسافر نہیں تھا۔ اس کے سامنے وہ گونگا چہرہ روشن تھا اور دور تک راستہ دکھائی دے رہا تھا۔

ٹرین چل پڑی۔ خسرو ایک بی ڈی آر کے آفیسر کے ساتھ کمپارٹمنٹ کے اندر آ گیا۔ پھر اس نے نیمن تارا کو تنہا دیکھ کر پوچھا: "وہ عورت کہاں ہے؟"

"غسل خانے میں ہے۔"

"یہ آفیسر اس کا بیان لینا چاہتے ہیں۔ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کہاں سے آئی ہے اور اس کے ساتھ کون لوگ تھے؟"

نیمن تارا نے کہا: "لیکن وہ تو..."

خسرو نے بات کاٹ کر کہا: "میں آفیسر سے کہہ چکا ہوں اس کی بولی کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ وہ گونگی ہے۔"

"اسے گونگی نہ کہو، وہ زبان والی تھی۔ کسی نے اس کی زبان کاٹ دی۔"

آفیسر نے کہا: "ہمارے دیش میں لوگ جانور بن گئے ہیں۔ پتا نہیں ہم لوگ کس طرف جا رہے ہیں؟ ہماری منزل کہاں ہے؟"

آفیسر نے برتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیمن تارا سے کہا: "آپ بیٹھیں۔"

وہ برتھ کے ایک سرے پر بیٹھ گئی۔ گاڑی تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ خسرو اور آفیسر کلیم الدین جھوتیاں کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ اس کے اچانک غائب ہونے پر طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ خسرو نے کہا: "ہم کسی طرح معلوم نہیں کر سکتے کہ یہ عورت ان دو جوانوں کے ساتھ کہاں سے آ رہی تھی کیونکہ ایک مارا گیا ہے اور دوسرا فرار ہو گیا۔ تیسری جو ہمارے پاس ہے۔ وہ بے زبان ہے۔"

آفیسر نے پوچھا: "کیا وہ عورت بہاری ہے؟"

خسرو نے انکار میں سر ہلا کر کہا: "میں نہیں جانتا۔"

نیمن تارا نے کہا: "وہ کچھ بول نہیں سکتی ہے اور میں کسی طرح پوچھ نہ سکی۔"

گاڑی اگلے اسٹیشن پر پہنچ کر رک گئی۔ نیمن تارا نے حیرانی سے ٹوائلٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ یہ غسل کرنے گئی ہے اور ابھی تک نہیں نکل رہی ہے۔"

آفیسر نے کہا: "اسے اب تک باہر آ جانا چاہیے۔ دروازے پر ناک کرو۔"

خسرو نے آگے بڑھ کر دستک دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے آفیسر کو اور نیمن تارا کو دیکھا۔ نیمن تارا فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے پر آئی۔ زور زور سے دستک دینے لگی۔ اسے آوازیں دینے لگی: "سنو! کیا تم سن رہی ہو؟ وہاں کیا کر رہی ہو؟ بہت دیر ہو چکی ہے۔ باہر آؤ یا ہمیں اپنی آواز سناؤ۔"

تقریباً دو منٹ کی چیخ و پکار کے بعد اندر سے اس کی اوں آں سنائی دی۔ نیمن تارا نے دروازے سے کان لگا کر سنا۔ وہ کچھ گڑبڑ گڑبڑ بول رہی تھی۔ اس نے خسرو سے کہا: "تم اُدھر چلے جاؤ۔ میں دروازہ کھلواتی ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ نیمن تارا نے پھر دستک دے کر کہا: "دروازہ کھولو۔ میں اندر آنا چاہتی ہوں۔"

دروازہ ذرا سا کھل گیا۔ نیمن تارا نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہ ابھی تک اپنے کیچڑ آلود لباس میں تھی۔ جو لباس اسے دیا گیا تھا۔ وہ واش بیسن پر رکھا ہوا تھا۔ گونگی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی وہ نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ نیمن تارا ٹوائلٹ کے اندر آ گئی پھر اس نے پوچھا: "تم اتنی دیر تک کیا کر رہی تھیں؟ تم نے غسل بھی نہیں کیا ہے؟"

وہ ٹوائلٹ کے فرش پر بیٹھ گئی۔ اپنی اداؤں سے اور اشاروں کی زبان سے بتانے لگی۔ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر تھکن کے انداز میں کبھی اپنے سر کو اور کبھی اپنے پاؤں کو ہولے سے دابنے لگی۔ اس کے بعد ایک طرف سر ڈھلکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی گڑبڑ زبان میں کچھ بولتی جا رہی تھی۔ نیمن تارا اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا: "میں سمجھ گئی۔ شاید اس سے پہلے تمہیں کہیں سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس لیے تھکن کے مارے سو گئی تھیں۔ تم جلدی سے غسل کر لو، کپڑے بدل لو، پھر اوپری برتھ پر جا کر آرام سے سو جانا۔ کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔"

وہ دونوں باتھ روم کے فرش پر سے اٹھ گئیں۔ نیمن تارا اسے سمجھانے کے بعد جانا چاہتی تھی۔ دروازہ کھول کر باہر نکلتے نکلتے رک گئی۔

ٹرین ابھی تک کسی اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ خسرو چاہتا

تھا، آفیسر اس کمپارٹمنٹ سے چلا جائے۔ نین تارا کا حسن ڈرا رہا تھا۔ وہ کھلنا سے لے کر یہاں تک یہی دیکھتا آ رہا تھا کہ کمپارٹمنٹ کا دروازہ یا کھڑکی کھلتی تھی تو بی ڈی آر کے آفیسر یا دوسرے جوان بظاہر اس سے باتیں کرتے تھے لیکن چور نظروں سے نین تارا کو دیکھتے جاتے تھے۔ مکھیوں کو زیادہ سے زیادہ ہنکایا جا سکتا ہے لیکن مٹھاس کے آس پاس اڑنے سے روکا نہیں جا سکتا۔ وہ فوجی انھیں نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اگر نیت میں خرابی ہو تو ضروری نہیں ہے کہ عمل بھی خراب ہو جائے۔ کیونکہ تہذیب ہم انسانوں پر شرافت کا ڈی ڈی ٹی چھڑکتی رہتی ہے۔ ویسے ہم آج تک وہ جراثیم کش دوا ایجاد نہ کر سکے جو نیت کے جراثیم کو ہلاک کرتی ہو۔"

خسرو نے آفیسر سے کہا "ہم سب کچھ سمجھ سکتے ہیں لیکن آدمی کی نیت کو سمجھ نہیں پاتے۔"

آفیسر نے پوچھا "اس کا مطلب کیا ہوا؟"

خسرو کے سامنے تلسی رام اگروال کا چہرہ آ گیا۔ وہ اسے جیجا جی کہتا تھا۔ اس کی بڑو دیدی کا وہ دھرم پتی تھا لیکن وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نین تارا کے بارے میں اس کی نیت خراب ہو گی۔ اس نے کہا "میرا مطلب یہ ہے کہ کھلنا میں میرے ایک بزرگ تھے۔ ہمارے لیے بڑے محترم تھے۔ ہم ان کی عزت کرتے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ میری بیوی پر بری نیت رکھتے ہیں۔"

آفیسر نے اپنا ایک کان پکڑ کر کہا "اللہ معاف کرے۔ یہ کتنی بری بات ہے۔"

"بری بات اس وقت ہوتی ہے جب نیت بری ہوتی ہے۔ میں نے کہا نا، ہم آدمی کی نیت کو سمجھ نہیں سکتے۔ میں جب سے اپنی بیوی کے ساتھ بھٹک رہا ہوں، بس یہی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ سوچتا ہوں کس کی نیت جانے کیسی ہو؟"

آفیسر بے اختیار ٹوائلٹ کے بند دروازے کو دیکھنے لگا جس کے پیچھے دو مورتیں تھیں۔ ایک کے حسن کو وہ دیکھ چکا تھا۔ دوسری کو اس نے ابھی دیکھا نہیں تھا۔ اسے دیکھنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر کہنے لگا "وہ بے چاری زبان کش ہے۔ میں بھلا اس سے کیا پوچھ سکوں گا اور وہ کیا جواب دے گی۔ خواہ مخواہ وقت ضائع ہو گا۔"

یہ کہتے ہی وہ پلٹ کر دروازے پر گیا۔ ہینڈل پر دباؤ ڈال کر اسے کھولتے ہوئے باہر جانے لگا۔ خسرو نے کہا۔ "آپ اچانک اٹھ کر جا رہے ہیں؟"

وہ پلیٹ فارم پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر کہا۔ "مجھے اچانک اپنی بیوی یاد آ گئی۔ میں بھی جب اس کے ساتھ کہیں نکلتا ہوں تو لوگوں کی نگاہوں سے بہت گھبراتا ہوں اور یہ ہماری بڑی حماقت ہے۔ ہم میں جو برائی نظر آتی ہے ہم اسے ختم کر دیتے ہیں یا روک دیتے ہیں لیکن کسی کی نیت ظاہر نہیں ہوتی۔ اس لیے نہ ہم اسے سمجھ سکتے ہیں، نہ اپنی نیت سمجھا سکتے ہیں۔ لہٰذا ایسے وقت دانشمندی یہی ہوتی ہے کہ اس راستے سے کترا کر دوسری طرف نکل جائیں۔"

اس نے یہ کہا۔ پھر گھوم کر فوجی انداز میں چلتا ہوا دور ایک کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ اسی وقت نین تارا ٹوائلٹ کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ لباس کہیں کہیں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ چہرے پر سے بکھری زلفوں کو ہٹاتے ہوئے برتھ پر بیٹھ گئی۔ پھر ہمدردی سے بولی "بے چاری!"

خسرو نے برتھ کے دوسرے سرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اس کے متعلق کچھ معلوم ہوا؟"

نین تارا نے انکار میں سر ہلایا پھر کہا "یہ ضروری نہیں ہے کہ زبان سے کوئی دکھڑا سنائے تو اس کا دکھ معلوم ہو۔"

"ہم سب کے دکھ ایک جیسے ہیں۔ کسی کے کم ہیں، کسی کے زیادہ ہیں۔ میں اس کا دکھ نہیں، اس کی ہسٹری پوچھ رہا ہوں۔"

نین تارا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شاید حیا کا تقاضا پھر بھی پورا نہ ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا لیا۔ پھر آہستگی سے بولی "خسرو! اس دورِ ابتلا میں سب کچھ پوچھنا کسی شریف زادی کی ہسٹری نہ پوچھنا۔"

خسرو کو چپ لگ گئی۔ تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی گاڑی کی کھٹ کھٹا کھٹ دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گاڑی پٹڑی سے ہٹ کر سینے پر سے گزر رہی ہے۔ ان کے درمیان تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر خسرو نے اسے دیکھتے ہوئے کہا "تمہارے کپڑے تقریباً بھیگ گئے ہیں۔ دیکھو تو کیا حالت ہو رہی ہے۔ تم بھی غسل کر کے لباس تبدیل کر لو۔ ہم جلد ہی سید پور پہنچ جائیں گے۔"

وہ کھڑکی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "وہ باہر آئے گی تو میں جا کر لباس بدل لوں گی۔"

خسرو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ پھر رک گیا۔ اسی وقت ٹوائلٹ کا دروازہ کھل گیا تھا۔ وہ نگاہوں کے سامنے سرو قد کھڑی ہوئی تھی۔ پھول دار۔ ساڑی اس کے بدن پر یوں سج رہی تھی۔ جیسے

بیچ بیچ کہیں پھول کھل رہے ہوں اور کہیں کلیاں چٹکنے کو رہ گئی ہوں۔ ہری ہری بیلیں اوپر سے نیچے تک لہرا رہی تھیں۔ کہیں چھپ رہی تھیں، کہیں نکل رہی تھیں، کہیں ڈوب رہی تھیں، کہیں ابھر رہی تھیں۔ ساری باغ تھی، گونگی بہار تھی۔ دونوں مل کر باغ و بہار ہو گئی تھیں۔

نین تارا نے چونک کر خسرو کو دیکھا۔ ایسے وقت دنیا کی ہر عورت پر [illegible] اپنے مرد کو دیکھتی ہے۔ خسرو اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ تاکہ وہ برتھ پر آ کر بیٹھ جائے۔ نین تارا آگے بڑھ کر گونگی کے پاس پہنچی۔ اس کے لانبے بھیگے بال ساری کو بھگو رہے تھے اور جہاں جہاں ساری بھیگ رہی تھی، وہاں وہاں بدن سے چپک رہی تھی۔ وہ اس کے بالوں کو سمیٹ کر پانی نچوڑنے لگی۔ اس کے اُجلے چہرے پر بھی پانی کے قطرے شبنم کی طرح لرز رہے تھے۔ وہ ہرنی جیسی وحشت زدہ آنکھوں سے خسرو کو دیکھ رہی تھی۔ کبھی اس سے نظریں چرا رہی تھی پھر اس نے نین تارا کا ہاتھ تھام کر خسرو کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا۔ نین تارا نے خسرو کی طرف دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولی: "یہ پوچھ رہی ہے، تم کون ہو؟"

اس نے کہا: "میرا نام خسرو ہے۔ نعیم الدین خسرو اور یہ نین تارا ہے۔ میری شریکِ حیات۔"

نین تارا نے شرماتے، مسکراتے ہوئے اپنے سر کو جھکا لیا پھر خسرو نے گونگی سے پوچھا: "تمھارا نام کیا ہے؟"

اس نے پہلے خسرو کو دیکھا۔ پھر نین تارا کو دیکھتے ہوئے بولی: "اوڑما۔۔۔"

وہ دونوں سوالیہ نظروں سے 'اوڑما' کو دیکھنے لگے پھر نین تارا نے پوچھا: "کیا تم اپنا نام بتا رہی ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا کر اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا: "اوڑما۔۔۔"

"بھلا یہ کیا نام ہوا؟"

"ہمیں سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جہاں اس کی زبان تالو سے لگتی ہے وہاں کا حرف ادا نہیں ہوتا۔ 'ڑ' کی آواز نکلتی ہے۔ اس حساب سے سوچنا ہوگا کتنے نام ایسے ہیں جن کے آخر میں 'ما' آتا ہے۔"

وہ دونوں سوچنے لگے۔ آہستہ آہستہ کئی نام ذہن میں لا کر بڑبڑانے لگے پھر خسرو نے چونک کر کہا: "عظمیٰ؟"

گونگی نے خوش ہو کر ہاں، ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔

نین تارا نے کہا: "اچھا تو تمھارا نام عظمیٰ ہے۔ چلو، اوپر برتھ پر جا کر لیٹ جاؤ۔ تمھاری آنکھوں میں نیند بھری ہے۔ ہم منزل پر پہنچ کر تمھیں جگا لیں گے۔"

وہ نین تارا کے ساتھ برتھ کے پاس آئی۔ پھر اشارے سے سمجھایا کہ وہ اوپر سو نہیں سکے گی۔ لہٰذا نیچے والی برتھ پر سونا چاہتی ہے۔ نین تارا نے خسرو کی طرف دیکھ کر سوچا، اگر یہ نیچے سوئے گی تو خسرو کو اٹھنے بیٹھنے کی تکلیف ہوگی۔ ایک خیال آیا کہ کمپارٹمنٹ کے فرش پر چادر بچھا کر عظمیٰ کو سُلا دے لیکن عظمیٰ شاید خسرو کے سامنے آرام سے نہ لیٹ سکے۔ خسرو نے کہا: "یہ جہاں کہتی ہے اسے سونے دو۔ ہم گزارا کر لیں گے۔"

وہ نیچے والی برتھ پر جا کر بیٹھ گئی۔ لیٹنے سے پہلے خسرو کی طرف دیکھا۔ ذرا شرماتے ہوئے، ذرا مسکراتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔ اس کے بعد منہ پھیر کر لیٹ گئی۔ اب اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ویسے چہرہ نظر نہ آنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک تو نظر آ ہی رہی تھی۔

نین تارا نے اس پر چادر ڈال دی۔ کیا بدلیاں پہاڑ کو چھپا سکتی ہیں؟ دیکھنے والوں کو بدلیوں میں چاند نظر آ جاتا ہے۔ خسرو نے کہا: "میں اوپر جا کر سو جاتا ہوں۔ تم غسل کر کے لباس بدل لو۔"

نین تارا نے ٹوائلٹ کی طرف دیکھا، پھر خسرو کو دیکھا، پھر عظمیٰ پر نظر ڈالی۔ اس کے بعد عظمیٰ کے پائنتی برتھ پر بیٹھ گئی۔ آہستگی سے بولی: "میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

* * *

۱۹۴۷ء میں سید پور ایک بہت ہی چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس کی اہمیت محض ریلوے ورکشاپ کی وجہ سے تھی۔ تقسیمِ ہند سے پہلے اس ورکشاپ کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ بہار اور مغربی بنگال میں ریلوے کے اتنے بڑے بڑے ورکشاپ تھے کہ ان کے سامنے سید پور اور پہاڑتلی کے ورکشاپ محض آٹو رکشہ ورکشاپ کی سی حیثیت رکھتے تھے۔

پاکستان وجود میں آیا تو بہاریوں کے وہ قافلے سید پور پہنچے جن میں ریلوے کے پینٹر، کارپینٹر، لوہار، ڈیزائنر، انجینئر اور ہر شعبے کے ماہرین موجود تھے۔ انھوں نے بہار اور بنگال ریلوے حکام کی یہ خوش فہمی ختم کر دی کہ مشرقی پاکستان ریلوے کسی معاملے میں ان کی محتاج ہو سکتی ہے۔ یہ بہاری خاصی تعداد میں ہنرمند تھے اور خاصی تعداد میں ایسے لوگ بھی سید پور آئے تھے جو نوسر باز تھے۔ سڑک کے کنارے تین پتے کھلا کر راہگیروں کی جیب خالی کر دیتے تھے۔ دیوالی کی رات کو کروڑپتی اور ارب پتی ہندو لاکھوں روپے کا جوا کھیلتے ہیں۔ ان کے

عقیدے کے مطابق لکشمی دیوی ان کے گھر آتی ہے اور لکشمی دیوی کے ساتھ دولت گھر آتی ہے۔ سیدپور میں چند لکھ پتی مارواڑی تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی سرزمین پر پہلی دیوالی منائی۔ دیوالی کی اس رات مسلمان جواری بھی کھیل میں شامل ہوئے۔ دوسری صبح چند مارواڑیوں نے حساب کیا تو پتا چلا، اس پہلی دیوالی میں بہاریوں نے ان کا دیوالیہ نکال دیا ہے۔ وہ ایک رات میں لاکھوں روپے ہار چکے تھے۔

ہندو بنیے سمجھ گئے تھے، یہ ہجرت کر کے آنے والے ہنرمند بھی ہیں اور چالاک بھی۔ جو بہاری سرمایہ لے کر ہندوستان سے آئے تھے، وہ ڈھاکہ، چاٹگام، کھلنا، بوگرہ اور پبنا جیسے شہروں میں اپنی اپنی کاروباری ذہانت کا سکہ بٹھانے لگے۔ اس کے باوجود ہندو بنیے صدیوں سے بنگال کی زمین میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکے تھے۔ ہندو بنگالی ہوں یا مسلمان بنگالی، سبھی ان مارواڑیوں سے متاثر تھے۔ اُن کو اپنا اَن داتا سمجھتے تھے۔

بہاری بزنس مین اور ہندو بنیوں میں ایک بہت ہی واضح فرق تھا۔ ہندو صرف کاروبار ہی نہیں، سیاست بھی کرتے تھے۔ جبکہ بہاری سیاستدان کبھی نہیں رہے۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک کسی بہاری نے سیاسی لیڈر کی حیثیت سے کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کیا۔ البتہ محدود پیمانے پر مشرقی پاکستان کے بہاریوں کی راہنمائی کی اور جتنے بھی بہاری رہنما رہے، ان سب کا ایک ہی سیاسی اصول رہا اور وہ یہ کہ پاکستان میں سیاسی حکومت ہو یا فوجی حکومت، بہاریوں کو ہر حال میں پاکستان کا وفادار رہنا ہے۔ ان کا یہ اصول زندہ لہو ہے، جو آج بھی بنگلہ دیش کے محصور بہاریوں کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔

ہندو تاجروں نے سیاسی چالیں چلنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ قائدِاعظم محمد علی جناحؒ نے ڈھاکہ میں اپنی پہلی اور آخری تقریر کے دوران کہا تھا: "پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔" اس تاریخی فیصلے پر بنگالی عوام نے کھل کر اعتراض نہیں کیا۔ اندر ہی اندر لاوا پکتا رہا اور اسے ہندوستانی تاجر اور سیاستدان پکاتے رہے۔ اس سلسلے میں کمیونسٹ پارٹی نے بھی اہم رول ادا کیا۔ ان دنوں روسی لٹریچر کا سیلاب آگیا تھا۔ ہر شہر، ہر گاؤں کے بازار ہاٹ میں لسانی مسئلے پر کتابچے دستیاب ہو جاتے تھے۔ ان کتابچوں کے ذریعے سمجھایا گیا تھا کہ پاکستان میں اکثریت کی جو زبان ہے، اسی کو قومی زبان ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ملک جب تک ناعاقبت اندیش سیاستدانوں اور مٹھی بھر سرمایہ داروں کی مٹھی میں رہے گا، تب تک عوام کی بھاری اکثریت سے ناانصافی ہوتی رہے گی۔

بعد میں ناعاقبت اندیش سیاستدانوں نے ایسے کتابچوں کی پیشگوئی درست ثابت کر دی۔ چوبیس برس پہلے زبان کے معاملے میں بنگالی اکثریت کو نظرانداز کیا گیا تو ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں چھ نکات کی بنیاد پر بھاری اکثریت سے جیت کر انھوں نے پچھلی ساری ناانصافیوں کا بدلہ لے لیا۔

انسانی تاریخ دراصل ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے۔ مورخین اپنے اپنے مشاہدات، مطالعے اور نظریات کا گوشت اس ڈھانچے میں بھرتے جاتے ہیں۔ اس پر تہذیب و ثقافت کی کھال منڈھتے ہیں۔ جب یہ ڈھانچہ مکمل جسم کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے تو اس کے منہ میں اپنی اپنی مادری زبان رکھ کر بولتے ہیں۔ اس کی رگوں میں بدلتی ہوئی حکومتوں کی، بدلتی ہوئی پالیسیوں کا لہو دوڑاتے ہیں۔ جب پالیسیاں بدلتی ہیں تو تاریخ کے سیاق و سباق زیادہ نہیں تو تھوڑے بدلتے ہیں۔ اگرچہ تاریخ گزرے ہوئے واقعات کی سچی ترتیب کا نام ہے۔ تاہم ترتیب کی یہ سچائی مورخین کے ذریعے بدلتی ہے۔ پہلے چوبیس برس تک پاکستان اور بنگلہ دیش کی تاریخ ایک تھی۔ تاریخ نگار کے قلم ایک تھے۔ آج اسی بنگلہ دیش اور اسی پاکستان کے مورخین اپنے اپنے طور پر تاریخ کے ڈھانچے میں اپنے مشاہدات، مطالعے اور نظریات کا گوشت بھر رہے ہیں۔ اپنی تہذیب اور ثقافت کی کھال منڈھ رہے ہیں اور اب تاریخ کے منہ میں اپنی اپنی زبان رکھ کر بول رہے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں سیدپور کی آبادی تقریباً پچیس ہزار تھی۔ ۱۹۷۰ء کے اوائل میں خاندانی منصوبہ بندی کے باوجود اس کی آبادی اسی ہزار ہو گئی پھر مارچ ۱۹۷۰ء کے بعد صرف ایک سال کے اندر اس کی آبادی پانچ لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ آبادی کے اس حیرت انگیز اضافے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ سیدپور میں فوجی چھاؤنی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہاں بہاریوں کی آبادی تھی۔ ایک ایسا مضبوط قلعہ تھا جس میں پناہ لینے کے لیے آس پاس کے تمام شہروں کے بہاری بھاگے چلے آئے تھے۔

وہ ریل گاڑی سیدپور پہنچنے لگی۔ خسرو نے کہا: "عظمیٰ کو جگا دو۔ ہمارا سفر ختم ہو رہا ہے۔"

نین تارا نے اسے آواز دی۔ پھر ذرا وقفے سے دوسری بار اسے پکارا۔ اس کے بعد بولی: "بے چاری کتنے دنوں سے بھٹک رہی تھی۔ جانے کب سے سونا نصیب نہیں ہوا۔ کتنی گہری نیند میں ہے۔"

یقیناً عظمیٰ گہری نیند میں تھی لیکن وہ ایسے حالات سے

گزرتی آئی تھی کہ گہری نیند میں بھی ہلکی سی آہٹ چونکا دیتی تھی۔ وہ نین تارا کی پہلی آواز پر ہی نیند کے حصار سے نکل آئی تھی لیکن آنکھیں بند کیے سوچ رہی تھی' انسانوں کے جہنم میں ہے یا جنت میں؟ نین تارا کی دوسری آواز نے اسے اطمینان دلایا کہ وہ محبت کرنے والوں کی پناہ میں ہے۔ اس وقت نین تارا خسرو سے پوچھ رہی تھی: "کہیں بڑو دیدی ہم دونوں کو بوجھ تو نہیں سمجھیں گی؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔ بڑو دیدی عورت کے روپ میں دیوی ہیں۔ وہ تم دونوں کو دل سے خوش آمدید کہیں گی پھر تمہاری بات تو کچھ اور ہی ہے۔"

وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ نین تارا نے نظریں چُراتے ہوئے کہا: "بڑو دیدی تم پر اتنا بھروسہ کرتی ہیں۔ تم انھیں دیوی کہتے ہو۔ کیا اپنی دیوی سے جھوٹ بولو گے کہ ہماری شادی ہو چکی ہے؟"

"سچ بولنا بہت آسان ہے لیکن عورت خواہ بیوی ہو یا بڑو دیدی' اس کے پیٹ میں بات نہیں پچتی۔ وہ اگر کسی کو نہ سنائے تو دیوار کو سنا دیتی ہے اور دیوار کے پیچھے کھڑے ہوئے لوگ سن لیتے ہیں۔"

وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کے اور عظمیٰ کے درمیان نیند کی ایک دیوار حائل ہے لیکن وہ بات اس دیوار کے پار چلی گئی تھی۔ عظمیٰ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں کو ایسے دیکھنے لگی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ کیونکہ اس سے پہلے اس کمپارٹمنٹ میں میاں بیوی کو دیکھا تھا۔ نین تارا نے مسکرا کر کہا: "تم تو جاگ رہی ہو۔"

خسرو نے کہا: "عظمیٰ جاگ بھی رہی تھی اور ہماری باتیں بھی سن رہی تھی۔"

وہ خسرو کو دیکھتے ہوئے برتھ پر سے اٹھ گئی۔ پھر اشارے سے نین تارا کو سمجھایا کہ وہ ٹوائلٹ سے منہ ہاتھ دھو کر آ رہی ہے پھر وہ ٹوائلٹ میں چلی گئی۔ "اس کے سن لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک تو بے چاری گونگی ہے' دوسرے مظلوم ہے۔ اس کے چہرے سے پتا چلتا ہے کہ بڑی محبت کرنے والی عورت ہے ہمارے خلاف کسی سے کچھ نہیں کہے گی۔"

خسرو ٹوائلٹ کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ نین تارا نے کہا: "کبھی محبت بھی بوجھ بن جاتی ہے۔ آخر یہ ہمارے ساتھ کب تک رہے گی؟"

خسرو نے جواب دیا: "حالات سیاسی ہوں یا غیر سیاسی۔ تقدیر اچھی ہو یا بُری۔ ہر حالت میں عورت کو مناسب پناہ اسی وقت ملتی ہے جب کوئی اس سے نکاح پڑھا کر اس کا سہارا بن جاتا ہے۔ جب تک عظمیٰ کو کہیں سے اخلاقی سہارا نہیں ملے گا' ہم اس کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔"

نین تارا نے ایک گہری سانس لے کر پوچھا: "ہماری پہلی ملاقات یاد ہے؟"

"ہاں' یاد ہے۔ میں نے تمھیں دیکھا تھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا پھر میں نے تمہارے چمکتے دمکتے حسن پر توے کی کالک مَل دی تھی۔"

"دوسرے لفظوں میں تم دشمنوں کی نظروں سے مجھے چُھپانا چاہتے تھے۔ بے شک اب تک مجھے چُھپاتے اور پناہ دیتے آئے ہو لیکن عظمیٰ بھی مجھ سے کچھ کم نہیں ہے۔ آخر تم دو دو عورتوں کی حفاظت کس طرح کر سکو گے؟"

"اب تو ہم بڑو دیدی کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ جب تک ان کے پاس رہیں گے' کوئی تم دونوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ انشاءاللہ ہم جلد ہی پاکستان جانے کا راستہ نکال لیں گے۔"

گاڑی پلیٹ فارم پر رُک گئی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ یہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ لوگ اپنے گھروں میں گہری نیند سوتے ہیں۔ لیکن کسی ٹرک یا ریل گاڑی کی آواز سن کر جیسے ساری بستی جاگ جاتی تھی۔ آبادی حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی تھی۔ ریلوے لائن کے آس پاس شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگ جھگیوں میں رہنے لگے تھے۔ درختوں کے سائے میں راتیں گزارتے تھے۔ ریل گاڑی کی آواز سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ جاتے تھے۔ آنکھیں ٹُل ٹُل کر دیکھتے تھے کہ مال گاڑی میں ان کے لیے کہیں سے اناج آیا ہے یا نہیں؟

تلسی رام کے آدمیوں نے دروازے پر دستک دی۔ خسرو نے ان کی آوازیں سن کر دروازہ کھول دیا۔ ان کے ساتھ کچھ مسلح سپاہی تھے۔ ایک نے کہا: "آپ آرام سے اپنی عورتوں کے ساتھ ویٹنگ روم میں چلے جائیں۔ آپ لوگوں کو تلسی رام جی کے مکان میں پہنچا دیا جائے گا۔"

نین تارا نے اپنی اٹیچی اٹھا لی۔ پھر عظمیٰ کے ساتھ خسرو کے پیچھے پلیٹ فارم پر آ گئی۔ دور بجلی کی روشنی میں بہت سے لوگ نظر آ رہے تھے۔ پولیس والے انھیں لاٹھیوں سے ہانکتے ہوئے اناج کے ویگن سے دور بھگا رہے تھے۔ رائفل بردار سپاہی فائرنگ کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ وہ تینوں ویٹنگ روم میں آ گئے۔ نین تارا نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے میز پر کہنی ٹیکتے

ہوئے پھر ایک ہاتھ سے سر کو تھامتے ہوئے کہا: "مجھ سے یہ منظر دیکھا نہیں جاتا۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس ویگن کا تمام اناج ان لوگوں میں تقسیم کر دیتی۔"

"یوں تقسیم کرنے کو خیرات کہتے ہیں اور خیرات دو کو دی جا سکتی ہے، دو ہزار کو دی جا سکتی ہے۔ خیرات سے ایک وقت کی یا دو دن کی بھوک مٹائی جا سکتی ہے۔ نین تارا! تم ذخیرہ اندوز نہیں ہو۔ اس لیے انسانی ہمدردی سے سوچ رہی ہو۔ ورنہ یقین کرو، ان ذخیرہ اندوزوں کے بس میں ہوا اور پانی نہیں ہے۔ ورنہ یہ نیکی کمانے کے لیے دوسروں کو ایک ایک قطرہ پانی پلاتے اور زندگی کی ایک ایک سانس خیرات کے طور پر دیتے رہتے۔ دراصل خیرات اس معاشرے میں دی جاتی ہے اور لی جاتی ہے جہاں ایک کے بس میں سب کچھ ہوتا ہے اور دوسرے کے بس میں کچھ نہیں ہوتا۔"

تلسی رام کا ایک آدمی ایک مارواڑی جوان کے ساتھ ویٹنگ روم کے اندر آیا۔ پھر اس نے کہا: "خسرو میاں! یہ تلسی رام جی کے سالے، آپ کی بڑو دیدی کے بھائی ہری رام ہیں۔"

ہری رام نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہوئے کہا "خسرو بھائی! آپ مجھے ہری رام نہیں صرف ہریا کہہ سکتے ہیں۔ پورے سید پور میں ہریا سیٹھ کے نام سے مشہور ہوں۔ بڑو دیدی تو آپ کے نام کی مالا جپتی رہتی ہیں۔ آپ سے ملنے کی بڑی اِچھا تھی۔ دیدی نے کہا ہے، آپ کو اور لبودی (بہو) کو فوراً ان کے پاس پہنچاؤں۔ پرنتو ایک سمسیا (مسئلہ) ہے۔"

خسرو نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھیے اور بتائیے۔ مسئلہ کیا ہے؟"

اس نے بیٹھتے ہوئے کہا: "ایک لاش کو دیکھ کر مردار کھانے والوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ ابھی ہمارا اناج کا ویگن آیا ہے اور سید پور کی جنتا کا یہ حال ہے۔ ویسے تو ہمارے آدمیوں اور سپاہیوں نے بھوکے ننگوں کو لاٹھیوں سے ہانک دیا ہے لیکن اور طرح کے بھی بھوکے ننگے ویٹنگ روم سے باہر کھڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ ریلوے کے افسر ہیں، کچھ مکتی باہنی والے ہیں، کچھ یہاں کے بنیے ہیں۔"

خسرو نے کہا: "میں سمجھ گیا، یہ لوگ اناج کے ویگن میں سے اپنا اپنا حصہ مانگ رہے ہوں گے۔"

"جی ہاں، مگر ہم نے کیا حرام کا اناج منگایا ہے۔ ہماری محنت لگی ہے، ہمارا دھن لگا ہے۔ ویسے میں پہلے ہی ریلوے افسروں کی جیبیں گرم کر چکا ہوں۔ یہ محض دکھاوے کے لیے رعب جمانے آئے ہیں۔ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر باتیں کرنے سے یہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے چلے جائیں گے۔ بی ڈی آر والے ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ مکتی باہنی والوں سے میں نمٹ لوں گا۔"

خسرو نے پوچھا: "پھر کیا مسئلہ رہ گیا؟"

"وہ کیا ہے کہ ہندو بنیے ہمارا پورا ویگن یہیں خرید لینا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں جو بھی ہماری رقم لگی ہے۔ یہ اس سے دوگنی رقم دیں گے۔ ہم ویگن ان کے حوالے کر دیں۔"

خسرو نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا: "میں کاروباری باتیں نہیں جانتا، مجھے کیا معلوم کہ یہ اناج کس طرح فروخت کرنا چاہیے۔"

"سیدھی سی بات ہے خسرو بھائی! اناج ہم ویگن سے گودام میں لے جائیں گے۔ گودام سے بازار میں لائیں گے۔ بڑی جھنجھٹ ہے پھر قدم قدم پر پولیس والوں کو بھتہ دو، غنڈوں، بدمعاشوں کو خوش رکھو۔ ورنہ وہ لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے اچھا ہے کہ دوگنی قیمت لگ رہی ہے۔ مال یہیں بیچ دیا جائے۔"

"آپ بہتر سمجھتے ہیں تو یہی کریں۔"

"میرے کرنے سے ہوتا تو میں کر چکا ہوتا۔ جیجا جی (تلسی رام) مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے ہیں۔ سختی سے کہلا بھیجا ہے کہ آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا۔ یہ کاغذ لے کر آیا ہوں۔ آپ اس میں لکھ کر مجھے آگیا (حکم) دیں تو میں اپنے طور پر یہ مال یہیں بیچ دوں۔"

اس نے ایک کاغذ خسرو کی طرف بڑھا دیا۔ ایک قلم بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔ خسرو نے تھوڑی دیر تک کاغذ اور قلم کو دیکھا۔ پھر کہا: "ہری رام جی!"

ہریا نے ٹوکتے ہوئے کہا: "ہری رام نہیں صرف ہریا۔ میں آپ سے چھوٹا ہوں۔ آپ کا سیوک ہوں۔"

"اچھی بات ہے ہریا! میں دستخط کرنے سے پہلے بڑو دیدی سے مشورہ کروں گا۔"

"یہ کیا خسرو میاں! کاروبار کے معاملے میں بھلا عورت کیا مشورہ دے سکتی ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ اتنا سمجھتا ہوں کہ اس کاغذ پر اگر دیدی کے بھی دستخط ہو جائیں تو میری ذمے داری بہت حد تک کم ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ دیدی سے ملنے، مشورہ کرنے، دستخط کرنے تک مجھے بہت کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع مل جائے گا۔"

"وہ کیا ہے کہ آپ یہاں گھنٹوں بیٹھ کر سوچ سکتے ہیں،

سمجھ سکتے ہیں۔ میں آپ کو ان خریداروں سے ملواتا ہوں۔ وہ آپ کو کاروبار کی اونچ نیچ سمجھائیں گے۔ آئیے نا، باہر چلیے۔"

وہ کرسی سے اٹھنے لگا۔ پھر اس نے نین تارا اور عظمیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے فوراً ہی ہاتھ جوڑ دیے۔ پھر کہا: "کیا ہے کہ میرا دماغ سودا پٹانے میں الجھا ہوا ہے۔ میں نے ابھی تک پوچھا ہی نہیں کہ آپ دونوں میں سے ہماری بودی کون ہیں؟"

خسرو نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے نین تارا کی طرف اشارہ کیا۔ نین تارا نے اپنے سر پر آنچل رکھ لیا۔ اپنا ہاتھ پیشانی تک لے جا کر سلام کیا۔ ہر پیا نے ہاتھ اٹھا کر کہا: "آداب، آداب، آپ تو ہمارے خیال سے بھی زیادہ سُندر ہیں۔ کیا ہے کہ ابھی میں کاروبار میں الجھا ہوا ہوں۔ گھر چل کے بہت سی باتیں ہوں گی۔ آئیے خسرو بھائی!"

خسرو نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "یہیں بیٹھی رہو۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ چاروں طرف پہرہ ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

نین تارا نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا: "ویٹنگ روم کے دروازے سے زیادہ دور نہ جانا۔"

"نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا۔"

وہ ہر پیا کے ساتھ باہر آیا۔ ریل گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی تھی۔ ان دنوں گاڑیاں جس اسٹیشن پر کھڑی ہوتی تھیں، کھڑی ہی رہ جاتی تھیں۔ آگے جانے کے لیے بڑی مشکل سے لائن کلیئر ملتی تھی۔ اناج کے ویگن کو اس گاڑی سے الگ کر کے گودام والی لائن پر پہنچا دیا گیا تھا۔ گاڑی کے مسافر دروازے کھڑکیاں بند کیے گہری نیند میں تھے۔ پلیٹ فارم پر ایک بھی مسافر نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ کچھ اور لوگ تھے۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی دھوتی پر ریشمی کُرتا پہنے ہوئے تھا۔ ماتھے پر بڑا سا تلک لگا ہوا تھا۔ سر پر نہرو کیپ تھی۔ گلے میں سونے کی چین تھی۔ چین سے ایک لاکٹ منسلک تھا، اور اس لاکٹ میں کرشن بھگوان کی تصویر تھی۔ اس نے خوشامدانہ انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "جے رام جی کی۔"

خسرو اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہر پیا نے کہا۔ "یہ دھرم چند جی ہیں۔ یہاں کے بہت بڑے بیوپاری ہیں۔ ہمارا مال یہیں کھڑے کھڑے خرید لینا چاہتے ہیں اور دھرم چند جی! یہ خسرو میاں ہیں۔ ان کے بارے میں تو میں آپ کو بہت پہلے بتا چکا ہوں۔ ہمارے پتا جی ان پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتے ہیں۔ تبھی تو ان کے آنے سے پہلے ہی کہلا بھیجا تھا کہ مال ان کے ہاتھ سے فروخت ہوگا۔"

دھرم چند نے کہا: "تلسی رام جی کو میں خوب جانتا ہوں وہ اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہیں کرتے۔ انھوں نے خسرو میاں کے اندر بہت سے گُن دیکھے ہوں گے۔ اب خسرو میاں! آپ کو ثابت کرنا ہے کہ آپ سچ مچ گُنی ہیں۔ کھڑے کھڑے پورا مال فروخت ہو جائے اور وہ بھی دوگنے منافع پر، تو تلسی رام جی کی نظروں میں آپ کا مان اور بڑھ جائے گا۔"

خسرو اس کی باتیں سن رہا تھا اور پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ان دس آدمیوں کو دیکھ رہا تھا جن کے حُلیے چور، بدمعاشوں کی طرح تھے۔ کوئی لنگی اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔ کسی کے ہاتھ میں لوہے کی لمبی سی سلاخ تھی۔ کوئی پتلون پہنے ہوئے تھا مگر اوپری جسم ننگا تھا۔ کسی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ کسی کی مونچھیں لانبی اور گھنی تھیں۔ پلیٹ فارم کی روشنی میں ان کی آنکھیں سرخ انگارہ جیسی لگ رہی تھیں۔ وہ سب نشہ میں چور تھے۔ وقت آنے پر کچھ بھی کر سکتے تھے۔

دھرم چند نے خسرو کی نظروں کو تاڑتے ہوئے کہا: "یہ سب میرے آدمی ہیں۔" پھر ذرا قریب ہو کر کہا: "چھٹے ہوئے بدمعاش ہیں۔ سب کے سب بہاری ہیں۔ پاکستان کے وقت ان لوگوں نے ہندوؤں اور بنگالیوں کو بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ اب یہی لوگ میرے پیچھے دُم ہلاتے ہیں۔ میرے ایک اشارے پر کسی بھی بہاری کے پیٹ میں چھرا گھونپ کر انتڑیاں باہر نکال سکتے ہیں۔"

دھرم چند نے اپنی کنپٹی کو ایک انگلی سے ٹھونکتے ہوئے کہا: "یہ دماغ کی بات ہوتی ہے۔ اپنے ہی قاتلوں کو اپنے بس میں کر کے ان کے آدمیوں کو قتل کرانا دماغ کی بات ہوتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک سیٹھ کا مال ٹرک میں آیا تھا۔ وہ مجھ سے سودا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ان بدمعاشوں نے اس مال کو بازار میں پہنچنے ہی نہیں دیا۔ راستے ہی میں لوٹ لیا۔ ہی ہی ہی ہی، مگر تم تو اپنے آدمی ہو۔ دیکھو نا، وہ جو اس بدمعاش کے ہاتھ میں لوہے کا سریا ہے، اس سریے سے وہ ویگن کے تالوں کو آسانی سے توڑ دیتا ہے۔ جانے ان بدمعاشوں کو کیسے معلوم ہو گیا کہ آج رات اناج کا ویگن پہنچنے والا ہے بس یہ دھاوا بولنا چاہتے تھے۔ میں نے ڈانٹ کر کہا: "خبردار! اپنے تلسی رام جی کا مال ہے اور اپنے خسرو میاں یہاں آ رہے ہیں۔ کوئی دھاندلی نہیں ہوگی۔ ہی ہی ہی ہی۔ آپ تو اپنے ہی آدمی ہیں۔"

خسرو نے ان دس غنڈوں پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ پھر پلٹ کر ویٹنگ روم کے دروازے کو دیکھا جس کے پیچھے

نیمن تارا اور عظمیٰ انتظار کر رہی تھیں۔ اب اُس کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ گئی تھیں۔ اس نے مسکرا کر کہا: "سیٹھ دھرم چند! آپ نے کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے۔ آپ بڑے سیانے ہیں اور ہاں ہریا! وہ میرے آدمی کہاں ہیں جو کھُلنا سے میرے ساتھ آئے تھے۔ مال کی بلٹی ان کے پاس ہے۔ انھیں میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں ابھی معاملات طے کرتا ہوں۔"

دھرم چند خوش ہو گیا۔ خسرو نے کہا: "آپ باہر انتظار کریں۔ میں ویٹنگ روم میں ذرا اپنے آدمیوں سے باتیں کر لوں۔"

وہ ویٹنگ روم میں آ گیا۔ عظمیٰ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ بے چاری زبان سے کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی۔ نیمن تارا نے پوچھا: "باہر کون لوگ ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟"

اس نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "دوست نما دشمن ہیں۔ ان کے اشاروں پر چلوں تو دوست، نہیں تو دشمن۔" پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا: "سچ پوچھو تو کوئی کسی کا دوست نہیں ہے۔ ہمارے جیجا جی مارواڑی ہیں اور یہ دھرم چند جو سودا کرنے آیا ہے یہ بھی مارواڑی ہے لیکن کاروباری معاملات میں جہاں منافع حاصل ہوتا ہے وہاں اپنے مارواڑی کا دشمن ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ سارا منافع جیجا جی کے کھاتے میں جائے اور یہ بھی نہیں چاہتا کہ جیجا جی سے دشمنی ظاہر ہو جائے۔ اسی لیے سودا کرنے آیا ہے۔ دُگنا منافع دینے کو تیار ہے۔ اگر سودا نہ ہوا تو یہ مال بازار تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اُدھر جیجا جی کو یہ خبر پہنچے گی کہ اناج سے بھرے ویگن کو غنڈوں، بدمعاشوں نے لوٹ لیا ہے۔ جیجا جی نے خوب سوچ سمجھ کر یہ سارا اناج میرے حوالے کیا ہے۔ وہ اپنے سالے پر بھروسہ نہیں کرتے ہیں اور ٹھیک کرتے ہیں۔ یہ ہریا اس دھرم چند سے ملا ہوا ہے۔"

نیمن تارا نے کہا: "ہاں اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ تم سے کاغذ پر دستخط کروا رہا تھا تاکہ مال کو اونے پونے بیچنے کی ذمے داری تم پر ہو۔"

"اناج سے بھرا ہوا ویگن ہم لے کر آ رہے ہیں، یہ بات صرف ہریا کو اور بڑو دیدی کو معلوم تھی لیکن مال پہنچتے ہی دھرم چند اور اس کے بدمعاش ہمارے سروں پر آ پہنچے۔ یقیناً ہریا نے انھیں خبر دی ہوگی۔ یہ سوچی سمجھی اسکیم ہے۔ پلیٹ فارم پر بی ڈی آر کا کوئی سپاہی نظر نہیں آ رہا ہے اور تو اور جیجا جی کے وہ آدمی بھی نہیں ہیں جو ہمارے ساتھ کھُلنا سے..."

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ویٹنگ روم کا دروازہ کھلا اور وہ دو آدمی داخل ہوئے۔ جو کھُلنا سے ان کے ساتھ آئے تھے۔ ان کے پاس مال کی بلٹی تھی۔ ان کے ساتھ ہریا بھی تھا۔ خسرو نے ان آدمیوں سے پوچھا: "تم لوگ کہاں چلے گئے تھے؟"

ایک نے جواب دیا: "ہمارا ویگن مال گودام کی آخری لائن پر لگایا جا رہا تھا۔ ہمارے دو آدمی ابھی مسلح سپاہیوں کے ساتھ وہاں موجود ہیں۔ ہم ویگن کو ریلوے واچ اینڈ وارڈ کے بھروسے پر چھوڑ نہیں سکتے۔ بڑی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔"

"وہ بی ڈی آر کے جوان کہاں ہیں۔ جو یہاں تک ہمارے ساتھ آئے تھے؟"

"کچھ ویگن کے پاس ہیں اور کچھ اسٹیشن کے پیچھے ایک ہوٹل کو کھلوا کر چائے پی رہے ہیں۔"

"ان سے جا کر کہو، پلیٹ فارم پر دھرم چند کے غنڈوں کو چاروں طرف سے گھیر لیں۔ انھیں بھاگنے کا موقع نہ دیں۔"

ہریا نے کہا: "خسرو بھائی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ اگر آپ سودا نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی، میں دھرم چند جی کو کہہ دیتا ہوں۔ وہ واپس چلے جائیں گے۔"

وہ جانا چاہتا تھا۔ خسرو نے سخت لہجے میں کہا: "ہریا! تم اس ویٹنگ روم سے باہر قدم نہیں نکالو گے۔ یہاں میرے پاس بیٹھو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا: "کیا ہے کہ دھرم چند جی نے اور ان کے آدمیوں نے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ پھر آپ انھیں..."

خسرو نے اس کی بات کاٹ کر کہا: "میں نے کہا نا تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ نہیں بیٹھو گے تو بڑو دیدی کو تمھارا کچا چٹھا سنا دوں گا۔"

وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک تلسی رام کا ایک آدمی باہر جا چکا تھا۔ دوسرا آدمی وہیں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا: "خسرو صاحب! باہر جو مارواڑی کھڑا ہوا ہے۔ وہ بی ڈی آر کے جوانوں سے کھسر پھسر کر رہا تھا۔ اس نے اسٹیشن کے پیچھے چائے کی ہوٹل کھلوائی ہے۔ تاکہ تمام سپاہی وہاں کھاتے پیتے رہیں۔"

خسرو، ہریا کو گھور کر دیکھنے لگا۔ ہریا نے کہا: "خسرو بھائی! میں جیجا جی کے فائدے کی بات کر رہا تھا۔ یہاں سید پور میں بڑی گڑبڑ ہوتی رہتی ہے۔ پھر ہماری کوئی دکان نہیں ہے کہ ہم صبح سے شام تک راشن بیچنے کے لیے بیٹھے رہیں۔ کہیں نہ کہیں تھوک کے حساب سے کسی نہ کسی سیٹھ کو دینا ہی ہوگا۔ اس لیے میں دھرم چند سے بات کر چکا تھا۔"

ایک بی ڈی آر کا جوان اسٹین گن شانے سے لٹکائے

ہوئے ویٹنگ روم میں داخل ہوا۔ خسرو نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا: "میں آپ لوگوں کا بہت شکر گزار ہوں کہ یہاں تک ہمارا ساتھ دیا لیکن دشمن ابھی تک پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

اس نے کہا: "مجھے ابھی آپ کے آدمی نے بتایا ہے۔ ہمارے مسلح جوانوں نے باہر دھرم چند اور ان کے آدمیوں کو گھیر رکھا ہے۔ کوئی وہاں سے جا نہیں سکے گا۔ دراصل یہ دھرم چند پہلے میرے پاس آیا تھا کہہ رہا تھا، "اگر میں اس کا ساتھ دوں تو ویگن کے مال سے مجھے اتنا منافع ملے گا، جتنا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں نے جواب دیا، میں ایسا کام کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے فائدہ بھی حاصل ہو اور میری ڈیوٹی پر کوئی بات نہ آئے۔ اگر خسرو صاحب کو، ان کی عورتوں کو اور اناج کے ویگن کو نقصان پہنچے گا تو ہم سے جواب طلبی ہوگی۔ اس لیے پہلے خسرو صاحب سے معاملات طے کریں۔"

خسرو نے کہا: "شاباش، آپ نے اچھا جواب دیا۔ آپ پر اب کوئی بات نہیں آئے گی اور رہ گئی آپ کے تھوڑے بہت منافع کی بات تو وہ مجھ سے ملے گا۔ آئیے باہر چلیں۔"

خسرو نے اشارے سے ہریا کو اٹھنے کے لیے کہا۔ وہ شکست خوردہ حالت میں اس کے ساتھ چلتا ہوا باہر آیا۔ باہر پلیٹ فارم پر پانچ مسلح نوجوان نظر آ رہے تھے جو دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان وہ دس بدمعاش سر جھکائے کھڑے تھے۔ دھرم چند نے خسرو کو دیکھتے ہی کہا: "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے تو آپ سے کوئی دشمنی نہیں کی۔ میں تو آپ کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔"

خسرو نے کہا: "بڑے بھائی! میں کب دشمنی کر رہا ہوں۔ آپ نے زبان سے دھمکی دی کہ آپ کے آدمی پیٹ میں چھرا گھونپ کر انتڑیاں باہر نکال لیتے ہیں۔ اناج کا ویگن لوٹ لیتے ہیں۔ میں بھی آپ کو بڑی خاموش دھمکی دے رہا ہوں۔ میرے پاس یہ مسلح جوان موجود ہیں جو میرے ایک اشارے پر آپ کے تمام بدمعاشوں کو بھون کر رکھ سکتے ہیں۔"

پھر وہ ان بدمعاشوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے بولا: "تم سب بھارتی کہلاتے ہو۔ میں تمھیں بتاؤں کہ بھار کے معنی کیا ہیں۔ بھار دراصل ہندی کا لفظ بیوہار ہے جو کثرتِ استعمال سے بھار بن گیا۔ بیوہار کے معنی ہیں حسنِ سلوک۔ اگر تم لوگوں میں حسنِ سلوک نہیں ہے تو بھاریوں کے نام کو بدنام نہ کرو۔ اس ویگن میں ہمارا جو اناج ہے، اس کی مالیت زیادہ سے زیادہ پچاس ہزار روپے ہے۔ سیٹھ دھرم چند اس کے ایک لاکھ روپے دینا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے، یہ مال بازار میں جا کر تقریباً دو لاکھ اور چار لاکھ کا منافع دے گا۔ سید پور میں اناج کتنا مہنگا ہے یہ میں سن چکا ہوں۔ غریب والدین اپنے بچوں کو بیچ کر بھی ایک وقت کا چاول خرید نہیں سکتے۔ کیونکہ بچوں کو کوئی خریدنے والا ہی نہیں ہے۔ سب پر اپنی اپنی جان بھاری ہے۔ کچھ دیر پہلے میری شریکِ حیات نے کہا تھا، اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ یہ سارا اناج غریبوں میں تقسیم کر دیتی۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہ میرے جیجا جی کا مال ہے۔ میں انھیں پچاس ہزار کے مال پر زیادہ سے زیادہ دس ہزار کا منافع دوں گا، لیکن کل سید پور کے بازار میں اناج سستا فروخت ہوگا۔ اگر چاول پندرہ روپے سیر بک رہا ہے تو میں پانچ روپے سیر فروخت کروں گا۔"

دھرم چند نے ہنستے ہوئے کہا: "آپ اپنے مال کے اور اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ویسے میں نے آج تک کسی بھی منڈی میں یہ نہیں دیکھا کہ سارے بیوپاری ایک بھاؤ میں بیچیں اور کوئی ایک بیوپاری ان کے مقابلے میں سستا بیچ کر چلا جائے۔ آپ نے بیچ لیا تو میں آپ کا غلام بن جاؤں گا۔ اچھا جی، نمستے۔"

وہ وہاں سے چلا گیا۔ خسرو نے تمام غنڈوں پر سرسری سی نظر ڈالی۔ ایک غنڈہ نسبتاً کم عمر تھا اور اچھی صورت شکل کا مالک تھا۔ معلوم ہوتا تھا، حالات نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ اس نے بی ڈی آر کے ایک جوان سے کہا: "ان سب کو جلنے دو۔ صرف اس جوان کو گرفتار کر لو۔"

وہ جوان گھبرا کر اپنے ساتھیوں کو دیکھنے لگا۔ ساتھی اپنی اپنی جان چھڑانے کی فکر میں تھے۔ اس لیے وہاں سے چلے گئے۔ بی ڈی آر کے ایک جوان نے خسرو قریب آ کر آہستگی سے کہا: "آپ اسے گرفتار کر کے کیا کریں گے۔ ہم زیادہ سے زیادہ اسے حوالات پہنچا دیں گے لیکن یہ ہندو بنیے دور تک اپنا اثر رکھتے ہیں۔ اسے چھڑا کر لے آئیں گے۔"

"میں اسے جیل بھجوانا نہیں چاہتا۔ اس سے دو باتیں کر لوں۔ پھر میں آپ لوگوں سے بات کروں گا۔"

یہ کہہ کر خسرو اس جوان کے پاس آیا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹہلنے کے انداز میں پلیٹ فارم پر ذرا دور نکل گیا۔ اس نے پوچھا: "دھرم چند تمھیں کیا دیتا ہے؟"

"وہ ہم سب کو روزانہ دو سیر چاول، آدھ سیر چنا اور ایک پاؤ ستو دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹھرے کی ایک بوتل ہمیں ملتی ہے۔ کبھی ضرورت پڑنے پر نقد روپے بھی مل جاتے ہیں۔"

"یہاں غنڈوں کی کتنی پارٹیاں ہیں؟"

"بس ہماری ایک پارٹی ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ کھلنا جیسے شہر میں غنڈوں کی دو پارٹیاں تھیں۔ سید پور تو بہت بڑا شہر ہو گیا ہے۔ جب شہر بڑھتا اور پھیلتا ہے تو غنڈوں کی تعداد بھی بڑھتی رہتی ہے۔"

اس جوان نے کہا: "یہاں جتنے بھی غنڈے ہیں، وہ کسی نہ کسی سیٹھ کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ان کی مدد سے یہ غنڈے شراب اور جوئے کا اڈہ چلاتے ہیں۔"

"یہاں ایسا کون شخص ہے جو اچھے اثر و رسوخ کا مالک ہو؟"

وہ ذرا سوچنے کے بعد بولا: "میں بڑے بڑے لوگوں کو نہیں جانتا۔ البتہ ایک جوان ہے جو دیکھنے میں کچھ بھی نظر نہیں آتا لیکن مکتی باہنی والے اس سے کتراتے ہیں۔ غنڈے بھی اس کے منہ نہیں لگتے۔"

"ابھی اس آدمی کو بلا کر لے آؤ۔ تم نے یہ کام کیا تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔"

"جناب! وہ میرے کہنے پر یہاں نہیں آئے گا۔"

"تمہارے ساتھ ایک سپاہی جائے گا۔ تم ابھی جاؤ۔"

خسرو نے ایک سپاہی سے کہا: "ابھی اس کے ساتھ رکشہ میں جاؤ اور یہ جس آدمی کو کہتا ہے اسے اپنے ساتھ لے آؤ۔"

وہ جانے لگے۔ خسرو نے کہا: "اور سنو! راستے میں اس کے غنڈے ساتھیوں نے یا دھرم چند نے اس سے کچھ پوچھنا چاہا تو کسی کو اس سے بات کرنے کی اجازت نہ دینا۔"

وہ چلے گئے۔ خسرو نے ہریا کے پاس آ کر کہا: "میں ان عورتوں کو جلد سے جلد بڑو دیدی کے پاس پہنچانا چاہتا تھا لیکن تم نے کاروباری معاملے کو الجھا دیا ہے۔ میں ابھی یہاں سے نہیں جا سکوں گا۔ تم جاؤ اور بڑو دیدی کو بلا کر لے آؤ۔"

"بھائی جی! کیا آپ دیدی سے میری شکایت کریں گے؟"

"شکایت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا دیدی تمہاری ہیرا پھیری کو نہیں سمجھتی ہیں؟" وہ چپ ہو گیا۔ خسرو نے کہا۔ "کھڑے کیوں ہو۔ جلدی جاؤ۔ میں ان عورتوں کو زیادہ دیر یہاں بٹھانا نہیں چاہتا۔"

وہ چلا گیا۔ بی ڈی آر کے جوان نے آ کر کہا: "یہاں سے ہماری ڈیوٹی ختم ہو جائے گی۔ کل دوپہر کو ہم چلے جائیں گے۔ کیا آپ نے سوچا ہے کہ ہمارے جانے کے بعد آپ کا کیا بنے گا؟"

خسرو نے ایک گہری سانس لی۔ پھر سانس چھوڑتے ہوئے بولا: "جہاں قانون ساتھ چھوڑ دیتا ہے یا بے بس ہو جاتا ہے، وہاں سے غنڈوں کی حکمرانی شروع ہوتی ہے۔ دھرم چند نے غنڈوں کو یہاں لا کر میرے حق میں بہت اچھا کیا۔ مجھے ایک سبق سکھا دیا کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ اس لیے اب میرے غنڈے ان کے غنڈوں کی کاٹ کریں گے۔"

وہ ویٹنگ روم میں آ گیا۔ نین تارا نے پوچھا: "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، سب چلے گئے۔ فی الحال دشمنوں کی طرف سے خطرہ نہیں ہے لیکن یہاں مجھے کچھ معاملات طے کرنے ہیں۔ اس لیے تم لوگوں کے ساتھ بڑو دیدی کے پاس نہیں جا سکوں گا۔ میں نے دیدی کو یہاں بلایا ہے۔ وہ آنے والی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر کہنیاں ٹیک کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ نین تارا اندر سے تڑپ گئی۔ اس کا جی چاہتا تھا ابھی اٹھ کر جائے اور اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرے۔ اس کی پریشانی کچھ تو کم ہو سکتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اسی دوران عظمیٰ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے خسرو کے پاس پہنچ گئی۔ پھر وہ اس کے سر پر محبت سے اور ہمدردی سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ نین تارا گم صم بیٹھی اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ خسرو سے کیوں اتنی ہمدردی کر رہی ہے؟

خسرو آنکھیں بند کیے سوچ رہا تھا۔ بند آنکھوں کے باوجود عورت کے ہاتھ کا لمس سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اس کے دل میں آیا۔ فوراً آنکھ کھول کر دیکھے۔ پھر دماغ نے سمجھایا۔ دیکھے گا تو وہ شرما کر دور ہو جائے گی۔ اس سے پہلے کھلنا سے آتے وقت وہ اوپری برتھ پر سو رہا تھا۔ نین تارا اسے نیند کی حالت میں سمجھ کر قریب آ گئی تھی۔ ہولے ہولے اس کے پاؤں دابنے لگی تھی۔ اس وقت بھی اس نے چاہا تھا کہ سر اٹھا کر دیکھے لیکن ضبط سے کام لیا تھا۔ اس وقت بھی دماغ نے سمجھایا تھا۔ سر اٹھا کر دیکھے گا تو وہ دور ہو جائے گی۔

نین تارا نادان نہیں تھی۔ اتنا سمجھتی تھی کہ عظمیٰ کے دل میں کھوٹ نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے خسرو سے ہمدردی اور محبت سے پیش آ رہی تھی۔ عورت کے پیار میں تقدس بھی تو ہوتا ہے۔

نین تارا کو حیرانی اس بات کی تھی کہ خسرو کیوں چپ ہے؟ کیوں آنکھیں کھول کر نہیں دیکھ رہا ہے؟ کیا سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں؟ ہر درخت کی چھاؤں میں سستانے لگتے ہیں؟

اسی وقت عظمیٰ نے ہاتھ کے اشارے سے نین تارا کو

خسرو کے پاس آنے کے لیے کہا۔ نین تارا نے بھی اشارے سے پوچھا: "کیا بات ہے؟ وہ کیوں بلا رہی ہے؟"

عظمیٰ نے گونگے اشارے میں سمجھایا: "میرے پاس آؤ۔ میری جگہ کھڑی ہو جاؤ اور اس طرح سر سہلاؤ۔"

وہ بول نہیں سکتی تھی۔ بول سکتی تب بھی خسرو کے سامنے نہ بولتی۔ اشاروں سے ہی سمجھاتی: اپنے مرد کی پریشانی کے وقت یہ تاثر دینا چاہیے کہ عورت اس کی پریشانیوں کو سمجھ رہی ہے۔ اس کے کسی مسئلے کو اگر حل نہیں کر سکتی ہے تو کم از کم اس کے پاس سایہ بن کر رہ سکتی ہے۔ اس کے لیے ایسی زمین بن سکتی ہے جو کبھی محاورتاً بھی پاؤں تلے سے نہیں نکلتی۔

نین تارا گونگی نصیحتوں کو سمجھ رہی تھی لیکن خسرو کے قریب جاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ اس نے کئی بار سوچا۔ اپنے آدمی کے پاس کسی اور کو نہیں ہونا چاہیے۔ خواہ کسی کا دل کتنا ہی صاف کیوں نہ ہو۔ خود آگے بڑھ کر اپنی ذمے داریوں کو سنبھالنا چاہیے لیکن وہ سوچتی ہی رہ گئی۔ اسے خسرو کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ وہ اسی طرح سر جھکائے، آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا: "نین تارا! میں جانتا ہوں، تم بے حد شرمیلی ہو مگر کبھی کبھی شرماتے ہوئے بھی اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ تم نے ابھی میرے پاس آ کر میرے ذہن کا بوجھ اتار دیا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

گونگی ایک ہاتھ سے منہ دبائے ہنس رہی تھی۔ نین تارا بھی دور بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ آخر گونگی سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ خسرو نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ عظمیٰ کو اپنے قریب دیکھ کر بوکھلا گیا۔ پھر اس نے سر گھما کر نین تارا کو دیکھا۔ وہ منہ چھپا کر ہنس رہی تھی۔ اسے ہنستے دیکھ کر خسرو خوشی سے کھل گیا۔ جب سے وہ اس کی ہم سفر بنی تھی، پہلی بار اسے کھل کر ہنستے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا "اچھا تو مجھے تم دونوں مل کر بیوقوف بنا رہی تھیں۔"

نین تارا نے کہا: "میں نے کچھ نہیں کیا۔ اسی عظمیٰ کو تمہاری باتوں پر ہنسی آ گئی تھی۔"

عظمیٰ نین تارا کے قریب کرسی پر آ کر بیٹھ گئی پھر سنبھل سنبھل کر بولنے لگی: "ہم کو کبھی کبھی ہڑنا بوڑنا ڑاہیے۔"

نین تارا اور خسرو اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ جہاں اس کی زبان تالو سے نہیں لگتی تھی، وہاں کے الفاظ اس نے صاف ادا کیے تھے باقی الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ عظمیٰ نے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "ہڑنا یعنی ہی ہی ہی۔۔۔"

خسرو نے کہا: "میں سمجھ گیا۔ ہڑنا کے معنی ہنسنا۔ تو پھر بوڑنا کے معنی بولنا ہوئے۔"

نین تارا نے کہا: "تو پھر عظمیٰ کی بات یہ ہی کہ ہم کو کبھی کبھی ہنسنا بولنا ڑاہیے۔ ڑاہیے کا مطلب ہوا چاہیے۔ ہم کو کبھی کبھی ہنسنا بولنا چاہیے۔"

عظمیٰ خوش ہو کر ہاں ہاں کے انداز میں سر ہلانے لگی پھر کہنے لگی: "ہم کو کبھی کبھی ہڑنا بوڑنا ڑاہیے۔ ڈُک ہڑکے ہو جاڑے ہیں۔"

وہ دونوں پھر اس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے کہ کون کون سے لفظ کٹی ہوئی زبان سے زخمی ہو جاتے ہیں اور اپنی صحیح صورت میں ادا نہیں ہوتے۔ بات رفتہ رفتہ سمجھ میں آ گئی۔ عظمیٰ کہہ رہی تھی: "ہم کو کبھی کبھی ہنستے بولتے رہنا چاہیے۔ دُکھ ہلکے ہو جاتے ہیں۔"

نین تارا نے محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "تم ہمارے ساتھ رہو گی تو یقیناً ہمارے دکھ ہلکے ہوتے رہیں گے۔ تم بہت اچھی ہو۔"

خسرو نے بند دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ دیدی اب آنے ہی والی ہوں گی۔"

نین تارا نے کہا: "ہم یہاں تک میاں بیوی بن کر آئے۔ ہم نے دنیا والوں سے جھوٹ کہا۔ کیا بڑو دیدی سے بھی جھوٹ بولیں گے؟"

خسرو نے کہا: "دنیا والوں سے صرف جھوٹ کہا ہے۔ بڑو دیدی سے سفید جھوٹ کہتے رہنا ہوگا۔ ورنہ جانتی ہو، کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟"

"جب انھیں معلوم ہوگا کہ میں نے شادی نہیں کی ہے تو پھر وہ مجھے اپنے پاس سے جانے نہیں دیں گی —— وہ کبھی گوارا نہیں کریں گی کہ میں کہیں جا کر بھٹک جاؤں اور دشمن مجھے مار ڈالیں۔"

"میری وابستگی سے کیا فرق پڑے گا؟"

"بہت فرق پڑے گا۔ میں ان سے کہوں گا، تمہارے رشتے دار پاکستان میں ہیں۔ اس لیے ہمارا یہاں سے پاکستان جانا ضروری ہے۔ وہ تمہیں تمہارے رشتے داروں کے پاس جانے سے نہیں روکیں گی۔ اس طرح میں تمہارے ساتھ یہاں سے نکل چلوں گا۔"

اس کی باتوں کے دوران عظمیٰ اشارے سے نین تارا کو

بتا رہی تھی کہ خسرو کا گریبان کھلا ہوا ہے۔ جا کر اس کے بٹن لگا دو۔

نین تارا اس کے اشاروں کو سمجھ رہی تھی لیکن خسرو کے قریب جانے کے خیال سے ہی پاؤں من من بھر کے ہو جاتے تھے۔ اسی وقت وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا "میں ذرا باہر جا کر دیکھتا ہوں۔ دیدی آتی ہی ہوں گی۔"

عظمیٰ نے نین تارا کے بازو میں ہلکی سی چٹکی لی، پھر آنکھ کے اشارے سے نصیحت کی "جاؤ بٹن لگا دو۔ مرد کو اس طرح باہر نہیں جانا چاہیے۔ کیونکہ کھلے ہوئے گریبان کے باعث وہ پریشان حال نظر آتا ہے۔"

خسرو نے دونوں کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر پوچھا "یہ کیا اشارے ہو رہے ہیں؟"

نین تارا نے کہا "کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔"

وہ جانے لگا۔ عظمیٰ نے نین تارا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔ اسی وقت وہ اٹھ کر بولی "آں...ں"

خسرو دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ عظمیٰ کی آواز سن کر رک گیا۔ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں کی نظریں ملیں، پھر وہ ہاتھ بڑھا کر کھلے ہوئے گریبان کو بند کرنے لگی۔ بٹن کو کاج سے منسلک کرنے لگی۔

ایسے ہی وقت ویٹنگ روم کا دروازہ کھل گیا۔ وہاں ایک بڑی عمر کی من موہنی صورت والی بڑی باوقار عورت کھڑی ہوئی تھی ـــ اس کے لباس سے پتا چلتا تھا کہ وہ مارواڑی ہے اور وہاں آنے والی مارواڑی عورت صرف بڑو دیدی ہو سکتی تھی

خسرو نے اسے دیکھتے ہی خوشی سے نعرہ لگایا "اوہ میری ماں سمان دیدی آ گئیں۔" پھر اس نے دیدی کے سامنے ذرا جھک کر کہا "بڑو دیدی پالاگن۔"

دیدی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "بھگوان تمھاری رکھشا کرے۔ خدا تمھیں سلامت رکھے۔ اب سامنے سے ہٹو۔ پہلے میں اپنی بھاوج کو جی بھر کر دیکھوں گی۔"

وہ خسرو سے کترا کر عظمیٰ کے پاس آئیں۔ پھر اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولیں "ہائے میری بھابی کتنی سندر ہے۔"

عظمیٰ ہنسی ضبط کر رہی تھی۔ دیدی نے کہا "کیسی چنچل آنکھیں ہیں۔ لگتا ہے اب تب میں ہنسنے ہی والی ہوں۔"

عظمیٰ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ خسرو نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا "بڑو دیدی! پٹری بدل دیجیے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

عظمیٰ، دیدی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے نین تارا کے سامنے لے آئی۔ وہ سر پر آنچل رکھے سر جھکائے شرما رہی تھی۔ زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ دیدی کے سامنے آتے ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا "آداب۔"

خسرو نے آگے بڑھ کر کہا "یہ میری دُلھن ہے۔"

دیدی، نین تارا کے سحر طاری کرنے والے حسن کو تک رہی تھیں۔ خسرو کی آواز پر چونک گئیں۔ انھوں نے پہلے عظمیٰ کو دیکھا، پھر خسرو کے گریبان کو دیکھا۔ وہ پتی سیوا کو اپنا دھرم سمجھتی تھیں۔ اس وقت یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بیوی کی موجودگی میں دوسری عورت اس کے بھائی کے گریبان کا بٹن کیوں لگا رہی تھی۔ اس کی بھابی سے پتی سیوا کا حق کیوں چھین رہی تھی اور یہ حق خسرو کیوں اسے دے رہا تھا؟

انھوں نے خسرو سے عظمیٰ کے متعلق پوچھا "یہ کون ہے؟"

عظمیٰ نے ذرا آگے بڑھ کر کہا "اوڑما۔ میڑاڑام اوڑباٹے۔"

دیدی شدید حیرانی سے پیچھے ہٹ گئیں۔ "یہ یہ کیا بول رہی ہے؟ یہ کون سی بھاشا ہے؟"

"دیدی! ظالموں نے اس کی زبان کاٹ دی ہے۔ یہ ٹھیک طرح بول نہیں سکتی ہے۔ بے چاری بہت معصوم ہے اس کی عمر زیادہ ہے لیکن عقل کم ہے۔"

دیدی نے نین تارا کی طرف گھوم کر کہا "اور تمھاری عمر بھی کم ہے اور عقل بھی کم۔ کیا نام ہے تمھارا؟"

"نین تارا۔"

"نین تارا! تم مجھ سے چھوٹی ہو۔ مجھے خسرو کی طرح عزیز ہو۔ تمھیں بری بھلی بات سمجھانا میرا فرض ہے۔ اگر سمجھنا چاہو تو میری بات سمجھ لو۔ میں ایک ہندو عورت ہوں۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں لیکن یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ میرے ماتھے کی بندیا کسی اور کے ماتھے پر چمکے۔"

دیدی نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر ذرا اپنے قریب جھکایا۔ پھر اس کے ماتھے کو محبت سے چوم لیا۔

*

وہ لانچ برہم پترا کی لہروں کو چیرتی ہوئی تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف جا رہی تھی۔ دوسرا کنارا ابھی میلوں دور تھا۔ لانچ کی ریلنگ کے اوپر ایک لوہے کا راڈ چھت سے لگی ہوئی تھی اس راڈ پر دو عدد رسیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک رسی کے آخری سرے پر ایک بچے کا دایاں ہاتھ بندھا ہوا تھا۔ دوسری رسی

کے آخری سرے پر اسی بچے کا بایاں ہاتھ بندھا ہوا تھا۔ وہ ان سے بندھا ہوا جھول رہا تھا۔ اگر رسّی ٹوٹ جاتی تو وہ سیدھا برہم پترا کے گہرے پانی میں ہمیشہ کے لیے کھو جاتا۔

وہ بچہ تقریباً سات برس کا ہوگا۔ نیچے گہرے پانی کو دیکھ کر دہشت سے کبھی چیخ رہا تھا اور کبھی رو رو کر اپنے والدین کو آوازیں دے رہا تھا۔ لانچ کے نچلے حصّے میں تیسرے درجے کے مسافروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے سبھی اس بچے کو یوں دیکھ رہے تھے، جیسے وہ تماشا دیکھنا نہ چاہتے ہوں مگر دیکھنے پر مجبور ہوں۔

بچے کے آس پاس مکتی باہنی کے جوان اسٹین گن لیے ریلنگ سے لگے کھڑے تھے۔ مسافروں کی بھیڑ میں سے کچھ رحمدل بنگالیوں نے اعتراض کیا۔ کسی نے کہا: "بچے کو چھوڑ دو۔" کسی نے کہا: "دشمنی بڑوں سے ہوتی ہے۔ بچوں سے نہیں ہوتی۔"

مکتی باہنی کے ایک جوان نے چیخ کر کہا: "ہم نے چوبیس برسوں میں یہ سیکھا ہے کہ ایک طرف سے سانپ آئے۔ دوسری طرف سے بہاری آئے تو پہلے بہاری کا سر کچلنا چاہیے کیونکہ سانپ کا کاٹا بچ سکتا ہے۔ بہاریوں کا مارا بچ نہیں سکتا۔"

مکتی باہنی کے دوسرے جوان نے اسی طرح چیخ کر کہا۔ "یہ بچہ ماوڑوں کی بھاشا بولتا ہے۔ یہ ضرور کسی سانپ کا بچہ ہے۔"

ایک عورت بھیڑ کو چیرتے ہوئے، چیختے ہوئے اس بچے کی طرف جانے لگی: "ایئی امار چھیلے۔ اماکے دیئے داؤ۔ ایئی امار چھیلے (یہ میرا بچہ ہے۔ مجھے دے دو۔ یہ میرا بچہ ہے)"

ایک مسلح جوان نے اسے پرے ہٹاتے ہوئے کہا: "نہیں بوکا (بیوقوف) نہ سمجھو۔ تم بنگالی ہو۔ یہ بہاری ہے۔"

اس عورت نے کہا: "میں بہاریوں کے محلے میں رہتی تھی۔ میرا بچہ ان کے بچوں کے ساتھ ہنستا، بولتا، کھیلتا تھا۔ اس لیے ان کی بولی بولتا ہے۔ اسے مجھے دے دو۔ یہ میرا ہے۔ تمہیں خدا کا واسطہ، ایک ماں کی بددعا نہ لو۔"

ایک مسلح جوان نے بچے کے پھول جیسے چہرے کو اپنے سخت کھردرے ہاتھ کی گرفت میں لیتے ہوئے پوچھا: "کیا یہ تمہاری ماں ہے؟"

بچہ نادان تھا۔ وہ صرف اپنی ماں کو ماں کہہ سکتا تھا۔ اس نے روتے ہوئے کہا: "نہیں، نہیں۔ میری امّی کو بلاؤ۔ میرے ابّو کو بلاؤ۔ امّی، میں پانی میں گر جاؤں گا۔ ابّو مجھے بچاؤ۔"

جانے وہ کس کا بچہ تھا۔ اس کے ماں باپ کہاں تھے؟ یقیناً اسی لانچ میں ہوں گے۔ ورنہ وہ بچہ وہاں کیسے پہنچ جاتا۔

ان دنوں بہاری اپنی اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے۔ کوئی اتنے لمبے سفر پر نہیں نکلتا تھا۔ اس لانچ میں تمام مسافر بنگالی تھے یا پھر وہ بہاری ہو سکتے تھے جو روانی سے بنگالی زبان بولتے تھے اور اپنی اصلیت کو چھپا سکتے تھے۔ بچے نادان ہوتے ہیں۔ وہ روپ بہروپ کو نہیں سمجھتے۔ اس لیے بے اختیار مادری زبان میں بولنے لگتے ہیں۔

ایک بنگالی مسافر ننھے سے بچے کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا: "ایسا ظلم نہ کرو۔ سب بچے معصوم ہوتے ہیں۔"

مکتی باہنی کے ایک جوان نے غصّے سے جھنجلا کر کہا: "تم لوگ کیسے بے حس ہو؟ اتنی جلدی بھول گئے کہ ان بہاریوں نے تمہارے معصوم بچوں کو چھری تلے ذبح کیا تھا۔ انھیں ان معصوموں پر رحم نہیں آیا تھا۔ ان میں سے کسی نے نہیں کہا کہ سب بچے معصوم ہوتے ہیں۔"

ایک اور بنگالی نے اٹھ کر کہا: "شاید کسی بہاری نے بھی یہی بات کہی ہوگی۔ کیونکہ ہر قوم میں صرف ظالم نہیں ہوتے۔ مظلوموں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ شریف زیادہ اور بدمعاش کم ہوتے ہیں اور جو کم ہوتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں ہتھیار ہوتے ہیں۔ وہی ظالم اور بدمعاش ہوتے ہیں۔"

مسلح جوان نے آگے بڑھ کر اسٹین گن کے دستے سے اس کے چہرے پر ضرب لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گرا اور تکلیف سے کراہنے لگا۔ اس نے گالیاں دیتے ہوئے کہا: "ہم نے اس دیش کو آزاد کرایا ہے۔ ہم مکتی باہنی والے نہ ہوتے تو آج بھی تم لوگ پاکستانی حکمرانوں کے غلام بنے رہتے۔"

سب کو چپ لگ گئی۔ کچھ بنگالی ایسے تھے جو کسی بھی بہاری سے انتقام لینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مشورہ تھا کہ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب اپنے دیش کو بنانے کی فکر کرنا چاہیے۔ کچھ بنگالی انتقام کی آگ میں جل رہے تھے لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو دوسروں کے معاملات میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اپنے دال بھات اور بال بچوں کی فکر میں مبتلا رہتے تھے۔ اس کے باوجود وہاں جتنے بچوں والے تھے۔ وہ سب دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ وہ معصوم زندہ رہ جائے اور اس کے ماں باپ کہیں سے آ جائیں۔

پچھلے دنوں خوب بارش ہوئی تھی۔ دریا لبالب بھرا ہوا تھا۔ لانچ تیز رفتاری سے منہ زور لہروں کو کاٹتے ہوئے گزر رہی جا رہی تھی اور لہریں یوں بپھر رہی تھیں، یوں اچھل رہی تھیں جیسے بچے کو اپنی آغوش میں لے کر ہی دم لیں گی۔ لانچ کے

عرشے پر فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس مسافروں کے لیے کیبن بنے ہوئے تھے۔ لیکن ان دنوں کوئی کسی کو اپنے مقابلے میں فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس تسلیم نہیں کرتا تھا۔ آزادی کے جوش میں رہنے والے جوان تیسرے درجے کا ٹکٹ لے کر پہلے درجے میں بے روک ٹوک گھس آتے تھے۔ کوئی اُن کے منہ لگنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ مکتی باہنی کے دو مسلح جوان عرشے پر آ کر اعلان کر رہے تھے: "یہ بچہ کس کا ہے؟ جس کا بھی ہے سامنے آ جائے پھر ہم اس بچے کو نہیں ماریں گے۔ نہیں تو یہ پانی میں بہہ جائے گا۔"

سبھی اس تجسس میں مبتلا تھے، آخر وہ بچہ کس کا ہے؟ اس کے والدین یا سرپرست سامنے کیوں نہیں آ رہے ہیں؟ اس کا ایک ہی جواب سمجھ میں آتا تھا کہ اس بچے کے پیچھے بہاریوں کا پورا ایک خاندان ہے جو بنگالی مسافروں میں گڈمڈ ہو گیا ہے اور ان کی شناخت نہیں ہو رہی ہے۔

عورتیں سوچ رہی تھیں۔ ایک ماں ممتا کے بے اختیارانہ جذبے سے پہچانی جاتی ہے۔ وہ بچے کی ایک چیخ پر ضبط کے سارے بندھن توڑ کر چلی آتی ہے۔ آخر اس بچے کی ماں کیسی ہے؟ کیا اپنی جان بچانے کے لیے بچے کی جان کو داؤ پر لگا رہی ہے؟

کیوں نہ لگائے؟ جب یہ بات یقینی ہے کہ بچے کے سامنے جائے گی تو بچہ زندہ نہیں رہے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی ماری جائے گی۔ شاید اس کے ساتھ اس کے خاندان کے دوسرے لوگ بھی مارے جائیں۔ ایک بچے کی خاطر وہ پورے خاندان کو قاتلوں کے سامنے بے نقاب نہیں کر سکتی تھی۔

فرسٹ کلاس کے ایک مسافر نے پولیس انسپکٹر سے کہا۔ "جناب! آپ آرام فرما رہے ہیں اور وہاں غیر قانونی حرکتیں ہو رہی ہیں۔ یہاں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے سینے میں انسان کا دل رکھتے ہیں اور انسان کا دل رکھنے والے کسی معصوم بچے کو اس طرح مرتے نہیں دیکھ سکتے۔"

انسپکٹر نے فرسٹ کلاس کی سیٹ پر آرام سے پہلو بدلتے ہوئے کہا: "میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہم بظاہر قانون کے محافظ ہیں۔ لیکن دیکھ لو کہ میرے پاس ایک ریوالور ہے جس میں صرف چار گولیاں ہیں۔ باقی رہے میرے چار سپاہی ان کے پاس لاٹھیاں ہیں۔ اس کے برعکس مکتی باہنی کے جوان اسٹین گن لیے پھرتے ہیں۔ وہ میری بات نہیں مانیں گے۔ وہ ایک ہی قانون جانتے ہیں کہ بہاریوں کو بالکل ختم کر ڈالو یا بنگلہ دیش سے باہر نکال دو۔"

ایک اور مسافر نے کہا: "ہم تمام بہاریوں کی بات نہیں کر رہے ہیں۔ صرف ایک معصوم بچے کی جان بچانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ تم اپنے سپاہیوں کے ساتھ جا کر انھیں سمجھانے کی کوشش تو کرو۔"

"میں اب سے پہلے سنتا ہار کے مکتی باہنی والوں کو سمجھا چکا ہوں اور اس کے نتیجے میں گالیاں سن چکا ہوں۔ خیریت ہوئی کہ انھوں نے مجھے جان سے نہیں مارا۔ ہم میں سے اگر کوئی بنگالی بہاریوں کی حمایت میں کچھ کہتا ہے تو وہ غدار کہلاتا ہے۔ ہمارا نام ان بنگالیوں کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے، جنھوں نے حکومتِ پاکستان کا ساتھ دیا تھا۔"

ایک عورت نے غصے سے کہا: "آپ انسپکٹر کی وردی پہن کر صرف باتیں بنانا جانتے ہیں۔ اس پھول جیسے بچے کی ننھی کلائیاں رسیوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ وہ اسی طرح لٹکا رہے گا تو کلائیاں کٹ جائیں گی۔ وہ پانی میں ڈوب جائے گا۔"

انسپکٹر نے کہا: "آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ بچے کو مارنا چاہتے تو بہت پہلے مار چکے ہوتے۔ یہ ڈراما نہ کرتے۔ یہ محض اس کے والدین کو بے نقاب کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ قصور مکتی باہنی والوں کا نہیں، بچے کے والدین کا ہے۔ وہ سامنے کیوں نہیں آتے؟ کیوں ہم مسافروں کو پریشان کر رہے ہیں؟"

اس بنگالی خاتون نے کہا: "تو پھر آپ مکتی باہنی کے جوانوں کو یہی سمجھائیں کہ بچے کو رسی سے آزاد کر دیں۔ اسے لے کر لانچ کے نچلے حصے سے اوپری حصے تک گھومتے پھریں اور ایک ایک مسافر عورت اور مرد کی صورت دکھاتے رہیں۔ بچہ ان میں یقیناً اپنے والدین کو پہچان لے گا۔"

مشورہ معقول تھا۔ انسپکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کر فرسٹ کلاس کیبن سے باہر آیا۔ اس کا ایک سپاہی لانچ کے اوپری حصے میں تھا۔ باقی تین سپاہی نچلے حصے میں تھے۔ جو لوگ بغیر ٹکٹ سفر کر رہے تھے، ان سے وہ روپے، دو روپے، چار روپے وصول کر رہے تھے۔ یہی ان کی اوپری آمدنی تھی۔ انسپکٹر فرسٹ کلاس کے کیبن میں بیٹھا اوپری آمدنی کا حساب کرنے والا تھا۔ اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ مسافروں کے اصرار پر وہ کیبن سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے اپنے چاروں سپاہیوں کو بلایا پھر ان کے ساتھ مکتی باہنی کے جوانوں کے پاس آ کر کہا: "یہ مناسب طریقہ نہیں ہے۔ بچہ آخر بچہ ہے۔ اس کی رسیاں کھول دو۔"

ایک جوان نے کہا: "انسپکٹر! ہم تمھارے معاملات میں دخل نہیں دے رہے ہیں۔ ورنہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تمھارے

سپاہی یہاں جیبیں گرم کرتے پھر رہے ہیں۔"

انسپکٹر نے جھینپ کر کہا: "وہ تو ٹھیک ہے۔ رشوت خوری یا تھوڑی سی ہیرا پھیری اور بات ہے لیکن عوام کے سامنے دہشت پھیلانا بہت بڑا جرم بھی ہے اور غیر انسانی سلوک بھی ہے۔"

"انسپکٹر! ان کے لیے یہ غیر انسانی سلوک نہیں ہے، جنھوں نے اس بچے کو پیدا کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اب تک ہمارے سامنے آچکے ہوتے۔"

"اس قدر تشدد کا مظاہرہ کرنے سے وہ سامنے نہیں آئیں گے۔ شاید بچے کی موت پر بھی خود کو بے نقاب نہ کریں۔ اس کی ایک دوسری صورت ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اس بچے کی رسیاں کھول دو پھر اسے ہمارے ساتھ لے کر لانچ کے نچلے حصے سے اوپری حصے تک گھومتے پھرو۔ بچہ ایک ایک مسافر کا چہرہ دیکھے گا اور اپنے والدین کو پہچان لے گا۔"

ایک جوان نے غصے سے کہا: "ہم کسی کے باپ کے نوکر نہیں ہیں۔ ہم کیوں اس بچے کو لے کر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر گھومتے رہیں جسے غرض ہوگی وہ ادھر آئے گا۔"

"آنا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا۔"

"نہیں آئے گا تو ابھی ہم اور انتظار کریں گے۔ آدھے گھنٹے کے بعد اس بچے کے ایک ہاتھ کی رسی کاٹ دی جائے گی۔ پھر وہ ایک ہاتھ سے لٹکتا رہے گا، پھر آدھے گھنٹے کے بعد دوسرے ہاتھ کی رسی بھی کاٹ دی جائے گی۔"

ایک مسلح جوان نے کہا: "نہیں، ہم ایسی حماقت نہیں کریں گے۔ رسی کو کاٹیں گے تو کٹ جائے گی۔ پھر وہ رسی کسی کام نہیں آئے گی۔ البتہ بچے کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے وہ پانی میں چلا جائے گا۔ رسیاں ہمارے کام آنے کے لیے رہ جائیں گی۔"

انسپکٹر تھوڑی دیر تک ان مسلح جوانوں سے بحث کرتا رہا انھیں سمجھانے کی کوششیں کرتا رہا۔ پھر مایوس ہو کر عرشے پر آگیا فرسٹ کلاس کے ایک مسافر نے پوچھا: "کیا ہوا؟"

"وہی جو ہوتا آرہا ہے۔ وہ کسی کی نہیں سنتے اور بھلا کیوں سنیں گے۔ جب یہ ملک پاکستان کہلاتا تھا تب ان مکتی باہنی کے جوانوں کو یہاں سے بھاگنا پڑا۔ سرحد پار جا کر انھوں نے بھارت میں پناہ لی۔ وہاں انھوں نے کیسی کیسی مصیبت اٹھائی۔

بنگلہ دیش کے لیے ان لوگوں نے دن رات بھوکے رہ کر ایک آنکھ سے سو کر، ایک آنکھ سے جاگ کر ہمیں آزادی دلائی ہے۔ ہم ان کے خلاف کچھ بول نہیں سکتے اور ہمیں بولنا نہیں چاہیے۔"

"ہاں، نہیں بولنا چاہیے، لیکن آزادی دلانے والے ناقابلِ برداشت ظلم و ستم کے ذریعے آزادی کو بدنام کرنے لگیں تو چپ نہیں رہنا چاہیے۔"

سب نے اس بولنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ ایک قدآور شخص تھا۔ اس نے پتلون اور نصف آستین کی بشرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کی داڑھی مونچھیں اور سر کے بال اس قدر بڑھے ہوئے تھے کہ چہرے کا بہت کم حصہ نظر آتا تھا۔ اس کا لباس اور جوتے کیچڑ آلود تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پانی میں ڈوبے ہوئے کھیتوں سے اور دلدلوں سے گزرتا آیا ہو۔ اب اس کے جسم اور لباس پر کیچڑ سوکھ گئی تھی۔ اس کی بغل میں کوئی چیز دبی ہوئی تھی اور وہ چیز کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ جیسے اس نے چھوٹا سا بستر باندھ کر بغل میں داب رکھا ہو۔ انسپکٹر نے پوچھا: "تومی کے (تم کون ہو)؟"

اس قدآور نے جواب دیا: "میں کون ہوں۔ میرا نام کیا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بعض اوقات بہت سے نام سمجھ میں نہیں آتے۔ اگر آتے ہیں تو مجھے بتایا جائے کہ اوڑما کا مطلب کیا ہے؟"

سب لوگ اسے تعجب سے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا: "اوڑما ایک حسین عورت کا نام ہے۔ وہ عورت اس وقت بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں مجھے محبت سے پکار رہی ہیں۔ مجھے اپنا نام بتا رہی ہیں: اوڑما۔"

ایک سپاہی نے ہنستے ہوئے کہا: "یہ کسی کا دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ بھلا اوڑما کوئی نام ہوتا ہے۔"

اس نے کہا: "ہاں، اگر کسی کی زبان کٹی ہو اور وہ اپنی کٹی ہوئی زبان سے اپنا نام ادا کرے تو یہی ادا ہوتا ہے۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا۔ جس نام کے آخر میں ما آتا ہے وہی اس کا نام ہو سکتا تھا۔ نجمہ، سلمیٰ۔ اگر وہ پنجابی عورت ہے تو ریشماں۔ ہندو عورت ہے تو روما، سوما۔ جانے کتنے نام ہوتے ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو مجھے اوڑما سے خوبصورت کوئی نام نہیں لگتا۔ کیونکہ یہ محبت کی کٹی ہوئی زبان سے ادا ہوا۔ یہ کٹا ہوا نام زخمی محبت کی طرح میرے سینے میں دُکھ رہا ہے۔"

ایک عورت نے ناگواری سے کہا: "یہاں ایک بچے کی جان جانے والی ہے اور تم اپنی محبت کا قصیدہ پڑھ رہے ہو۔"

"بچے کو عورت پیدا کرتی ہے اور عورت کی محبت مرد کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی حفاظت کرے۔ میں بہت دیر سے اس بچے کو دیکھ رہا تھا جو رسیوں سے بندھا ہوا ہے۔

کسی وقت بھی رسیاں کاٹی جا سکتی ہیں اور اسے پانی میں ڈبویا جا سکتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں، اس بچے کو دیکھتے ہی ابھی ابھی اوڑما دلہن بن کر میرے پاس آگئی تھی۔ میں اپنے ایمان سے اور روح کی گہرائیوں سے محبت کرتا ہوں۔ محبت بنگالیوں اور بہاریوں کی جاگیر نہیں ہے۔ محبت کسی سے بھی کی جا سکتی ہے میں نے دیکھا" اوڑما ایک بچے کی ماں بن گئی ہے۔ وہ بچہ سات یا آٹھ برس کا ہو گیا ہے اور اسے دشمنوں نے رسیوں سے باندھ کر لٹکا دیا ہے۔ میرے سر کے اندر اوڑما چیخ رہی ہے۔ میرے بچے کی جان بچاؤ۔ میں موجود نہیں ہوں تو کیا تم میرے بچے کو مرنے کے لیے چھوڑ دو گے؟ ماں جنم دیتی ہے۔ باپ بچے پہ سایہ بن کر رہتا ہے۔ ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ باپ خون اور پسینہ ایک کرتا ہے۔ میں اپنا بچہ تم سے لوں گی، میں اپنا بچہ تم سے لوں گی۔ یہ آواز میرے سر کے اندر گونج رہی ہے۔"

وہ سب چپ چاپ اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایسا کہنے کے دوران اپنی بغل میں دبے ہوئے بستر کو کھول رہا تھا۔ لپٹے ہوئے کپڑوں کو نکال کر نیچے قدموں کے پاس گراتا جا رہا تھا۔ پھر اس کے اندر سے جو چیز برآمد ہوئی اسے دیکھتے ہی سب سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔

انسپکٹر نے پوچھا "تم کون ہو؟"

"امارا نام کوہیمودین بھوتیاں (میرا نام کلیم الدین بھوتیاں ہے) یہ اسٹین گن میں نے اپنی اور اوڑما کی حفاظت کے لیے حاصل کی تھی۔ اب اسے اس بچے کی حفاظت کے لیے استعمال کروں گا۔"

انسپکٹر نے انکار کے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "نہیں، تم ایسا نہیں کرو گے۔ وہ تمہارا بچہ نہیں ہے۔ تم جذباتی بن رہے ہو۔ وہ تمہاری اور اوڑما کا بچہ نہیں ہے۔"

وہ غصے سے گرج کر بولا "میری اوڑما نے اس بچے کو [illegible] دیا ہے۔ اسے اپنی گود میں کھلایا ہے۔ اسے اپنا دودھ پلا [illegible] ہے۔ اب میرا کام شروع ہوگا۔"

"دیکھو مسٹر بھوتیاں! اگر تم نے اسٹین گن کو استعمال کیا تو یہاں آگ اور خون کی ہولی شروع ہو جائے گی۔ بہت سے بے گناہ مسافر مرد، عورتیں، بچے بوڑھے فائرنگ کی زد میں آکر مارے جائیں گے۔"

"تو پھر سیدھی سی بات ہے انسپکٹر! تم قانون کے محافظ ہو ان لوگوں کو قانون ہاتھ میں لینے سے روکو۔ اپنے اختیارات استعمال کرو۔ اگر تمہیں اس بات کی شکایت ہے کہ وہ ہتھیاروں کے اعتبار سے برتر ہیں اور تمہاری بات نہیں مانیں گے۔ تو میں تمہارے پیچھے اسٹین گن لیے کھڑا رہوں گا۔ ہتھیاروں کے اعتبار سے دونوں طرف برابر کی ٹکر ہوگی۔"

"مگر وہ تعداد میں چار ہیں۔ ان کے پاس چار اسٹین گنیں ہیں۔ تم ایک ہو۔ تمہارے پاس ایک . . ."

اس نے بات کاٹ کر سخت لہجے میں کہا "انسپکٹر! الیو آر آن ڈیوٹی، ڈیوٹی دینے والا سپاہی دشمنوں کی تعداد نہیں دیکھتا۔ وہ اپنے حوصلوں کو آزماتا ہے اور اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ تم بھی یہی کرو گے ورنہ . . ."

انسپکٹر نے اسٹین گن کی طرف دیکھتے ہوئے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ورنہ؟"

"تم ابھی ان سب لوگوں کے سامنے قانون کی وردی اتار کر دریا میں بہا دو گے۔ جب یہاں قانون نہیں ہوگا تو پھر لاقانونیت ہوگی۔"

اس نے ایک ہاتھ سے اسٹین گن سنبھالتے ہوئے، دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں دکھاتے ہوئے کہا "پھر دو میں سے ایک بات ہوگی۔ وہ بچہ زندہ سلامت میری گود میں آئے گا یا پھر اس لانچ کا ایک مسافر بھی دوسرا کنارہ نہیں دیکھ سکے گا۔ اس بچے کے ساتھ یہ لانچ بھی دریا میں غرق ہو جائے گی۔ میرا نام کلیم الدین بھوتیاں ہے۔ میں جو کہتا ہوں۔ وہ کر دکھاتا ہوں۔"

*

وہ عمارت آسیب زدہ تھی۔

آسیب زدہ عمارت کا تصور کسی ویرانے میں کیا جاتا ہے یا ایسی جگہ جو آبادی کے آخری سرے پر ہو، جدھر دن کے وقت بھی جانے والوں کے گھٹنے کانپنے لگتے ہوں لیکن وہ عمارت ویرانے میں نہیں تھی۔ اس کے دروازے پر مٹی کے دو شیر بنے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ عمارت شیر بلڈنگ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ اس کے آس پاس تنگ گلیاں تھیں۔ وہاں ایک دوسرے کے قریب مکانات بنے ہوئے تھے۔ لوگ دن رات ادھر سے گزرتے رہتے تھے اس کے باوجود وہاں دن ہو یا رات۔ کبھی کسی عورت کی چیخ سنائی دیتی تھی اور وہ اس عمارت سے نکل کر بھاگ آتی تھی۔ کبھی کوئی بوڑھا مرد یا کوئی بچہ چیختے چیختے بے ہوش ہو جاتا تھا۔

خسرو مین روڈ کو چھوڑ کر اسی گلی میں مڑ گیا جو شیر بلڈنگ کے سامنے سے گزرتی تھی۔ مین روڈ پر چلتا تو اسے ذرا گھوم کر جانا پڑتا۔ اس گلی سے ہو کر وہ جلد ہی بڑے ڈیڈی کی حویلی تک پہنچ سکتا تھا۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے کہیں کہیں بجلی کی روشنی تھی اور جہاں روشنی نہیں تھی، وہاں دور تک نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے شیر بلڈنگ کے متعلق سن رکھا تھا لیکن کوئی اسے یہ نہ بتا سکا تھا کہ اس بلڈنگ میں کوئی آسیب ہے۔

یا کوئی بلا ہے' یا کیا ہے؟

اس نے عمارت کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا' باہر تاریکی تھی۔ دو شیر منہ کھولے اپنے دانتوں کی نمائش کر رہے تھے۔ شیر بلڈنگ کے اندر تاریکی نہیں تھی۔ ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے لالٹین کی زرد روشنی جھلک رہی تھی۔ وہاں بظاہر دہشت زدہ کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ آدھی رات کے بعد بھی لوگ اس عمارت کے سامنے سے گنگناتے ہوئے یا سیٹی بجاتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ خسرو کے دل میں ایک ذرا سا خوف نہ تھا۔ وہ بڑے مزے سے ٹہلنے کے انداز میں عمارت کے سامنے سے گزر گیا لیکن چند قدم آگے جاتے ہی ایک دم سے اچھل پڑا۔ ایک فلک شگاف چیخ سنائی دی تھی۔ وہ چیخ اسی عمارت کے اندر سے گونجتی ہوئی باہر آئی تھی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس ماحول میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آس پاس کے مکانات اسی طرح خاموش تھے۔ البتہ ایک آدھ کھڑکی' دروازے کھل گئے تھے۔ عورتیں وہاں سے جھانک کر شیر بلڈنگ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ دو چار مرد اپنے مکان کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ چیخنے کی آوازیں کچھ وقفے سے آتی جا رہی تھیں۔ خسرو نے آگے بڑھ کر ایک شخص سے پوچھا "بھائی صاحب! کیا بات ہے۔ یہاں کون چیخ رہا ہے؟"

اس نے بیزاری سے کہا: "یہاں تو آئے دن کوئی نہ کوئی چیختا ہی رہتا ہے۔"

"کس بات کیا ہے؟"

اس نے کہا: "بھئی کیوں میرا سر کھاتے ہو۔ جا کر دیکھ لو۔ اس عمارت کے اندر جانے پر کوئی پابندی تو ہے نہیں۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا: "لیکن آپ اتنی بیزاری سے جواب کیوں دے رہے ہیں؟"

"کیوں نہ دوں۔ آپ تو ابھی یہاں سے گزر جائیں گے ہم یہاں دن رات رہتے ہیں۔ آدھی رات کے بعد بھی کوئی چیخنا شروع کر دے گا اور ہماری نیند اڑ جائے گی۔ یہ باہر سے آنے والے ہمارے لیے مصیبت بن گئے ہیں۔"

وہ شخص ان لوگوں کو باہر سے آنے والے کہہ رہا تھا جو ٹنگ پور' دیناج پور اور پاربتی پور وغیرہ سے جان بچا کر سید پور آئے تھے۔ خسرو نے کہا: "بھائی صاحب! یہ تمام آنے والے آپ کی طرح اردو بولتے ہیں۔ آپ کی طرح بہاری اور پنجابی ہیں۔ تقسیم پاکستان کے وقت جس طرح آپ لوگ باہر سے یہاں آئے تھے۔ اسی طرح اب یہ لوگ پناہ لینے کے لیے آ رہے ہیں۔"

اس نے ناگواری سے کہا: "یہ کیا ضروری ہے کہ سبھی لوگ مرنے کے لیے سید پور پہنچ جائیں۔ ان کے آنے سے مہنگائی آسمان تک پہنچ گئی ہے۔ ہم یہاں دانے دانے کے لیے ترستے ہیں۔ راشن اتنا مہنگا ہے کہ روز اپنے گھر کی کوئی چیز بیچنے کے بعد بھی پیٹ نہیں بھرتا۔"

"آپ کے خیال میں بہاری پناہ گزیں بے موت مرنے کے لیے یہاں سے چلے جائیں۔ تاکہ آپ کے زندہ رہنے کے لیے راشن سستا ہو جائے۔"

اس نے گھور کر خسرو کو دیکھا۔ اسی وقت پھر چیخ سنائی دی۔ خسرو تیزی سے چلتا ہوا شیر بلڈنگ کے دروازے پر آیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر ایک بہت ہی وسیع و عریض ہال تھا۔ اس ہال میں جگہ جگہ پھٹی پرانی چادریں تان کر دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ ان چادروں کی دیواروں کے درمیان چھوٹے چھوٹے کمرے سے بن گئے تھے۔ ہر چادر کی چار دیواری میں بہاریوں کا ایک ایک خاندان آباد تھا۔ وہ عمارت بالکل بوسیدہ سی تھی۔ دیواروں پر جگہ جگہ سے پلاسٹر ادھڑے ہوئے تھے۔ چھت سے پانی رستا رہتا تھا۔ اس لیے چھت اور دیواروں پر کہیں کہیں کائی سی جم گئی تھی۔ ہال کے وسط میں کچھ لوگوں نے ایک پندرہ برس کے لڑکے کو پکڑ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس کی حالت سے پتا چل رہا تھا کہ وہ بہت ہی دہشت زدہ ہے۔ ایک بوڑھی عورت اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی کچھ لوگ اسے سمجھا رہے تھے۔ ایک مولوی صاحب کچھ پڑھ کر اس پر پھونک رہے تھے۔ ایک صاحب پانی دم کر کے اسے پلا رہے تھے۔ خسرو تھوڑی دیر تک کھڑا انہیں دیکھتا رہا پھر اس نے پوچھا: "اسے کیا ہو گیا ہے؟"

ایک نے جواب دیا: "کچھ نہیں۔ بے چارہ دہشت زدہ ہے۔ یہاں اس نے کچھ دیکھا ہے۔"

"کیا دیکھا ہے؟"

"یہ تو ہم نہیں جانتے۔"

"کیا تم یہیں رہتے ہو؟"

"پچھلے چار ماہ سے اس ہال میں رہتا ہوں لیکن مجھے آج تک کچھ نظر نہیں آیا۔ کسی چیز نے مجھے دہشت زدہ نہیں کیا۔"

خسرو نے اس خوف زدہ لڑکے کے پاس آکر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے پوچھا: "جوان! کیا بات ہے۔ تم تو دیکھنے میں بڑے صحت مند اور دلیر نظر آتے ہو۔ کس بات سے ڈر رہے ہو؟"

اس نو عمر لڑکے نے دھیرے گھبرا کر خسرو کو دیکھا لیکن جواب نہ دے سکا۔ بعض اوقات دہشت کے مارے زبان نہیں کھلتی۔ ایک شخص نے کہا: "بات یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ہم سب آفت زدہ ہیں۔ ہم میں سے کسی کی آنکھوں کے سامنے جوان بیٹوں کو ہلاک کیا گیا"

کسی کے سامنے اس کی بیوی، بہن اور بیٹی کی عزت کو کھلونا بنایا گیا۔ ایسے ایسے ظلم ڈھائے گئے۔ جن کی یاد آنے سے بے اختیار چیخیں نکل جاتی ہیں۔ یہ عمارت آسیب زدہ نہیں ہے۔ ہم آفت زدہ ہیں۔"

ایک شخص نے جواباً کہا: "ویسے تو ہم سب آفت زدہ ہیں لیکن ہم جنون میں مبتلا نہیں ہوتے۔ یہاں کچھ لوگوں کی طرح بے اختیار نہیں چیختے۔"

ایک بوڑھے نے کہا: "بیٹے! کچھ لوگ جنونی ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ آسیب زدہ ہوتے ہیں۔ یہی دیکھو کہ اب تک کتنے ہی مرد، عورتیں اور بچے جنون میں مبتلا ہو کر یہاں سے چلے گئے۔ سیدپور میں جگہ جگہ پناہ لیتے رہے۔ ہزاروں خاندان ریلوے لائن کے دونوں کناروں پر جھگیاں ڈالے آباد ہیں۔ ہزاروں لوگ مختلف کرائے کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ ایسے لاکھوں افراد ہیں جو ظلم اور بربریت کا ناٹک اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں لیکن کسی جگہ رہ کر وہ جنون میں مبتلا نہیں ہوتے۔ کبھی بے اختیار چیخیں نہیں مارتے۔ صرف یہ عمارت ایسی ہے جہاں آکر جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آخر کیوں؟"

وہ بوڑھا درست کہہ رہا تھا۔ خسرو وہاں ایک ہفتے سے یہی سنتا آ رہا تھا کہ شیر بلڈنگ آسیب زدہ ہے لیکن اب تک یہ نہیں [illegible] کہ باہر سے آنے والے پناہ گزیں کسی پناہ گاہ میں اس طر[illegible] چلاتے اور جنون میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک شخص نے کہا: "بڑے میاں ٹھیک کہتے ہیں۔ یہاں اب تک جتنے لوگ آسیب میں مبتلا تھے، وہ باہر دوسری جگہ جا کر ٹھیک ہو گئے۔ ان پر جنون طاری نہیں ہوتا ہے۔ یہاں ضرور کچھ ہے جو ہمیں تو نظر نہیں آتا لیکن چند لوگوں کو نظر آتا ہے اور وہ یہاں سے گھبرا کر چلے جاتے ہیں۔"

خسرو نے کہا: "انھیں روکنا چاہیے، ان سے پوچھنا چاہیے کہ آخر وہ کیا دیکھتے ہیں؟ کیوں چیختے ہیں؟"

ایک اور بوڑھے نے کہا: "ہم کسی کو یہاں روک کر اس کی جان کے دشمن بننا نہیں چاہتے۔ یہاں کوئی نادیدہ بلا ہے۔ پہلے وہ ایک جوان لڑکی پر آئی تھی۔ وہ یہاں سے بھاگنا چاہتی تھی۔ ہم اسے روکتے رہے، اس سے پوچھتے رہے پھر وہ مر گئی۔ اس کے بعد ایک بوڑھی عورت جان سے گئی۔ اس کے بعد ایک بچہ اور پھر ایک جوان مر گیا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آگئی کہ یہاں آنے کے بعد جو بھی دہشت زدہ ہوتا ہے اسے روکنا نہیں چاہیے بلکہ جلد سے جلد یہاں سے بھگا دینا چاہیے۔"

خسرو نے پوچھا: "کیا اس نادیدہ بلا سے آپ لوگوں کو ڈر نہیں لگتا ہے۔"

"ہم ڈر کر کیا کریں گے۔ یہ جگہ چھوڑ کر جائیں گے تو کہیں مفت رہنے کو جگہ نہیں ملے گی۔ کرایہ ادا کرنا پڑے گا یا ریلوے لائن کے کنارے جھگی ڈال کر رہیں گے۔ وہاں کبھی پولیس والے اور کبھی غنڈے آکر تاک جھانک کرتے ہیں۔ کچھ پیسے وصول کرتے ہیں، مار پیٹ کرتے ہیں، ہماری بہو بیٹیوں پر بُری نظر ڈالتے ہیں۔ یہاں عزت بھی محفوظ ہے اور کرایہ بھی ادا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی بلا آئے گی تو زیادہ سے زیادہ جان لے گی۔ لیکن عزت نہیں لے گی۔ نہ غنڈہ ٹیکس وصول کرے گی۔"

خسرو نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا: "انسان انسانوں سے اس قدر سہما ہوا ہے کہ اب نادیدہ بلاؤں کی دہشت کوئی معنی نہیں رکھتی۔"

وہ پلٹ کر دروازے کی طرف جانا چاہتا تھا۔ چادروں کی ایک چار دیواری میں ایک جوان شخص نظر آیا۔ وہ ٹاٹ کی چٹائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے گلے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ سانس کس طرح لیتا ہوگا۔ اس نے قریب جا کر پوچھا: "تمھیں کیا ہوا تھا؟ یہ پٹیاں اس طرح کیوں بندھی ہوئی ہیں؟"

اس نے خسرو کو ایسے دیکھا جیسے کسی احمق کو دیکھ رہا ہو۔ اس کے ہونٹ کھلے لیکن آواز نہیں نکل سکی۔ دو چار آدمی اس کے آس پاس آکر بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا: "بھائی صاحب! یہ بولے گا کیسے؟ اس کے گلے پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ ہم بڑی مشکلوں سے ستو یا بھات کا پانی اس کے حلق تک پہنچاتے ہیں اور یہ آہستہ آہستہ اسے نگلتا ہے۔"

خسرو نے پوچھا: "کیا دشمنوں نے اس کی گردن پر وار کیا تھا؟"

"ہاں، یہ سنتا ہار کا رہنے والا ہے۔ آپ شاید جانتے ہوں گے، سنتا ہار میں ایک بھی بہاری زندہ نہ رہ سکا۔ سبھی کو بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ ان قتل ہونے والوں میں یہ شخص بھی ہے۔ اس کا نام شہباز ہے۔ سنتا ہار ریلوے لائن کے پاس سیکڑوں بہاریوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ کسی کو گولی ماری گئی۔ کسی کی گردن پر چھری پھیری گئی۔ اس کی گردن بھی نرخرے تک کاٹی گئی تھی۔ یہ ان لاشوں کے درمیان پڑا رہا۔ مارنے والوں نے سمجھا کہ یہ مر چکا ہے۔ یہ تمام دن وہاں پڑا بارش میں بھیگتا رہا۔"

شہباز کچھ کہہ نہیں سکتا تھا لیکن کہنے والوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہنے والے کے بازو کو تھام لیا۔ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ شہباز نے اپنے ہاتھ کی دو انگلیاں دکھائیں۔ تب ایک شخص نے کہا: "یہ کہہ رہا ہے۔ وہاں بارش میں ریلوے لائن پر

ایک دن نہیں بلکہ دو دنوں تک پڑا رہا۔"

خسرو نے پوچھا۔ "جب یہ بول نہیں سکتا ہے تو آپ لوگوں کو اس کی روداد کیسے معلوم ہوئی؟"

"یہ بول نہیں سکتا ہے۔ لکھ تو سکتا ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس نے اپنی داستان تفصیل سے لکھی تھی۔"

"کیا سنتا ہار میں اسے طبی امداد نہیں ملی؟"

"کیا بات پوچھ رہے ہو بھائی! جہاں ہمارا وجود برداشت نہیں کیا جاتا' وہاں ہمارے زخموں پر مرہم کون لگاتا ہے؟ اگر کوئی دیکھ لیتا کہ یہ قتل کیے جانے کے باوجود زندہ ہے تو وہ اسے یہاں تک پہنچنے کا موقع ہی نہ دیتا۔"

"لیکن یہ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ گلا نرخرے تک کاٹ دیا گیا اور یہ زندہ یہاں تک پہنچ گیا۔ کیسے پہنچا؟"

"یہ ٹرین کے ذریعے نہیں آسکتا تھا۔ کوئی بہاری اپنی پناہ گاہ سے نکل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر نہیں کر سکتا۔ یہ سنتا ہار سے پیدل آیا ہے۔"

خسرو نے شدید حیرانی سے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔ "کیا سنتا ہار سے؟ یہ ناقابلِ یقین بات ہے۔ سنتا ہار یہاں سے تقریباً اسّی میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ وہاں سے پیدل کیسے آسکتا ہے؟"

"دیکھ لو کہ آگیا ہے۔ یہ اپنی کٹی ہوئی گردن کے ساتھ اپنی زندگی کی دعائیں مانگتے ہوئے بیس دن تک چلتا رہا۔ کبھی چھپتا رہا' کبھی کسی گاؤں میں جاکر اپنی زندگی کی بھیک مانگتا رہا۔ گاؤں والے جو خود دو دو' تین تین وقت کے فاقے کرتے ہیں وہ کسی کے جانی دشمن نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ اسے دیکھ کر سہم جاتے تھے۔ دور بھاگ جاتے تھے کیونکہ اس کی گردن پر خون جما ہوا تھا۔ خون جمنے کے باعث کٹا ہوا نرخرہ عارضی طور پر جڑ گیا تھا جس کے باعث یہ سانس لے سکتا تھا۔ یہ اپنے حوصلے اور قوتِ ارادی سے یہاں تک پہنچ گیا۔ اسپتال میں اس کا باقاعدہ علاج کیا گیا ہے چونکہ وہاں مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اس لیے ہم اسے یہاں لے آئے ہیں۔"

خسرو اپنی آنکھوں سے یہ حقیقت دیکھنے کے باوجود بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ آج بھی کچھ واقعات ایسے رونما ہوتے ہیں جو معجزات سے کم نہیں ہوتے۔ جنھیں عقل تسلیم نہیں کرتی لیکن دل ایمان لے آتا ہے۔ ایک بزرگ نے گہری سانس لے کر کہا۔ "جب ہم خدا کو بھول جاتے ہیں تو وہ ہمیں یاد دلاتا ہے۔ وہ ہمارے سامنے ناقابلِ یقین واقعات پیش کرتا ہے کہ سوچو' غور کرو اور سمجھو۔ کیا ان حالات میں کوئی انسان زندہ رہ سکتا ہے؟ میں نے اپنی آنکھوں سے دیناج پور میں ایک ستّر برس کی بڑھیا کو دیکھا۔ وہ بکریوں کے ایک باڑے میں نیم مردہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ دشمنوں نے شاید لوہے کی کسی راڈ سے یا کسی ہتھیار سے اس کے سر پر ضرب لگائی تھی۔ اس کے سر کا پچھلا حصہ پھٹ گیا تھا۔ وہ چکرا کر گری تھی۔ دشمنوں نے اسے مُردہ سمجھا۔ اگر وہ نیم مُردہ بھی سمجھی جاتی' تو وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چلے جاتے۔ اس خیال سے کہ ستّر برس کی بڑھیا سسک سسک کر' تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔"

اس بوڑھے نے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان آنکھوں نے عجیب منظر دیکھا ہے۔ شاید تین دن یا چار دن کے بعد میں اس باڑے میں پہنچا تو میں نے اسے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کبھی آہستگی سے کھلتی تھیں' کبھی بند ہو جاتی تھیں۔ میں نے دیکھا' اس کے سر کا پچھلا حصہ خون آلود تھا۔ جدھر سے پھٹ گیا تھا' ادھر اس کا مغز نظر آرہا تھا اور اس مغز میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگ رہے تھے۔ میں نے دیکھا تو ایک دم سے آنکھیں بند کرلیں۔ دیکھا نہ گیا۔ کیڑے لاش کو کھاتے ہیں لیکن وہ قبر میں نہیں تھی۔ زمین کے اوپر تھی۔ وہ مردہ نہیں تھی۔ نیم مردہ تھی' ابھی زندہ تھی اور کیڑے زندہ لاش کا ذائقہ چکھ رہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے بلا کا کرب جھانکنے لگا۔ وہ منہ سے بول نہیں سکتی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا پھر وہاں سے کمرے میں لے آیا۔ اسے ایک چٹائی پر لٹا دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کروں؟ ان کیڑوں کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔ لیکن ایک انسان خواہ وہ قبر تک کیوں نہ پہنچ چکا ہو۔ اگر اس میں زندگی کے ذرا سے بھی آثار ہوں تو اسے زندہ رکھنے کی کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔

میں نے ایک قینچی لے کر اس کے سر کے تمام بال کاٹ دیے۔ اس کا پھٹا ہوا سر اور مغز اور واضح طور پر نظر آنے لگے۔ کیڑے اور صاف طور سے کلبلاتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ میں اس کے سرہانے زمین پر بیٹھ گیا پھر ایک ایک کیڑے کو اپنی چٹکیوں سے پکڑ پکڑ کر وہاں سے نکال نکال کر ایک طرف پھینکنے لگا۔ جیسے سر سے جوئیں ٹٹول ٹٹول کر نکالی جاتی ہیں اسی طرح میں انھیں چُن چُن کر نکال رہا تھا۔ اس بات کا خاص طور پر خیال تھا کہ میرا ہاتھ اس کے سر سے زیادہ نہ ٹکرائے۔ وہ بہت کمزور تھی۔ میرے ہاتھ کی ہلکی سی چوٹ اسے ختم کر سکتی تھی۔ ایک

گھنٹے بعد میں بازار جاکر اس کے لیے دودھ لے آیا۔ دودھ پینے کے بعد اس میں ذرا جان آئی۔ اس نے نقاہت سے پوچھا۔

"میرا پوتا کہاں ہے؟"

میں نے پوچھا: "تمھارا پوتا کون ہے؟ کہاں گیا ہے؟"

"وہ امن کمیٹی والے آئے تھے۔ میرے پوتے کو یہ کہہ کر لے گئے کہ میٹنگ ہے۔ بنگالی بہاری اتحاد کے لیے سب کو اس میٹنگ میں شریک ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا: "ماں جی! یہ تو آپ پانچ ماہ پہلے کی بات کہہ رہی ہیں۔ یہاں امن کمیٹی قائم ہوئی تھی مگر . . . ."

مگر میں آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ میں جانتا تھا 'امن کمیٹی میں جو بہاری شامل تھے' انھیں تالاب کے پاس لے جاکر گولی مار دی گئی تھی۔ میں اس بوڑھی کے سامنے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے کہا: "تم کہتے ہو پانچ ماہ پہلے کی بات ہے۔ تو کیا ہوا؟ پانچ ماہ سے میں انتظار کر رہی ہوں۔ میں اس کے لیے زندہ ہوں۔ وہ بھی میرے لیے زندہ ہوگا۔ جب تک وہ نہیں آئے گا میں نہیں مروں گی۔"

"بیشک وہ اپنی قوت ارادی سے اور اپنے پوتے کی محبت کے شدید جذبے سے زندہ تھی۔ موت سے لڑ رہی تھی۔ کیڑے اسے کھا رہے تھے مگر پھر بھی وہ موت کو ٹال رہی تھی۔ لیکن ایسا کب تک ہو سکتا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ مر گئی۔"

اس بوڑھی کی داستان سنانے والا سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک اس ماحول میں گہری ماتمی خاموشی چھائی رہی پھر خسرو وہاں سے اٹھ کر باہر آگیا۔ اس عمارت کے اندر رہتا تو سیکڑوں آفت زدہ اپنی اپنی داستانیں سنانے لگتے۔ جو لوگ اپنے بچھڑنے والوں کو تلاش نہیں کر سکتے تھے اور جو لوگ اپنے مرنے والوں پر روتے روتے تھک چکے تھے۔ وہ ان کی خوبیوں اور اپنی مجبوریوں کی داستانیں سنا سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے تھے۔

خسرو کو ان سب سے ہمدردی تھی لیکن اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ داستانیں سننے کے لیے بیٹھا رہ جاتا۔ آج آدھی رات کے بعد پھر اناج کا ویگن سیدپور پہنچنے والا تھا۔ بلیٹی اس کے نام تھی اور اسی کو وہ مال بازار میں فروخت کرنا تھا۔

پہلے ویگن کا اناج اس نے دوگنے منافع پر فروخت کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اناج وہاں کے عوام کے لیے سستا تھا کیونکہ دوسرے مہاجن اندھی کمائی کر رہے تھے کبھی پندرہ روپے سیر کے حساب سے چاول دے رہے تھے اور کبھی وہی چاول بیس روپے اور پچیس روپے فی سیر کے حساب سے فروخت کرتے تھے جبکہ خسرو نے چھ روپے سیر کے حساب سے چاول فروخت کیا تھا۔ سارے شہر میں اس کی دھوم مچ گئی تھی۔ غریب عوام اسے دعائیں دیتے تھے۔ ایک ہی ہفتے میں وہاں کے بچے، بوڑھے، جوان اس کے نام سے اور اس کے چہرے سے واقف ہو گئے تھے۔ لیکن بازار میں تمام بیوپاری اس کے دشمن بن چکے تھے۔

وہ سوچتا ہوا ایک گلی سے دوسری گلی میں گھوم رہا تھا۔ اچانک ہریا سے سامنا ہوگیا۔ اس نے دیکھتے ہی کہا: "خسرو بھائی! آپ یہاں ہیں۔ میں آپ کو تمام شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔"

"ڈھونڈنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی جبکہ میں نے کہا تھا" بارہ بجے تک اسٹیشن پہنچ جاؤں گا۔ اس سے پہلے ہمارا مال نہیں آئے گا۔"

ہریا نے قریب آکر کہا: "بات مال کی نہیں ہے۔ بات بہت ہی بُری ہے۔ وہ کیا ہے کہ . . ."

وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ "تم بولتے کیوں نہیں کیا بات ہے؟"

"وہ ہماری ششی لاپتا ہے۔"

خسرو نے حیرانی سے پوچھا: "ششی لاپتا ہے۔ یہ کیا بک رہے ہو۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ شام کو پوجا کے لیے مندر گئی تھی۔ اس کے بعد واپس نہیں آئی۔"

ششی تلسی رام کی بہن تھی۔ پچیس برس کی عمر میں بیوہ ہوگئی تھی۔ پانچ برس سے بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی خوش شکل تھی۔ کوئی بدمعاش بھی اسے دیکھ کر بدمعاشی پر آمادہ ہو سکتا تھا۔ خسرو نے پریشانی سے پوچھا: "کیا آس پاس کے گھروں میں پوچھا گیا ہے؟"

"صرف آس پاس کے گھروں میں نہیں بلکہ جتنی ہندو فیملی ہیں، سب کے گھروں میں جاکر دیکھ لیا۔ وہ کہیں نہیں ہے۔"

"تمھارا کیا خیال ہے۔ وہ کہاں جا سکتی ہے؟"

"وہ خود گئی نہیں ہے بلکہ کوئی اسے اٹھا کر لے گیا ہے۔"

"بھلا مندر سے کون لے جا سکتا ہے۔ مندر ہمارے گھر سے صرف دو سو گز کے فاصلے پر ہے۔ بیچ میں گھنی آبادی ہے لوگ چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ کوئی اسے چھیڑنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔"

"خسرو بھائی! یہ سب ٹھیک ہے لیکن مندر کا ایک پچھلا دروازہ بھی ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ غنڈے، بدمعاش

نے اسے وہیں سے غائب کر دیا ہے۔"

"غنڈے، بدمعاش۔" خسرو نے پوچھا: "تمھیں کس غنڈے پر شبہ ہے؟"

"اور کس پر شبہ ہوگا۔ یہاں کوئی بنگالی غنڈہ تو ہے نہیں کبھی کبھی مکتی باہنی والے آتے ہیں لیکن وہ کسی ہندو عورت پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ یہ بہاریوں کا کام ہے۔"

خسرو تیزی سے چلتا ہوا حویلی کی طرف جا رہا تھا۔ ہریا نے پوچھا: "کیا آپ بڑو دیدی کے پاس جا رہے ہیں؟"

"ہاں، میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟"

"دیدی پہلے ہی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔ آپ ان کے آنسو پونچھنا چاہتے ہیں تو پہلے ششی کو تلاش کریں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہاں تلاش کیا جائے۔ کیا تھانے میں رپورٹ لکھائی ہے؟"

"میں نے سب انسپکٹر کو سب کچھ بتا دیا ہے لیکن تاکید کی ہے کہ رپورٹ درج نہ کرے۔ ہماری بدنامی ہوگی۔ چپ چاپ ششی کو تلاش کیا جائے۔ انسپکٹر نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ سبھی اپنے اپنے طور پر اسے تلاش کر رہے ہیں۔"

خسرو چلتے چلتے رک گیا۔ پریشان ہو کر بولا: "اسے کہاں تلاش کیا جا سکتا ہے؟"

"میں اسے کئی جگہ دیکھ چکا ہوں۔ اب ایک ہی جگہ رہ گئی ہے۔ اگر یہ کسی غنڈے بدمعاش کا کام ہے تو ششی ہمیں ماگی پاڑہ میں مل سکتی ہے۔"

خسرو فوراً ہی اُدھر جانے لگا۔ ہریا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے کہا: "دیکھو ہریا! تم کہتے ہو مکتی باہنی والے یہاں کی کسی ہندو عورت پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ وہ ہندوؤں سے ڈرتے ہیں لیکن بہاری تو ہندوؤں سے بھی ڈرتے ہیں۔ اور مکتی باہنی والوں سے بھی ڈرتے ہیں حتیٰ کہ عام بنگالیوں کے منہ بھی نہیں لگتے۔ پھر وہ ایک ہندو عورت کو اغوا کرنے کی جرأت کیسے کر سکتے ہیں؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔ جب ششی ملے گی تو یہی بات سامنے آجائے گی۔"

وہ دس منٹ میں ماگی پاڑہ پہنچ گئے۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ ایسے وقت وہاں بڑی رونق رہا کرتی تھی۔ تماش بینوں کا ہجوم ہوا کرتا تھا لیکن اب شاید ہی کوئی بھولا بھٹکا آجاتا تھا۔ گنہگاروں کو اب اس علاقے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ جب تک پانی ایک ہی تالاب میں رہتا ہے پینے والے اسی طرف دوڑے آتے ہیں۔ اب سید پور کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ تھی جن میں ڈیڑھ لاکھ عورتیں ضرور ہوں گی۔ کچھ بوڑھی ہوں گی کچھ جوان ہوں گی اور کچھ نوجوان ہوں گی۔ وہ سب شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا لیکن حالات بڑے پاپی تھے۔ جہاں کہیں اناج کی قیمت انسان کی قوتِ خرید سے بہت اوپر ہو جاتی ہے، وہاں پیٹ کے سامنے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ چونکہ اناج خریدنے کے لیے گھر کا فرنیچر یا پورا گھر صرف ایک بار بیچا جا سکتا ہے اور پیٹ کا جہنم روز بھرا جاتا ہے۔ تب ہی گناہ کا بازار چمک اٹھتا ہے۔ عورت ہاتھ کے میل کی طرح بار بار گھر سے نکلتی ہے پھر اناج لے کر تقدیر کی لکیر کی طرح واپس آجاتی ہے۔ بہرحال سب ایسے نہ تھے۔ پاپی حالات نے کچھ لوگوں کے لیے پاپ کے راستے کھول دیے تھے۔ سید پور میں اب ایک تالاب نہیں رہا تھا۔ کئی جگہ کنویں اور تالاب دریافت کر لیے گئے تھے۔ اس لیے ماگی پاڑہ، ویران پڑا ہوا تھا۔

ہریا نے کہا: "خسرو بھائی! میں اُدھر والی گلی میں جا کر دیکھتا ہوں۔ آپ اس گلی میں دیکھیں۔ میں ادھر سے گھوم کر آؤں گا اور آپ سے اسی گلی میں ملوں گا۔"

خسرو نے کہا: "میں ایسے بدنام محلے میں کبھی نہیں آیا۔ اور تم مجھے تنہا اس گلی میں جانے کے لیے کہہ رہے ہو۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ تم اُدھر جاؤ اور میں اِدھر۔"

"کیا ہے کہ میں ششی کو جلدی سے تلاش کرنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہوں۔ آپ کو پسند نہیں ہے تو چلیے آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔ آس پاس کے مکانات ویران سے تھے۔ کئی مکانوں کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ کسی کا دروازہ کھلا ہوا تھا مگر اندر تاریکی تھی۔ ایک جگہ روشنی دیکھ کر ہریا نے کہا: "چلو اُدھر چل کر پوچھتے ہیں۔"

خسرو نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پوچھا: "کیا ہمارے پوچھنے سے مجرم اپنے جرم کا اقرار کر لیں گے؟"

"کیا ہے کہ ہم نہیں پوچھیں گے سیدھے اس گھر میں گھس جائیں گے۔ کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ یہ محلہ ہی ایسا ہے۔ بلکہ ہمیں خوش آمدید کہا جائے گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک تاریک مکان کے دروازے پر بھاری بھرکم بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ پھر دو سائے وہاں سے چھلانگ لگا کر خسرو اور ہریا کے آس پاس پہنچ گئے۔ وہ مسلح تھے۔ ان کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ مکتی باہنی کے جوان ہیں۔ ایک نے کہا: "اس مکان میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ادھر ہمارے ساتھ آؤ۔ ہم تمھاری ضرورت کی چیز مہیا کر دیں گے۔"

ایک نے بندوق کی نال سے خسرو کے سینے پر ٹھوکا دیا اور اشارے سے اس تاریک مکان میں چلنے کے لیے کہا۔ خسرو نے التجا کی: "دیکھیے ہم اپنے گھر کی ایک عورت کو تلاش کرنے نکلے ہیں۔ اگر آپ کو ہم سے کوئی فائدہ پہنچ رہا ہو تو ہمیں بتائیں اور اگر آپ میری اس گمشدہ بہن کو ڈھونڈ نکالیں تو میں آپ کو منہ مانگا انعام دوں گا۔"

بندوق کی نال سے ٹھوکا دینے والے نے کہا: "اس مکان میں چلو۔ وہیں ساری باتیں طے ہو جائیں گی۔"

خسرو نادان نہیں تھا۔ ایسی چالبازیوں کو سمجھتا تھا۔ اس کے دل نے کہا: "یقیناً ان لوگوں نے ششی کو چھپا رکھا ہے اور اس کے لیے سودا کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال مجبوری تھی۔ ان کی بات مان کر ہی ششی کہ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ بعد میں قانونی کارروائیوں کے متعلق سوچا جا سکتا تھا۔"

وہ ہریا کے ساتھ اس مکان میں داخل ہوا۔ مسلح جوانوں میں سے ایک آگے، ایک ان کے پیچھے تھا۔ اس وقت تک اس تاریک مکان میں لالٹین جلا دی گئی تھی۔ ان دونوں کو ایک بڑے سے کمرے میں لایا گیا۔ وہاں ایک چھوٹی سی میز تھی اور اس کے آس پاس دو کرسیاں تھیں۔ میز کے اوپر شراب کی دو بوتلیں اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ایک نے خسرو سے کہا: "کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" دوسرے نے ہریا سے کہا: "اے! تم بھی وہاں بیٹھو۔"

وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے پھر ان سے کہا گیا۔ "بوتل کھولو اور پینا شروع کر دو۔"

خسرو نے کہا: "میں نے اس لعنت کو آج تک ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ مجھ سے کام کی باتیں کرو اور مجھے جانے دو۔"

"کام کی باتیں اس وقت تک نہیں ہو سکتیں، جب تک ہم سب موڈ میں نہ ہوں۔ ہم تو پیے ہوئے ہیں تمھیں بھی پلانا چاہتے ہیں۔"

ہریا نے کہا: "کیا ہے کہ میں پیتا ضرور ہوں مگر یہ کوئی پلانے کا طریقہ نہیں ہے۔ ہم پریشان ہیں۔ اپنے گھر کی عورت کو ڈھونڈ رہے ہیں اور تم یہ مذاق کر رہے ہو۔"

خسرو چور نظروں سے ان کی بندوقوں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ ہریا سے توقع نہیں تھی کہ وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اگر وہ ساتھ دیتا تو ان دونوں پر قابو پانا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوتا۔ پھر وہ ششی کو اس مکان میں تلاش کر سکتے تھے۔

ایک نے کہا: "اگر تم دونوں باتوں میں وقت ضائع کرنا چاہتے ہو تو کوئی بات نہیں۔ ہم تمام رات تمھاری باتیں سنتے رہیں گے لیکن ضرورت مند تم لوگ ہو۔ تم کسی کو یہاں سے لے جانا چاہتے ہو۔ اس کی پہلی شرط یہی ہے کہ پینا شروع کر دو۔ بھاگنے کے متعلق نہ سوچنا اور سوچنا ہے تو پہلے کھڑکی اور دروازے کی طرف دیکھ لینا۔"

خسرو اور ہریا نے دیکھا، دروازے اور کھڑکی کے پاس دو، دو رائفل بردار نظر آ رہے تھے۔ ان لوگوں نے منہ پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ شاید خسرو یا ہریا کے جاننے والوں میں سے ہوں گے۔ اسی لیے اپنے اپنے چہرے کو چھپا رہے تھے۔

ہریا نے بوتل کھول کر گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا: "میں تم لوگوں کی بات مان کر پینا شروع کر رہا ہوں۔ اتنا بتا دو کیا ششی تمھارے پاس ہے؟"

"ہاں ہمارے پاس ہے۔"

"میں خسرو کو بھی پینے پر آمادہ کر لوں گا لیکن ہمیں اس کی آواز سنائی جائے یا اس سے ہم کو ملایا جائے۔"

خسرو نے تائید کی: "ہاں پہلے ہم ششی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

ان میں سے ایک نے ہریا کے کالر کو پیچھے سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا: "تم ہمارے ساتھ چلو اور ششی کو دیکھ کر آؤ، ہم دونوں کو نہیں جانے دیں گے۔"

خسرو نے کہا: "ٹھیک ہے ہریا! تم اطمینان کر کے آ جاؤ۔"

ایک مسلح جوان ہریا کو دھکا دیتے ہوئے کمرے سے باہر لے گیا۔ خسرو نے دوسرے مسلح جوان سے کہا: "میں نے جو گناہ کبھی نہیں کیا، وہ مجھ سے کیوں کرواتے ہو۔ پینا کیا ضروری ہے؟ ششی یہاں موجود ہے تو اپنا مطالبہ پیش کرو۔ ہم پورا کریں گے اور اسے لے جائیں گے۔"

"ہمارا پہلا مطالبہ یہی ہے کہ بوتل کھولو اور پینا شروع کرو۔ نہیں پیو گے تو ہم زبردستی پلائیں گے۔ مار مار کر پلائیں گے۔"

خسرو نے شراب کی بوتل کو دیکھا۔ پھر اسے دیکھتے ہوئے کہا: "تم لوگ کسی ہندو عورت کو کبھی نہیں چھیڑتے پھر ایسی حرکت کیوں کر رہے ہو؟"

"ہمیں کسی ہندو عورت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم تمھیں پلانا چاہتے ہیں۔ شرط یہی ہے کہ یہ بوتل ختم کر دو اور ششی کو ساتھ لے جاؤ۔"

ہریا اس مسلح جوان کے ساتھ واپس آ گیا۔ اس نے کہا۔ "میں نے ششی کو دیکھا ہے۔ وہ اُدھر سامنے والے مکان کے کمرے میں چارپائی سے بندھی ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ میرے منہ کو دبا دیا اور یہاں گھسیٹ

کر لے آئے۔"

خسرو نے کہا: "ہم شستی کو ہر قیمت پر لے جائیں گے لیکن یہ لوگ کوئی قیمت نہیں لگا رہے ہیں اور میں کبھی پیتا نہیں ہوں۔ خدا کے لیے سمجھوتے کی کوئی راہ نکالو۔"

بات ختم ہوتے ہی اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ پڑا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ فرش پر گرتے ہی وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا، اسی وقت ایک نے رائفل کے کندے سے اس کی پیٹھ پر ضرب لگائی۔ وہ اٹھتے اٹھتے پھر فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔ دوسرے نے اپنے بھاری بھرکم بوٹ سے اس کی کمر پر ٹھوکر ماری۔ وہ کروٹ لیتا ہوا چاروں شانے چت ہو گیا۔ ایک نے اس کے سینے پر اپنے وزنی بوٹ سے دباؤ ڈالا۔ رائفل کی نال کو اس کے حلق پر رکھا۔ دوسرے نے بوتل کھولی اور کہا: "اپنا منہ کھولو۔"

خسرو نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا تھا۔ رائفل والے نے اپنی انگلی ٹریگر پر رکھی۔ اس کے حلق پر رائفل کی نال کا دباؤ ڈالا اور کہا: "میں فائر کر دوں گا۔"

حلقوم پر اس طرح دباؤ پڑ رہا تھا کہ خسرو کا منہ آپ ہی آپ کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے نے بوتل کے منہ کو اس کے منہ کے اندر ٹھونس دیا۔ شراب اس کے حلق تک پہنچی۔ کچھ باہر نکلنے لگی کچھ سانس رکنے کی وجہ سے حلق کے اندر بھی پہنچنے لگی۔ سینے میں ایسی جلن ہوئی جیسے انگارے دہک رہے ہوں۔ وہ دیسی شراب تھی۔ پانی ملائے بغیر پلائی جا رہی تھی اور وہ بھی ایک اناڑی پی رہا تھا۔ اس کا جو حال ہو رہا تھا وہی جانتا تھا۔ اس نے سر کو اِدھر اُدھر جھٹک کر بوتل کو منہ سے نکال دیا لیکن کافی شراب حلق سے اتر چکی تھی۔ بوتل والے نے اس کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر فرش پر بٹھا دیا۔ رائفل والے نے کہا: "ہم تو اسے عزت کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر پلانا چاہتے تھے مگر یہ عزت کے قابل نہیں ہے چلو فرش پر ہی سہی، پھر پلاؤ۔"

خسرو فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہونا چاہتا تھا مگر اس کا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دیواریں اِدھر سے اُدھر ڈولتی ہوئی نظر آ رہی تھیں پھر بھی اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو ایک نے اسے ٹھوکر مار کر بٹھا دیا۔ دوسرے نے کہا: "ذرا سوچ سمجھ کر پٹائی کرنا۔ چہرے پر یا جسم پر زخم کے نشان نہیں آنے چاہئیں۔ مگر یہاں سے جانے کے بعد یہ خود کو مظلوم ثابت کرے تو کوئی یقین نہ کرے۔"

وہ بوتل پھر اس کے منہ سے لگائی گئی۔ وہ اپنا منہ پھیرنے لگا۔ رائفل والے نے اس کے گھٹنے پر رائفل کے کندے سے ضرب لگائی۔ وہ چیخ پڑا۔ تکلیف سے کراہنے لگا۔ چیخنے کے دوران منہ کھلتا ہے۔ بوتل والے نے کھلے ہوئے منہ میں پھر تھوڑی سی شراب انڈیل دی تھی۔ اس نے بوتل کو ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے کہا: "مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، آخر مجھے شراب پلا کر تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا۔"

ایسا کہنے کے دوران اس نے محسوس کیا کہ اس کی زبان لڑکھڑا رہی ہے۔ الفاظ صاف طور سے ادا نہیں ہو رہے ہیں لیکن دماغ ابھی کام کر رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا، آخر ایسا کیوں کیا جا رہا ہے۔ کیا اس لیے کہ آج اناج کا ویگن یہاں پہنچ رہا ہے اور وہ ویگن کے پاس نہیں ہو گا۔ اس کے آدمی نہیں رہیں گے۔ پہرا بھی نہیں رہے گا تو ویگن کو لوٹ لیا جائے گا؟

وہ آگے نہ سوچ سکا۔ بوتل پھر اس کے منہ سے آ کر لگ گئی تھی۔ اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا گیا تھا۔ جتنی وہ پی چکا تھا، اتنی ہی اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ سر گھوم رہا تھا، ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ رہے تھے۔ اس کے باوجود اتنا حوصلہ تھا کہ وہ پینے سے اب بھی انکار کر رہا تھا اور وہ لوگ طرح طرح سے اذیتیں پہنچا رہے تھے۔ زبردستی اس کے منہ میں زہر ڈال رہے تھے اور اسے نگلنے پر مجبور کر رہے تھے۔

اناڑی آدمی ایک گھونٹ پینے کے بعد ہی چکرانے لگتا ہے جبکہ اسے ایک پوّا پلا دیا گیا تھا۔ اب وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اِدھر سے اُدھر جھوم رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے ایک طرف لڑھک جانا چاہتا تھا۔ اسے دونوں طرف سے پکڑ کر اٹھایا گیا پھر کرسی پر لا کر بٹھا دیا گیا۔ وہ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر بڑبڑانے لگا۔ "میں مار ڈالوں گا۔ تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ شستی کو یہاں سے لے جا کر رہوں گا۔"

نشے کی زیادتی سے اس کی زبان بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ اس کی بات اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آدھی بات منہ سے نکلتی تھی، آدھی بات منہ میں ہی رہ جاتی تھی۔ ایک رائفل بردار نے کہا: "اب یہ ہمارے کام کا ہو گیا ہے۔ اسے لے چلو۔"

دو آدمیوں نے اسے دو طرف سے سہارا دے کر اٹھایا۔ پھر اسے چلاتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ وہ خود چل سکتا تھا لیکن اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔ لڑکھڑا جاتا تھا۔ لہٰذا ان کے سہارے چل رہا تھا۔ وہ مکان سے باہر آ گئے۔ باہر تاریکی تھی۔ دور مکانوں کی روشنیاں اتنی مدھم تھیں کہ وہ تاریکی کو دور نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ اسے سہارا دے کر چلاتے ہوئے

سامنے والے مکان میں لے گئے۔ وہاں بھی گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ خسرو نشے میں بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ دوسروں کا سہارا لے کر چل رہا ہے۔ کسی دروازے سے گزر کر مکان میں داخل ہو رہا ہے پھر کسی نے کان کے قریب سرگوشی میں کہا۔ "اب تم اس دیوار کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جاؤ۔ سامنے ایک دروازہ ہے۔ اس دروازے کے پیچھے ششی موجود ہے۔"

اسے ایک دیوار کے سہارے چھوڑ دیا گیا۔ سب دور ہٹ گئے۔ تاریکی میں پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ دور سے تماشا دیکھ رہے ہیں یا چلے گئے ہیں۔ وہ دیوار کے سہارے آگے بڑھنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اندھا ہو گیا ہو اور ٹٹول ٹٹول کر راستہ تلاش کر رہا ہو۔ پھر وہ ایک دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کسی نے اس کے منہ پر ٹارچ کی روشنی پھینکتے ہوئے کہا: "خسرو صاحب! آپ نے پینے میں اتنی دیر لگا دی۔ بے چاری ششی دیوی کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ جائیے دروازہ کھلا ہوا ہے۔"

پھر ٹارچ کی روشنی کمرے کے اندر پھینکی گئی۔ وہاں ایک چارپائی پر ششی بندھی ہوئی تھی۔ وہ سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے خسرو کو دیکھ لیا تھا۔ اب نفرت سے کہہ رہی تھی: "بھیا تلسی رام نے تم پر بھروسہ کیا۔ میں تمہیں اپنا بھائی کہتی رہی لیکن آج تم نے ثابت کر دیا کہ ہماری بھروسے کے قابل نہیں ہوتے۔ تمہیں بھائی کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میں تم پر تھوکتی ہوں۔"

خسرو نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا: "ششی! میں تو تمہیں۔۔۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دروازے کے اندر قدم رکھنا چاہا۔ وہ کمرے میں جانا چاہتا تھا۔ اسی وقت ٹارچ بجھ گئی۔ کسی نے اسے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ اندھیرے میں دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی کسی نے سختی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ کمرے کے اندر سے ششی کی نفرت بھری آواز سنائی دے رہی تھی: "چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو، خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ خسرو! میں تمہیں آخری بار بھائی ہوں۔ اگر میں بچ گئی تو تمہارے ساتھ تمہاری ان دونوں عورتوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

خسرو دو آدمیوں کی گرفت میں تھا۔ کسی نے اب تک اس کے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اپنے آپ کو چھڑا سکتا۔ وہ لوگ اسے گھسیٹ کر وہاں سے لے جا رہے تھے۔ اب اس کا سر بہت بری طرح چکرا رہا تھا۔ نشہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ نیند آ جائے یا پھر وہ مر جائے۔

ایک خون آشام چمگادڑ نے ہسپتال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسری خون آشام چمگادڑ سے کہا: "آؤ، ایک ایک جام ہو جائے۔ یہاں ہمیشہ تازہ خون ملتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ ننگے فرش پر چاروں شانے چت پڑا ہوا ہے۔ اس کے آس پاس کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتیں اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس کے باوجود ان کی آوازیں اس کے کانوں میں بج رہی تھیں۔ ایک کہہ رہا تھا: "ایسی ہی چال کو کہتے ہیں، سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اب اس مسلمان بچے کا گزر تلسی رام کے ہاں نہیں ہوگا۔ بڑی بے عزتی سے نکالا جائے گا۔"

"تم بے عزتی سے نکلنے کی بات کرتے ہو ہمارے تو ہمارے جوان زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ہمارے دھرم کی کسی عورت پر ہاتھ ڈالے اور یہاں سے زندہ چلا جائے۔ یہ ممکن نہیں ہے۔"

دھرم چند کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا: "یہ سالا ہریا بڑا پاپی ہے۔ جب دیکھو، میرے سامنے ششی کا ذکر کرتے وقت ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا تھا۔ میں نے سمجھایا۔ بھلے مانس! ایسا کرو کہ وہ بھی ہاتھ لگے اور وگین کا اناج بھی اپنا ہو۔ میرا نام بھی دھرم چند ہے۔ پہلے میں دھرم سے انگلی سیدھی کر کے گھی نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ نہیں نکلتا تو انگلی ٹیڑھی کرتا ہوں۔ اب دیکھ لو۔ ایک ذرا انگلی ٹیڑھی کی تو ادھر ہریا کا کام بن گیا۔ کل صبح خسرو اپنی دونوں عورتوں کے ساتھ حرام موت مارا جائے گا۔ اس کے بعد وگین کا مال ہریا بیچے گا اور ہمارے ہی ہاتھ بیچے گا۔

وہ تمام باتیں خسرو کے کانوں میں بج رہی تھیں لیکن اس کے کانوں پر، آنکھوں پر اور دماغ پر نشے کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ سن رہا تھا مگر سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ پھر وہ رفتہ رفتہ مدہوشی کی نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

*

لانچ اپنی مخصوص رفتار سے دوسرے کنارے کی طرف چلی جا رہی تھی۔ دوسرا کنارا ابھی بہت دور تھا۔ نظر نہیں آ رہا تھا اور اس کنارے تک پہنچنے سے پہلے کلیم الدین بھوتیاں اپنی دھمکی پر عمل کرنے کے لیے بالکل تیار کھڑا ہوا تھا۔

اس کے آس پاس دور دور تک فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کے مسافر کھڑے ہوئے تھے۔ عرشے پر بھیڑ کم تھی۔ مکتی باہنی کے جوان لانچ کے نچلے حصے میں تھے۔ انھیں خبر نہیں تھی کہ اوپر کیا ہو رہا ہے۔ انسپکٹر نے کہا: "میں یہ قانون کی وردی اتار کر تمھارے کہنے کے مطابق دریا میں بہا سکتا ہوں مگر یاد رکھو، میں بزدل نہیں ہوں۔ تمھارے ساتھ مل کر مکتی باہنی والوں سے مقابلہ اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ فائرنگ کے دوران بے گناہ مسافر مارے جائیں گے۔ میں خود کو اس کا ذمے دار نہیں ٹھہرانا چاہتا۔"

کلیم الدین بھوئیاں نے غصے سے پوچھا: "آپ ایک پولیس آفیسر ہو کر یہ برداشت کر رہے ہیں کہ ایک معصوم بچہ دریا میں ڈبو دیا جائے گا؟"

"بعض حالات میں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ایک کی جان جائے یا سب کی جان جائے؟ اگر سب کی جان بچانے کے لیے ایک کی قربانی لازمی ہو جائے تو مجبوراً خاموش تماشائی بن کر رہنا پڑتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے تمھارے قانون کی کتاب میں کہیں ایسی کوئی بات لکھی ہو لیکن انسانیت کا تقاضا ہے، اگر ایک بچہ بھی موت کے منہ میں جا رہا ہو تو اسے بچانا ہمارا تمھارا سب سے پہلا فرض ہوتا ہے۔"

ایک عورت نے بھوئیاں سے کہا: "ابھی تم نے چیلنج کیا تھا کہ بچے کو ڈبویا گیا تو تم اس کے ساتھ اس لانچ کو بھی ڈبو دو گے۔ کیا یہ انسانیت کا تقاضا ہے؟"

"اگر تمام مسافروں نے انسان ہونے کا ثبوت دیا تو یہ لانچ ڈبوئی نہیں جائے گی۔ تعجب ہے، میری اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر ہم سارے مسافر ایک ہو کر ان چار مکتی باہنی کے خلاف فیصلہ سنا دیں اور اس بچے کی جان بچانے کے لیے متحد ہو جائیں تو کیا وہ چاروں اپنی من مانی کر سکیں گے؟"

وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ پھر ایک نے کہا: "ہاں ہم سب ایک ہو کر اس بچے کی جان بچا سکتے ہیں۔"

دوسری سمت سے کسی نے تائید کی: "وہ چار مسلح جوان اکثریت کے سامنے جھک جائیں گے۔ جبکہ ہم جائز بات کہیں گے۔ ایک معصوم کی جان بچانے کے لیے ایک نیک قدم اٹھائیں گے۔"

اس کے بعد سب ہی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ کچھ لوگ آپس میں مشورے کرنے لگے۔ نوجوان لڑکے فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کے کیبنوں میں جا کر مسافروں کو وہاں سے بلا کر لانے لگے تاکہ سب متحد ہو کر لانچ کے نچلے حصے میں جائیں اور ان مکتی باہنی کے مسلح جوانوں پر دباؤ ڈالیں۔

ایک نوجوان نچلے حصے سے دوڑتا ہوا عرشے پر آیا۔ اس نے کہا: "ان لوگوں نے بچے کی رسیاں کھول دی ہیں۔ اسے ساتھ لے کر ایک ایک مسافر کے سامنے جا رہے ہیں۔"

انسپکٹر نے کہا: "آخر انھوں نے میری بات مان ہی لی۔"

بھوئیاں نے کہا: "قانون پر عمل کرانے کے لیے کچھ سیدھے کچھ ٹیڑھے راستے ہوتے ہیں۔ اگر آپ وہاں مسلسل موجود رہتے تو وہ بہت پہلے ہی آپ کی بات مان لیتے۔"

ایک عورت نے کہا: "چلو، اب اس بچے کو ڈبویا نہیں جائے گا۔ اتنا تو اطمینان ہو گیا ہے۔ وہ بچہ ہم مسافر عورتوں میں سے اپنی ماں کو ڈھونڈ نکالے گا۔"

آنے والے نوجوان نے کہا: "وہ لوگ اوپر بھی آئیں گے اور بچے کے ماں باپ کو تلاش کریں گے۔"

کلیم الدین بھوئیاں نے اسٹین گن کپڑوں میں لپیٹتے ہوئے کہا: "میں آپ تمام لوگوں سے التجا کرتا ہوں کہ ان مکتی باہنی کے جوانوں کو میرے متعلق کچھ نہ بتایا جائے۔ ورنہ وہ میرے متعلق طرح طرح کے سوالات کریں گے۔ میں انھیں یہ بتانا نہیں چاہتا کہ یہ اسٹین گن میرے پاس کہاں سے آئی ہے؟ اس پر بات بڑھ جائے گی۔ پھر [illegible] درمیان فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو جائے گا۔"

کئی لوگوں نے ہم آواز ہو کر کہا کہ وہ اس کے متعلق کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ کپڑوں میں اسٹین گن کو اچھی طرح چھپاتے ہوئے سوچ رہا تھا: "بے شک یہ کچھ نہیں کہیں گے لیکن کس پر کس حد تک بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ سیکڑوں مسافر ہیں۔ کسی نہ کسی کے منہ سے بات ضرور نکلے گی یا کوئی چغلی کھائے گا یا مکتی باہنی کے جوانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کہہ دے گا کہ یہاں لانچ میں ایک آدمی کے پاس اسٹین گن ہے۔"

وہ وہاں سے عرشے کے آخری سرے پر چلا آیا۔ اُدھر ایک چھوٹی سی حفاظتی کشتی رکھی ہوئی تھی۔ کشتی کے قریب ہی ریلنگ سے ایک لائف بوٹ منسلک تھی تاکہ ڈوبنے والے کو اس لائف بوٹ کے ذریعے بچایا جا سکے۔ اس نے اسٹین گن کو فرش پر رکھ دیا پھر وہیں ریلنگ سے ٹیک لگا کر کشتی کے قریب اسٹین گن کے اوپر بیٹھ گیا۔

وہ حفاظتی کشتی تقریباً چھ فٹ لمبی تھی۔ اس کشتی کے دوسرے سرے کے پاس ایک عورت فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے سر پر آنچل کو گھونگھٹ کی طرح اوڑھ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ریلنگ کی طرف منہ کیے جیسے تمام مسافروں

سے منہ بھرے ہوئے تھی۔ بھوتیاں نے دیکھا وہ اپنے آنچل کے ایک سرے کو تھام کر چہرے تک لے گئی تھی۔ شاید منہ صاف کر رہی تھی۔ شاید آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو پونچھ رہی تھی۔

کلیم الدین بھوتیاں کی توجہ اس پر سے ہٹ گئی۔ زینے پر قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان چار مسلح مکتی باہنی والوں کے ساتھ ساتھ کتنے ہی مسافر چلے آ رہے تھے۔ ایک مکتی باہنی کے جوان نے بچے کو بازو سے پکڑ رکھا تھا اور اسے کھینچتا ہوا عرشے پر لا رہا تھا۔

حفاظتی کشتی کے پاس بیٹھی ہوئی عورت فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کھڑے ہونے کے بعد پتا چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے ـــــ اس نے اپنا آنچل اِدھر اُدھر سے درست کیا اسے چہرے کو چھپانے کی فکر تھی۔ اس نے گھونگھٹ کو اور کھینچ لیا تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک مسافر کے سامنے ہاتھ پھیلا دیے۔ وہ بھیک مانگ رہی تھی۔

وہ لوگ بچے کو عرشے پر لے آئے تھے۔ تمام مسافر دور دور تک کھڑے ہوئے تھے اور اس بچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بچہ اب نہیں رو رہا تھا۔ شاید روتے روتے تھک گیا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دہشت مسلسل طاری رہے تو خوف کی شدت کچھ کم ہو جاتی ہے یا پھر بچے کو اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ لوگ اسے پانی میں نہیں ڈبوئیں گے۔ تب ہی اسے رسیوں سے آزاد کر کے وہاں لے آئے ہیں۔

ایک مسلح جوان نے بچے کو جھنجھوڑتے ہوئے اردو میں کہا۔ "آگے بڑھو اور اپنے ماں باپ کو پہچانو۔"

وہ کیبن کے پاس بیٹھی ہوئی اور کھڑی ہوئی عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے آواز دی۔ "امی! امی!"

وہ بھیک مانگنے والی تیزی سے زینے کے پاس آئی۔ پھر وہ نیچے جانا چاہتی تھی کہ بچے نے اسے دیکھ لیا۔ اگرچہ اس کا چہرہ گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا، تاہم بچہ اپنی ماں کو اس کے لباس سے اور اس کی چال سے بھی پہچان لیتا ہے۔ وہ امی کہہ کر دوڑتا ہوا آیا۔ پھر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

وہ رو رہی تھی گھونگھٹ میں منہ چھپائے بلک بلک کر رو رہی تھی۔ لیکن منہ سے آواز نہیں نکال رہی تھی۔ بچہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ لپٹ کر کہہ رہا تھا۔ "امی! یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے مجھے بچاؤ۔ مجھے اپنی گود میں اٹھا لو۔ ابو کہاں ہیں؟ امی! ابو کہاں ہیں؟"

عرشے پر تمام مسافر گم صم کھڑے ماں بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔ مکتی باہنی کے ایک جوان نے اس بھکارن کے قریب پہنچ کر کہا۔ "بچے کی ماں تو مل گئی۔ باپ کہاں ہے؟"

وہ چاروں طرف مرد مسافروں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے بھکارن کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "منہ کیوں چھپا رہی ہو۔ بتاؤ اس کا باپ کہاں ہے؟"

اب اس کی صورت نظر آ رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ کبھی وہ خوبصورت رہی ہوگی مگر اب کھنڈر بن چکی تھی۔ اس کے چہرے اور گردن پر کہیں کہیں زخموں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ اس نے بنگالی زبان میں کہا۔ "امار سوامی مورے گے چھے (میرا شوہر مر چکا ہے)"

ایک مسلح جوان نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ "تم جھوٹ بولتی ہو۔ یہ بچہ کئی بار اپنے باپ کو پکار چکا ہے۔ یہ سات آٹھ برس کا ہے۔ اتنا تو سمجھتا ہے کہ جو مر جاتے ہیں انہیں مدد کے لیے پکارا نہیں جاتا۔ یہ صرف تمہیں ہی پکارتا رہتا۔"

"یہ نہیں جانتا کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔ میں نے ایک بار اس سے مرنے کی بات کہی تھی تو یہ بیمار پڑ گیا تھا۔ تب سے میں اس کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے باپ کی تصویریں دکھا کر کہتی تھی کہ یہ دوسرے ملک کام کرنے گئے ہیں۔"

ایک مسلح جوان نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "بہت خوب، تم اس کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھیں لیکن اس کو مرنے کے لیے ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔"

اس نے بچے کو اٹھا لیا۔ پھر گلے سے لگا کر رونے لگی سب اس کا جواب سننے کے منتظر تھے ـــــ وہ بچے کو لے کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ریلنگ کے پاس آئی۔ پھر بچے کو اتار کر فرش پر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی ماں اتنی ظالم نہیں ہوتی کہ بچے کو مرنے کے لیے دشمنوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دے۔ میں بہت مجبور ہو گئی تھی۔ مجبور ہو کر سوچا اگر میں اس طرح چھوڑ دوں گی تو یہاں سیکڑوں مسافر ہیں، سیکڑوں مائیں ہیں۔ کسی کے دل میں تو ممتا جاگے گی۔ اگر وہ میرے بچے کو نہیں اپنائے گی۔ تو کم از کم اسے مرنے بھی نہیں دے گی۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "جب تک میرا بچہ رسیوں سے لٹکتا رہا میری ممتا سولی پر چڑھی رہی۔ میں اپنے آپ کو اندر ہی اندر مارتی رہی، انتظار کرتی رہی کہ اسے بچانے کے لیے سارے مسافر ایک ہو جائیں گے۔ کسی قوم میں سب کے سب بدمعاش نہیں ہوتے۔ سارے بہاری یا سارے بنگالی بدمعاش نہیں ہیں۔ ہزار انتقامی جذبوں کے باوجود انسان کا ضمیر اسے جھنجھوڑتا ہے۔ سوچنے، سمجھنے، ہمدردی اور محبت کرنے پر مجبور کرتا

ہے۔ تم کہتے ہو، میں نے اپنے بیٹے کو موت کے منہ میں چھوڑ دیا۔ میں کہتی ہوں، جب تک یہ بچہ موت کے شکنجے میں رہا تب تک میں نے یہاں باضمیر انسانوں کا ایک ہجوم دیکھا۔ وہ سب میرے بچے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ سب کے دل میں ممتا اور پدرانہ محبت تھی۔ سب اس بچے کے لیے سوچ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس لانچ کی اوپر سے نیچے تک مسافر عورتوں نے کھانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس بچے کی باتیں کر رہی تھیں۔ میرا بچہ ایک اجتماعی محبت کا مرکز بن گیا تھا۔ میں نے اپنی ایک ممتا کو ہار کر ساری ماؤں کی محبتیں اپنے بیٹے کے لیے جیت لی تھیں۔"

ایک مسافر نے کہا: "ہمیں تمہارے بچے سے ہمدردی ہے۔ ہم اسے مرنے نہیں دیں گے لیکن تم نے اپنے بچے کو بے یار و مددگار کیوں چھوڑ دیا؟ کیا ہماری انسانیت کو آزمانے کے لیے؟"

وہ بولی: "انسانیت کو آزمانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں نے ایسے بہاریوں کو دیکھا ہے جو بہاری غنڈوں کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔ ایسے بنگالیوں کو دیکھا ہے جو بنگالی بدمعاشوں کا محاسبہ کرتے رہے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میں اپنے بچے کو چھوڑ دوں گی تو کوئی نہ کوئی محبت کرنے والا اسے اپنے ساتھ لے جائے گا اور اگر کوئی نہ بھی لے گیا تو یہ بھیک مانگ کر کسی طرح اپنی زندگی گزار لے گا۔"

ایک عورت نے پوچھا: "تم اتنی سنگدل کیوں ہو۔ اپنے بچے کو حالات کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑنا چاہتی ہو؟"

دوسری عورت نے کہا: "اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ بھیک مانگنے پر بھی پیٹ نہیں بھرتا ہوگا۔ اس لیے اولاد کو چھوڑ رہی ہے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی: "نہیں، میں اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے بچے کو کھلا سکتی ہوں۔ اسے زندہ سلامت رکھنے اور اپنے کلیجے سے لگائے رکھنے کے لیے میں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ ہارا ہے۔ بڑی بڑی قیمتیں ادا کی ہیں لیکن اب میں مجبور ہو گئی ہوں۔"

کسی نے پوچھا: "کیا مجبوری ہے؟"

وہ بچے سے الگ ہو کر مسافروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے بولی: "میں بھیک مانگتی ہوں۔ کبھی میں بہت ہی خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر ماضی کے گن گانے کا فائدہ بھی کیا ہے۔ بس حالات نے مجھے بھکارن بنا دیا۔ اگر میں تنہا ہوتی تو بہت پہلے ہی خودکشی کر چکی ہوتی لیکن اپنے بچے کی خاطر زندہ ہوں۔ اس کے لیے بھیک مانگتی ہوں۔"

کسی نے کہا: "یہ بچہ بھی تمہارے ساتھ بھیک مانگتا رہے گا تو تمہاری آمدنی بڑھے گی۔ پھر اسے کیوں چھوڑنا چاہتی ہو؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ بھی بھیک مانگتا ہے تو ایک سے دو وقت کا کھانا مل جاتا ہے لیکن یہ بنگلہ بولتے بولتے بے اختیار اردو بولنے لگتا ہے۔ بچہ ہے۔ میں اسے سمجھاتی ہوں مگر یہ سمجھتا نہیں ہے۔ اس کی نادانی مجھے ذہنی اذیتوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ میں خیرات مانگتی ہوں تو کوئی مجھے اللہ کے نام پر دیتا ہے، کوئی میری جوانی کے نام پر سخی داتا بن جاتا ہے لیکن جب یہ بچہ اچانک اردو بولنے لگتا ہے تو میرا راز فاش ہو جاتا ہے۔ خیرات دینے والے سمجھ لیتے ہیں کہ میں بہاری ہوں پھر وہ میرے بچے کے سامنے میرے وجود کے دشمن بن جاتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔"

کچھ لوگ مسکرا رہے تھے کیونکہ بنگالی عورتوں پر بھی ایسے ہی مظالم ڈھائے گئے تھے۔ کچھ لوگوں کے سر ندامت سے جھکے ہوئے تھے۔ عورتیں اپنے سر پر آنچل رکھنے کے بہانے اپنا منہ چھپا رہی تھیں۔ وہ بچہ دوڑتا ہوا اپنی ماں کے پاس پھر آ گیا تھا۔ پھر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔ وہ کہنے لگی: "میں نے سوچا، ڈھاکہ جاؤں گی اور وہاں محمد پور کیمپ میں پناہ لوں گی لیکن یہاں لانچ میں سوار ہونے سے پہلے میرے ساتھ پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ میرے اندر کی ممتا چیخ چیخ کر کہنے لگی کہ ماں اور بیٹے کے درمیان شرم و حیا کی اتنی اونچی دیوار کھڑی کر دو کہ بیٹا کبھی ماں کو نہ دیکھ سکے۔ میں نے اسے لانچ کے مسافروں میں لا کر بٹھا دیا۔ چپ چاپ چھوڑ کر یہاں عرشے پر چلی آئی۔ یہ مجھے تلاش کرتا ہوا عرشے پر آیا تو میں اس سے کترا کر نیچے چلی گئی۔ جب یہ نیچے گیا تو میں پھر اوپر آ گئی۔ اسی دوران یہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا۔"

وہ ذرا چپ ہوئی۔ پھر چیخ کر بولی: "میرا بیٹا مجھ پر بوجھ نہیں ہے۔ یہ تو کمانے والا بیٹا ہے۔ پھر بھی میں نے اسے چھوڑ دیا، ہاں چھوڑ دیا۔ درندوں کے درمیان ماں اور بیٹا ساتھ نہیں رہ سکتے اس لیے ماں نے بیٹے کو چھوڑ دیا۔"

اچانک وہ تکلیف سے کراہنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کمر کو تھام لیا۔ پھر وہ لڑکھڑاتے ہوئے ایک عورت کی طرف بڑھی۔ دو عورتوں نے اسے سہارا دے دیا۔

ایک عورت نے پوچھا: "کیا ہوا؟"

دوسری نے کہا: "اور کیا ہوگا۔ دیکھتی نہیں ہو؟" پھر اس نے بلند آواز سے کہا: "ذرا کوئی دیکھے۔ کوئی دائی ماں یہاں مل سکتی ہے؟"

کچھ عورتوں کو ایک بھکارن کے ماں بننے سے گھن آ رہی تھی۔ وہ دور ہٹ گئیں۔ کچھ عورتیں ایسے معاملات میں بڑھ

چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ وہ اسے سہارا دے کر کیبن میں لے آئیں۔ کیبن کے مرد باہر چلے آئے۔ ایک نے ناگواری سے کہا: "یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے دیش میں ہزاروں بھکاری ہیں۔ کیا ہم ان سب کو اپنے سر پر بٹھالیں؟"

دوسرے جنٹلمین نے کہا: "ہم مہنگے ٹکٹ لے کر فرسٹ کلاس میں اس لیے تو سفر نہیں کرتے کہ بھکاریوں کو بھی یہاں لے آیا جائے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کلیم الدین بھُوئیاں کی گرج دار آواز سنائی دی۔ سب ادھر پلٹ کر دیکھنے لگے۔ وہ ریلنگ سے ٹیک لگائے اسٹین گن پر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا: "بکواس کرنے سے پہلے اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ ہم گناہ کے لیے ایک تھرڈ کلاس عورت کو فرسٹ کلاس میں لے آتے ہیں لیکن گناہ کا خمیازہ بھگتنے کے لیے اسی عورت کو سماج کے تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہیں دیتے۔"

ایک شخص نے کہا: "یہ باتیں ان سے کہو جو اپنا منہ کالا کرتے ہیں۔ ہم شریف لوگ ہیں۔"

"اگر شریف ہو تو باضمیر بھی بنو۔ اپنے ضمیر کی عدالت میں فیصلہ کرو۔ کیا اس بہاری بچے کو مار ڈالنا چاہیے؟"

ایک شخص نے کہا: "نہیں، ہم اسے مارنے کے حق میں نہیں ہیں۔"

دوسرے نے کہا: "ہم فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ یہاں مکتی باہنی کے جوان موجود ہیں۔ انھوں نے ہمارے دیش کو ظالموں سے مکت کیا ہے۔ یہ ہمارے نجات دہندہ ہیں۔ انھوں نے آزادی کی جنگ لڑی ہے۔ یہ اپنے طور پر فیصلہ کریں گے۔"

ایک مکتی باہنی کے جوان نے کہا: "ہمارا فیصلہ ہے، ہمارے دیش کی زمین پر ایک بہاری بھی زندہ نہ رہے۔ ہم ان کے بچوں کو اگر جان سے نہیں ماریں گے تو کم از کم اپاہج بنا کر چھوڑ دیں گے۔"

ان کی باتوں کے دوران کلیم الدین بھُوئیاں اپنے بچے سے کپڑے کو ہٹاتا رہا۔ پھر اچانک ہی اسٹین گن لے کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چاروں مسلح جوان کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک خستہ حال بنگالی کے پاس اسٹین گن ہو سکتی ہے۔ ایک نے پوچھا: "کون ہو تم؟"

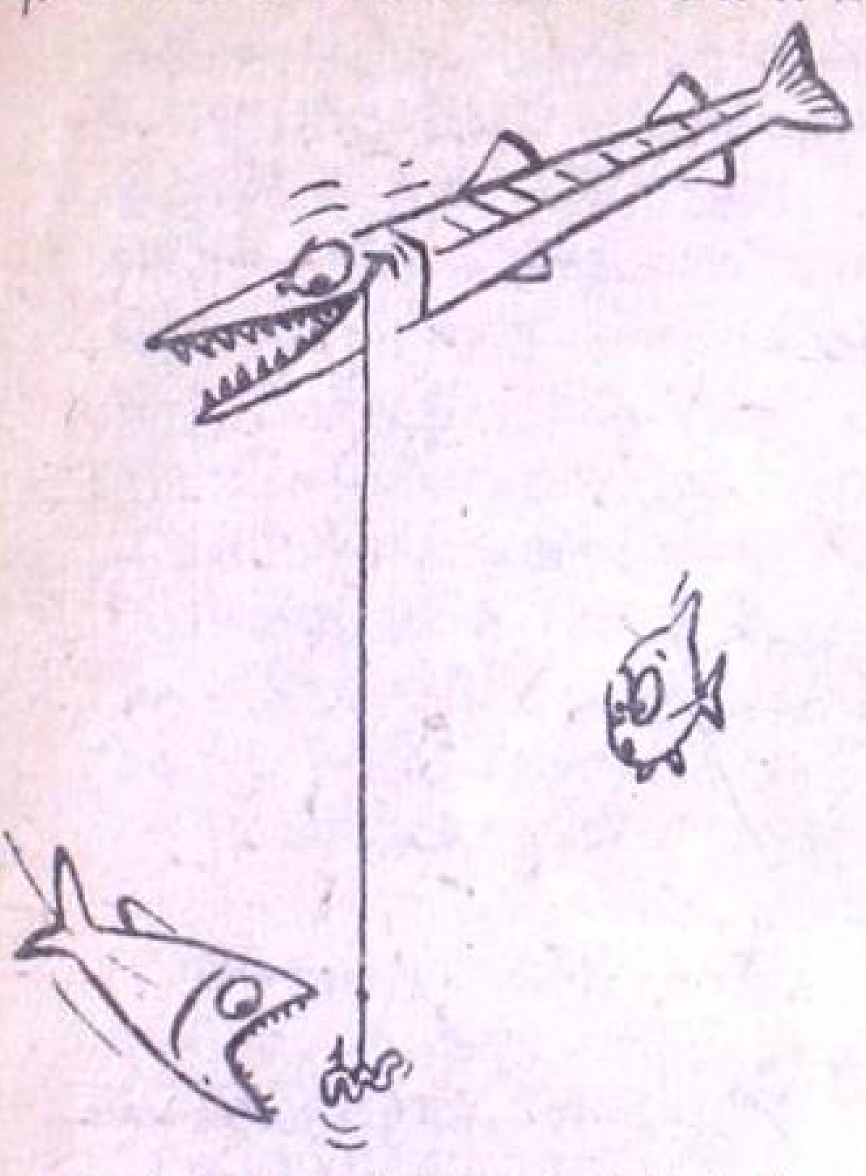

"تمھاری طرح ایک پیدائشی بنگالی ہوں۔ جب میرا گھر بار لُٹ گیا، میرا اس دنیا میں کچھ نہیں رہا تو میں جنون میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے سوچا 'بنگالی بنگالی نہیں ہیں، بہاری بہاری نہیں ہیں۔ سب شیطان ہو گئے ہیں۔ کوئی بھی میرے ہتھے چڑھے گا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا' لیکن تقدیر نے مجھ سے بڑا ہی خوبصورت مذاق کیا ہے۔ میری زندگی میں ایک عورت آئی۔ میں نہیں جانتا کہ وہ بنگالی تھی یا بہاری۔ وہ چند گھنٹوں تک ہمارے ساتھ سفر کرتی رہی۔ جب ہمارا ایک بہاری ساتھی مارا گیا تو وہ اس کے لیے بین کرنے لگی۔ اس عورت کی اداؤں نے سمجھایا کہ انسانیت کیا ہوتی ہے۔ میں اس عورت کے نام پر یہ ہتھیار اٹھا رہا ہوں۔ میں نے کچھ دیر پہلے یہاں کے مسافروں کو دھمکی دی تھی کہ اس بچے کو مارا گیا تو لانچ کا ایک مسافر بھی دوسرے کنارے تک نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ لانچ بھی اس بچے کے ساتھ ڈوب جائے گی۔"

ایک مکتی باہنی کے جوان نے اسٹین گن سنبھالتے ہوئے کہا۔ "تم ایسا نہیں کر سکو گے۔ ہم چار ہیں اور تم ایک ہو۔"

بھُوئیاں نے کہا۔ "میرے پاس اٹھائیس کارتوسوں کا ایک راؤنڈ ہے۔ جتنی دیر میں تم مجھ پر گولیاں برساتے رہو گے۔ میں اتنی دیر میں ایک راؤنڈ تمام مسافروں پر خالی کر دوں گا۔"

مسافر سہمے ہوئے پیچھے ہٹتے رہے تھے۔ کلیم الدین بھُوئیاں نے کہا: "خبردار! کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ کوئی حرکت کرے گا تو فائرنگ شروع ہو جائے گی۔"

سب اپنی اپنی جگہ سہمے ہوئے کھڑے رہے۔ کلیم الدین بھُوئیاں نے کہا: "ہاں، میں نے دھمکی دی تھی لیکن میں اپنی اس دھمکی پر عمل نہیں کروں گا۔ میں انسان ہوں۔ میں نے کہا نا، اور زمانے نے مجھے انسانیت کا درس دیا ہے۔ مجھے محبت کرنا سکھایا ہے۔ میں

تم سب سے محبت کرتا ہوں۔ اس لیے یہ گولیاں تم پر خالی نہیں کروں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ دوسری طرف پلٹ گیا۔ دوسری طرف دریا تھا، کھلا آسمان تھا۔ وہ اچانک ہی فائرنگ کرنے لگا۔ تڑ تڑا تڑ کی آواز کے ساتھ ہی دائیں سے بائیں گولیاں چلاتا گیا اور کہتا گیا: "ہمارے دیش میں گولیاں بہت چل چکیں۔ اب انھیں دریا میں بہا دو۔"

تڑ تڑا تڑ کی آواز دور تک دریا میں گونجتی جا رہی تھی۔ لانچ کے مسافروں کے کان بج رہے تھے۔ وہ سب دم بخود تھے۔ کسی کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اٹھائیس کارتوس فوراً ہی ختم نہیں ہو جاتے۔ تڑ تڑا تڑ کی آواز کے ساتھ وہ گولیاں دہشت کی طرح دماغوں میں چیخ رہی تھیں اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: "ہمارے دیش میں رقص ہے، موسیقی ہے، گیت ہے، محبت ہے اور یہ سب کچھ انسانی رابطوں اور رشتوں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔"

تڑ تڑا تڑ، تڑ تڑا تڑ اور پھر راؤنڈ ختم ہو گیا۔ اسٹین گن خالی ہو گئی۔ اس نے پلٹ کر تمام مسافروں کی طرف دیکھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں پر اسٹین گن رکھ کر اسے یوں آگے بڑھایا جیسے محبت کا تحفہ تھال میں رکھ کر پیش کر رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔ "یہ خالی ہو چکی ہے۔ اس کی ایک ایک گولی تمھارے سینوں میں اتر سکتی تھی۔ میں نے تم سب کو حیات نو دی ہے۔ اب تم اس بچے کو معاف کر دو۔"

یہ کہہ کر اس نے اسٹین گن کو دور لانچ کے باہر پھینک دیا۔ وہ اسٹین گن فضا میں چکراتی ہوئی دریا کی لہروں میں جا کر گم ہو گئی۔ لانچ کے تمام مسافر گم صم کھڑے ہوئے تھے۔ بہت سے لوگ مکتی باہنی کے مسلح جوانوں کو دیکھ رہے تھے۔ اب فیصلہ ان کے ہاتھ میں تھا

اتنے سارے مسافروں کے درمیان وہ ننھا سا بچہ سہما ہوا کھڑا تھا۔ چند لمحوں تک گہری خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ مکتی باہنی کے جوان اپنی اپنی اسٹین گنوں کو شانوں سے لٹکا کر آگے بڑھتے ہوئے زینے تک آئے۔ وہاں پہنچ کر رک گئے۔ ایک نے تمام مسافروں پر سرسری سی نظر ڈالی۔ پھر کہا: "بھوئیاں! ہم انسان ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔ اس کے ساتھ اس کے ساتھی بھی زینے سے اترتے ہوئے نیچے چلے گئے۔ کتنے ہی مردوں نے اطمینان کی سانس لی۔ کتنی ہی عورتوں کی آنکھیں ممتا سے چھلک رہی تھیں۔ کلیم الدین بھوئیاں تھکے ہوئے انداز میں ریلنگ کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ بیٹھ گیا۔

عرشے کے آخری سرے پر مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت کیبن سے ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز آنے لگی۔

* * *

نین تارا، عظمیٰ اور بڑو دیدی جاگ رہی تھیں۔ رات کے تین بجنے والے تھے۔ نین تارا بے چینی سے کبھی اٹھتی تھی، کبھی بیٹھتی تھی، کبھی دروازے تک جاتی تھی اور مایوس ہو کر لوٹ آتی تھی۔ خسرو نے کہا تھا" وہ نو بجے آئے گا۔ رات کا کھانا کھا کر گیارہ بجے تک ریلوے اسٹیشن چلا جائے گا پھر شاید صبح واپسی ہوگی۔ کیونکہ اسی شام اناج کا دوسرا ویگن پہنچنے والا تھا۔

بڑو دیدی رو رہی تھیں۔ ان کی نند ششی شام سے مندر گئی تھی۔ پھر لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ ہر جگہ تلاش جاری تھی۔ ہریا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک آدھ گھنٹے میں ہی اسے ڈھونڈ نکالے گا لیکن رات گزرنے والی تھی۔ چنتا اس بات کی تھی کہ ششی اس کے پتی کی بہن تھی۔ تلسی رام نے اپنی بہن کو اس کی پناہ میں رکھا تھا۔ اب وہ آ کر سختی سے پوچھ گچھ کر سکتا تھا کہ جب حالات اتنے خراب تھے تو بڑو دیدی نے ششی کو تنہا مندر کیوں جانے دیا تھا؟

عظمیٰ چپ چاپ ان دونوں کو دیکھتی رہتی تھی۔ زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ اسے اچھی طرح تسلیاں دینا بھی نہیں آتا تھا۔ وہ کبھی اپنا ہاتھ نین تارا کی پشت پر رکھتی تھی۔ محبت سے سہلاتی تھی۔ کبھی بڑو دیدی کا ہاتھ تھام کر تھپکنے لگتی تھی۔ ان تینوں نے دوپہر کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک مر گئی، نیند اڑ گئی تھی۔ بڑو دیدی نے نین تارا سے کہا: "میں نے تمھارے پتاجی سے کہہ دیا تھا، ششی کو لے کر سید پور میں نہیں رہوں گی۔ یہاں غنڈے بدمعاش زیادہ ہیں۔ مگر انھوں نے میری نہیں سنی۔"

نین تارا نے کہا: "غنڈے بدمعاش کہاں نہیں ہیں۔ جہاں جہاں سے ہم گزرتے گئے ہیں، اپنی جان ہتھیلی پر رہی ہے۔ انھوں نے کہا تھا، رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیں گے لیکن اب تک نہیں آئے۔ دیدی! میرا جی چاہتا ہے، بھاگ کر باہر چلی جاؤں۔ چیخ چیخ کر انھیں آوازیں دینے لگوں۔ جب سے وہ سید پور پہنچے ہیں، ان کے ہزاروں دشمن ہو گئے ہیں۔"

وہ پھر تڑپ کر اٹھ گئی۔ تیزی سے چلتے ہوئے دروازے کی طرف جانے لگی۔ وہ تینوں سامنے والی بیٹھک میں تھیں۔ وہاں سے اٹھ کر باہر برآمدے میں آ گئی تھیں۔ برآمدے میں چھت سے

فرش تک لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس لیے ڈر نہیں لگتا تھا۔ جالی سے باہر والی سڑک دور دور تک نظر آتی تھی۔ آس پاس مارواڑیوں کے دو منزلہ اور تین منزلہ مکانات تھے۔ سڑک ویران تھی۔ مکانات بھی خاموش اندھیروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ عظمیٰ اس کے ساتھ آ کر باہر دیکھ رہی تھی۔

باہر سامنے ہی ایک گائے کھڑی ہوئی تھی۔ گائے کے ماتھے پر سیندور لگا ہوا تھا اور اس کی دونوں سینگوں پر گیندے کے پھول نظر آ رہے تھے۔ ایسی کتنی ہی گائیں مارواڑی پٹی میں چہل قدمی کرتی رہتی تھیں۔ ہندو انھیں دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتے تھے پھر اس سے پہلے کہ گئو ماتا ٹکرا رہے، وہ کترا کر گزر جاتے تھے۔ جب یہ علاقہ پاکستان تھا تو ہندوؤں کے محلے میں شاذونادر ہی گائے نظر آتی تھی۔ چور اُچکے انھیں قصائیوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے۔ بنگلہ دیش بنتے ہی مارواڑی پھر وہاں آ کر آباد ہونے لگے۔ ان کے ساتھ اب گائیں بھی ماتھے پر تلک لگائے نظر آیا کرتی تھیں۔ اب کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان جانوروں کو ہاتھ لگاتا۔ اگرچہ بنگلہ دیش بھی مسلمانوں کا تھا لیکن وہاں ہندوؤں کو سینگ مارنا آتا تھا۔

نین تارا لوہے کی جالیوں کو دونوں ہاتھوں سے تھامے دیر تک دیکھتی رہی۔ کبھی کوئی بھولا بھٹکا گزرتا ہوا نظر آتا تو اس پر خسرو کا گمان ہوتا۔ دوسرے لمحے وہ مایوس ہو جاتی۔ انتظار کرنے والا کیا جانے کہ آنے والے پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ مایوس ہو کر بڑو دیدی کے پاس آ گئی۔ عظمیٰ وہیں جالی کے پاس کھڑی رہی۔ بڑو دیدی نے پوچھا: "وہ کہاں ہے؟"

نین تارا نے تھکے ہوئے انداز میں موڑھے پر بیٹھ کر کہا۔

"وہیں برآمدے میں ہے۔"

دیدی نے ناگواری سے پوچھا: "آخر وہ اتنی بے چین کیوں ہے؟ کیا خسرو سے جتنی محبت تم کرتی ہو اتنی ہی وہ بھی کرتی ہے؟ میں دیکھتی آ رہی ہوں، وہ خسرو کے معاملے میں تمھاری برابری کرتی رہتی ہے۔"

نین تارا نے سر جھکا کر کہا: "دیدی! میں عظمیٰ کو جہاں تک سمجھ پائی ہوں، وہ محبت کی بھوکی ہے اور دل کی بُری نہیں۔"

"کیا تم اس کے دل میں بیٹھی ہو؟"

"دل کی بات خدا جانتا ہے۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ عورت کیسی ہی ہو، اپنا آدمی ٹھیک ہے تو سب ٹھیک ہے۔"

"میں جب بیاہ کر آئی تھی تو ایسا ہی سوچتی تھی کہ اپنے آدمی کو ٹھیک رہنا چاہیے۔ میں تمھارے جیجا جی پر بہت بھروسہ کرتی تھی۔ ان کے ایک دور کے رشتے کی بیوہ عورت ہمارے ہاں آ گئی۔ اچھی خوبصورت تھی۔ میں سمجھی تمھارے جیجا جی اس سے ہمدردی کر رہے ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ میرے سینے پر مونگ دلنے آئی تھی۔ پھر بڑے جھگڑے ہوئے۔ کیا بتاؤں اس عورت کو گھر سے نکالنے میں کتنی دشواریاں پیش آئیں۔ یہ مرد کسی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں تو اسے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ میں بھی کچھ کم نہیں ہوں۔ آخر چھڑا کر ہی رہی۔ تب سے کان پکڑ لیے کہ پھر کسی عورت کو اپنے گھر میں قدم رکھنے نہیں دوں گی۔ تمھاری بات اور ہے۔ تم میری بھابی ہو لیکن اس گونگی کو دیکھ کر تمھارے جیجا جی کی حرکت یاد آ جاتی ہے۔ میں بار بار تمھیں سمجھا چکی ہوں، میرا کچھ نہیں جائے گا، تمھیں نقصان اٹھاؤ گی۔ میں نے خسرو کو بھی دبی زبان سے کہا ہے کہ وہ اس گونگی کا کہیں ٹھکانہ کرے لیکن وہ توجہ ہی نہیں دیتا۔ ایک بات پوچھوں؟"

"کیا بات ہے، دیدی؟"

"تم خسرو کی دھرم پتنی ہو لیکن میں دیکھتی رہتی ہوں، اس کے پاس جانے سے ہچکچاتی ہو۔ میں اس کے پاس بیٹھنے کے لیے کہتی ہوں تو تم بیٹھتی ہو ورنہ کھنچی کھنچی سی رہتی ہو۔ اس کے برعکس وہ گونگی سیدھی اس کے پاس چلی جاتی ہے۔ بُرا نہ ماننا، کوئی دیکھنے والا یہی کہے گا کہ تم ہاتھی کے دانت ہو، صرف دکھانے کے لیے۔ کھانے والا دانت کوئی اور ہے۔"

عظمیٰ دروازے کے پاس کھڑی ہوئی سن رہی تھی۔ وہ بے زبان تھی۔ بے حس نہیں تھی۔ اس کے دل پر چوٹیں لگ رہی تھیں مگر وہ کیا کہہ سکتی تھی، مجبور تھی۔ بڑو دیدی کے تیور کو سمجھتی تھی وہ اسے اپنے ہاں رکھنا نہیں چاہتی تھیں — وہ خود سوچتی تھی کہ خسرو اور نین تارا سے کیوں لگی ہوئی ہے، کب تک ان پر بوجھ بنی رہے گی؟ وہ ایسا سوچتی تھی لیکن انھیں چھوڑ کر کہاں جا سکتی تھی؟ کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ باہر نکلتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔

وہ بیٹھک میں آئی۔ بڑو دیدی اسے دیکھتے ہی چپ ہو گئیں۔ نین تارا سے اس کی نظریں ملیں۔ اس نے کہا: "اڑڑ باڑ یہ ہے (اصل بات یہ ہے) کہ تم خسرو کی منکوحہ ہوتے ہوئے بھی اس کی بیوی نہیں ہو۔ اسی لیے تم اس کے قریب جانے سے ہچکچاتی ہو۔ میرے اور خسرو کے درمیان کوئی جھجک والا رشتہ نہیں ہے۔ خسرو کی جو خدمت تمھیں کرنا چاہیے، وہ میں کرتی ہوں۔ میرے من میں کوئی کھوٹ نہیں ہے اور اسی کھوٹ کو بڑو دیدی نہیں سمجھ سکتیں۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی اور دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی۔ اس کے جانے کے بعد بڑو دیدی نے حیرانی سے پوچھا: "یہ

کیا کہہ رہی تھی۔ کیا تم اس کی گڑ بڑ گڑ بڑ بولی کو سمجھ لیتی ہو؟"

نین تارا اور خسرو اس کی بولی کو بڑی حد تک سمجھنے لگے تھے۔ نین تارا نے سمجھ کر بھی انکار کیا: "نہیں، میں سمجھ نہیں سکتی لیکن اتنا جانتی ہوں، جب یہ کچھ بولنا چاہتی ہے اور بولے بغیر نہیں رہ سکتی تو اپنی زبان ہلانے لگتی ہے خواہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔"

بڑو دیدی نے کہا: "مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ ہمیں باتیں سنا کر گئی ہے۔"

وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی، اسی وقت ہریا کی آواز سنائی دی۔ وہ باہر سے بڑو دیدی کو پکار رہا تھا۔ وہ دونوں فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھیں اور تیزی سے چلتے ہوئے برآمدے میں آگئیں۔ ان کے پیچھے عظمیٰ بھی چلی آئی تھی۔ بڑو دیدی نے بے چینی سے پوچھا: "جلدی بتاؤ ہریا! کیا ششی مل گئی ہے؟"

ہریا نے نین تارا اور عظمیٰ کو گھورتے ہوئے کہا: "ہاں مل گئی مگر میں ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

بڑو دیدی نے نین تارا اور عظمیٰ کو دیکھا۔ پھر حیرانی اور غصے سے پوچھا: "کیا بکواس کر رہے ہو؟ پہلے ششی کے متعلق بتاؤ۔ ان دونوں کو آنکھیں کیوں دکھا رہے ہو؟"

"دروازہ کھولو۔ بات ایسی ہے کہ سنو گی تو انھیں گولی مار دو گی۔"

"بات کیا ہے؟"

یہ پوچھتے ہوئے بڑو دیدی نے دروازے کو کھول دیا۔ ہریا نے اندر آتے ہوئے کہا: "تم جسے بھائی کہتی ہو، جس کے گن گاتی ہو، جس کی شرافت کی قسمیں کھاتی ہو۔ وہی غنڈہ ششی کو لے گیا تھا۔"

بڑو دیدی نے غصے سے کہا: "ہریا! میں تھپڑ مار دوں گی۔ خسرو کے بارے میں ایسا مت کہو۔"

"تم مجھے بولنے سے روک سکتی ہو۔ دنیا والوں کو نہیں روک سکتیں۔ ابھی کتنے ہی لوگ خسرو اور ششی کو پکڑ کر یہاں لا رہے ہیں۔"

"کیا؟" بڑو دیدی حیرانی اور بے یقینی سے اپنے بھائی کو منہ تکنے لگیں۔ ہریا نے کہا: "وہ ششی کو ماگی پاڑہ کے ایک مکان میں لے گیا تھا۔ اب میں کیا بتاؤں۔ کچھ بولتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اب تو جو کہنا ہے۔ وہ دنیا والے ہی کہیں گے اور تم سنو گی۔ تم کیا، بھیا جی بھی سنیں گے اور کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ میں پہلے ہی کہتا تھا۔ یہ مسلمان بھلا کسی کے ہوئے ہیں۔ جس تھالی میں کھاتے ہیں۔ اسی میں چھید کرتے ہیں۔"

نین تارا نے بڑو دیدی کے بازو کو تھام کر کہا: "نہیں دیدی! نہیں۔ وہ ایسے نہیں ہیں۔ یہ اُن پر بہتان ہے۔"

دیدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پہلی بار سرد مہری کا اظہار کیا۔ ابھی وہ نین تارا وغیرہ سے ناراض نہیں تھیں۔ نہ ہی خوش تھیں۔ جو کچھ ہریا کہہ رہا تھا، اسے آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنا چاہتی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہی لوگوں کی بھیڑ دکھائی دی۔ ان کے درمیان ایک سائیکل رکشہ تھا جس پر ایک عورت گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہوئی تھی۔ رکشہ کے آگے آگے خسرو تھا اور وہ تمام لوگ باری باری اسے مار رہے تھے اور دھکا دیتے ہوئے اسی طرف لا رہے تھے۔

بڑو دیدی، نین تارا اور عظمیٰ گم صم کھڑی دیکھ رہی تھیں۔ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی انھیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتنا سمجھ میں آگیا کہ رکشہ میں بیٹھی ہوئی عورت ششی ہے۔ وہ بھیڑ بڑو دیدی کے برآمدے کے سامنے آکر رک گئی۔ تقریباً سو ڈیڑھ سو آدمیوں کا مجمع ہوگا۔ اس وقت چار بجنے والے تھے۔ ایسے وقت لوگ گہری نیند سوتے ہیں لیکن آئے دن کے ہنگاموں کے لوگ عادی ہو گئے تھے۔ ذرا سی بات ہو تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے تھے۔ اسی لیے اتنی بھیڑ لگ گئی تھی۔ اس بھیڑ میں دھرم چند اور اس کے غنڈے بھی موجود تھے۔

دھرم چند کو دیکھتے ہی بڑو دیدی نے گھونگھٹ نکال لیا۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا: "بھابی! تلسی رام جی یہاں موجود نہیں ہیں لیکن میں آنکھیں کھلی رکھتا ہوں۔ جس دن سے یہ بہاری مسلمان آپ کے گھر میں آیا ہے، میں ہمیشہ اس کی ٹوہ میں لگا رہتا تھا۔ آج شام کو جب معلوم ہوا کہ ششی غائب ہو گئی ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے اپنے تمام آدمیوں کو سید پور کے چپے چپے پر پھیلا دیا۔ ششی کو تلاش کرتا رہا۔ آخر ہم نے ماگی پاڑہ میں ان دونوں کو ڈھونڈ نکالا۔"

ہریا رکشہ کے پاس پہنچ گیا تھا اور ششی کو سہارا دے کر اتار رہا تھا۔ خسرو کو اتنی مار پڑی تھی کہ اس کا چہرہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ وہ زخموں سے چُور تھا۔ اس میں کھڑے رہنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ اِدھر سے اُدھر ڈگمگا رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے چیخ کر کہا: "یہ سب جھوٹ ہے۔ دیدی! اوپر میرا خدا ہے۔ نیچے آپ ہیں..."

وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے آیا۔ پھر لوہے کی جالی کو پکڑ کر کہنے لگا: "آپ مجھ پر بھروسہ کرتی ہیں۔ آپ اچھی طرح جانتی

ہیں، میں ششی کو اپنی بہن کی طرح چاہتا ہوں۔"

پیچھے سے کسی نے اسے لات ماری۔ پھر اسے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ "شرم نہیں آتی۔ اسے بہن کہتے ہو۔ ہم تمہارا منہ توڑ دیں گے۔"

بھیڑ میں سے کسی نے کہا۔ "اور نہیں تو کیا تمہیں زندہ چھوڑیں گے۔"

کسی اور نے کہا۔ "ہم نے اپنی آنکھوں سے تمہارے کرتوت دیکھے ہیں۔ ہم تو تمہاری بوٹی بوٹی کرکے چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔"

دھرم چند نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "خاموش رہو۔ سانچ کو آنچ کیا ہے۔ ابھی ششی کے بیان سے اس کا کچا چٹھا سامنے آجائے گا۔"

اسی وقت تھانے کا داروغہ چھ سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ بڑو دیدی نے کہا۔ "ہریا! انسپکٹر صاحب سے کہو اندر آجائیں اور کوئی نہ آنے پائے۔ ان کے سپاہی خسرو کا خیال رکھیں کوئی اسے ہاتھ نہ لگائے۔"

تھوڑی دیر بعد بیٹھک میں بڑو دیدی ششی کو لے کر لکڑی کے تخت پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ داروغہ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ نین تارا اور عظمیٰ تخت سے لگی کھڑی ہوئی تھیں۔ ہریا بیٹھک میں نہیں آیا۔ اس کے اندر کا چور کہہ رہا تھا کہ پکڑا جا سکتا ہے لیکن پکڑے جانے کے لیے کوئی ثبوت نہیں تھا۔ پھر بھی وہ بیٹھک کے باہر کھڑا کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔

بڑو دیدی نے ششی کا گھونگھٹ اٹھا کر کہا۔ "ششی! تم پر جو قیامت گزری ہے" اسے میں دل سے محسوس کر رہی ہوں۔ میری بہن! جو کچھ بھی ہو اپنے دل پر پتھر رکھ لو۔ یہاں داروغہ صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ سچ سچ بتادو۔ تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟"

سب اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دیدے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ پلک نہیں جھپک رہی تھی۔ بڑو دیدی کو ڈر سا لگا۔ وہ زندہ لاش لگ رہی تھی۔ اس نے جھنجوڑ کر پوچھا۔ "ششی! تم ایسے خاموش کیوں ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن بڑو دیدی کو اطمینان ہوگیا۔ اس کی سانس چل رہی تھی۔ وہ زندہ تھی۔ داروغہ نے اپنی کرسی پر ذرا سیدھی طرح بیٹھتے ہوئے کہا۔ "دیوی جی! آپ خاموش نہ رہیں۔ اگر کسی نے دھمکی دی ہے۔ زبان بند رکھنے کے لیے کہا ہے تو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا نام بتائیں میں ابھی آپ کے سامنے اس کی پٹائی کروں گا اسے حوالات میں بند کردوں گا۔"

"مرنے کے بعد اگر تمہیں دوبارہ دنیا میں بھیجا جائے۔" پادری نے پوچھا۔ "تو کیا تم دوبارہ انھیں غلطیوں کو دہراؤ گے جو پہلے جنم میں تم سے سرزد ہوتی رہی تھیں؟"

"یقیناً" جواب ملا۔ "لیکن پادری صاحب دوسری مرتبہ ہچکچاہٹ سے کام نہیں لوں گا۔ غلطیوں کی ابتدا ابتدا ہی سے کردوں گا۔"

وہ کچھ نہیں بول رہی تھی۔ گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ نین تارا اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی پھر دو زانو ہوگئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔ "میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں۔ خدا کے لیے زبان کھولو۔ نہیں تو ان پر الزام آئے گا ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ لوگ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

عظمیٰ بھی ششی کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ وہ زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی لیکن اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ بڑو دیدی نے بار بار پوچھا۔ پھر داروغہ نے کہا۔ "دیوی جی! آپ خاموش رہیں گی تو ہمارے لیے مشکل ہو جائے گی۔ آپ اپنی بھابی کے کان میں صرف مجرم کا نام بتا دیجیے۔"

بڑو دیدی آگے کھسک کر ششی کے قریب آگئیں آہستگی سے بولیں۔ "میرے کان میں بتا دو۔"

بڑی دیر بعد ششی کے جسم میں حرکت سی پیدا ہوئی۔ وہ آگے پیچھے ڈول رہی تھی جیسے جنون طاری ہو رہا ہو پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا جیسے سر چکرا رہا ہو۔ بڑو دیدی نے پوچھا۔ "کیا ہوا، ششی! بولو، کیا ہوا؟"

اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر اس نے اپنے جسم کا سارا بوجھ اپنی بھابی پر ڈال دیا۔ بڑو دیدی، نین تارا اور عظمیٰ نے اسے سنبھالا۔ پھر لکڑی کے تخت پر لٹا دیا۔ اسے پنکھا جھلنے لگیں عظمیٰ نے اس کی نبض ٹٹولی، نین تارا نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ دھڑکنیں جاری تھیں۔ وہ زندہ تھی لیکن بے ہوش ہو گئی تھی۔

باہر خسرو چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "ہریا! تم خاموش کیوں ہو، تم لوگوں کو کیوں نہیں بتاتے کہ میں تمہارے ساتھ تھا۔ بدمعاشوں نے ہم دونوں کو پکڑ لیا تھا۔ زبردستی ہم دونوں کو شراب پلائی تھی۔"

داروغہ اس کی باتیں سن کر بیٹھک کی کھڑکی کے پاس آگیا۔ وہیں ہریا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "ہریا! یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

ہریا نے کہا: "آپ خود دیکھ لیں۔ کیا میرے منہ سے شراب کی بو آ رہی ہے' ہا۔۔۔"

اس نے انسپکٹر کے قریب منہ کھول کر سانس چھوڑی۔ پھر کہا: "یہ بکواس کرتا ہے۔ میں نے شام سے اسے دیکھا تک نہیں اور کہتا ہے' میں اس کے ساتھ تھا۔ بدمعاشوں نے ہمیں پکڑ لیا تھا۔ داروغہ صاحب! یہ مار کھا کر آدھا پاگل ہو گیا ہے۔ میرے ہی گھر کی عورت کو لے گیا اور مجھے ہی اپنی حمایت میں گواہ بنا رہا ہے۔ پاگل کا بچہ۔"

داروغہ نے گھور کر خسرو کو دیکھتے ہوئے کہا: "اے ماوڑا! اپنا منہ بند رکھو۔ جب پوچھا جائے تو جواب دینا۔ اس سے پہلے کچھ بولو گے تو میرے سپاہی تمھاری پٹائی کریں گے۔"

پھر اس نے ایک سپاہی سے کہا: "تم فوراً اس رکشہ میں جاؤ اور کسی ڈاکٹر کو لے آؤ۔ ششی دیوی بے ہوش ہو گئی ہیں۔"

سپاہی رکشہ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ خسرو چپ چاپ کھڑا ہوا تھا۔ اب وہ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اتنی مار کھا چکا تھا کہ سپاہیوں کی مار کھانا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ ایک ہاتھ بھی پڑتا تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔

دھرم چند نے اونچی آواز میں بڑو دیدی کو آواز دی۔ "شانتا بھابی! ہمارے گھر کی کچھ عورتیں آنا چاہتی ہیں۔ دروازہ کھول دیجیے۔"

بڑو دیدی نے کہا: "داروغہ صاحب! آپ اپنی طرف سے منع کر دیں۔ ان سے کہہ دیں' جب تک قانونی کارروائی مکمل نہیں ہوگی ششی کا بیان نہیں لیا جائے گا۔ اس وقت تک کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

داروغہ نے یہی بات دھرم چند سے کہہ دی۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر آیا۔ اس کے لیے دروازہ کھول کر پھر بند کر دیا گیا۔ اس وقت تک ششی کو دوسرے کمرے میں پہنچایا گیا تھا۔ وہاں ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کیا۔ پھر اس کے لیے نسخہ لکھا۔ اسے ایک انجکشن لگایا۔ پھر کہا: "میں یہاں آتے وقت سپاہی کی زبان سے بہت کچھ سن چکا ہوں۔ دیوی جی کے دماغ کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ اسی صدمے سے یہ بے ہوش ہو گئی ہیں ——— جلد ہی یہ ہوش میں آ جائیں گی۔ جب ہوش میں آئیں تو یہ دوا انھیں پلا دیجیے گا۔"

ڈاکٹر چلا گیا۔ صبح کی ہلکی ہلکی سی روشنی پھیل رہی تھی۔ داروغہ نے کہا: "میں اس بدمعاش کو لے جا کر حوالات میں بند کر دیتا ہوں۔ جب دیوی جی بیان دیں گی تو۔۔۔"

بڑو دیدی نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا: "آپ کس بدمعاش کی بات کر رہے ہیں؟"

"وہی جو باہر کھڑا ہے۔ لوگوں نے جسے پکڑ رکھا ہے۔"

"لیکن داروغہ صاحب! ششی نے ابھی کسی کا نام نہیں لیا ہے۔ میں خسرو کو دس برس سے جانتی ہوں۔ یہ لڑکا میرے سامنے جوان ہوا ہے۔ بہت ہی شریف لڑکا ہے لیکن آدمی کب جانور بن جاتا ہے' یہ کہا نہیں جا سکتا۔ پھر یہ کہ اس کے خلاف سیکڑوں گواہ ہیں۔ جب تک اس کی بے گناہی ثابت نہیں ہوگی۔ میں اسے اور اس کی ان دو عورتوں کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کروں گی لیکن یہ بھی نہیں چاہوں گی کہ یہ دربدر ہو جائیں ——— کیا آپ ششی کا بیان لینے تک ان تینوں کو دشمنوں سے کہیں بچا کر نہیں رکھ سکتے؟"

داروغہ نے ذرا سوچ کر کہا: "میں ان عورتوں کو یہاں قریب ہی شیر بلڈنگ میں پہنچا دوں گا اور خسرو کو حوالات میں بند کر دوں گا۔"

نین تارا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نہیں نہیں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے اور روتے ہوئے کہا: "نہیں دیدی! نہیں' مجھے بھی ان کے ساتھ حوالات میں بھیج دیجیے۔ میں ان سے دور نہیں رہوں گی۔"

منّی نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بڑو دیدی نے ان دونوں کو دیکھا۔ کچھ سوچا پھر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ واپس آئیں تو اس کے ہاتھ میں سو روپے کا ایک نوٹ تھا۔ اس نے وہ نوٹ انسپکٹر کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا: "میں چاہتی ہوں' آپ خسرو کو بھی ان عورتوں کے ساتھ اسی شیر بلڈنگ میں حفاظت سے پہنچا دیں۔ ہو سکے تو اپنے ایک سپاہی کو وہاں چھوڑ دیں۔"

داروغہ نے نوٹ کو تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ چنتا نہ کریں۔ میں ان تینوں کو حفاظت سے وہاں پہنچا دوں گا۔ کوئی انھیں ہاتھ تک نہیں لگائے گا اور جب تک ششی کا بیان ہم نہیں سنیں گے' تب تک کسی نتیجہ پر نہیں پہنچیں گے۔ اس وقت تک ان تینوں کی حفاظت کی ذمے داری مجھ پر ہوگی۔"

بڑو دیدی نے نین تارا اور منّی کو دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا: "اب جاؤ یہاں سے۔"

نین تارا دوسرے کمرے میں گئی۔ وہاں سے اپنی اٹیچی لے آئی۔ پھر اس اٹیچی کو بڑو دیدی کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہا: "آپ تلاشی لے لیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ یہاں سے۔"

اس نے اٹیچی اٹھا لی۔ پھر منّی کا ہاتھ تھام کر داروغہ

کے پیچھے چلتے ہوئے بیٹھک سے باہر نکل آئی۔

⁂

وہ عمارت آسیب زدہ تھی۔ جب وہ تینوں عمارت کے دروازے پر پہنچے تو دن کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ شیر بلڈنگ کے بڑے ہال میں پناہ لینے والے مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے پولیس والوں کو دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ داروغہ نے کہا۔ "یہ تینوں یہاں رہیں گے۔ ایک سپاہی کی ڈیوٹی یہاں رہے گی مگر تم لوگوں کو بھی تاکید کی جاتی ہے، اس شخص کو اچھی طرح پہچان لو۔ اس کا نام خسرو ہے۔ یہ اس بلڈنگ سے باہر نہ جانے پائے۔ اگر جانا چاہے تو پولیس کو خبر کر دینا۔"

داروغہ اپنی افسری دکھا کر چلا گیا جس پولیس والے کی ڈیوٹی تھی، وہ بھی باہر چلا گیا۔ وہ تینوں اس بڑے ہال کی ایک دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے۔ ان کے آس پاس چادریں تنی ہوئی تھیں۔ سب لوگ چادروں کی چار دیواری میں اپنے اپنے خاندان کے ساتھ وہاں زندگی گزار رہے تھے۔ کچھ لوگ آکر خسرو کے متعلق پوچھنے لگے۔ اسے کیا ہو گیا ہے؟ کیسے زخمی ہو گیا ہے؟

خسرو فرش پر لیٹ گیا تھا۔ نین تارا نے کہا: "میرے بھائیو! میری بہنو! اگر ہمدردی کرنا ہے تو ان کے لیے کوئی دوا لاؤ۔ کچھ مرہم پٹی کرو۔ آپ یہ پوچھ کر کیا کریں گے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہی ہوا ہے جو آپ تمام لوگوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔"

بھیڑ چھٹنے لگی۔ ایک بوڑھے نے آکر اس کے زخموں کو صاف کرنا شروع کیا۔ پھر ان پر حکیمی دوا کا لیپ چڑھانے لگا۔ وہ مار کھا کھا کر ادھ موا ہو چکا تھا۔ ذرا آرام ملا تو آنکھ لگ گئی۔ اگرچہ ابھی اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہونا تھا۔ ششی کے بیان دینے کے بعد اس کے ساتھ نین تارا اور عظمیٰ بھی ماری جاتیں لیکن موت کا یقین ہونے کے باوجود، وہ اذیتیں برداشت کرنے کے باوجود تھکن کے مارے بیدار نہ رہ سکا۔ جب نیند آتی ہے تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ اس لیے وہ سو گیا۔

نین تارا نے عظمیٰ سے پوچھا: "کیا تم خسرو کو گنہگار سمجھتی ہو؟"

عظمیٰ نے انکار میں سر ہلایا۔ پھر نین تارا کے سر کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اسے تھپکنے لگی۔ ایک ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیا۔ اشارے سے کہہ رہی تھی: "سو جاؤ، زیادہ نہ سوچو، جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔"

بے شک ہونی ہو کر رہتی ہے۔ اس کے باوجود فکر کرنے والے مرنے سے پہلے مرتے رہتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ ہونے والی بات کے متعلق نہیں سوچیں گے پھر بھی دماغ سوچتا چلا جاتا ہے۔ ویسے نین تارا کو اب اتنی زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ خسرو واپس آ گیا تھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ وہ پچھلی تمام رات اسی کی واپسی کے لیے دعائیں مانگتی رہی تھی۔ دعا قبول ہو گئی تھی۔ اب اس کے ساتھ موت بھی آئے تو پروا نہیں تھی۔

> مشہور فلم ایکٹرس صوفیہ لارین کا کہنا ہے کہ عام طور پر کوئی لڑکی اس بات کی فکر نہیں کرتی کہ ایک شخص اس سے محبت کرے اور اسے چھوڑ جائے بشرطیکہ بہت کچھ چھوڑ کر جائے۔

وہ بھی خسرو کی قربت سے مطمئن ہو کر رفتہ رفتہ سو گئی۔ وقت گزرنے لگا۔ عظمیٰ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ نین تارا اس کے زانو پر سر رکھے سو رہی تھی۔ وہ کتنے مان سے تلسی رام کے ہاں گئے تھے۔ بڑو دیدی نے ان کی بڑی عزت کی تھی اور بڑی بے عزتی سے نکالا تھا۔ عظمیٰ آنکھیں بند کیے ہوئے تھی لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ بعض حالات میں انسان نیند کے دوران بھی جاگتا رہتا ہے۔

اسے چاروں طرف سے فکر اور اندیشوں نے گھیر رکھا تھا۔ فکر اس بات کی تھی کہ اس کا گزارا کہاں ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ آخر وہ زندگی کا باقی حصہ کیسے گزارے گی؟ اس کی موجودگی سے خسرو اور نین تارا کی ازدواجی زندگی میں بے اعتمادی پیدا ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ ایک بڑو دیدی کی بات ہی نہیں تھی۔ دنیا والے بھی اس کی موجودگی سے طرح طرح کی باتیں بنا سکتے تھے پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ بہت پہلے جب وہ اپنی بڑی بہن اور بہنوئی کے ساتھ رہتی تھی تو بہن اسے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتی تھی۔ اپنے شوہر سے لڑتی تھی کہ عظمیٰ سے ہنسی مذاق نہ کیا کرو۔ شوہر کہتا تھا: "یہ میری سالی ہے۔ ایک نہیں ہزار بار مذاق کروں گا۔"

اس کی خوبصورتی اس کے لیے مصیبت بن گئی تھی۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد کوئی رشتے دار اسے مستقل اپنے ہاں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جس گھر میں رہتی تھی، اس گھر کی عورتیں سوچتی تھیں۔ یہ بلا کسی دوسرے رشتے دار کے ہاں چلی جائے۔

عظمیٰ کو وہ گزرے ہوئے تمام واقعات خواب کی طرح لگ رہے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے سوچ رہی تھی لیکن لگ رہا تھا، نیند میں ہے۔ اس آسیب زدہ عمارت میں لوگوں کے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے سائے چل رہے

ہوں، سائے بول رہے ہوں کسی کی صورت پہچانی نہیں جاتی تھی۔

ایسے ہی وقت اس کی آنکھ ذرا سی کھلی۔ کچھ نیند کا خمار تھا، کچھ نیم بیداری تھی۔ اسے عمارت کا ماحول خواب سا لگا۔ نگاہوں کے سامنے دھندلکا سا تھا۔ اس دھندلکے میں اس نے سامنے والی دیوار کو دیکھا۔ تب اسے وہ آسیب نظر آیا جو کسی کسی کو نظر آتا تھا اور انھیں جنون میں مبتلا کر دیتا تھا۔

اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی اَدھ کھلی آنکھوں کے سامنے دیوار پر بڑے بڑے دانت نظر آئے۔ دانت بہت نوکیلے اور تیز تھے۔ دانت والے کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ منہ پھاڑے ہوئے تھا۔ اوپر دانتوں کی ایک قطار تھی نیچے دانتوں کی دوسری قطار تھی پھر ایک گاجر اس کے منہ میں آئی۔ اس نے کچکچا کر گاجر کو کاٹا۔ کچ کی آواز کے ساتھ گاجر کا تھوڑا حصہ کٹ کر دانتوں کے اندر منہ میں رہ گیا۔ باقی حصہ باہر تھا۔

یہ منظر دیکھتے ہی عظمیٰ کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ ہڑبڑا کر آنکھیں کھول کر وحشیانہ انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اس ہال میں جتنے پناہ گزیں تھے، سب دوڑتے ہوئے چلے آئے۔ عورتیں کہہ رہی تھیں: ”دیکھو! اب اس پر دورہ پڑا ہے اس پر وہی آسیب سوار ہے۔“

نین تارا اور خسرو بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھے تھے۔ وہ دونوں عظمیٰ کو دونوں طرف سے جھنجھوڑ کر پوچھ رہے تھے: ”کیا ہو گیا؟ کیا ہوا تمھیں؟“

عظمیٰ نے دوسری بار ایک چیخ ماری۔ پھر ساکت ہو کر سامنے والی دیوار کو دیکھنے لگی۔ دراصل وہ عمارت بہت ہی بوسیدہ تھی۔ اس کی دیواریں کہیں کہیں سے تڑخ گئی تھیں۔ کہیں ان پر کائیاں سی جم گئی تھیں۔ اس کے علاوہ پلاستر ادھڑا ہوا تھا۔ جب دیواروں کے پلاستر جگہ جگہ سے اُدھڑ جاتے ہیں تو وہاں عجیب و غریب نقشے سے بن جاتے ہیں۔ انھیں غور سے دیکھا جائے تو کہیں گھوڑے کی شکل نظر آتی ہے، کہیں کوئی بے ڈھنگا سا آدمی تلوار یا نیزہ لیے حملہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جو لوگ کسی بھی چیز کو سرسری طور پر دیکھ کر گزر جاتے ہیں، ان کی بات الگ ہے لیکن وہ لوگ جو ہر چیز کو توجہ سے دیکھتے ہیں، ان کا دماغ ان چیزوں میں اپنی زندگی کے بگڑے ہوئے حالات کی تصویریں دیکھنے لگتا ہے اور وہ تصویریں پھر زندہ ہو کر انھیں ڈرانے لگتی ہیں۔

اس عمارت میں آ کر پناہ لینے والوں میں، جو بہت زیادہ حساس تھے، ان میں سے کسی نے دیوار کے اُدھڑے ہوئے پلاستر میں اپنے پیارے کا سر تن سے جدا ہوتے دیکھا تھا اور وحشت و جنون میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کہیں دیوار کا پلاستر یوں اُدھڑا ہوا تھا جیسے کسی کا لختِ جگر نیزے کی انی پر پھڑپھڑا رہا ہو۔ اسے دیکھ کر کتنی ہی حساس مائیں چیخنے چلانے لگتی تھیں۔ نوشتۂ دیوار آنے والے وقت کا آئینہ ہوتا ہے لیکن بوسیدہ، شکستہ دیواریں گزرے ہوئے وقت کا فسانہ سناتی ہیں۔ اس عمارت کی دیواروں پر اُدھڑے ہوئے پلاستر پاکستان سے بنگلہ دیش بننے تک کی تاریخ مرتب کر چکے تھے۔ انھیں صرف پڑھنے والے پڑھ سکتے تھے جو نہیں پڑھ سکتے تھے، وہ اسے آثارِ قدیمہ سمجھ کر گزر جاتے تھے۔

لیکن عظمیٰ نے اس دیوار پر کیا دیکھا؟ اور جو دیکھا تھا اس کی زندگی سے اس کا کیا تعلق تھا؟ بول عظمیٰ! بول تو بے زبان سہی، دیوار کے ادھڑے ہوئے پلاستر بھی بے زبان ہوتے ہیں مگر بولتے ہیں۔ تو بھی زبانِ بے زبانی سے بول...

دوسرے ہی لمحے وہ بولنے والی مینا بن گئی۔ وہ خوب بولتی تھی، اگرچہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی۔ ماں باپ بچپن میں ہی مر گئے تھے۔ رشتے داروں نے اسے لکھانا پڑھانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ یہ چڑیل اپنے حسن و شباب کے بل بوتے پر کسی کے ہاں جا بسے گی۔

اکثر پیشگوئی درست ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے اس کے متعلق پیشگوئی کی تھی، وہ ایک ایک کر کے مکتی باہنی والوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان کے کمانڈر نے پہلے عظمیٰ کی بہن سے پوچھا۔ ”کیا تم بنگالی بھاشا بول سکتی ہو؟“

اس کی بہن نے جواب دیا: ”اے گے ہاں، آمی بولتے پاری (جی ہاں، میں بول سکتی ہوں)“

پھر اس کمانڈر نے عظمیٰ کے بہنوئی سے یہی سوال کیا۔ اس کے بہنوئی نے بھی بنگالی زبان میں جواب دیا اور کہا: ”ہمارا پورا خاندان کلکتہ سے آیا ہے۔ ہم بڑی روانی سے بنگالی بول سکتے ہیں۔“

کمانڈر نے حقارت سے کہا: ”تم لوگ تھالی کے بینگن ہو۔ جب تک پاکستان رہا، اردو زبان کی حمایت کرتے رہے۔ دن رات اردو بولتے رہے۔ تمھارے گھروں میں کوئی ہماری بھاشا بولنے والا نہیں تھا۔ اب اپنی موت کو سامنے دیکھ کر ہمارے سامنے ہماری بھاشا سنا رہے ہو۔“

اس نے فائر کا حکم دیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے تڑاتڑ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی اس کی بہن اور بہنوئی کی چیخیں سنائی دیں۔ وہ دوسرے کمرے میں چھپی ہوئی تھی۔ ان کی موت کا تماشا نہ دیکھ سکی۔ پھر دوسرے جوان اسے پکڑ کر آنگن میں لے آئے۔ مکتی باہنی کے کمانڈر نے اسے دیکھا تو چند لمحوں تک دیکھتا ہی

رہ گیا۔ پھر اس نے سخت اور کھردرے لہجے میں کہا: "آمی منعم باللہ۔ تومی کے؟ (میں منعم باللہ ہوں۔ تم کون ہو؟)"

عظمیٰ کے سامنے بہن اور بہنوئی کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے بولی: "عظمیٰ!"

اس نے پوچھا: "تمھار بھاشا؟ (تمھاری زبان کیا ہے؟)"

عظمیٰ نے ڈرتے ڈرتے بنگالی زبان میں کہا: "مجھ سے پہلے میری بہن اور بہنوئی نے بنگلہ زبان میں باتیں کیں۔ انھیں مار ڈالا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، میں کون سی زبان بولوں۔"

"دنیا کی کوئی سی زبان بولو گی تو زندہ رہو گی۔ بنگلہ بھاشا بولو گی تو پیار سے اٹھا کر لے جاؤں گا لیکن بہاریوں کی زبان بولو گی تو تمھارے حسن سے آنکھیں چرا کر تمھاری موت کا حکم دے دوں گا۔"

عظمیٰ بنگالی زبان میں اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔

منعم باللہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا اس کے سامنے پہنچا۔ پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ عظمیٰ نے ڈرتے ڈرتے اپنا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسے اپنی طرف کھینچا۔ پھر اپنے کاندھے پر لاد لیا۔ اس کے رشتے دار کبھی اسے کوستے رہتے تھے۔ طنزیہ پوچھتے رہتے تھے، تم اتنی حسین ہو۔ کوئی تمھیں اٹھا کر کیوں نہیں لے جاتا؟ آج اسے اٹھا کر لے جانے والا آ گیا تھا۔

وہ عظمیٰ کو دیناج پور کے ریلوے کوارٹر میں لے آیا۔

عظمیٰ کو اپنے رشتے داروں کی موت کا صدمہ تھا لیکن کچھ زیادہ نہیں تھا۔ کسی نے اس کے ساتھ کبھی ایک رشتے دار جیسا سلوک نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ ایک نوکرانی سمجھا تھا۔ اپنا جھوٹا کھانے کے لیے دیتے تھے۔ کسی نے اسے ایک لفظ پڑھانے اور اس کے لیے کبھی پیسے خرچ کرنے کے متعلق سوچا تک نہیں تھا۔ اس لیے وہ ان کے متعلق نہیں سوچتی تھی۔ اسے منعم باللہ کی محبت مل گئی تھی اور وہ اس سے متاثر ہوتی جا رہی تھی۔

دوسری طرف منعم باللہ بھی اس سے متاثر تھا۔ وہ کہتا تھا: "میں جو کچھ لوٹ کر لاؤں گا، تمھارے قدموں میں رکھ دوں گا۔ تم جو کھاؤ گی، کھلاؤں گا۔ جو پہنو گی، پہناؤں گا لیکن یاد رکھنا، اپنی زبان سے اردو کا ایک لفظ بھی ادا نہ کرنا۔ میرے کان گالی سن سکتے ہیں مگر یہ زبان نہیں سن سکتے۔"

وہ بھول کر بھی اس کے سامنے اردو نہیں بولتی تھی۔ عورت اپنے مرد کے لیے دنیا چھوڑ دیتی ہے۔ ایک زبان چھوڑنے میں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ اردو نہیں بولتی تھی مگر کب تک نہ بولتی۔ یہ زبان اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس نے دن رات، سوتے جاگتے، اس زبان کے آہنگ کو اپنے دل و دماغ میں اور روح کی گہرائیوں میں جذب کیا تھا —— وہ شعوری طور پر نہ بولے۔ غیر شعوری طور پر ایک بے چینی سی رہتی تھی۔ پہلے پہل اس نے اس بے چینی کو محسوس نہیں کیا۔ منعم باللہ نے اسے جیسے ڈھالا، وہ ڈھل گئی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ گھٹن سی ہوتی ہے جب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ریوالور اور اسٹین گن لے کر چلا جاتا تھا اور وہ کوارٹر میں تنہا رہ جاتی تھی تو آہستگی سے اردو کا کوئی فقرہ ادا کرتی تھی۔ پھر گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھتی تھی۔ دروازہ اندر سے بند ہوتا تھا۔ وہ کھڑکیوں کو بھی بند کر دیتی تھی۔ پھر منعم باللہ کی تصویر کے پاس جاتی تھی۔ اسے سینے سے لگاتی تھی۔ پھر تصویر کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر سرگوشی میں کہتی تھی: "دیکھو، میں اپنی مادری زبان بول رہی ہوں۔ بڑے آئے اپنی بات منوانے والے۔ دیکھ لو میں تمھارے کان میں اپنی زبان کا رس گھول رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگتی تھی۔ ایک رات اس نے بڑی محبت سے پوچھا: "تم اس زبان سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہو؟"

وہ بنگالی زبان میں گفتگو کر رہی تھی۔ اردو زبان میں اس سے باتیں کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عظمیٰ اس کے اس اضطراب کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے کہا: "جب یہ فیصلہ کیا گیا کہ صرف اردو زبان قومی زبان ہو گی، ان دنوں میں چار برس کا تھا۔ میری ماں ڈھاکہ یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ میری نانی میری پرورش کرتی تھی اور میری ماں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کرتی تھی۔ وہ بہت ذہین طالبہ تھی —— بنگلا بھاشا کو قومی زبان بنانے کی تحریک میں پیش پیش رہی تھی —— جب یہ تحریک زور پکڑنے

عذاب

ایک روز شیطان سے کسی نے پوچھا۔ "تم انسانوں پر طرح طرح کی مصیبتیں ڈالتے رہتے ہو۔ اب تک تم نے سب سے بڑی بلا کس پر ڈالی ہے؟"

جواب ملا۔

"ایک عورت پر۔ میں نے اسے سو جوڑے لباس، سو جوڑے جوتے اور میک اپ کی بے شمار اشیا دے کر ایسے گھر میں بھیج دیا جہاں آئینہ نہیں تھا۔ یہ بڑی اس کے لیے عذاب دوزخ سے زیادہ دہشت ناک تھی۔"

لگی تو بنگلہ زبان کا حق مانگنے والوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ میری ماں نے بھی اپنے سینے پر گولی کھائی۔ ڈھاکہ کے شہید مینار پر آج بھی میری ماں کا نام لکھا ہوا ہے۔ جب بھی میں اس کا تصور کرتا ہوں تو میری رگوں میں خون کے بجائے آگ سی پگھلنے لگتی ہے۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگتی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے، جو سامنے آئے اسے کچا چبا جاؤں۔ جب میں پانچ برس کا تھا تو میری ماں شہید ہوئی تھی۔ آج میں اٹھائیس برس کا ہوں۔ میری ماں کا عزم تھا کہ پاکستان میں بنگالیوں کی اکثریت ہے۔ لہٰذا قومی زبان بنگلہ بھاشا ہوگی آج ہم نے بنگلہ دیش بنا لیا لیکن میری ماں کی قاتل زبان ابھی اس دھرتی پر موجود ہے۔ میں اپنے دیش کی اس دھرتی سے اس زبان کو مٹا کر ہی دم لوں گا۔ جب تک زندہ رہوں گا، اردو بولنے والے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ کان لگا کر کچھ سننے لگا۔ عظمیٰ نے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

اس نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا — "کوئی اردو بول رہا ہے۔"

وہ حیرانی سے بولی: "کون بول رہا ہے۔ مجھے تو کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ رات کے دو بجے ہیں۔ بھلا یہاں کون اردو بولنے اور تمھارے ہاتھوں مرنے کے لیے آئے گا۔"

وہ غصے سے چیخ کر بولا: "بول رہا ہے، وہ کمینہ بول رہا ہے۔"

ایسا کہتے ہوئے وہ بستر سے اچھل کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے چلتا ہوا الماری کے پاس پہنچا۔ پھر الماری سے ایک ریوالور نکال کر اس کے چیمبر کو چیک کرنے لگا۔ عظمیٰ ڈرتے ہوئے اس کے پاس آئی۔ پھر بولی: "تمھیں کیا ہو گیا۔ باہر کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں بول رہا ہے۔"

اس نے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی کو تھام لیا۔ پھر اسے کھینچتا ہوا کوارٹر سے باہر لے جاتے ہوئے کہنے لگا: "تم بہری ہو گئی ہو آؤ میں تمھیں اس کی آواز سناتا ہوں کہ وہ کیسے بول رہا ہے اور میں تمھیں دکھاتا ہوں کہ کس طرح میں بولنے والوں کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیتا ہوں۔"

باہر دور تک ویرانی تھی۔ بھلا اتنی رات کو لوگ اپنے گھر سے نکلتے جبکہ حالات سازگار نہیں تھے۔ کوارٹر کے سامنے ہی اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں ایک کتا بھونکتا ہوا نظر آیا۔ عظمیٰ اور منعم باللہ کی آہٹ سنتے ہی وہ ان کی طرف پلٹ کر بھونکنے لگا۔ منعم باللہ نے کہا: "دیکھا، میں نہ کہتا تھا کہ بول رہا ہے کوئی اپنی خبیث زبان بول رہا ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے ٹھائیں سے گولی مار دی۔ عظمیٰ نے اپنے ہاتھ دونوں کانوں پر رکھ لیے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ جب اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ کتا تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس نے عظمیٰ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "طوطا پالنے والے اپنی اپنی زبان اسے سکھاتے ہیں۔ تم میری مینا ہو، میں تمھیں اپنی زبان سکھا رہا ہوں۔ جس دن تم کتوں کی زبان میں بولوگی، وہ تمھاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

وہ اس کی گرفت میں سہمی رہی۔ اگرچہ اس نے محبت سے گرفت میں لیا تھا۔ اس رات وہ سو نہ سکی۔ اس کی اور اپنی محبت کا تجزیہ کرتی رہی۔ پتا چلا کہ اس نے منعم باللہ کو قبول کیا تھا۔ لیکن یہ قبولیت ایسی ہی تھی، جیسے حالات نے اسے قتل کرنے سے پہلے اس کی آخری خواہش پوچھی ہو۔ بتاؤ، تم تلوار سے مرنا چاہتی ہو یا نفرت سے؟ اس نے سوچا "تلوار کے ایک وار سے زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی، نفرت سے کبھی کبھی مرے گی مگر طبعی عمر تک زندہ تو رہے گی۔

اور وہ زندہ تھی۔ اکثر مشرقی عورتیں اپنے نفرت کرنے والے شوہروں کے ساتھ زندگی گزارتی ہی ہیں۔ ان کی گالیاں سنتی ہیں۔ ان کی لاتیں جوتے کھاتی ہیں لیکن ان کے سائے میں زندہ تو رہتی ہیں۔ منعم باللہ کبھی اسے گالی نہیں دیتا تھا کبھی اسے مارتا نہیں تھا۔ وہ اس کا دیوانہ تھا۔ بس ایک زبان کی نفرت تھی جسے وہ برداشت کر لیتی تھی لیکن کبھی کبھی یہ نفرت کانٹے کی طرح چبھتی تھی۔ وہ کبھی کبھی اس کی محبتوں سے سرشار ہو کر سوچتی تھی کہ اپنے جذبوں کا کھل کر اظہار کرے۔ بنگلہ زبان میں اظہار کرتی تھی مگر پھر بھی تشنگی محسوس ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے لفظوں کو بنا بنا کر سنبھل سنبھل کر بول رہی ہے۔ محبت بناوٹ نہیں چاہتی۔ محبت کا اظہار تو خود بخود بڑی روانی اور بڑی بے ساختگی سے ہوتا ہے۔ اس کے لیے لفظ تلاش کرنے نہیں پڑتے۔ مادری زبان خود ہی منہ سے نکلتی چلی جاتی ہے۔ لیکن وہ اس روانی اور بے ساختگی کو روکتی تھی۔ اپنی مادری زبان کے آگے بنگلہ بھاشا کا بند باندھتی رہتی تھی۔

لیکن کوئی کب تک بند سے کسی سیلاب کا راستہ روک سکتا ہے۔ راستہ روک بھی لے تو پانی اپنے گزرنے کے لیے دوسرا راستہ بنا لیتا ہے۔ کوئی بات ہو تو بچہ بے اختیار اپنی مادری

زبان میں اپنی ماں کو پکارتا ہے۔ آدمی خواب کی حالت میں یا نیم بے ہوشی کی حالت میں اپنی ہی زبان میں بڑبڑاتا ہے۔ یہ بنگالیوں اور بہاریوں کی دو مختلف نفسیاتی اور لسانی حقیقتیں ہیں۔ بنگالی کسی حیرت کے مقام پر یا کسی دہشت کے زیرِ اثر ماں کو پکارتے ہیں "او ماگو" اور بہاری باپ کو آواز دیتے ہیں۔ ایسے کسی موقع پر بے اختیار ان کی زبان سے نکلتا ہے: "باپ رے!"

یہ اپنی اپنی مادری زبان کی ایسی اٹل سچائیاں ہیں جنھیں بے اختیار زبان پر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ایک رات منعم باللہ کوارٹر میں نہیں آیا۔ دوسرے دن دوپہر کے قریب آیا۔ کہنے لگا: "اپنی اٹیچی اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ ہم رنگ پور جا رہے ہیں۔"

عظمیٰ نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے ساتھ جانے سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بھلا انکار کب سننے والا تھا اگر اسے چھوڑ بھی دیتا تو وہ کس کے رحم و کرم پر رہتی۔ اس نے اٹیچی میں زیورات، نقد روپے اور اپنے کپڑے رکھ لیے۔ وہ لوٹ کا مال اس کے ہاتھوں میں لا کر یوں رکھتا تھا جیسے شوہر اپنی بیوی کے ہاتھوں میں اپنی کمائی لا کر دیتا ہے۔

وہ شام کو پاربتی پور پہنچ گئے۔ ادھر مکتی باہنی کے جوانوں نے بتایا کہ ایک ریلوے ٹرالی کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس ٹرالی میں وہ رنگ پور جائیں گے۔ اس سے پہلے وہ پاربتی پور کی ایک مالدار آسامی کو لوٹنے کے لیے گئے۔ اس نے عظمیٰ کو ریلوے کے ایک خالی بنگلے میں چھوڑ دیا۔ اسے تاکید کی 'دروازے اور کھڑکیاں باہر سے بند رکھے جب تک وہ آواز نہ دے دروازہ نہ کھولے۔

ایک گھنٹے بعد ہی وہ واپس آ گیا۔ اس کے ساتھی لوٹ کا بہت سا مال اٹھا کر لائے تھے۔ اس نے کہا: "میرا حصہ دروازے پر رکھ دو اور تم لوگ چلے جاؤ۔"

ایک نے کہا: "منعم دادا! جب تک ٹرالی نہیں آئے گی ہم سب اسی بنگلے میں جشن منائیں گے۔"

اس نے سختی سے کہا: "نہیں، میں اپنی گھر والی کے ساتھ ہوں۔ یہاں کوئی شراب نہیں پیے گا۔ کوئی شور نہیں مچائے گا۔ تم لوگ دوسرے بنگلے میں چلے جاؤ۔"

وہ بند دروازے کے پیچھے سے اس کی باتیں سن رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی کہ اس نے اپنے ساتھیوں کے سامنے اسے اپنی گھر والی کہا ہے۔ ان کے جانے کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چرمی بیگ تھا دوسرے میں بھری ہوئی بوتل تھی۔ اس نے بیگ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "اسے کھول کر دیکھو۔ کچھ زیورات اور نقد روپے ہیں۔"

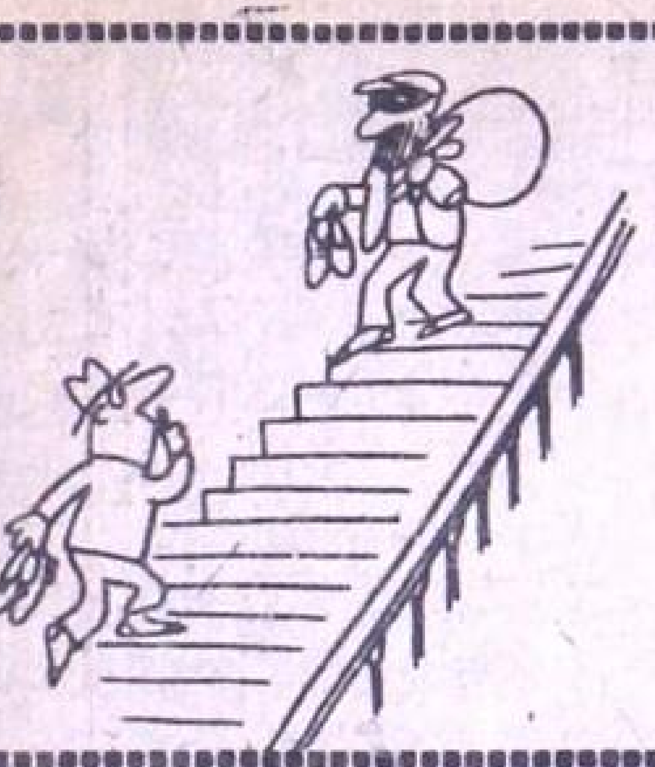

اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پہلے اس کے لیے ایک جگ پانی اور گلاس لے آئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ بیٹھ کر شراب پیے گا اور خوب ہنستا بولتا رہے گا۔ جب نشہ بڑھے گا تو اس کی محبت کی قسمیں کھاتا رہے گا جب اور زیادہ مدہوش ہو جائے گا تو اس کے قدموں میں سر رکھ کر اسے اپنی جان اور ایمان کہتا رہے گا۔

وہ پینے کے لیے بیٹھ گیا۔ عظمیٰ نے چرمی بیگ کو کھول کر دیکھا پھر بے دلی سے زیورات اٹھا کر اٹیچی میں رکھ دیے۔ اب اسے اتنے زیورات پہننے کو ملتے تھے کہ پہننے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ منعم باللہ نے اسے اپنے پاس بلا لیا پھر پاس بٹھا کر پینے لگا۔ خوب ہنسنے بولنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب نشہ ہونے لگا تو اس نے کہا: "چلو اٹھو جو بہترین ساڑی اور زیورات ہیں انھیں پہن کر میرے سامنے آؤ۔ میں تمھیں سندر انیک سندر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ اس کے پاس سے اٹھ کر اٹیچی کے پاس گئی پھر لباس بدلنے لگی۔ اس نے زیورات پہنے، کنگھی چوٹی کی۔ آنکھوں میں کاجل لگایا۔ خوب بن سنور کر جب اس کے سامنے آئی تو وہ نشے میں جھوم رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہونے لگا۔ مگر ڈگمگا گیا۔ میز اور کرسی کو تھام کر سنبھل گیا۔ پھر وہ آگے بڑھا تو عظمیٰ نے اسے سہارا دیا۔ وہ اسے تھام کر رقص کرنے لگا اپنی بے سُری آواز میں گنگنانے لگا۔ عظمیٰ ہنس رہی تھی۔ اتنے دنوں میں اس کے مزاج کو خوب سمجھ لیا تھا۔ ایسے وقت وہ اس کی مرضی کے مطابق اسے خوش کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

رقص ہو، نغمہ ہو، مترنم ہنسی کانوں میں چاندی کی گھنٹیوں کی طرح بجتی ہو تو نشہ تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ وہ پیتا

جا رہا تھا اور اس کے ساتھ مستی میں جھومتا جا رہا تھا جبھی وہ مدہوش ہو کر بستر پر گر پڑا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مسرتوں کے یا جذبوں کے ہجوم میں عظمیٰ کی زبان سے اپنی مادری زبان کے الفاظ ادا ہونا چاہتے تھے۔ لیکن وہ ضبط کر لیتی تھی۔ اپنے اندر سے اٹھنے والے طوفان کو روکنے کی مشق ہوتی جا رہی تھی۔

جب وہ مدہوش ہو کر گر پڑا تو اس نے آواز دی "منعم! کیا باہر نہیں جاؤ گے؟ کچھ کھانے کے لیے نہیں لاؤ گے؟"

وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ چپ چاپ پڑا رہا۔ عظمیٰ نے اسے جھنجوڑا تو اس کے حلق سے آواز نکلی۔ وہ نشے کی حالت میں ذرا سا غرّایا۔ پھر چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کی باچھوں سے ملی جلی سی رال اور شراب بہہ رہی تھی۔ عظمیٰ نے اطمینان کی سانس لی —— اور اپنے زیورات ایک ایک کر کے اتار کر انھیں بستر پر پھینکتی گئی۔ جب زیورات کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

سویا ہوا آدمی نصف مُردہ ہوتا ہے۔ اگر وہ مدہوش ہو تو نصف سے زیادہ مُردہ ہوتا ہے۔ اس کا وجود ہونے کے باوجود نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ جب وہ موجود نہیں رہتا تھا تو وہ اس کی تصویر کے پاس جاتی تھی —— کانوں میں آہستہ سے اردو میں کہتی تھی "مجھے تم سے محبت ہے"

اس وقت وہ اس کے سرہانے بیٹھی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی "بنگلہ بھاشا میں بڑی وسعت ہے۔ ہر جذبے کے اظہار کے لیے موزوں الفاظ موجود ہیں لیکن مجھے بنگلہ زبان پر عبور حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کبھی کبھی بے چین ہو جاتی ہوں۔ جو کہنا چاہتی ہوں۔ وہ کہہ نہیں پاتی۔ خدا کا شکر ہے، اس وقت تم مدہوش ہو۔ تم سن نہیں سکتے لیکن میں بول کر اپنے جذبوں کی تسکین تو کر سکتی ہوں اور میں بول رہی ہوں۔ تمہارے کانوں میں میری آواز اتر رہی ہے تم سمجھو یا نہ سمجھو۔ میرے محبوب!"

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ سکی۔ اسی وقت منعم باللہ کی غراہٹ سنائی دی۔ غرر۔ غرر کی آواز کے ساتھ وہ ذرا سا کسمسایا پھر اس نے آہستگی سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ عظمیٰ نے سر اٹھایا تو وہ اسے گھورنے لگا۔

تصویر کے سامنے کچھ کہہ کر گزر جانا اور بات ہے مگر وہ تصویر نہیں تھا، موجود تھا۔ مدہوش تھا مگر اس کے دماغ میں اٹھائیس برس سے جو انگارے سُلگ رہے تھے۔ وہ اس کا نشہ اتار سکتے تھے۔ اس نے ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے عظمیٰ کو ایک طرف پھینک دیا۔ وہ بستر پر چاروں شانے چت ہو گئی۔ اس کے تیور دیکھ کر پہلے تو سہم گئی۔ پھر وہ ہنسنے لگا۔ اس کے ساتھ وہ بھی جبراً ہنسنے لگی۔ اس نے کہا "تم نے کتنی میٹھی زبان میں کچھ کہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ بھلا کبھی بھونکنے والوں کی بات سمجھ میں آتی ہے؟"

وہ دہشت زدہ ہو کر اسے دیکھتی رہی۔ منعم باللہ نے محبت سے اس کے سر کو سہلا کر کہا "ڈرنے کی کوئی بات نہیں تمہاری زبان میں بڑی مٹھاس ہے۔ تو می روشو گلا موتن مشتی۔ تم رس گلے کی طرح میٹھی ہو —— ذرا اپنی زبان دکھاؤ" جیسے مریض ڈاکٹر کو اپنی زبان نکال کر دکھاتا ہے۔ اسی طرح اس نے دکھائی۔ وہ اس پر جھک گیا۔

دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ اس آسیب زدہ عمارت کی دیوار پر بڑے بڑے دانت نظر آئے۔ دانتوں کی ایک قطار اوپر تھی دوسری قطار نیچے۔ پھر ایک گاجر ان دانتوں کے درمیان آئی۔ ان دانتوں نے کچکچا کر اسے کاٹ لیا۔ کچ کی آواز کے ساتھ گاجر کے ٹکڑے ہو گئے۔ اس کا ایک ننھا سا ٹکڑا منہ میں رہا ہوگا۔ باقی گاجر باہر رہ گئی۔

عظمیٰ کے حلق سے پھر ایک چیخ نکلی۔ گڑبڑ، گڑبڑ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا "ہائے اڈا، میں مر گئی (ہائے اللہ میں مر گئی)"

انقلاب کے دنوں میں تہذیب ہر لمحہ مرتی ہے مگر بے شرم کی طرح زندہ رہتی ہے۔ گڑبڑ، گڑبڑ، انسانی زبان، انسانی ثقافت گڑبڑ، گڑبڑ۔

تہذیب کی کھولتی ہانڈی میں نفرت کے کنکر ڈال کر ابالا جائے تو ہانڈی سے ایسی ہی آواز نکلتی ہے۔ گڑبڑ، گڑبڑ، گڑبڑ، گڑبڑ۔

منعم باللہ نے نشے میں مدہوش ہونے کے باوجود محسوس کیا کہ اس کے منہ کے اندر کوئی ننھی سی چیز تڑپ رہی ہے۔ اس نے تھوک کے اسے تھوک دیا۔ ننھی سی کٹی ہوئی زبان فرش پر آ کر گری اور وہاں تڑپنے لگی، پھدکنے لگی۔ جیسے زندہ جسم کا کوئی حصہ کٹنے کے باوجود تھوڑی دیر کے لیے مردہ نہیں ہوتا، زندگی کی طرح تڑپتا رہتا ہے۔ اسی طرح وہ زبان تڑپ رہی تھی۔ اپنے باقی حصے کو تلاش کر رہی تھی۔ جیسے پوچھ رہی تھی۔ کہاں جائے؟

ہاں، کہاں جائے؟ کیا ہندوستان؟ گڑبڑ، گڑبڑ
کیا بنگلہ دیش میں رہے؟ گڑبڑ، گڑبڑ
کیا پاکستان میں جگہ ملے گی؟ گڑبڑ، گڑبڑ

اناج سے لدا ہوا ویگن پچھلی رات کو ہی سید پور پہنچنے والا تھا لیکن گاڑی لیٹ ہو گئی۔ ان دنوں گاڑیاں گھنٹوں کے حساب سے نہیں بلکہ دنوں کے حساب سے لیٹ ہو جایا کرتی تھیں۔ پچھلی رات آنے والی گاڑی کو صبح نو بجے لائن کلیئر دی گئی۔ سیٹھ دھرم چند بے چینی سے پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ اس کے زرخرید بدمعاش اسی پلیٹ فارم پر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ایک بدمعاش نے دوڑتے ہوئے آکر کہا: "سیٹھ جی! آپ کا وہ ہریا آگیا ہے۔ میں نے ابھی اسے سائیکل رکشا سے اترتے دیکھا ہے۔"

سیٹھ دھرم چند تیزی سے چلتا ہوا اسٹیشن کے پیچھے آیا۔ ہریا رکشا کا کرایہ ادا کرنے کے بعد اسی کی طرف آرہا تھا۔ سیٹھ نے پوچھا: "کیا ہوا؟ وہ اناج والا ویگن تمہارے ہی ہاتھوں میں رہے گا نا؟"

"ہاں۔ اب تو وہ اپنا ہی ہے لیکن وہ ششی ابھی تک بے ہوش ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے پلیٹ فارم کی طرف جانے لگے۔ دھرم چند نے آہستگی سے کہا: "گھبراتے کیوں ہو۔ ششی نے مائی پاڑہ میں تمہیں نہیں خسرو کو دیکھا ہے۔ اس کا بیان خسرو کے خلاف ہوگا۔"

وہ پلیٹ فارم پر آگئے۔ ہریا نے دیکھا دور سگنل ڈاؤن

ہوچکا تھا۔ ٹرین کسی وقت بھی پہنچنے والی تھی۔ اس نے پریشان ہوکر کہا: "پتا نہیں کیوں، ششی کے سامنے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ اگرچہ مجھے یقین ہے، اس نے مجھے نہیں دیکھا ہے۔ وہ مجھے پہچان نہیں سکتی تھی۔ مگر۔۔۔"

"مگر کیا؟" دھرم چند نے پوچھا۔

ہریا نے اپنے دونوں ہاتھوں کو سر کے بالوں پر پھیرا۔ پھر چہرے پر ان ہاتھوں کو پھیرتے ہوئے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا: "میں نے سنا ہے، عورتوں کی حس لامسہ بہت تیز ہوتی ہے۔"

دھرم چند نے اس کی پیٹھ پر ایک ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے کہا: "تم تو بہت ہی بزدل نکلے۔ بھئی، وہ عورت ہے الو تو نہیں ہے کہ اندھیرے میں دیکھ سکے، چھو کر پہچان سکے؟"

ہریا نے تھوک نگلتے ہوئے کہا: "اندھے بھی چھو کر پہچان لیتے ہیں۔"

"اندھے عادی ہوجاتے ہیں۔ وہ اندھیرے میں زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ ششی نے ساری زندگی اجالے میں گزاری ہے اگر اچانک تاریکی چھا جائے، گھبراہٹ کا ماحول ہو تو روشنی میں رہنے والے نہ تو چھو کر پہچان سکتے ہیں۔ نہ ہی آواز سے پہچان سکتے ہیں۔"

"میں بالکل گونگا بنا رہا تھا۔ میرے منہ سے ایک ذرا آواز نہیں نکلی تھی۔"

"شاباش، پھر گھبرانے کی کیا بات ہے یار۔ کام کی بات کرو۔ ابھی وہ مال ہمارے ہاتھ میں آئے گا اور ہماری چاندی ہی چاندی ہوگی۔"

"جب مال ہمارے ہاتھ میں آرہا ہے تو ضرور چاندی ہوگی مگر میں اپنے دماغ کو کیا کروں۔ کتنے ہی جتن سے بہلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ بہلا نہیں سکتا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ وہ آپ ہی آپ ہوش میں آجائے گی۔ میں نو بجے تک وہاں انتظار کرتا رہا لیکن وہ ہوش میں نہیں آئی۔ یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ بے ہوش ہے یا گہری نیند میں ہے۔"

اس کی باتوں کے دوران گاڑی آگئی۔ وہ لوگ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ گاڑی کے ایک ایک کمپارٹمنٹ کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھتے رہے پھر وہ گاڑی رک گئی۔ تب انھوں نے تلسی رام کو دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی ہریا کا چہرہ زرد پڑگیا۔ اس نے کہا: "یہ کیا، جیجا جی کیسے آگئے؟ ہم نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ پہنچ جائیں گے۔"

دھرم چند کا منہ لٹک گیا تھا۔ ہاتھ آنے والے اناج کا دھن دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس نے ہریا سے کہا: "ساری محنت اکارت گئی۔ تمھارے تو مزے ہی رہے۔ تمھارے جیجا جی تمھارے ہاتھوں سے اناج فروخت کرائیں گے۔ تم کچھ الٹ پھیر کرکے اپنی رقم بنالوگے۔ میں تو کہیں کا نہ رہا۔"

ہریا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ تم رہوگے تو مجھے سہارا رہے گا۔"

"فکر نہ کرو۔ میں آخری وقت تک اپنے لوگوں کا ساتھ دیتا ہوں۔ اب معاملہ ایسا ہوگیا ہے کہ مجھے تمھارے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔"

اس وقت تک تلسی رام اپنے آدمیوں کے ساتھ کمپارٹمنٹ سے اتر کر ان کے قریب چلا آیا۔ ہریا نے آگے بڑھ کر اس کے سامنے جھکتے ہوئے پرنام کیا۔ دھرم چند نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "آپ بڑے اچھے موقع پر آئے، اگر نہ آتے تو ہم آدمی بھیج کر آپ کو بلاتے۔"

تلسی رام انھیں نظر انداز کرکے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا: "خسرو کہاں ہے؟"

دھرم چند نے کہا: "آپ یہ پوچھیں کہ وہ چنڈال کہاں ہے؟ اس کی تو قسمت کچھ اچھی ہے کہ اب تک زندہ ہے۔ نہیں تو سید پور کے لوگ اس کے ساتھ والیوں کی بھی بوٹی بوٹی کرکے چیل کوؤں کو کھلا دیتے۔"

تلسی رام نے حیرانی سے پوچھا: "کیا کہہ رہے ہو؟ خسرو کہاں ہے؟"

"وہ جہاں بھی ہے۔ پہلے آپ ویٹنگ روم میں چل کر اطمینان سے سارا قصہ سن لیں۔"

"میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں۔ مجھے زیادہ نہ الجھاؤ۔ یہیں کھڑے کھڑے بتاؤ۔"

"بات ایسی ہے کہ سنتے ہی شرم سے گردن جھک جائے گی۔"

تلسی رام نے گھور کر ہریا کو دیکھتے ہوئے پوچھا: "تم چپ کیوں کھڑے ہو۔ تمھاری دیدی اور ششی خیریت سے تو ہیں؟"

"دیدی تو خیریت سے ہیں مگر ششی۔۔۔ رام رام۔ اس بدمعاش نے ہمیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

تلسی رام اگروال کبھی دھرم چند کی طرف اور کبھی ہریا کی طرف گھوم گھوم کر دیکھنے لگا پھر جلدی سے ویٹنگ روم کی طرف چلتے ہوئے بولا: "آؤ مجھے بتاؤ۔ کیا بات ہے؟"

وہ سب ویٹنگ روم میں آگئے۔ ایک جگہ بیٹھ گئے۔ دھرم چند آہستہ آہستہ اسے بتانے لگا۔ تلسی رام سن رہا تھا اور بے یقینی سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کبھی خسرو کا چہرہ آتا تھا کبھی مینا تارا کا حسن چاندنی کی طرح بکھر جاتا تھا پھر اس کے آدمیوں نے بتایا تھا کہ سید پور آتے وقت ایک گونگی بھی اس

کے ساتھ ہوگئی تھی یعنی خسرو کے ساتھ دو عورتیں تھیں۔ وہ اپنے محسن کے گھر میں ڈاکہ کیسے ڈال سکتا تھا۔ اسے سب کچھ سن کر بھی یقین نہیں آرہا تھا۔

تمام باتیں سن لینے کے بعد اس نے پوچھا: ”کیا ششی اب تک ہوش میں نہیں آئی ہے؟“

”نہیں، داروغہ اسی کا بیان لینے کے انتظار میں ہے۔ وہ بیان دے گی تو دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

دھرم چند نے کہا: ”ارے کیا دودھ اور کیا پانی۔ کیا اتنے سارے ثبوت کافی نہیں ہیں۔ خسرو نے جس ماگی کے مکان پر اپنے غنڈوں کے ساتھ قبضہ کیا تھا۔ وہ ماگی اس بات کی گواہ ہے کہ وہاں کیا ہوتا رہا۔ اس نے ششی کو وہاں باندھ کر رکھا تھا۔ اس کے غنڈے پہرہ دے رہے تھے۔“

”یہ کیسے پتا چلا کہ خسرو ششی کو ماگی پاڑہ لے گیا ہے؟“

”جس کے مکان میں لے گیا تھا۔ وہی ماگی میرے نوکر کی جاننے والی ہے۔ اس نے میرے نوکر کو بتایا اور اس نوکر نے مجھے بتایا۔ پھر میں نے اور ہریا نے اپنے غنڈوں کو جمع کیا تاکہ کوئی لڑائی جھگڑے والی بات ہو تو ہمارے علاوہ کچھ معزز لوگ گواہی دے سکیں۔ ہمارے علاقے کے بہت سے ہندو مسلمان اس بات کے گواہ ہیں۔ سب نے اپنی آنکھوں سے ان دونوں کو ماگی پاڑہ کے اس مکان میں دیکھا ہے۔ وہیں سے ہم انہیں پکڑ کر تمہارے گھر پہنچے تھے۔ ششی تو تمہارے گھر میں ہے خسرو اور اس کی سا، والیوں کو شیر بلڈنگ میں رکھا گیا ہے۔ جب تک ششی بیان نہیں دے گی۔ پولیس ان کی نگرانی کرتی رہے گی۔“

تلسی رام وہاں سے اٹھ کر باہر آیا۔ پھر اس نے اپنے ایک ماتحت سے کہا: ”تم ویگن کا خیال رکھو۔ آج شام تک اس کا سارا مال گودام میں پہنچا دو۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔“

وہ تیز تیز چلتا ہوا اسٹیشن کے باہر آیا۔ ہریا اس کے پیچھے پیچھے کبھی چل رہا تھا کبھی دوڑ رہا تھا۔ دھرم چند کب پیچھے رہنے والا تھا۔ وہ تو خسرو کو مار ڈالنا چاہتا تھا۔ یا پھر ذلیل کر کے سید پور سے نکال دینا چاہتا تھا۔ وہ سب مختلف سائیکل رکشا میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔

تلسی رام کی عجیب حالت تھی۔ وہ کبھی رکشا کی سیٹ پر پہلو بدلتا تھا کبھی رکشا والے کو ڈانٹ کر کہتا تھا: ”تیز چلاؤ اور تیز چلاؤ۔“ وہ جلد سے جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ ششی کی زبان سے سچی باتیں سننا چاہتا تھا۔ ویسے دھرم چند اور ہریا نے جو کچھ بتایا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ خسرو نے غداری کی ہے۔ اپنے لوگ (ہندو) ٹھیک کہتے ہیں کہ مسلمان پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ ویسے ہر مذہب کے اپنے لوگ یہی کہتے ہیں، پرائے مذہب والوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے اور جب کسی کا داؤ چل جاتا ہے تو سبھی غداری کرتے ہیں یعنی اعتماد کو دھوکا دیتے ہیں۔

اس لمحہ غصہ کی آگ میں جلنے والا تلسی رام اگر والا بھول گیا کہ کھلنا سے آتے وقت ایک مسلمان نے اس پر اعتماد کیا تھا۔ لیکن اس نے نین تارا کو جن نظروں سے دیکھا تھا۔ اسے بھی غداری ہی کہا جائے گا۔ اس نے بھی خسرو کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس وقت تلسی رام یہ سب کچھ بھول رہا تھا۔ اپنی آگ میں جلتے وقت سبھی بھول جاتے ہیں کہ چور ڈاکو اور لٹیرے ہم مذہب بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مذہب کے لوگ بھی ہوتے ہیں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ششی کا مجرم ہریا تھا تو اس سے صرف تلسی رام کے گھر والوں کی ناک کٹے گی اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ گناہ خسرو نے کیا ہے تو محض ایک گھرانے کی نہیں بلکہ پورے دھرم کی ناک کٹ جائے گی۔ پتا نہیں، اپنے گناہ کے وقت دھرم اور ایمان کی ناک کیسے سلامت رہ جاتی ہے؟

جب اس کا رکشا مارواڑی پٹی سے گزر رہا تھا تو دونوں طرف کے مکانوں اور دکانوں سے تلسی رام کی ذات برادری والے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے لیکن ان کی نگاہیں کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں کہ مسلمان کو اور اپنے ہاں پناہ دو۔ اب تم کسی سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں رہے۔

وہ سچ مچ سر جھکائے ہوئے تھا کسی سے نظریں ملانے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ رکشے پر بیٹھا ہوا گھر پہنچا تو گھر کے سامنے بھی رکشے پر ہی بیٹھا رہ گیا۔ اتر کر اندر جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا سوچ رہا تھا: اپنی بیوہ بہن سے کیسے نظریں ملائے گا یا وہ بیچاری نظریں نہیں ملا سکے گی۔

شانتا نے سر پر آنچل رکھتے ہوئے برآمدے میں آکر دونوں ہاتھ جوڑ دیے پھر سر جھکاتے ہوئے کہا: ”اندر آجائیے نا۔“

وہ رکشا میں بیٹھا گھور کر اپنی دھرم پتنی کو دیکھتا رہا۔ شانتا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا پھر کہا: ”یہ گھر پہلے ہی تماشا بن گیا ہے۔ آپ وہاں بیٹھ کر غصہ دکھائیں گے تو ہم اور زیادہ تماشا بن جائیں گے۔“

تلسی رام نے سخت لہجے میں پوچھا: ”ششی کیسی ہے؟“

”ابھی ابھی اس نے آنکھ کھولی ہے۔ مگر کچھ بولتی نہیں ہے۔“

”اسے بولنے کے لیے کہو۔ کمزور ہوگی اسے کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ ہریا تم ڈاکٹر کو بلا کر لے آؤ۔ داروغہ کو خبر دو۔ وہ ابھی آکر اس کا بیان لے گا۔“

ششی کے ہوش میں آنے کی خبر ذرا سی دیر میں دور

تک پھیل گئی۔ تلسی رام کے مکان کے سامنے لوگوں کی بھیڑ لگ گئی تھی لیکن کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بیٹھک میں داروغہ کے ساتھ چار سپاہی تھے۔ ان کے علاوہ دھرم چند اور مارواڑی پٹی کے چند عمر رسیدہ معتبر لوگ بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر ششی کی نبض دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے بیٹھک میں آکر کہا: "انسپکٹر صاحب! آپ ششی کا بیان لے سکتے ہیں۔"

ایک بزرگ نے کہا: "بیان اس طرح لیا جائے کہ ہم سب سن سکیں۔"

اس بزرگ کی تائید سب نے کی۔ ڈاکٹر نے کہا: "وہ ابھی کمزور ہے۔ اس کا بستر سے اٹھنا مناسب نہیں ہے۔ یوں بھی وہ اندر سے دل شکستہ ہے۔ اسے کسی بات کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا آپ یوں کریں کہ جہاں اس کا بستر ہے وہاں ایک کھڑکی ہے۔ آپ لوگ کھڑکی کے باہر چپ چاپ جاکر کھڑے ہو جائیں تاکہ اسے کسی کی موجودگی کا علم نہ ہو ورنہ وہ شرم کے مارے کچھ بول نہیں سکے گی۔"

سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور دبے قدموں جاکر اس کھڑکی کے پاس کھڑے ہو گئے۔ داروغہ اجازت لے کر ششی کے کمرے میں آیا۔ شانتا اس کے سرہانے بیٹھی اس کے سر کو سہلا رہی تھی۔ داروغہ نے ایک کرسی پر بیٹھ کر کہا: "بہن! ہم جانتے ہیں آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ اپنا بیان لکھوائیں۔ ہم اس بدمعاش کو ایسی سزا دیں گے کہ دوسروں کو عبرت حاصل ہوگی۔"

ششی نے لیٹے ہی لیٹے کروٹ بدلی۔ پھر شانتا بھابی کی گود میں منہ چھپا کر انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگی: "نہیں نہیں میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے مر جانے دو۔ مجھے مر جانے دو۔"

شانتا نے اسے پیار سے تھپکتے ہوئے کہا: "اگر تم بدمعاش کا نام نہیں بتاؤ گی تو اسے سزا کیسے ملے گی؟"

وہ روتے ہوئے بولی: "کیا اسے سزا دینے سے میں پہلے کی طرح باعزت ہو جاؤں گی۔"

شانتا نے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے بڑے کرب سے کہا: "زبان سے نکلی ہوئی بات اور گھر سے نکلی ہوئی عزت کبھی واپس نہیں آتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا نہ دی جائے۔ سزا ظالموں کو ختم تو نہیں کر سکتی مگر ظلم کو کم ضرور کر سکتی ہے۔"

وہ چپ رہی اور انکار میں سر ہلانے لگی۔ شانتا نے داروغہ کو دیکھا پھر کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "داروغہ صاحب! آپ باہر چلے جائیں۔ ہماری ششی کسی کے سامنے کچھ نہیں بولے گی۔ یہ صرف اپنی بھابی کو بتائے گی۔"

داروغہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا پھر کھڑکی کے باہر آکر دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ شانتا بڑے پیار سے ششی کو بہلانے لگی۔ اسے بیان دینے پر مجبور کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ششی نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا: "بھابی! میں مندر گئی تھی پوجا کر رہی تھی کہ کسی نے اچانک پیچھے سے آکر میرے منہ اور ناک پر کپڑا رکھا۔ میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر چھڑا نہ سکی پتا نہیں اس میں سے کیسی بو آرہی تھی۔ میں دیکھتے ہی دیکھتے بے ہوش ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک خالی کمرے میں بندھی پڑی تھی۔"

شانتا نے پوچھا: "وہاں تم نے کس کو دیکھا؟"

"پہلے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ دوسرے کمرے سے لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک کہہ رہا تھا: جب تک خسرو یہاں نہیں آئے گا۔ ہم پہرہ دیتے رہیں گے۔"

دوسرے نے کہا: "پہرہ دینا ہی ہوگا۔ وہ ہمیں منہ مانگی رقم دے رہا ہے۔"

تیسرے نے کہا: "رقم تو آج دے گا لیکن ششی کو اغوا کرانے سے پہلے اس نے ہم سب کو چاول کی دو بوریاں دی ہیں یہاں پیسے سے زیادہ چاول مہنگا ہے۔"

ایک اور نے ہنستے ہوئے کہا: "یہ خسرو بھی کمال کا آدمی ہے تلسی رام کا چاول لاکر بیچ رہا ہے اور اسی کے عوض اس کی عزت کو پامال کر رہا ہے۔"

ایسا کہتے ہوئے ششی رونے لگی۔ شانتا نے اسے تھپکتے ہوئے کہا: "صبر کرو ششی! مجھے بتاؤ پھر کیا ہوا۔ کیا تم نے خسرو کو وہاں دیکھا؟"

"ہاں، دیکھا۔ جانے کتنی رات ہو گئی تھی۔ اتنا اندھیرا تھا کہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بہت رات کو خسرو کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ وہ نشے میں تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ میرے کمرے کا دروازہ اندھیرے میں کھل گیا ہے۔ کسی نے ٹارچ روشن کی تھی۔ میں نے اس کی روشنی میں خسرو کو دیکھا۔ وہ نشے میں چور تھا دروازے کا سہارا لیے ہوئے تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی نفرت سے تھوک دیا۔ اسے باتیں سنائیں لیکن زیادہ کچھ کہہ نہ سکی۔ ٹارچ کی روشنی بجھ گئی تھی۔"

وہ پھر رونے لگی۔ شانتا اسے ہولے ہولے تھپک رہی تھی تھوڑی دیر بعد وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی: "میں بندھی ہوئی تھی وہاں سے اٹھ نہیں سکتی تھی لیکن میرے پاؤں آزاد تھے۔ تب میں

نے محسوس کیا کہ وہ خسرو نہیں ہے۔"

شانتا اور دوسرے تمام سننے والے چونک گئے۔ شانتا نے پوچھا: "تم نے کیسے سمجھا کہ وہ خسرو نہیں ہے؟"

"بھابی! جب میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو وہ نشے میں مدہوش تھا۔ اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ کے سہارے کھڑا ہوا تھا لیکن وہ بدمعاش نشے میں نہیں تھا۔"

یہ ایسی بات تھی کہ سننے والوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر دو چار بزرگوں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انھیں خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔ ہریا گھبرا کر ان کی بھیڑ سے نکل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اندر شانتا نے کہا: "دیکھو ششی! خوب سوچ سمجھ کر بتاؤ، وہ کون ہو سکتا ہے؟"

وہ رو رہی تھی۔ شانتا نے کہا: "میں مانتی ہوں۔ وہاں بہت اندھیرا ہوگا۔ تمھیں کچھ نظر نہیں آ رہا ہوگا لیکن جہاں تم نے اپنی ذہانت سے اتنا سمجھ لیا کہ وہ خسرو نہیں، کوئی اور ظالم تھا تو اس ظالم کا کچھ سراغ ملنا چاہیے۔"

اچانک ہی ششی نے چیخ کر کہا: "ہاں، میں اس کا نام لے سکتی ہوں۔ میں اسے اچھی طرح پہچان گئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ پاپ اندھیرے میں چھپ جاتا ہے مگر کچھ پاپی ایسے ہوتے ہیں جو اندھیرے میں بھی چھپنے نہیں پاتے۔ میں نے گھور اندھیرے کے باوجود اس کے انگوٹھے سے لگی ہوئی ایک انگلی کو محسوس کیا اور سمجھ گئی کہ اس کے ہاتھ میں چھ انگلیاں ہیں۔"

یہ سنتے ہی کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے سب کے سب ہریا کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ نہیں، نہیں کہہ کر لڑکھڑاتے ہوئے ایک دیوار سے جا کر لگ گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ یوں اوپر اٹھ گئے تھے جیسے کوئی اس کے سامنے ریوالور تان کر ہینڈز اپ کرنے کے لیے کہہ رہا ہو۔ اس کے اٹھے ہوئے ایک ہاتھ میں چھ انگلیاں نظر آ رہی تھیں۔

بوڑھے آنکھیں بھینچ بھینچ کر دیکھ رہے تھے۔ چھ انگلیاں تھیں۔

جوان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ انگوٹھے کے ساتھ ایک چھوٹی سی انگلی جڑی ہوئی تھی جو پیدائش کے وقت سے اس انگوٹھے کے ساتھ تھی۔ وہ چھٹی انگلی بے جان تھی۔ کسی کام نہیں آتی تھی۔ ایسے کئی لوگ ہوتے ہیں جن کے زندہ جسموں پر کہیں نہ کہیں فاضل گوشت ہوتا ہے جو بے حس ہوتا ہے۔ بالکل مردہ ہوتا ہے۔ وہ مردہ گوشت زندہ جسم کے کسی کام نہیں آتا۔ اسی طرح وہ چھٹی انگلی ہریا کے کسی کام نہیں آئی لیکن یہ خدا کی قدرت ہے کہ وہ چھٹی انگلی خسرو کے کام آ گئی۔

ششی کا بیان سنتے ہی شانتا نفرت اور غصے کے مارے تھر تھر کانپنے لگی۔ اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا، ابھی اپنے بھائی کا گلا دبوچ لے۔ وہ ششی کے پاس سے اٹھ گئی۔ تیزی سے چلتے ہوئے، دوسرے کمرے سے گزرتے ہوئے تلسی رام کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کے پتی کے پاس ایک پستول اور ایک رائفل کا لائسنس تھا۔ وہ پستول کو اپنے لباس میں چھپا کر رکھتا تھا۔ رائفل بستر کے سرہانے والی دیوار سے لٹکی رہتی تھی۔ شانتا نے بستر پر چڑھ کر رائفل کو اتار لیا۔ پیٹی سے دو کارتوس نکال کر اس میں لوڈ کیے پھر اسے لے کر تیزی سے چلتے ہوئے کمرے کے باہر آ گئی۔

بیٹھک میں طرح طرح کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بہت سے لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا اور کوئی کچھ سمجھا رہا تھا۔ تلسی رام غصے کی حالت میں ہریا کی پٹائی کر رہا تھا کچھ لوگ اسے چھڑا رہے تھے اور کہہ رہے تھے: "اسے مارنے سے بات نہیں بنے گی پہلے معلوم تو ہو کہ یہ سب کیوں ہوا؟"

ایک نے کہا: "بات صاف ہے۔ یہ اپنے گھر میں خسرو کی برتری برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے جیجا جی نے سارا کاروبار خسرو کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ اس لیے یہ اس کا پتا کاٹنا چاہتا تھا۔"

ایک بوڑھے نے غصے سے کہا: "ایک مسلمان کا پتا کاٹنے کے لیے کیا اپنے ہی دھرم کو بے عزت کرنا ضروری تھا؟"

تلسی رام نے ہریا کو چھڑی سے مارتے ہوئے کہا: "میں اسے اور اس کی بہن کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ دونوں کو جان سے مار ڈالوں گا یا لات، جوتے مار کر گھر سے نکال دوں گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ٹھائیں سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ آواز ایسی تھی کہ سب کو اپنی موت نظر آئی۔ سب سہمے ہوئے گھبرائے ہوئے مختلف دیواروں کی طرف سمٹنے لگے۔ کوئی کرسی کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ کوئی لکڑی کے تخت کے نیچے چھپنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ آواز کی سمت دیکھ رہے تھے۔ شانتا بپھری ہوئی شیرنی کی طرح دروازے پر کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں رائفل تھی اور اس کا رُخ ہریا اور تلسی رام کی طرف تھا۔ وہ غصے اور جنون کی حالت میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی: "آپ نہ تو مجھے ذلیل کر کے گھر سے نکال سکیں گے اور نہ مار سکیں گے۔ میرا بھائی آپ کا مجرم ہے لیکن میرا بھی مجرم ہے۔ جہاں میرا سہاگ آخری سانس تک قائم رہنے والا تھا ایسے گھر میں دس منٹ [illegible] تک یہاں [illegible] نہیں

نہیں ملا سکوں گی۔ میں گھر سے نکل کر خسرو کا سامنا نہیں کر سکوں گی۔ بارہ برس سے وہ میرا منہ بولا بھائی ہے۔ وہ مجھے بڑی بہن کہتا رہا اور ماں سمجھ کر میرے سامنے جھکتا رہا۔ آج وہ زخموں سے چُور ہو کر دروازے کے پاس آیا لیکن میں نے اسے اندر نہیں آنے دیا۔ بھائی بہن اور ماں بیٹے کے مقدس رشتوں کے درمیان کس نے نفرت، عداوت اور شک و شبے کی دیوار کھڑی کی۔ اس کمینے نے جو میرا مال جایا ہے۔"

داروغہ رائفل سے دور سہما کھڑا تھا۔ وہیں سے ہاتھ اٹھا کر بولا: "دیوی جی! آپ قانون کو ہاتھ میں نہ لیں۔ رائفل مجھے دے دیں۔ ہم ہریا کو بہت سخت سزا دیں گے، جیل بھجوا دیں گے۔"

"آپ اسے کتنی سزا دلا سکتے ہیں۔ عورت کی عزت واپس نہیں آتی۔ مگر یہ جیل جا کر واپس آ جائے گا۔"

"لیکن دیوی جی! عزت لوٹنے والے کو موت کی سزا تو نہیں دی جا سکتی۔"

"اور اگر خسرو مجرم ثابت ہوتا تو ابھی تم سب مل کر اسے جان سے مار ڈالتے۔ اسے موت کی سزا ہو جاتی۔"

"یہ لوگ ایسا کرتے لیکن قانون ایسا نہ کرتا۔"

"تو میں قانون سے التجا کرتی ہوں کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ میں اپنے مجرم سے نمٹ لوں گی۔ جو سزا خسرو کے لیے تجویز کی گئی تھی۔ اب وہی ہریا کو ملے گی۔"

کچھ لوگ ہریا کے سامنے ڈھال بن گئے۔ ایک نے کہا۔ "بھابی! آپ اس پر گولی چلائیں گی تو پہلے ہم لوگوں کو لگے گی ہم بے قصور مارے جائیں گے۔"

شانتا نے رائفل کے کندے کو زمین پر ٹیک دیا۔ اس کی نال اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اس نال کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے لگایا۔ ٹریگر پر انگوٹھا رکھا پھر کہا: "خبردار! میری طرف کوئی نہ آئے۔ میں تین تک گنتی ہوں۔ اگر ہریا میرے سامنے نہ آیا تو میں خودکشی کر لوں گی۔"

تلسی رام نے ڈانٹ کر کہا: "شانتا! حماقت نہ کرو۔ رائفل پھینک دو۔"

وہ بولی: "آپ میرے پتی دیو ہیں۔ آپ کی خواہش کا احترام کرنا میرا دھرم ہے لیکن میں ہریا کو مار ڈالنے کے بعد ہی آپ سے آنکھیں ملا سکتی ہوں مگر لگتا ہے آپ سے کبھی آنکھیں نہیں ملا سکوں گی۔ مرنا میرے نصیب میں ہے۔"

"نہیں شانتا! تم زندہ رہو گی۔ ہم دونوں خسرو کے پاس جائیں گے۔ اس سے معافی مانگیں گے۔ میں غصے میں تمہیں مار ڈالنے [illegible] رہا تھا، لیکن اب میں ہریا کو سزا دوں گا تمہیں اسے قتل کرنے کا موقع نہیں دوں گا میں کبھی یہ نہیں چاہوں گا کہ میری پتنی قتل کے الزام میں عدالت تک جائے۔ رائفل پھینک دو۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔"

وہ چیخ کر بولی: "نہیں، آپ ایک قدم بھی میری طرف بڑھائیں گے تو میں جان دے دوں گی۔"

"یہ کیا حماقت ہے؟"

شانتا نے گننا شروع کیا: "ایک . . ."

سب لوگ دم بخود ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ ان سے صرف دو قدم کے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ کوئی بھی اس کی طرف چھلانگ لگا سکتا تھا لیکن اس سے پہلے اس کا انگوٹھا ٹریگر پر دب جاتا۔

تلسی رام نے کہا: "خودکشی نہ کرو اپنے بھائی کے گناہ کی سزا اپنے آپ کو نہ دو۔ شکتی کے معاملے میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے جس کا قصور ہے۔ میں اس سے نمٹ لوں گا۔"

شانتا نے اس کی بات اَن سنی کر دی پھر اونچی آواز میں کہا: "دو . . ."

اب وہ کسی لمحے میں بھی تین کہہ سکتی تھی اور وہ اس کی زندگی کی آخری گنتی ہوتی۔ اس سے پہلے ہی باہر سے خسرو کی آواز سنائی دی: "دیدی! بڑو دیدی! میں آ گیا ہوں، آپ آتم ہتیا کر رہی ہیں۔ نہیں دیدی، نہیں۔ خودکشی بہت بڑا پاپ ہے آپ اپنی جان کی دشمن نہیں بن سکتیں۔"

شانتا نے کہا: "آہ خسرو! میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔"

"دیدی! آپ نے مجھے زخموں سے چُور دیکھا لیکن میرے سر پر نہ تو محبت سے ہاتھ رکھا اور نہ ہی میرے زخموں کی پروا کی۔ مجھے گھر کے دروازے سے لوٹا دیا۔ اب میں اس بات کا حق رکھتا ہوں، آپ میرے زخموں پر مرہم رکھیں۔ اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو پھر میں کیا، آپ کو بھگوان بھی معاف نہیں کرے گا۔"

تلسی رام نے کہا: "اگر تم مر جاؤ گی تو میں بھی تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ تمہاری آتما بھٹکتی رہے گی۔"

شکتی کی آواز سنائی دی۔ وہ دوسرے کمرے سے کہہ رہی تھی: "بھابی! آپ اسے پھینک دیں اگر آپ نے اپنی جان دی تو میں بھی آپ کو معاف نہیں کروں گی۔"

ٹریگر پر شانتا کا انگوٹھا رکھا ہوا تھا اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے رائفل کی نال تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے ادھر اُدھر کی آوازیں سن رہی تھی اور اس حقیقت کو سمجھ رہی تھی کہ جن کے

لیے جان دے رہی ہے وہی اگر اس دنیا میں اسے معاف نہیں کریں گے تو دوسری دنیا میں بھگوان بھی اسے معاف نہیں کریں گے۔

ان باتوں کے دوران خسرو اندر چلا آیا۔ دیدی سے اس کی نظریں ملیں تو اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا: "ٹھہر جائیے دیدی! جان دینے سے پہلے میری ایک بات کا جواب دیجیے جب انسان کو خوشی ملتی ہے تو وہ جشن مناتا ہے یا جان دیتا ہے؟"

"تمہاری بکواس کا کیا جواب دوں؟ کیسی خوشی ملی ہے؟ کیا مجھے؟"

"ہاں آپ کو، ذرا سوچیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کا یہ مظلوم بھائی بہت بڑے الزام سے بری ہو گیا ہے۔"

"میں تم پر فخر کرتی ہوں مگر تمہاری یہ بدنصیب بہن دو بھائیوں کے بیچ کھڑی ہے۔ منہ بولے بھائی نے بہن کا سر اونچا کیا اور ماں جائے نے منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔"

"دیدی! آج آپ کی محبت کا امتحان ہے۔ آپ اپنے ماں جائے کے جھوٹ پر مرنا چاہتی ہیں یا منہ بولے بھائی کی سچائی پر فخر سے زندہ رہنا چاہتی ہیں۔ اس امتحان سے گزرتے ہوئے یہ یاد رکھیے۔ آپ کی موت سچائی سے انکار ہو گی۔"

وہ تذبذب میں مبتلا ہو گئی۔ خسرو اسے باتوں اور نصیحتوں میں الجھاتا ہوا قریب آتا جا رہا تھا جب دونوں کے درمیان گز بھر کا فاصلہ رہ گیا تو اس نے اچانک ہی ایک قدم آگے بڑھا کر رائفل کی نال پر زور کا ہاتھ مارا۔ وہ نال بڑی دیدی کی ٹھوڑی سے ہٹ گئی لیکن جھٹکا کھاتے ہی انگوٹھا ٹریگر پر دب گیا تھا۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ گولی چلی اور چھت پر ادھورا سا سوراخ پڑ گیا۔ شائستہ کو یوں لگا جیسے گولی اس کے جسم کے آر پار ہو گئی ہو۔ وہ چکرا کر گرنے والی تھی، خسرو نے اسے فوراً ہی سنبھال لیا۔

✤

۱۶ دسمبر کی رات سید پور کے پانچ لاکھ بہاریوں کے لیے قیامت کی رات تھی منصوبہ بندی کے لحاظ سے یہ چھوٹا سا شہر مضبوط قلعہ تھا۔ انتہا پسند اس شہر میں آکر کسی بہاری کو نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بیرونی خطرات سے بھی پورا محفوظ تھا کہ وہاں فوجی چھاؤنی تھی لیکن اس رات تمام فوجی اپنی بیرکوں میں خاموش تھے۔ یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ دوسری صبح انڈین آرمی شہر میں داخل ہونے والی ہے۔

بات صرف انڈین آرمی کی ہوتی تو شاید اتنی دہشت نہ پھیلتی۔ سب جانتے تھے کہ بھارتی فوج کے آگے آگے مکتی باہنی کے جوان ہوں گے۔ اب ان کے سامنے سید پور ایک کاغذی قلعہ ہو گا۔ وہ جس گلی میں جس گھر میں گھسنا چاہیں گے کوئی انھیں روک نہیں سکے گا۔ وہ سیاہ و سفید کے مالک ہوں گے۔ جہاں دولت ہو گی دولت سمیٹ کر لے جائیں گے اور جہاں عزت ہو گی عزت چھین کر لے جائیں گے اگر انڈین آرمی نے اس پر اعتراض کیا تو وہ بہاریوں کو مجرم ثابت کریں گے۔ ایسے لوگوں کی نشاندہی کریں گے جو کٹر پاکستانی ہیں ان پر الزام لگایا جائے گا کہ انھوں نے ہندوؤں کو اس شہر میں قتل کیا۔ ان کا مال و اسباب لوٹا۔ ان کی جائداد پر قبضہ کیا اور بنگالیوں کو اس شہر سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

اور ان کے یہ الزامات غلط نہیں ہوں گے۔ سید پور کے بہاریوں میں ایک مجموعی خرابی تھی اور کئی انفرادی بدمعاشیاں تھیں۔ انفرادی بدمعاشیاں ہر قوم میں، ہر ملک میں ہوتی ہیں۔ مثلاً غنڈے بدمعاش اپنے مفاد کی خاطر لوٹ مار کرتے ہیں۔ مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد سید پور میں ہندوؤں اور بنگالیوں کا جو قتل عام ہوا۔ اس میں کسی بھی شریف اور پُر امن بہاری کا ہاتھ نہیں تھا لیکن ان بہاریوں میں غنڈے اور بدمعاش بھی تھے جنھوں نے یہ خونیں ناٹک کھیلا تھا۔ یہ ان کی انفرادی بدمعاشیاں تھیں لیکن ان میں جو مجموعی خرابی تھی۔ وہ یہ کہ قیام پاکستان کے بعد سے انھوں نے ہمیشہ بنگالیوں کو

عورت

- ایک پاک دامن اور حسین عورت اللہ تعالیٰ کی مکمل ترین صنعت ہے اُس سے سچی ملکوتی شان نمایاں ہوتی ہے، وہ قدرت کا ایک معجزہ ہے، اُسے عجائبات میں شمار کرنا چاہیے۔ عورت کی نگاہ میں ہمارے قانون سے زیادہ قوت ہے اور اس کے آنسوؤں میں ہماری دلیلوں سے زیادہ اثر ہے۔

(سیورین)

- جب عورت کے دل میں رحم سما جاتا ہے تو پھر آسمان یا زمین میں عورت کے دل سے زیادہ اور کوئی چیز شفیق یا نرم نہیں ہوتی۔

(لوتھر)

- عورت وہ راز ہے جس کا قلب اسرار سے بھرا ہوا ہے اور کوئی زبان اس کی شرح نہیں کر سکتی۔ (سٹوری)
- عورت بہترین اور آخری آسمانی تحفہ ہے (ملٹن)
- عورت فرشتوں اور انسانوں کے درمیان کی حسین مخلوق ہے۔

(بالزاک)

- اگر دنیا میں عورت نہ رہے تو دنیا کے لوگ چند ہی دنوں میں خونخوار درندے بن جائیں۔ (ناطق کمال)

اپنے سے کمتر سمجھا۔ یہ تلخ حقیقت صرف سیدپور کے بہاریوں سے تعلق رکھتی ہے۔ انھوں نے نہ تو کبھی اپنے بچّوں کو بنگالی میڈیم سے تعلیم دلائی۔ نہ ہی بنگالی تہذیب کو برادرانہ جذبوں کے تحت رسمی طور پر ہی اپنانے کی ضرورت سمجھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج اورنگی کراچی کے لاکھوں بہاریوں میں بنگالی بولنے والے لاکھوں کی تعداد میں ضرور ملیں گے لیکن بنگالی پڑھنے اور لکھنے والے شاید دو یا چار فی صد ہوں۔ کسی کو بھی اس کی زبان اور تہذیب سے دور رہ کر کبھی دوست نہیں بنایا جاسکتا۔

اور ۱۶ر دسمبر کی وہ رات سیدپور کے بہاریوں کو یہ عبرت ناک درس دے رہی تھی کہ چوبیس برس تم بنگالی زبان اور تہذیب سے دور رہ کر وہ کل صبح آنے والی انڈین آرمی کو اور خون کے پیاسے مکتی باہنی کے جوانوں کو کسی قیمت پر دوست نہیں بنا سکیں گے۔

اس رات لیڈر قسم کے لوگ سر جوڑ کر حالات پر غور کر رہے تھے مذہبی رہنما اور سماجی کارکن وغیرہ بھی اپنی اپنی جگہ پریشان تھے۔ وہ ایک دوسرے سے مشورے کرتے پھر رہے تھے۔ کسی نے کہا: "انڈین آرمی نیلفاماری کی طرف سے آئے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ سیدپور میں داخل ہو۔ ہم نمائندہ قسم کے لوگ ان کا استقبال کرنے کے لیے شہر سے باہر چلیں اور انھیں خوش آمدید کہیں۔"

دوسرے نے کہا: "خوش آمدید کہنا گویا خوشامد کرنا ہے۔ وہ لوگ نادان نہیں ہو سکتے۔ خوشامدیوں کو خوب پہچانیں گے۔ ذرا عقل سے سوچو۔ مکتی باہنی کے جوان ان کی آنکھوں کا تارا ہیں۔ ان کے سامنے ہم جیسے خوشامدی پیچھے ہیں۔ وہ ہماری ایک نہیں سنیں گے۔"

ایک نے کہا: "آج ہم ہر طرف سے نہتّے ہیں۔ ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں۔ جن کے پاس ہتھیار تھے۔ انھوں نے بھی ایک طرف رکھ دیے۔"

ایک نے کہا: "آنے والے ہندو ہیں۔ ہم انھیں خدا رسول کا واسطہ نہیں دے سکتے۔"

"انسانیت کا واسطہ تو دے سکتے ہیں؟"

ایک نے جواب دیا: "مکتی باہنی کے جوان پوچھیں گے۔ ہمارا استحصال کرتے وقت تمھاری انسانیت کہاں گئی تھی۔ بھئی، سیاست کا یہ دستور ہے جب کوئی کسی سے دبتا نہیں ہے تو اسے دوسرے ذرائع سے دبایا جاتا ہے لیکن ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔"

مظفر گروپ کے ایک کارکن نے کہا: "ہمارے پاس ایسا ذریعہ ہے۔"

سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا: "میری بات کو سمجھنے کے لیے پہلے بیٹا، پوتا اور دادا کے رشتے کو سمجھنا ہوگا۔ ایک دادا جان ہیں جو کروڑوں کی جائداد کے مالک ہیں اور ان کے دم سے ہی کاروبار چلتا ہے۔ دادا کے کاروبار کو ان کا بیٹا چلاتا ہے اور بیٹے کا بیٹا اپنے باپ اور دادا کا محتاج ہے۔ جب بیٹے کو جیب خرچ کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ باپ سے مانگتا ہے اور باپ اپنے باپ سے رقم طلب کرتا ہے۔ گویا کہ سب سے زیادہ اہمیت دادا کی ہوئی جس کے پاس دولت ہے۔ طاقت ہے اسی کی اہمیت ہوتی ہے۔ اسی طرح بنگلہ دیش بنانے کے لیے بھارت سے مدد طلب کی گئی بھارت نے روس کا تعاون حاصل کیا تو بھائیو! اہمیت کس کی ہوئی؟"

ایک مذہبی جماعت کے لیڈر نے اس کارکن کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا: "تم جیسے جوان چھوکرے روس کا دم بھرتے تھے۔ بڑے اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتے تھے۔ دیکھ لو تمھارے روس نے کیا کیا؟"

اس نے کہا: "بڑے میاں، جل گئے مگر بَل نہیں گئے۔ اب بھی سیاست کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ کون روس ہے اور کون امریکہ، کون ہندو ہے اور کون مسلمان۔ یہاں یہ سوچیے کہ پانچ لاکھ انسانوں کی جان کس طرح بچائی جائے؟"

ایک نے طنزیہ انداز میں کہا: "تم لوگ روس کے چمچے ہو۔ تمھی لوگ بچانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

اس نے مسکرا کر کہا: "ہاں، جب ہانڈی پک جاتی ہے تو چمچہ ہی کام آتا ہے۔ نہ کام آئے تو ہانڈی جل جاتی ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ لفظ چمچہ نفرت یا طنز کا سبب کیسے بن گیا؟ جبکہ یہ کسی پہلو سے غیر اہم نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ میلے ہوں یا پھوڑے پھنسیاں نکل آئی ہوں تو چمچہ ہی آپ کے حلق تک لقمہ پہنچاتا ہے۔"

کسی لیڈر نے کہا: "بھئی باتیں نہ بناؤ۔ کام کی بات کرو۔"

کامریڈ نے کہا: "ابھی کسی صاحب نے کہا تھا کہ مکتی باہنی کے جوان بھارتی فوج کی آنکھوں کا تارا ہیں۔ یہ غلط ہے۔ پاکستان بھارت اور بنگلہ دیش کے اس تاریخی اہم موڑ پر صرف ہماری پارٹی کی اہمیت ہے۔"

بھاشانی گروپ کے ایک ممبر نے اٹھ کر کہا: "یہ مسلمانوں کے لیے بڑے ہی شرم کی بات ہے کہ مسلمان بہاری بھی ہیں اور بنگالی بھی۔ ان مسلمانوں نے مسجدوں میں گھس کر ایک دوسرے کو قتل کیا۔ کلام پاک کا واسطہ دیا گیا مگر کسی نے کسی کی نہیں سنی۔ ہم کمیونسٹ پارٹی کے لوگ بنگالی بھی ہیں، بہاری بھی ہیں، ہندو بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں۔ اتنے بدترین حالات میں بھی ہمارے درمیان کسی سے نفرت پیدا نہیں ہوئی۔ آج بھی یہاں کے بنگالی ہم بہاریوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور ہم پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا اور ان کا نظریہ ایک ہے۔ آپ کا نظریہ جو کئی سو سال سے چلا آرہا ہے۔ وہ کیسے کمزور ہوگیا؟ اس پر دوسرے نظریے کس طرح حاوی ہوگئے؟ یہ سوچنا اور شرم کرنا آپ کا کام ہے۔ ہم بھاشانی گروپ کے

لوگ بھی مسلمان ہیں لیکن ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہم نے آج تک کسی بنگالی یا ہندو کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور نہ ہی کوئی ہندو یا بنگالی ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"ہم جانتے ہیں کہ مکتی باہنی کے جوان اپنے مقتول بنگالیوں کا خون معاف نہیں کریں گے۔ وہ یہاں آ کر انتقام لینے کے لیے بے چین ہوں گے لیکن انڈین آرمی کے افسران ہمیں نظرانداز نہیں کریں گے مکتی باہنی کے جوانوں کو ہم قتل عام کا موقع نہیں دیں گے۔ ان کی انتقامی کارروائی محدود کر دیں گے۔ وہ لوگ یہاں چھپے ہوئے قاتلوں کو خوب پہچانتے ہوں گے اگر انھوں نے ان کے خلاف انتقامی کارروائی کی تو ہم کچھ نہیں کر سکیں گے لیکن اس بات کا یقین ہے کہ ہم یہاں کے شریف اور پُرامن شہریوں پر آنچ نہیں آنے دیں گے اگر کوئی ان پر کسی قسم کا الزام عائد کرے گا تو ہم اسے تسلیم نہیں کریں گے اور جب ہم تسلیم نہیں کریں گے تو انڈین آرمی بھی ہمارا ساتھ دے گی آئندہ یہاں جو بنگالی اور ہندو آ کر آباد ہوں گے۔ وہ بھی ہمارا ساتھ دیں گے۔"

اس رات سب نے اتفاق کیا کہ بھاشانی گروپ کے جوانوں کی قیادت میں ہی اپنی جان بچائی جا سکتی ہے۔ دوسری صبح ہزاروں کی تعداد میں لوگ سفید جھنڈیاں لے کر امن اور سلامتی کے خاموش پرچم لہراتے ہوئے اس راستے پر چل پڑے۔ جدھر سے انڈین آرمی آنے والی تھی۔ گولاہاٹ سے آگے جانے کے بعد دور سے ہی بھاری بھرکم ٹینک نظر آنے لگے۔ فوجی بوٹوں اور گاڑیوں سے اس قدر دھول اڑ رہی تھی کہ اس گرد و غبار میں بھارتی فوج کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آنے والے ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ وہ سفید جھنڈیاں دیکھ کر رک گئے۔ دونوں کے درمیان تقریباً نصف میل کا فاصلہ تھا۔ دو جوان صلح کا پرچم لہراتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے آرمی افسران کے پاس پہنچے۔ اپنا تعارف کرایا مکتی باہنی کے جوان ان دونوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ انھوں نے تصدیق کی کہ سیدپور نیپ سے ان کا تعلق ہے۔ آرمی کے افسران نے ان سے مصافحہ کیا پھر کہا: "ہم عوام کو جانی یا مالی نقصان پہنچانے نہیں آئے ہیں۔ سیدپور سے گزرتے ہوئے پاکستان آرمی کی بیرکوں میں جائیں گے لیکن اگر راستے میں مزاحمت کی گئی تو ہم ایک ایک کو بھون کر رکھ دیں گے۔"

ایک جوان نے یقین دلایا: "سیدپور کے باشندے امن پسند ہیں اور آپ لوگوں کا استقبال کرنے کے لیے یہاں تک آئے ہیں۔"

مکتی باہنی کے ایک نوجوان نے غصے سے کہا: "سیدپور کے لوگ غنڈے، بدمعاش اور قاتل ہیں۔ ہم ایک ایک کو پہچانتے ہیں۔ ہم انھیں ضرور سزا دیں گے۔"

مظفر گروپ کے ایک ممبر نے کہا: "جو قاتل ہیں، سزا کے مستحق ہیں۔ انھیں ضرور سزا ملے گی لیکن اندھے انتقام کے نتیجے میں امن پسند شہریوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے لہٰذا ہم آپ لوگوں کے ساتھ رہیں گے۔ آپ غلط آدمیوں کا محاسبہ کریں۔ ہم پُرامن شہریوں کی حفاظت کریں گے۔"

آرمی کے افسران نے تائید کی اور یقین دلایا کہ امن پسند شہریوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس رائفل، پستول، ریوالور یا دوسرے قسم کے ہتھیار ہیں۔ وہ شام ہونے سے پہلے تھانے میں جمع کر دیں۔

ان کے درمیان معاملات طے ہو گئے۔ یوں بھی انڈین آرمی کو اپنی نیک نامی مقصود تھی۔ سیاسی حکمتِ عملی کا تقاضا تھا کہ پانچ لاکھ انسانوں کو ٹینکوں سے روند کر گزرا نہیں جا سکتا اور نہ ہی اتنی بڑی آبادی کو نذرِ آتش کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے بڑی آسانی سے سمجھوتہ ہو گیا۔ جب انڈین آرمی فاتح کی شان سے آگے بڑھی تو سیدپور کے باشندے 'جے بنگلہ' اور بھارتی سینا زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ بھارتی سینا جس راستے سے گزر رہی تھی۔ اس کے اطراف مکانوں اور دکانوں کی چھتوں پر بنگلہ دیش اور بھارت کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔

ڈھاکہ، چاٹگام، کھلنا، میمن سنگھ، بوگرہ اور دوسرے تمام شہروں کے بہاریوں نے نہ تو بنگلہ دیش کو تسلیم کیا تھا اور نہ ہی بھارتی فوج کو خوش آمدید کہا تھا۔ بہاریوں کی ایک عادت ہے اوّل تو وہ کسی کو تسلیم نہیں کرتے اور جب تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے تمام شہروں کے بہاری آج بھی خود کو پاکستانی کہتے ہیں اور پاکستان آنے پر بضد ہیں۔ اس کے برعکس سیدپور کے بہاریوں نے جب بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا تو تادمِ تحریر وہ خود کو بنگلہ دیشی ہی کہتے ہیں۔ سیدپور میں بہاریوں کا کوئی کیمپ نہیں ہے وہاں بہاریوں کی طرف سے پاکستان آنے کی کوئی آواز اٹھائی نہیں جاتی۔ اب وہاں کے لوگ اپنے بچوں کو بنگالی پڑھاتے لکھاتے ہیں اور آہستہ آہستہ بنگالی تہذیب کو اپناتے جا رہے ہیں جو کام چوبیس برس پہلے کرنا تھا وہ اب کر رہے ہیں اور راضی خوشی کر رہے ہیں۔

کچھ عرصے بعد بھارتی فوج کے واپس جانے کے بعد بھی نیپ کے بہاری اور بنگالی جوان مکتی باہنی کے ساتھ لگے رہے۔ انھیں اتنا موقع نہیں دیتے تھے کہ وہ بے ضرر شہریوں کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کر سکیں اگر وہ کسی بات پر بضد ہوتے تو اس بات کو تھانے اور نیلفاماری کی کچہری تک پہنچایا جاتا تھا لیکن مکتی باہنی کے جوانوں کو من مانی کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔

ایک دن پارٹی کے دفتر میں اطلاع پہنچی کہ وہ نعیم الدین خسرو جو پچھلے دنوں سستا اناج فروخت کر رہا تھا اس پر کوئی خطرناک الزام

عائد کیا گیا ہے اور بہت سے لوگوں نے اس کی پٹائی کی ہے۔ تھانیدار نے اسے ضمانت پر شیر بلڈنگ پہنچا دیا ہے اور اب اس کے خلاف سخت کارروائی کی جانے والی ہے۔

پارٹی کے چند نوجوان شیر بلڈنگ پہنچے۔ خسرو اس وقت تلسی رام اگروال کی حویلی میں اپنی قسمت کا فیصلہ سننے گیا تھا۔ شیر بلڈنگ میں پناہ لینے والے ایک بوڑھے نے کہا: "خسرو تو نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ آنے والی عورتیں یہاں ہیں۔"

ایک نے کہا: "چلو، ان سے ہی پوچھ لیتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے؟"

بوڑھے نے انھیں ایک چادر کی چار دیواری میں پہنچا دیا۔ وہاں عظمیٰ دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھی ہوئی تھی۔ نین تارا نے اجنبیوں کو دیکھا تو سر پر آنچل رکھ کر دوسری طرف منہ پھیرنے لگی۔ ایک نے کہا: "بہن! ہم آپ کی مصیبت میں کام آنا چاہتے ہیں۔ نعیم الدین خسرو جیسا نیک دل انسان جو اناج کو سستا فروخت کرتا ہو، کوئی برائی نہیں کر سکتا ہمیں بتائیے، اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ہم اس پر ظلم نہیں ہونے دیں گے۔ یہاں سے عدالت تک دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیں گے۔"

وہ رونے لگی۔ شیر بلڈنگ میں پناہ لینے والے مردوں اور عورتوں نے نین تارا کو سمجھایا: "تمھاری خوش قسمتی ہے کہ یہ لوگ تمھارے پاس چل کر آئے ہیں اور تمھاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ کسی پر زیادتی ہونے نہیں دیتے۔ تم انھیں سب کچھ بتا دو۔"

ایک عورت نے کہا: "یہ دونوں کیا بتائیں گی۔ ایک تو گونگی ہے کچھ کہہ نہیں سکتی۔ دوسری کا دکھ اتنا بھاری ہے کہ آنکھ سے آنسو نکلتے ہیں۔ منہ سے بات نہیں نکلتی۔ چلو، میں ہی بتا دیتی ہوں۔" "بھائی! میں نے جو سنا ہے، تم بھی سن لو۔"

وہ ان کا دکھڑا سنانے لگی۔ جہاں وہ بھولتی تھی۔ دوسری عورتیں لقمہ دیتی جاتی تھیں۔ اس بوڑھی کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی عظمیٰ کچھ کہنے لگی۔ گڑبڑ گڑبڑ زبان کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ سب سوالیہ نظروں سے اس کی پشت کو دیکھ رہے تھے کیونکہ وہ ابھی تک دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھی ہوئی تھی۔ نین تارا اس کی باتوں کو اچھی طرح سمجھنے لگی تھی۔ اس نے کہا: "یہ کہہ رہی ہے، خسرو کے معاملات میں میرا نام نہ لو۔ جانے کیوں دنیا والے اسے خوبصورت کہتے ہیں۔ خوبصورتی ایک بہت بڑا الزام ہے۔ یہ جن کے ہاں پناہ لیتی ہے۔ وہی الزام دیتے ہیں۔ یہ کسی کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ کسی کی پناہ نہیں چاہتی۔ یہاں سے چلا جانا چاہتی ہے۔ یہ کہہ رہی ہے، اسے کسی طرح سرحد پار بھیج دیا جائے۔ یہ اکیلی پاکستان چلی جائے گی۔"

ایک جوان نے عظمیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اس عورت پر بھی الزامات تراشے جاتے ہیں؟"

نین تارا نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "عورت آئینے کی طرح صاف ہو تو اس کی شفاف صفت کو کوئی نہیں سمجھتا۔ سب اسے آئینہ سمجھ کر اس میں جھانکنے لگتے ہیں۔ یہ بہت ہی صاف دل کی لڑکی ہے۔ میرے سامنے میرے شوہر کی خدمت کرتی تھی تو ہماری میزبان خاتون نے اس کا بُرا مانا۔ اسے غلط سمجھا۔ جانے ہم سے پہلے یہ کہاں رہتی رہی ہے اور کتنی جگہ سے نکالی گئی ہے۔ یہ واقعی بیزار ہو گئی ہے۔"

نوجوان نے کہا: "بہن! اگر تم اس قدر پریشان ہو۔ تمھارا کوئی نہیں ہے اور تم پاکستان جانا چاہتی ہو تو ہم تمھارے لیے کچھ انتظام کر سکتے ہیں۔ ہماری پارٹی کے چند لوگ آج رات کی ٹرین سے چاٹگام جا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ عورتیں اور بچے بھی ہیں اگر چاٹگام کے راستے برما جانا چاہو تو بھی معاملات طے کیے جا سکتے ہیں۔"

عظمیٰ یہ سنتے ہی فوراً پلٹ گئی۔ وہ ہاں، ہاں کے انداز میں سر ہلا رہی تھی جیسے جانے کے لیے ایک پاؤں پر کھڑی ہو۔ کامریڈ نے اس کی صورت دیکھتے ہی حیرانی سے کہا: "ارے عظمیٰ! یہ تم ہو؟"

عظمیٰ اسے اجنبی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس نے کہا: "تمھارا بہنوئی صابر حسین میرا بہت گہرا دوست تھا۔"

پھر اس نوجوان نے نین تارا سے کہا: "یہ عظمیٰ میرے دوست صابر حسین کی سالی ہے۔ اب میں سارا قصہ سمجھ گیا ہوں۔ صابر اکثر مجھے اپنے خاندانی حالات بتایا کرتا تھا۔ اس بے چاری کو کسی کے ہاں زیادہ عرصے تک پناہ نہیں ملتی تھی۔ جانے کہاں کہاں بھٹکتی رہتی تھی۔"

نین تارا نے کہا: "کچھ بھی ہو۔ اب نہیں بھٹکے گی۔ میں اسے اپنے ساتھ ہی رکھوں گی۔"

عظمیٰ نہیں، نہیں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے اپنی گڑبڑ زبان میں بولنے لگی۔ نین تارا نے جواباً کہا: "بڑو دیدی کو شبہ کرنے دو۔ ہم ان کے پاس نہیں رہیں گے۔ جب تک پاکستان جانے کا کوئی راستہ نہ نکلے۔ ہم اسی جگہ رہیں گے لیکن تمھیں چاٹگام کے راستے برما نہیں جانے دوں گی۔ سنا ہے بہت ہی خطرناک راستہ ہے۔"

نوجوان نے کہا: "ابھی کہیں جانے کا مسئلہ نہیں ہے۔ پہلے ہمیں خسرو کی خبر لینا چاہیے۔ ہم تلسی رام کی حویلی کی طرف جا رہے ہیں۔"

نین تارا نے کہا: "میں بھی خسرو کے ساتھ جانا چاہتی تھی لیکن انھوں نے اپنے ساتھ لے جانے سے منع کر دیا ہمیں یہاں رہنے پر مجبور کر دیا۔ اگر آپ جا ہی رہے ہیں تو کسی طرح جلدی ان کی خبر بھیجیے۔ ہم بہت پریشان ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی خسرو کی آواز سنائی دی۔ وہ خوشی سے نین تارا کو آوازیں دیتا ہوا ڈگمگاتا ہوا چلا آرہا تھا۔ وہ دونوں فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ عظمیٰ اپنی گڑبڑ زبان میں کچھ پوچھ رہی تھی۔ اسی بات کو نین تارا نے پوچھا "کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے؟"

"بالکل خیریت ہے سچائی کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔ اصل گنہگار ہریا تھا۔ ششی نے اس کے خلاف بیان دیا ہے۔ اسے حوالات میں بھیج دیا گیا ہے۔"

یہ سنتے ہی یوں لگا جیسے نین تارا خوشی سے نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑی ہو۔ لیکن وہ سجدے میں گری ہوئی تھی اور اپنے رب کا شکر ادا کر رہی تھی۔ وہاں سب کو چپ لگ گئی۔ شیر بلڈنگ میں سناٹا چھا گیا۔ وہ سجدے میں کچھ کہہ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ عظمیٰ نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کے سر پر خاموشی سے ہاتھ رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد بڑو دیدی کی آواز سنائی دی "نین تارا! ہم بہت شرمندہ ہیں اگر کوئی دوسروں کے فریب میں آکر غلطی کر بیٹھے اور پھر اسے غلطی کا احساس ہو جائے تو معاف کر دینا چاہیے۔ میں تم سے بڑی ہو کر بھی معافی مانگنے آئی ہوں۔"

خسرو نے کہا "بڑو دیدی جو کہہ رہی ہیں، دل کی گہرائی سے کہہ رہی ہیں۔ یہ اس قدر نادم تھیں کہ اپنی جان دے رہی تھیں اگر میں وقت پر نہ پہنچ جاتا تو آج بہن سے محروم ہو جاتا۔ سر اٹھا کر دیکھو۔ دیدی کے ساتھ جیجا جی بھی ہمیں لینے آئے ہیں۔"

اس نے سجدے سے سر اٹھایا۔ پھر اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر بڑو دیدی سے ذرا دور پیچھے ہٹ کر خسرو کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں لیکن حویلی میں واپس نہیں جاؤں گی۔ ہم یہاں سے کہیں جائیں گے تو پاکستان جائیں گے ورنہ یہیں مر جائیں گے۔"

تلسی رام نے آگے بڑھ کر کہا "معلوم ہوتا ہے تم نے ہمیں معاف نہیں کیا ہے؟"

نین تارا نے کہا "معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب خسرو آپ کے گلے لگ گئے ہیں تو کوئی گلہ نہیں رہا لیکن ایک ٹھوکر کھانے کے بعد بار بار ٹھوکر کھانا دانشمندی نہیں ہے۔ میں آپ لوگوں کو برا نہیں سمجھتی لیکن آپ ہمیں سمجھنے کی کوشش کریں۔ حالات ہمارے خلاف ہیں۔ آج ہریا نے ہمارے خلاف سازش کی۔ کل کوئی دوسرا سازش کرے گا۔ آپ یقیناً ہم پر اعتماد کریں گے لیکن ہمیں کتنے دشمنوں سے بچاتے رہیں گے۔ اگر واقعی آپ کو ہم سے ہمدردی اور محبت ہے اور آپ ہمارے کام آنا چاہتے ہیں تو خدا کے لیے ہمیں سرحد پار بھیج دیجیے کسی طرح نیپال پہنچا دیجیے۔ اس کے بعد ہم پاکستان پہنچ جائیں گے۔"

تلسی رام کچھ کہنا چاہتا تھا۔ شانتا نے ہاتھ اٹھا کر کہا "ٹھہریے، یہ درست کہہ رہی ہے۔ کانٹے سب کو چبھتے ہیں لیکن اپنے پھول کو کبھی نہیں چبھتے۔ میں اب غلطی سے بھی اپنے بھائی اور بھاوج کو چبھنا نہیں چاہتی۔ نین تارا! میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔ ہم ایک ہفتے کے اندر یہاں سے ہندوستان جائیں گے پھر وہاں سے میں تم لوگوں کو پاکستان پہنچا دوں گی۔ جب تک ہریا پر مقدمہ چلتا رہے گا، میں یہاں نہیں رہ سکوں گی۔ پڑوسیوں اور محلے کی عورتوں سے نظریں نہیں ملا سکوں گی۔ ان حالات میں جب میں نہیں رہ سکتی تو تم لوگوں کو کیسے چھوڑ دوں گی۔ اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ تم مجھ پر بھروسہ کرتی ہو؟"

نین تارا نے خسرو کو دیکھا۔ خسرو نے کہا "دیدی کی بات مان لو۔"

وہ آگے بڑھ کر بڑو دیدی کے پاس آئی اور ان کے سامنے سر کو جھکا لیا۔ عظمیٰ گڑبڑ گڑبڑ بولنے لگی۔ نین تارا نے کہا۔ "بڑو دیدی! میں آپ کے ساتھ چلوں گی لیکن عظمیٰ نہیں جائے گی۔ یہ اب کسی کا سہارا لینا نہیں چاہتی۔ اسے کس طرح سمجھاؤں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ تنہا بے یار و مددگار ہے۔ میں اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتی۔"

دیدی نے آگے بڑھ کر عظمیٰ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ پھر کہا "میں تمہاری بھی بڑی بہن ہوں۔ میری بات مان کر چلو۔ تم بھی پاکستان جانا چاہتی ہو۔ ان کے ساتھ چلی جانا۔"

عظمیٰ اس نوجوان کے پیچھے جا کر کھڑی ہوگئی جو اس کے بہنوئی کا دوست تھا پھر وہاں سے گڑبڑ زبان میں بولنے لگی۔ نین تارا نے کہا "یہ ہمارے ساتھ جانا نہیں چاہتی ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ان لوگوں کے ذریعے چاٹگام سے برما جائے گی۔"

تلسی رام نے کہا "یہ اس کی بہت بڑی حماقت ہوگی۔ سیدھا راستہ چھوڑ کر بھیانک راستوں سے گزرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟"

نین تارا نے عظمیٰ کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لے گئی پھر آہستگی سے بولی "یہ کیسی نادانی ہے۔ آخر ہم سے الگ کیوں ہونا چاہتی ہو تمہارا مقصد پاکستان پہنچنا ہے۔ ہمارے ساتھ چل سکتی ہو۔"

دور کھڑے ہوئے لوگ اس کی زبان نہیں سمجھ رہے تھے۔ لیکن نین تارا سمجھ رہی تھی۔ عظمیٰ کہہ رہی تھی "میں ایسی کسی عورت کا سہارا نہیں لوں گی جس کے ساتھ ایک مرد ہو۔ میں تنگ آگئی ہوں۔ اب مجھ سے طعنے نہیں سنے جاتے۔ اب تک مجھ پر اپنوں نے اور غیروں نے بے شرمی اور بد چلنی کے الزامات لگائے۔ میں چور نہیں تھی۔ اب چور بنوں گی جو مجھے سہارا دے گا اس کو دھوکا

دوں گی۔ اگر تمھارے ساتھ یہاں سے پاکستان تک سفر کروں اور سفر کے دوران تمھارے خسرو کو جیت لوں تو کیا تم ہارنا پسند کرو گی؟"

مین تارا شدید حیرانی سے اسے ایک ٹک دیکھنے لگی۔ اس نے کہا: "اسے مذاق نہ سمجھنا۔ یہ میرا چیلنج ہے اور تم خوب سمجھتی ہو حوا کی بیٹی خسرو جیسے سیدھے سادے لوگوں کو بھی تہذیب کی جنت سے نکال سکتی ہے۔"

مین تارا شکست خوردہ انداز میں ایک قدم پیچھے ہٹ گئی وہ اپنی زندگی ہار سکتی تھی لیکن خسرو کو کسی قیمت پر بھی ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ منظی کو ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے اس کے اندر چھپی ہوئی کسی بدکردار عورت کو تلاش کرنا چاہتی ہو لیکن وہ گونگی کسی پہلو سے بدکردار نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی۔ حالات سے مجبور ہو کر کہہ رہی تھی۔ اس حقیقت کو خوب سمجھتی تھی کہ محبت سے جدا ہونا چاہے گی تو مین تارا اور خسرو اسے کبھی الگ نہیں کریں گے۔ اسی لیے اس نے یہ راستہ اختیار کیا تھا۔

خسرو نے ان کے قریب آ کر پوچھا: "یہ کیا کہہ رہی ہے؟"

منظی خسرو سے منہ پھیر کر اس نوجوان کے پاس چلی گئی۔ خسرو نے مین تارا سے پوچھا: "آخر کیا بات ہے یہ کہتی کیا ہے؟"

مین تارا نے نظریں اٹھا کر خسرو کو دیکھا۔ اس کے جی میں آیا کہہ دے۔ یہ گونگی دنیا والوں کی گالیاں سنتے سنتے خود ایک گالی بن گئی ہے۔ لیکن وہ خسرو سے یہ بات نہ کہہ سکی۔ وہ دیکھنے میں بہت ہی سیدھا سادا سا لگتا تھا مگر بعض حالات میں بھولے بھالے مرد بھی ایک خوبصورت گالی کھانا پسند کر لیتے ہیں۔

خسرو نے پوچھا: "تم چپ کیوں ہو۔ بولتی کیوں نہیں؟"

"آں۔ وہ چونک گئی پھر سنبھل کر بولی: "یہ کوئی نادان لڑکی تو نہیں ہے۔ سمجھ دار ہے، اپنا فیصلہ خود کر سکتی ہے۔ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ جب ان لوگوں کے ساتھ جانا چاہتی ہے تو ہم اسے روکنے والے کون ہوتے ہیں؟"

"مین تارا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ اس کا کوئی نہیں ہے۔"

"اس کے ہم بھی نہیں ہیں۔ ہم سے کون سا خون کا رشتہ ہے۔ ہم نے اب تک زبان سے ہمدردی اور محبت کی۔ کیا آپ ایک ٹھوکر سے نہیں سمجھ سکتے کہ زبان کے رشتے کتنے کچے ہوتے ہیں۔ میں تمھارے آس پاس کسی عورت کا وجود برداشت نہیں کروں گی۔ آج ایک الزام لگا ہے، کل منظی کے ساتھ بھی تمھیں بدنام کیا جا سکتا ہے۔"

خسرو نے چونک کر منظی کو دیکھا۔ منظی اس نوجوان کے پیچھے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ یکبارگی لرز گیا۔ اسے یوں لگا جیسے دوسری بار پھر الزام عائد ہو گیا ہو۔ لوگ اسے تھپڑوں، گھونسوں لاتوں اور ڈنڈوں سے مار رہے ہوں۔ اس نے سر کو جھٹکتے ہوئے مین تارا کو دیکھا۔ پھر سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا: "میں صرف تمھارے ساتھ ہی نیک نام رہ سکتا ہوں۔ آؤ چلیں۔"

◆

چاٹگام کو انگریزی میں چٹاگانگ کہتے ہیں۔ بعض بنگالی اسے چٹوگرام اور بعض بہاری چٹاگاؤں یا چاٹگاؤں کہتے ہیں۔ بہرحال جس طرح بھی اس شہر کا نام ادا کیا جائے۔ اس میں چاٹنے کا لفظ ضرور آتا ہے۔ مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد بہاریوں نے بنگالیوں کی جان و مال کو چاٹنا شروع کیا تو بنگالی اپنی اپنی رہائش گاہیں چھوڑ کر صدر گھاٹ، دام پاڑہ، قاضی ڈیوڑھی، لولائن اور چوک بازار کے علاقوں میں جا کر پناہ لینے لگے جب سقوط ڈھاکہ کے بعد بنگالیوں نے انتقاماً بہاریوں کو چاٹنا شروع کیا تو وہ اپنی اپنی رہائش گاہیں چھوڑ کر سردار بہادر کالونی، حالی شہر کالونی اور فیروز شاہ کالونی میں جا کر پناہ لینے لگے تھے۔

عبدالمعبود خان عابد بنگالی تھے مگر اردو زبان میں شاعری کرتے تھے کٹر مسلم لیگی تھے۔ اسد گنج میں چیئرمین کی بلڈنگ کے قریب ہی ان کا ایک دو منزلہ مکان تھا جب بنگالیوں پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے اور وہ اپنے مکانات اور اپنی زمینیں چھوڑ کر بھاگے آ رہے تھے، تب عبدالمعبود خان نے ان کی بڑی مدد کی تھی۔ مسلم لیگ کے ممبران اور لیڈروں سے التجا کی تھی کہ بنگالیوں کو تحفظ دیا جائے۔ ان دنوں مفرور بنگالیوں کو پناہ دینا بہت بڑا جرم تھا۔ پاکستانی فوج کے جوان ایسے بنگالیوں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے جو غدار سمجھے جاتے تھے اور جو حکومت وقت کے خلاف محاذ آرائی کرتے رہتے تھے۔ بہرحال وہ وقت گزر چکا تھا۔ اب بنگالیوں کی حکومت تھی اب عبدالمعبود خان عابد کا شمار ان بنگالیوں میں ہونے لگا تھا جو بنگلہ دیش کی مخالفت کرتے تھے اور حکومت پاکستان کے وفادار تھے۔ عبدالمعبود خان عابد کا بڑا جرم یہ تھا کہ وہ مسلم لیگی تھے اور اردو زبان میں شاعری کرتے تھے۔

ایسے لوگوں کو معاف نہیں کیا جاتا تھا۔ فوراً ہی گولی مار دی جاتی تھی لیکن عبدالمعبود خان عابد کی وہ نیکیاں کام آ گئی تھیں جو انھوں نے مفرور بنگالیوں کے ساتھ کی تھیں۔ ان کے مکان کے قریب ہی چیئرمین کی بلڈنگ مکتی باہنی کا اڈہ بنی ہوئی تھی۔ وہاں ان کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ وہ بنگالی ہو کر اگرچہ بنگلہ دیش کے غدار رہے تاہم انھوں نے بنگالیوں کی جان و مال کی حفاظت کی ہے لہٰذا ان کی جان بخشی کی جاتی ہے لیکن سختی سے یہ کہا گیا کہ وہ اردو زبان میں شاعری نہیں کریں گے۔ مسلم لیگ سے تعلق رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جب قائداعظم کا پاکستان نہیں رہا تھا تو قائداعظم کی مسلم لیگ وہاں زندہ کیسے رہ سکتی تھی؟

عبدالمعبود خان عابد نے گھر پہنچ کر اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ سجدۂ شکر ادا کیا۔ پاکستان گیا، مسلم لیگ گئی، اردو شاعری گئی، ان تمام باتوں کا انھیں افسوس تھا لیکن بیوی بچوں کی جان بچ گئی اس سے بڑی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ وہ ہر حال میں انسانی زندگی کا تحفظ کرنے کے قائل تھے۔ اس لیے شاعری اور سیاست پر اہلِ خاندان کو قربان نہیں کر سکتے تھے۔ بے چارے نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

۶ مارچ ۱۹۷۲ء کو انڈین آرمی واپس چلی گئی۔

بہ تاہم

بنگلہ دیش بن جانے کے بعد اسی بھارتی فوج نے وہاں اردو بولنے والوں کی جان و مال کی حفاظت کی تھی اور انھیں بنگالیوں کے انتقام سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے تھے جب تک وہ موجود رہے۔ اردو بولنے والے مطمئن رہے لیکن بنگلہ دیش کے عوام بحیثیت مسلمان، پاکستان کے مسلمان فوجیوں کو برداشت نہ کر سکے تو پھر بھلا ہندوستانی فوجیوں کو کب تک برداشت کرتے۔ ایک دن تو انڈین آرمی کو واپس جانا ہی تھا، سو وہ چلی گئی۔

۶ مارچ تک بنگلہ دیش کی افواج نے وہاں کے حالات پر بڑی حد تک قابو پا لیا تھا۔ امن و امان کو بحال رکھنے کے لیے سب سے پہلے انھوں نے مکتی باہنی سے ہتھیار رکھوانے شروع کیے تاکہ بنگالیوں اور بہاریوں کے درمیان تصادم کم سے کم ہوتا چلا جائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مکتی باہنی کے جوانوں نے بنگلہ دیش کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات ہزاروں کی تعداد میں یہ نوجوان اپنا گھر، اپنا دیش چھوڑ کر سرحد پار کر کے ہندوستان پہنچ گئے تھے۔ وہاں ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور

انھیں خبریں ملتی رہتی تھیں کہ پاکستان میں ان کے بیوی بچوں کے ساتھ، عوام کے ساتھ کیسے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ وہ ذہنی اذیتوں میں مبتلا ہوتے تھے۔ انتقام کی آگ میں سلگتے تھے

حتیٰ کہ ایک

وقت آیا جب انھوں نے بنگلہ دیش بنانے کے لیے گوریلا جنگ کا آغاز کیا۔ ہم پاکستانی انھیں ملک دشمن عناصر کہہ سکتے ہیں لیکن وہ بنگلہ دیش کے دوست تھے۔ ایسے جوانوں کو بنگلہ دیش کی حکومت ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ بہتر یہ کہ انھیں اپنی فوج میں مزید سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ لہٰذا ایسے ہی لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا جو گوریلا جنگ لڑ چکے تھے۔ یعنی ایک طرف مکتی باہنی کے جوانوں سے ہتھیار رکھوائے گئے دوسری طرف انھی جوانوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا اور ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھما دیے گئے۔ ناک اِدھر سے نہیں پکڑی گئی۔ اُدھر سے پکڑ لی گئی۔

عبدالمعبود خان عابد بہت عرصے کے بعد اپنے بہاری دوستوں سے ملنے سردار بہادر کالونی پہنچے۔ وہ اُدھر جانے سے ہچکچاتے تھے لیکن بی ڈی آر کا ایک آفیسر ان کا شناسا تھا۔ اس نے یقین دلایا: "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ جیسے بنگالیوں کو جو اردو زبان اچھی طرح جانتے ہیں ان بہاریوں سے رابطہ رکھنا چاہیے انھیں جا کر سمجھانا چاہیے کہ وہ دل سے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیں، بنگلہ زبان اور تہذیب کو اپنا لیں یا پھر پاکستان چلے جائیں۔"

وہ بہاریوں کے علاقے میں پہنچے تو وہاں ہر جگہ سہمی ہوئی صورتیں نظر آئیں۔ یہ وہی بہاری تھے جو پچھلے برس پاکستانی فوج کے آگے آگے رہتے تھے۔ ان ملک دشمن لوگوں کی نشاندہی کرتے تھے جو حکومتِ پاکستان کے خلاف محاذ آرائیاں کرتے رہتے تھے۔ کرفیو کے اوقات میں تمام بنگالی سہمے ہوئے اپنے گھروں میں دبکے رہتے تھے اور بہاری کرفیو پاس لے کر بنگالیوں کے علاقے میں دندناتے پھرتے تھے۔ اس وقت ان کے چہرے پر فاتحانہ جوش و خروش کی چمک دمک ہوا کرتی تھی۔ آج یہی چہرے بجھے ہوئے تھے، سہمے ہوئے تھے۔ لوگ صدیوں سے انسانی تاریخ پڑھتے آ رہے ہیں اور سمجھتے آ رہے ہیں کہ طاقت سے اور ہتھیاروں سے انسان کبھی دائمی آسودگی اور امن قائم نہیں رکھ سکتا۔ ہاتھ میں بندوق ہو اور منہ میں کڑوی زبان ہو تو خوشحالی کا پرندہ دہشت زدہ ہو کر اُڑ جاتا ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ ؎

گلاب ہاتھ میں ہو آنکھ میں ستارہ ہو
کوئی وجودِ محبت کا استعارہ ہو

عبدالمعبود خان عابد نے سردار بہادر کالونی میں ایسے لبِ دم مریضوں کو دیکھا جن کے لیے علاج کی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ ایسے خاندان دیکھے جہاں بچے بھوک سے ایڑیاں رگڑتے تھے اور ایسے تو سبھی تھے جو راتوں کو سوتے نہیں تھے کبھی ذرا آنکھ لگ جاتی تو یوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے جیسے موت اچانک ان کے سروں پر پہنچ گئی ہو۔ وہ اپنے ایک شاعر دوست کے ہاں پہنچے۔ وہاں بھی بھوک، بیماری اور رت جگے تھے۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ باہر دروازے پر ہی بیٹھ گئے۔ سر جھکا کر بولے "میں اپنے ساتھ کچھ اناج لے کر آیا تھا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے دوستوں میں تقسیم ہو گیا۔ اب میرے پاس یہ پچاس روپے رہ گئے تھے۔ پانچ روپے اپنی واپسی کے لیے رکھتا ہوں۔ پینتالیس تم رکھ لو۔"

انھوں نے وہ روپے اپنے شاعر دوست کے ہاتھ پر رکھ

دیے۔ شاہد نے ندامت سے کہا: "اب کوئی چار پیسے کی مدد بھی کرتا ہے تو رسماً انکار نہیں کیا جاتا۔ انکار کریں گے تو بچوں کا پیٹ کیسے بھرے گا۔"

انھوں نے دوست کی پیٹھ کو تھپکتے ہوئے کہا: "حوصلہ کرو۔ ان حالات میں رسمی تکلفات ختم ہو جاتے ہیں۔"

اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا: "یہ وقتی امداد کہاں تک کام آئے گی۔ ہم کب تک بے یار و مددگار رہیں گے۔ کب تک بے بسی کی زندگی گزارتے رہیں گے۔"

"اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ کسی طرح یہاں سے نکل جانے کی کوشش کرو۔ ابھی امیر صاحب کہہ رہے تھے کہ دلال دو چار سو روپے لے کر سرحد پار کرا دیتے ہیں۔"

"سرحد پار کرنے کے لیے اپنے پیروں سے چل کر جانا ہوتا ہے لیکن دشمنوں نے میرے جوان بیٹے کو چلنے پھرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

عبدالمعبود خان عابد نے چونک کر پوچھا: "کیا ہوا منظور بیٹے کو؟ کیا دشمنوں نے اس کے پاؤں کاٹ دیے ہیں؟"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا: "نہیں، پاؤں تو سلامت ہیں لیکن وہ شاید کئی ماہ تک یا کئی برسوں تک اپنے پیروں سے چل نہیں سکے گا۔"

"کیا ہوا کچھ تو بتاؤ۔ وہ تو فٹ بال کا بہترین کھلاڑی تھا۔"

"ہاں، 'رائٹ آؤٹ' کا کھلاڑی، جب گیند لے کر بھاگتا تھا تو کوئی اس کے ساتھ دوڑ نہیں سکتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ کھیل کھیل میں اتنی بھیانک دشمنی ہو جائے گی۔ مخالف ٹیم کے مقامی کھلاڑی اس پر دانت پیستے رہتے تھے۔ شاید کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے اور وہ موقع انھیں مل گیا۔ منظور کچھ کھانے پینے کا انتظام کرنے کے لیے اسد گنج کی طرف گیا تھا۔ وہاں دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ بتاتا تھا کہ اسے کس طرح مارا پیٹا گیا۔ کس طرح اسے گالیاں دی گئیں پھر اسے ایک چارپائی پر لٹا کر باندھ دیا گیا۔ ایک نے کہا اسے جان سے مار دو۔ دوسرے نے کہا۔ نہیں، یہ بنگالی زبان بولتا ہے لیکن اس کا جرم یہی ہے کہ یہ ماوڑا (بہاری) ہے۔ اسے ایسی سزا دی جائے جس سے ہمیں تسکین بھی پہنچے اور یہ ہماری دی ہوئی سزا کو ہمیشہ یاد رکھے۔

ایک اور کھلاڑی نے کہا: "یہ ہم سے بہت تیز بھاگتا تھا۔ گیند ایسے لے جاتا تھا جیسے وہ پاؤں سے چپک گئی ہو پھر یہ کمبخت گول کر کے ہی واپس آتا تھا۔"

کسی اور کھلاڑی نے کہا: "اس کے پاؤں نہیں رہیں گے تو یہ آئندہ کبھی ہم سے آگے نہیں بھاگ سکے گا۔"

'کیا اس کے پاؤں کاٹ دیے جائیں؟'

'ارے نہیں، نہیں، بے چارے کو لنگڑا اپاہج نہیں بنانا چاہیے۔ یہ بڑا ظلم ہو گا بس تھوڑی سی سزا دو۔'

پھر انھوں نے میرے بیٹے کے پاؤں کے تلوے کو چاقو سے چھیلنا شروع کیا۔ ان کی کوشش تھی کہ دونوں پاؤں کے تلووں کی کھال اتار دی جائے لیکن ایڑی کی طرف کھال موٹی ہوتی ہے۔ وہ کسی ماہر قصائی کی طرح اسے نہ اتار سکے۔ لہٰذا چاقو سے چھیلتے چلے گئے۔ دونوں پاؤں اب تک موجود ہیں لیکن وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس کے تلووں کی جلد نہیں ہے صرف لال لال گوشت نظر آتا ہے۔ وہاں خون کے لوتھڑے خشک ہو کر جم گئے ہیں۔ ہم کس سے علاج کرائیں۔ یہاں کوئی معقول ڈاکٹر نہیں ہے اور ڈاکٹر جو بھی دوائیں بتاتا ہے۔ وہ ہمیں حاصل نہیں ہوتیں پھر بھی رو دھو کر کچھ مرہم پٹی ہو رہی ہے۔"

کمرے کے اندر سے منظور کی آواز سنائی دی: "ابا جان! میں پاکستان جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔"

عبدالمعبود خان عابد نے سر گھما کر کمرے کے اندر دیکھا پھر فوراً ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے جو نوجوان کھڑا نہیں ہو سکتا تھا وہ اس وقت ان کے سامنے کھڑا ہوا نظر آیا۔ اس طرح کہ اس کے پاؤں کے دونوں تلوے زمین پر ٹکے ہوئے نہیں تھے بلکہ اس نے پاؤں کے دونوں سروں پر اپنے تمام جسم کا بوجھ ڈال رکھا تھا۔ تلوے ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے اور وہ اسی طرح پاؤں کے دائیں اور بائیں سروں پر وزن ڈالتا ہوا، دیوار کا سہارا لے کر ان کے قریب آ گیا تھا۔ عبدالمعبود خان عابد نے کہا۔

"بیٹے! اپنے بستر پر لیٹے رہو۔ میں خود تمھارے پاس آنے والا تھا۔"

منظور نے انکار میں سر ہلا کر کہا: "نہیں چچا میاں! میں یہاں تک آ کر ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جب میں اپنے دروازے کی چوکھٹ پار کر سکتا ہوں تو بنگلہ دیش کی سرحد کو بھی پار کر لوں گا۔"

"لیکن بیٹے! یہ کیا نادانی ہے۔ تم زمین پر بیٹھ کر گھسٹ گھسٹ کر یہاں تک آ سکتے تھے۔"

"ابا جان! میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میں اپاہج بننا پسند نہیں کروں گا۔ میں ایک اسپورٹس مین ہوں۔ جب تک میرے دم میں دم ہے۔ جب تک میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ میں ہزار زخم کھانے کے باوجود اپنے پاؤں پر کھڑا رہوں گا اور اپنے پیروں پر چلتا رہوں گا۔"

اس کے باپ نے اپنے بیٹے کو ہاتھ سے تھپکتے ہوئے کہا: "میرا بیٹا جوانمرد ہے، حوصلہ مند ہے مگر بیٹے تم آرام سے لیٹو۔ پہلے تمھارے زخموں کا علاج ہو جائے۔ تمھارے پاؤں کے

تلوے اس قابل ہو جائیں کہ تم انھیں زمین پر ٹیک ٹیک کر آہستہ آہستہ چل سکو تو میں کسی طرح تمھارے جانے کا بندوبست کردوں گا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اب جلد سے جلد پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ جب میں چلا جاؤں گا تو آپ کی آدھی سے زیادہ پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ میں نے آپ کو بچپن سے دیکھا ہے آپ بہت ہی حوصلہ مند ہوتے تھے۔ لیکن اب شاید میری وجہ سے، شاید ان حالات کی وجہ سے ٹوٹ گئے۔ جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو آپ اسی حوصلے سے میرے چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھال لیں گے پھر میں وہاں جاتے ہی اپنی ملازمت بحال کراؤں گا اور آپ لوگوں کو بلاؤں گا۔“

”لیکن بیٹے! تمھیں اب کون ملازمت دے گا؟“

”کیوں نہیں دے گا۔ میں حکومت پاکستان کے دور میں واپڈا کا ملازم رہ چکا ہوں۔ میرے پاس تمام ضروری کاغذات موجود ہیں۔ پاکستان یہاں نہ رہا تو وہاں تو ہے۔ میں کل بھی پاکستانی تھا۔ آج بھی پاکستانی ہوں۔ کل بھی واپڈا کا ملازم تھا، آج بھی ملازم ہوں۔ لہٰذا میری ملازمت برقرار ہے اور برقرار رہے گی۔“

”لیکن تمھیں تو فٹبال کے کھلاڑی کی حیثیت سے ملازمت ملی تھی۔ کیا آئندہ تم کھیل سکوگے؟“

اس نے دور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”خزاں کے بعد بہار آتی ہے۔ نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ میرے پاؤں کے تلووں پر بھی نئی کھال چڑھے گی۔ میں نئے سرے سے ایک کھلاڑی بننے کی کوشش کروں گا۔“

وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو گردن کی طرف لے گیا۔ وہ گلے میں کچھ پہنے ہوئے تھا جب اس نے گلے سے اسے اتارا تو وہ سونے کا میڈل تھا۔ اسے فٹبال کے بہترین کھلاڑی کی حیثیت سے وہ میڈل انعام میں ملا تھا۔ اس نے سونے کا میڈل عبدالمعبود خان عابد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”میں نے کئی بار ابا جان سے کہا کہ اسے بیچ کر گھر کے اخراجات پورے کریں لیکن انھوں نے امی کے زیورات بیچ دیے۔ گھر کا کتنا ہی سامان فروخت ہوگیا بہرحال آپ اسے بیچ کر میرے لیے رقم فراہم کردیں۔ میں کسی دلال کے ذریعے یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

اس کے باپ نے کہا ”نہیں بیٹے! میں ابھی تمھیں نہیں جانے دوں گا۔ پہلے تمھارے پیروں کا باقاعدہ علاج ہوگا۔“

”جب تک علاج ہوگا، تب تک پانی سر سے گزر چکا ہوگا میں اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو دن رات فاقے کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں جلد سے جلد پاکستان پہنچوں گا۔ آپ خدا پر بھروسہ رکھیں۔ مصیبت کے یہ دن جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔“

عبدالمعبود خان نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی ”بیٹے! یہ سونے کا میڈل بیچنے سے پہلے اپنی طرف دیکھ لو۔ یہاں سے برما تک کا راستہ بہت ہی دشوار گزار ہے۔ صحیح سلامت ہاتھ پاؤں رکھنے والے راستے میں تھک کر گر جاتے ہیں۔ بنگال اور برما کے جنگلوں کا عذاب انھیں مار ڈالتا ہے۔ خدا تمھیں لمبی عمر دے لیکن کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ وہ قدم منزل تک پہنچ سکتے ہیں یا نہیں؟“

منظور نے بڑے عزم سے کہا ”چچا میاں! جب میرے پاؤں صحیح سلامت تھے تو میں گیند لے کر گول تک پہنچ جاتا تھا۔ ایک کھلاڑی کی منزل گول پوسٹ تک ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے صلے میں مجھے یہ سونے کا میڈل ملا تھا۔ جب میں زخمی پاؤں سے چلتا ہوا، مصائب سہتا ہوا پاکستان پہنچوں گا تو انشاءاللہ مجھے سونے کا مستقبل ملے گا۔“

عبدالمعبود خان عابد نے سر جھکا کر اس کے پیروں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں پاؤں کے دائیں بائیں سرے پر اپنے تمام جسم کا بوجھ اٹھائے کھڑا تھا۔ پاؤں کے تلوے صاف نظر آرہے تھے۔ وہاں خون کے لوتھڑے خشک ہو چلے تھے۔ گوشت کی سرخ رنگت ماند پڑ گئی تھی۔ اگر باقاعدہ علاج ہوتا تو وہ زخم شاید مہینوں میں بھر جاتے۔ اب تو برسوں تک توقع نہیں تھی، انھوں نے وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے سوچا۔ دیوانے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو پیروں سے نہیں بلکہ زخموں سے چل کر منزلِ محبوب تک پہنچتے ہیں۔

وہ جھاؤ تلا سے لوکل ٹرین میں بیٹھ کر چاٹگام اسٹیشن پہنچے۔ وہاں ان کا ایک ڈاکٹر دوست غلام انبیا رہتا تھا۔ شام کے وقت کلینک کھلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر غلام انبیا مریضوں میں گھرا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ دونوں نے مصافحہ کیا پھر عبدالمعبود خان عابد نے کہا ”میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں لیکن تنہائی میں۔“

”تو پھر صبر کرنا ہوگا۔ گھنٹے دو گھنٹے میں مریضوں سے نمٹ لوں گا۔“

”اچھی بات ہے۔ میں دو گھنٹے بعد آجاؤں گا۔“

وہ کلینک سے نکل کر بیپائی بیتان نیو مارکیٹ پہنچے۔ وہاں ایک سنار کو سونے کا میڈل دکھایا۔ سنار نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر کہا ”یہ تو ساگر ٹورنامنٹ کا میڈل ہے۔ آپ بوڑھے ہیں۔ یہ آپ کو کہاں سے مل گیا۔ یہ تو جوانوں کو ملتا ہے۔“

”میرا بھتیجا فٹ بال کا کھلاڑی ہے۔ اسے انعام میں ملا تھا۔“

”آپ کے بھتیجے کا نام کیا ہے؟“

"منظور احمد۔ وہ بہت مشہور کھلاڑی ہے۔"

اس کا نام سنتے ہی دوسرے کاؤنٹر پر کھڑا ہوا نوجوان تیزی سے چلتا ہوا اپنے سنار باپ کے پاس آیا پھر اس کے ہاتھ سے میڈل لے کر دیکھتے ہوئے بولا "کیا یہ منظور میاں کا میڈل ہے؟"

عبدالمعبود خان عابد نے سر ہلا کر کہا "ہاں' یہ اسی کا ہے۔"

"لیکن منظور صاحب اسے کیوں بیچ رہے ہیں؟"

"بیٹے! اگر تم منظور احمد کو اچھی طرح جانتے ہو تو اس کی مجبوریوں کو بھی سمجھ سکتے ہو۔"

نوجوان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں' وہ بہاری ہے اور ان دنوں کن مصیبتوں میں مبتلا ہوگا۔ یہ میں سمجھ سکتا ہوں۔ میں ان کا بہت مداح ہوں۔ جب بھی ان کا کھیل ہوتا ہے' اپنے دوستوں سے بازی لگاتا ہوں کہ وہ ضرور مخالف ٹیم کے خلاف گول کریں گے اور یہ شرط میں ہمیشہ جیت جاتا ہوں۔ افسوس' آج اتنا بڑا کھلاڑی اپنے حالات سے مجبور ہو کر اسے بیچ رہا ہے۔ میں اسے بکنے نہیں دوں گا۔"

اس کے سنار باپ نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا "یہ فٹبال گراؤنڈ نہیں ہے۔ کاروبار کی جگہ ہے' دکان ہے یہاں صرف کاروبار کی باتیں کرو۔"

اس جوان نے میڈل کا وزن کیا پھر کہا "یہ چونی بھر وزن کا ہے۔ زیادہ سے زیادہ پچیس روپے ملیں گے اور پچیس روپے میں ان کا کیا بھلا ہوگا؟ آپ پرابلم بتائیں۔ مجھے ان کے لیے کچھ کر کے بڑی خوشی ہوگی۔"

بوڑھے سنار نے اپنے بیٹے کے ہاتھ سے میڈل کو چھین کر عبدالمعبود خان عابد کے سامنے کاؤنٹر پر پھینکتے ہوئے کہا "یہ چونی بھر ہے۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ روپے ملیں گے۔ منظور ہو تو بیچ دو' پیسے لے جاؤ۔"

اس نوجوان نے میڈل کو اٹھا کر کہا "میرا نام جمال الدین ہے۔ میں آپ کے ساتھ باہر چل رہا ہوں۔ اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

وہ کاؤنٹر سے نکل کر جانے لگا۔ اس کا باپ آوازیں دیتا رہ گیا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ باہر پہنچ کر اس نے کہا "آپ مجھے منظور صاحب کے حالات بتائیں۔"

عبدالمعبود خان عابد نے جب یہ بتایا کہ اتنے نامور کھلاڑی کے دونوں پاؤں کے تلوے چاقو سے چھیل دیے گئے ہیں تو وہ سنتے ہی لرز گیا۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک رکشا کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "آئیے میرے ساتھ چلیے۔ ہم یہاں کے ایک کھلاڑی سے ملاقات کریں گے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ فٹبال کے ایک کھلاڑی کے مکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کھلاڑی نے کہا "میرا نام افسر میاں ہے۔ میں منظور کی ٹیم کا سینٹر فارورڈ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ دشمنوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ جب ہمیں اطلاع ملی تو دیر ہو چکی تھی۔ میں اپنی ٹیم کے تمام جوانوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ دشمن اس وقت تک اس کے دونوں پاؤں کے تلوے چھیل چکے تھے۔ پھر بھی ہم نے اس کی جان بچالی۔ اگر ہم وقت پر نہ پہنچتے تو شاید وہ اسے جان سے بھی مار سکتے تھے۔"

جمال الدین نے کہا "افسر میاں! تم سب کھلاڑی ہو۔ ایک دوسرے کی مدد سے گیند لے کر گول تک پہنچتے ہو اور یہ سبق حاصل کرتے ہو کہ منزل تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے کا تعاون بہت لازمی ہے۔"

افسر میاں نے کہا "بے شک' ہم یہ سبق حاصل کرتے ہیں۔"

"تو پھر منظور صاحب کو پاکستان تک پہنچانے کے لیے تمھاری ٹیم کے سارے جوانوں کو ان سے تعاون کرنا ہوگا۔ ان کے جو پرابلم ہیں۔ انھیں حل کرنا ہوگا۔"

"ہم ضرور کریں گے اور آج ہی منظور صاحب سے ملاقات کریں گے۔"

عبدالمعبود خان عابد نے خوش ہو کر کہا "میں تم جوانوں کے جذبات سے آج بہت خوش ہوں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ بنگالیوں اور بہاریوں کے درمیان اتنی نفرت اور خونریزی کے باوجود ہماری جوان نسل کی ایک بڑی تعداد تعصب اور نفرتوں سے پاک ہے لیکن اب رات کو جانا مناسب نہیں ہے۔ کل صبح ہم سب مل کر جائیں گے۔"

وہ ان جوانوں سے رخصت ہو کر ڈاکٹر غلام انبیا کے پاس پہنچے۔ وہ انھی کا انتظار کر رہا تھا۔ کہنے لگا "ہاں تو فرمائیے۔ تنہائی میں کیا باتیں کرنا چاہتے ہیں؟"

"ایک بہاری کے زخم بھرنے ہیں۔ وہ میرے جگری دوست کا بیٹا ہے۔"

"معاملہ کیا ہے؟"

عبدالمعبود خان عابد اسے منظور کے متعلق بتانے لگے۔ تمام باتیں سننے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اگر وہ جوان یہاں سے پاکستان جانا چاہتا ہے تو اس سلسلے میں میرا بھی ایک پرابلم ہے۔ تم میرے کام آؤ۔ میں تمھارے کام آتا ہوں۔"

"میں ابھی تمھارا پرابلم سنوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ۔ کیا پاؤں کے

تلووں کے بغیر وہ اتنا لمبا سفر کر سکتا ہے؟"

ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا: "میرے خیال میں تو یہ ناممکن ہے لیکن جوانوں کا حوصلہ کچھ اور ہوتا ہے جس کام کو ہم ناممکن کہتے ہیں۔ وہ اسے دشوار کہتے ہیں اور کوئی دشواری جوانوں کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔"

"درست کہتے ہو۔ ہم بوڑھے سمجھتے ہیں مقدر منزل تک لے جاتی ہے جوان کہتے ہیں۔ ان کی جوانمردی وہاں پہنچاتی ہے بہرحال اپنا پرابلم بتاؤ۔"

ڈاکٹر غلام انبیاء نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا: "میرے ایک بنگالی دوست کا لڑکا ہے۔ وہ بھی پاکستان جانا چاہتا ہے۔"

عبدالمعبود خان عابد نے حیرانی سے پوچھا: "بنگالی یہاں سے پریشان ہو کر ہندوستان یا برما جاتے ہیں۔ وہ پاکستان جا کر کیا کرے گا؟"

"بھئی جس طرح تم اردو میں شاعری کرتے تھے اور یہاں مجرم سمجھے جاتے تھے۔ اسی طرح اس کا باپ بنگالی ہونے کے باوجود حکومتِ پاکستان کا وفادار تھا۔ آج اس کے لیے بنگلہ دیش کی زمین تنگ ہو گئی ہے۔ جہاں جاتا ہے۔ وہاں دشمنوں کا خوف پیچھا کرتا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں اس دلال سے بات کروں گا جو منظور کو لے جائے گا۔"

"جو اخراجات ہوں گے۔ وہ میں پورے کروں گا۔"

"منظور کے پاؤں کے زخم کتنے دنوں میں بھر سکتے ہیں؟"

"تمہارے بیان کے مطابق مہینوں لگ جائیں گے۔ ویسے میں زخم دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔"

"تم کل صبح میرے ساتھ چل سکتے ہو؟ اپنے دوست کے لڑکے کو بھی لے چلنا۔ وہاں ہم دلال سے معاملات طے کر لیں گے۔"

ڈاکٹر غلام انبیاء راضی ہو گیا۔

دوسرے دن منظور احمد کے مکان کے اندر اور باہر اس کے مداحوں کی بھیڑ لگ گئی۔ بنگالی نوجوان کھلاڑی اس کے لیے راشن، کپڑا، نقد روپے اور ضرورت کا بہت سا سامان لے کر آئے تھے۔ ڈاکٹر انبیاء بھی دواؤں کی اٹیچی کے ساتھ اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں پہنچے تھے۔ عبدالمعبود خان عابد نے ان سے پوچھا: "تم اپنے دوست کے صاحبزادے کو کیوں نہیں لائے ہو؟"

"میں بہت محتاط ہوں۔ اسے گھر میں چھپا رکھا ہے۔ باہر اگر کوئی اسے غدار کی حیثیت سے پہچان لے گا تو مجھ پر ایک غدار کو پناہ دینے کا الزام عائد ہو جائے گا۔ جب یہاں کسی دلال سے معاملات طے ہو جائیں گے اور جانے کا دن مقرر ہو جائے گا تو میں اسے یہاں لے آؤں گا۔"

فٹبال کا ایک شوقین کہہ رہا تھا: "منظور صاحب! ہم آپ کو یہاں سے نہیں جانے دیں گے۔ آخر یہاں کیا تکلیف ہے۔ دشمنوں نے آپ کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا ہم بدلہ لیں گے آپ کے پیروں کا علاج کرائیں گے۔ ان شاء اللہ آپ جلد ہی چلنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

منظور نے کہا: "آپ لوگوں سے مجھے جتنی محبت مل رہی ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ میں نہ جاؤں لیکن میں جس قدر آپ لوگوں سے گھل مل کر رہتا آیا ہوں۔ میری فیملی اسی قدر آپ لوگوں سے دور رہتی آئی ہے۔ ہمارے خاندان کے لوگ کہتے ہیں ہم پاکستان میں رہنے کے لیے ہندوستان چھوڑ کر آئے اور آج بھی پاکستان کی محبت میں بنگلہ دیش چھوڑ کر جائیں گے۔ جئیں گے تو پاکستان میں، مریں گے تو پاکستان میں۔ جب حب الوطنی کے جذبات اس قدر انتہائی ہوں تو ہم میں سے کسی کو راستے میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔"

ان کی باتوں کے دوران غلام انبیاء نے اس کے زخموں کا معائنہ کیا۔ ان کی صفائی کی، مرہم لگایا، پٹی باندھی پھر انجکشن لگاتے ہوئے کہا: "میں تمہیں زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کا مشورہ دوں گا کم از کم ایک برس تک گھر سے نکلنے کا خیال دل سے نکال دو میرے اندازے کے مطابق تم چار چھ مہینے میں اپنے پاؤں زمین پر جما کر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکو گے۔"

عبدالمعبود خان عابد نے مسکراتے ہوئے کہا: "ڈاکٹر! تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا، کل یہ لڑکا میرے سامنے اپنے پیروں پر چلتا ہوا باہر دروازے تک آیا تھا۔"

ڈاکٹر نے منظور کو بے یقینی سے دیکھا۔ منظور نے کہا: "میں پاؤں کے ان دو ابھروں پر اپنے جسم کا بوجھ ڈال کر چل سکتا ہوں۔"

"چلنے کی ضرورت کیا ہے؟ جب تک زخم بھر نہ جائیں۔ تب تک کیا تم زمین پر بیٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت نہیں کر سکتے اور کہیں آنے جانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ آرام سے بستر پر پڑے رہو۔"

"ڈاکٹر! میں اسپورٹس مین ہوں۔ نہ تو میں بیماروں کی طرح بستر پر زیادہ عرصے تک لیٹ سکتا ہوں، نہ ہی اپاہجوں کی طرح زمین پر رینگ سکتا ہوں۔ میں چلنا پھرنا، دوڑنا اور ورزش کرنا چاہتا ہوں۔ میں جب بھی بستر سے اٹھوں گا تو دونوں پاؤں کے بل پر اٹھوں گا۔ آپ میرے لیے ایسی دوائیں، انجکشن اور مرہم وغیرہ تجویز کریں جنہیں میں سفر کے دوران استعمال کر سکوں میرے زخم ساتھ ساتھ بھرتے رہیں اور سفر کے دوران مجھے ڈاکٹر اور دواؤں کی ضرورت نہ پڑے۔"

ڈاکٹر انبیاء نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "وہ تو میں

ضرور کروں گا لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ تم بنگال اور برما کے جنگلات میں اپنے پاؤں پر چل سکو گے۔ میرا مشورہ ہے اپنے ساتھ ایک اسٹریچر لے جانا۔ تاکہ ہمسفر تمھیں اٹھا کر لے جا سکیں۔"

"ڈاکٹر! میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک اسپورٹس مین کا مذاق نہ اڑائیں۔ میں مر جاؤں گا مگر جیتے جی کسی کے کاندھے کا سہارا نہیں لوں گا۔"

ڈاکٹر نے تعریفی نظروں سے مسکرا کر دیکھا پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا: "آخر جوان ہو ایسی ہی باتیں کرو گے۔ بہر حال میں سمجھتا ہوں، نہ تو یہ پاؤں تمھیں پاکستان پہنچائیں گے اور نہ ہی تقدیر نے آج تک کسی اپاہج کا ساتھ دیا ہے۔ اگر تم اپنی منزل تک پہنچو گے تو صرف اپنے حوصلے سے۔"

وہ عبدالمعبود خان عابد کے ساتھ باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سنار کے بیٹے جمال الدین نے اپنی جیب سے سونے کا وہ میڈل نکالا پھر اسے دکھاتے ہوئے کہا: "اب اسے بیچنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم اتنے سارے لوگ تمھاری ہر طرح سے مدد کر رہے ہیں۔"

"مجھے آپ لوگوں کی دوستی اور محبت سے بے انتہا خوشی حاصل ہو رہی ہے لیکن یہ خیال ستا رہا ہے کہ میں ایک معذور کی حیثیت سے امداد حاصل کر رہا ہوں۔"

"انسان کو اتنا خوددار بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ضرورت کے وقت وہ کسی کی مدد حاصل نہ کرے۔ آخر انسان ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ہی مخالف ہواؤں کے سامنے ثابت قدم رہ سکتے ہیں۔"

ایک جوان نے کہا: "اگر تمھاری خودداری کو ٹھیس پہنچتی ہے تو ہماری اس امداد کو یاد رکھنا۔ تمھارے اچھے دن آئیں گے تو ہمارے بھی کسی کام آجانا۔"

جمال الدین نے کہا: "منظور صاحب! سونے کا یہ میڈل ایک طرح سے آپ کا نہیں رہا کیونکہ اسے فروخت کرنے کے لیے بازار بھیجا گیا تھا۔ یہ ایک مجبور بہاری کے ہاتھ سے نکل کر صاحبِ حیثیت بنگالیوں کے ہاتھوں میں آگیا ہے۔ آپ یہاں سے جانے والے ہیں۔ اس میڈل کو ہماری طرف سے تحفہ سمجھ کر قبول کر لیجیے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد یہ آپ کی اور آپ کے احباب کی نظروں میں آئے گا تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ جس بہاری نے بھی بنگالیوں سے محبت کی۔ بنگالیوں نے جواباً اس کے سینے پر محبت کے تمغے سجا دیے۔"

جمال الدین نے آگے بڑھ کر اس میڈل کو منظور کے گلے میں پہنا دیا۔ تمام نوجوان خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔

دو دن کے بعد اسی کالونی کے ایک مکان میں کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اس مکان کے ایک کمرے میں عظمیٰ چند عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسرے کمرے میں مرد حضرات باتیں کر رہے تھے۔ ایک بنگالی کہہ رہا تھا: "ہم ایک آدمی کا تین سو ٹاکا لیتا ہے اور بوڑھا مانوس کو، بیمار مانوس کو لے کے نہیں جاتا ہے۔ کوئی اپنے سے جانا مانگتا ہے تو ہم کیا کرے گا۔ ہم کو ٹوٹا کا سے مطلب ہے اگر وہ راستے میں بیمار ہو جاتا ہے۔ آگے چلنے کو نہیں سکتا ہے تو ہم اس کو وہی جگہ میں چھوڑ دیتا ہے۔ ایک مانوس کے واسطے دس مانوس کو نہیں روک سکتا۔ روکنے سے وہ لوگ بھی پھنسے گا اور ہم بھی پھنس جائے گا۔"

ایک شخص نے کہا: "ٹھیک ہے تم اپنے ٹاکا سے مطلب رکھو مگر میرے بیٹے کو لے جاؤ۔"

"تمار چھیلے کے پاؤں کا تلا نہیں ہے۔ وہ کھڑے ہونے کو نہیں سکتا، چلنے کو کیسے سکے گا؟"

"وہ چلے گا اور چلنے والوں سے زیادہ چلے گا۔ میں اپنے بیٹے کے حوصلوں کو خوب سمجھتا ہوں۔"

دوسرے لوگ اس کی تائید کرنے لگے۔ دلاّل کو سمجھانے لگے کہ اسے صرف اپنے پیسوں سے مطلب رکھنا چاہیے اگر ایک راہی چلتے چلتے گر پڑے۔ آگے نہ بڑھ سکے تو اس میں راہنما کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔

"اے باری آمی چار جون (آدمی) کے نیئے جابو (اس بار میں چار آدمیوں کو لے جاؤں گا) ایک جون کا پاؤں ہے مگر نہیں ہونے کے مافق ہے۔ دوسرا بوڑھا مانوس ہے۔ وہ راستے میں بہت گڑبڑ کرے گا۔ تیسری ایک گونگی ہے۔ اس کے اوپر میں کوئی شک نہیں کرے گا مگر وہ زنانہ ہے اور زنانہ لوگ بہت مصیبت کورتا ہے۔"

عظمیٰ سر جھکائے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ڈاکٹر غلام انبیا کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا: "اور چوتھا شخص میرا یہ بھتیجا ہے اور یہ بنگالی ہے۔"

کسی نے پوچھا: "تعجب ہے۔ جب یہ بنگالی ہے تو اسے بنگلہ دیش سے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے۔" ایک جوان کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی وہ کہہ رہا تھا: "میں بنگالی ہوں اور میں پاکستان جا رہا ہوں۔ میرے جانے پر کسی کو حیران نہیں ہونا چاہیے جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا دشمن ہو سکتا ہے تو ایک بنگالی دوسرے بنگالی کا دشمن کیوں نہیں ہو سکتا؟ حالانکہ بنگالی زیادہ تر مسلمان ہیں۔ ہندو بنگالی اب ہم سے دور دور رہتے ہیں ہم سے انھیں جو کام لینا تھا وہ انھوں نے لے لیا۔"

اس جوان کی آواز سنتے ہی عظمیٰ یکلخت اٹھ کر کھڑی ہو گئی اس کے چہرے پر ایسی تازگی آ گئی جیسے کوئی دیرینہ شناسا مل گیا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا: "پاکستان سے محبت کرنے والے صرف بہاری نہیں ہیں۔ بنگالی بھی ہیں اور ایسے بنگالی یہاں غدار سمجھے جاتے ہیں۔"

وہ دیوار سے لگ گئی۔ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جانے لگی۔ آواز سننے کے بعد آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا: "میرے والد سلیم الدین بھویاں دیناج پور کے ایک معزز جج تھے۔ وہ بحیثیت جج قانون کا احترام کرتے تھے۔ پاکستان سے وفا کرنے کے جرم میں انھیں میری ماں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ میں اپنی جان بچا کر یہاں تک پہنچا ہوں اگر دشمنوں میں سے کسی نے مجھے پہچان لیا تو وہ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ وہ کہہ رہا تھا: "سچ پوچھو تو میں اب تک شاید زندہ نہ رہتا۔ جب میرا اپنا کوئی بھی اس دنیا میں نہیں رہا تو میں رہ کر کیا کرتا۔ میرے اندر کشمکش جاری تھی۔ زندہ رہوں یا مر جاؤں۔ خودکشی کر لوں یا دشمنوں سے انتقام لیتے لیتے اپنی جان دے دوں۔ اسی کشمکش کے دوران میری زندگی میں ایک ایسی ہستی آئی جس نے میرے اندر زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ میری آنکھوں کو محبت کی وہ بینائی دی کہ دنیا بالکل نئی اور خوبصورت نظر آنے لگی۔ ابھی آپ لوگوں نے ایک گونگی کا ذکر کیا تو میرے تصور میں وہی ہستی آ کر مسکرانے لگی اور اپنا نام بتانے لگی: "اوڑما!"

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ عظمیٰ کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: "میں نہیں جانتا اوڑما کیا نام ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے مگر یہ تمام دنیا کی عورتوں کے ناموں میں سب سے پرکشش نام ہے۔ وہ پیدائشی گونگی تو نہیں تھی۔ کسی نے اس کی زبان کاٹ دی تھی، اور اس کی کٹی ہوئی زبان سے محبت کا یہی نام ادا ہوتا ہے: اوڑما!"

وہ اچانک ہی کھلے ہوئے دروازے کے عین وسط میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ سلیم الدین بھویاں کے سامنے جیسے بجلی لپک گئی ہو۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ منہ کھلا رہ گیا۔ وہ ایک ٹک عظمیٰ کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے بجلی کوندنے کے بعد کچھ اور نظر نہ آ رہا ہو۔ بس اسی بجلی کا تصور رہ گیا ہو اور وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ تصور ہی ہے یا وہ حقیقتاً سامنے آ گئی ہے؟

○

یہ روز کا معمول تھا۔ نین تارا اور خسرو رات کے آٹھ بجے بڑو دیدی کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ تلسی رام کے آنے کے بعد بھی یہی معمول رہا۔ کھانے کے بعد وہ حویلی کی چھت پر بیٹھ کر گھنٹے دو گھنٹے تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ کبھی ہریا گفتگو کا موضوع بنتا تھا۔ کبھی بنگلہ دیش کے حالات پر تبصرے ہوتے تھے۔ رات کے دس بجے تک وہ دونوں کمرے میں آ جاتے تھے۔ ان کے لیے بڑو دیدی نے شروع دن ہی سے ایک کمرہ مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ انھیں میاں بیوی سمجھتی تھی۔ لہٰذا نین تارا کو ایک سہاگن کا بھرم رکھنا پڑتا تھا۔

جب وہ پہلی بار خسرو کے ساتھ سید پور آئی تھی تو بڑو دیدی نے عظمیٰ کو الگ کمرہ دیا تھا۔ نین تارا ذرا دیر کے لیے بھول گئی تھی کہ اسے ایک سہاگن کا رول ادا کرنا ہے۔ وہ عظمیٰ کے ساتھ سونے جا رہی تھی۔ اسی وقت بڑو دیدی نے آ کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ پھر اسے کھینچتے ہوئے خسرو کے کمرے میں لے آئیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں۔ شاید میاں بیوی میں ناراضگی ہے۔ اس لیے نین تارا عظمیٰ کے پاس سونے جا رہی تھی۔ بہرحال انھوں نے اپنی دانست میں میاں بیوی کے درمیان صلح کرانے کے لیے انھیں ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ وہ رات نین تارا کے لیے قیامت کی رات تھی۔ اگرچہ وہ غیر نہیں تھا۔ اپنا ہی تھا۔ دل سے قریب تھا۔ اس کے باوجود وہ تمام رات بند دروازے سے لگی بیٹھی رہی جیسے خسرو پکڑنے آئے گا تو وہ دروازہ توڑ کر نکل جائے گی۔

خسرو نے سمجھایا تھا: "دیکھو تم آرام سے پلنگ پر سو جاؤ۔ میں زمین پر چٹائی بچھا کر لیٹ جاؤں گا۔ اگر تم مجھ سے ڈرتی رہو گی اور بڑو دیدی کے سامنے غیر شعوری طور پر مجھ سے کتراتی رہو گی تو وہ تاڑ لیں گی۔ تمھیں یہاں رہ کر یہ رشتہ نبھانا ہے۔"

"نہ، نہیں سوؤں گی۔ بس یونہی دروازے کے پاس بیٹھی رہوں گی۔"

"اگر تم مجھ پر بھروسہ نہیں کرتی ہو اور مجھ سے ڈرتی ہو تو چلو ہم بڑو دیدی کے سامنے اعتراف کر لیں۔ ان سے کہہ دیں کہ ابھی ہماری رخصتی نہیں ہوئی ہے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی: "نہیں انھیں معلوم ہو گا تو پھر وہ تمھیں روک لیں گی۔ مجھے پاکستان میں اپنے بھائیوں کے پاس پہنچانے کے لیے یہاں سے کسی قافلے کے ساتھ روانہ کر دیں گی۔ میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

وہ اسی طرح باتیں کرتے رہے اور رات گزرتی رہی۔ اس رات دونوں سو نہ سکے پھر دوسری رات آئی۔ اس کے بعد تیسری رات آئی۔ رفتہ رفتہ نین تارا کے دل میں اعتماد پیدا ہوتا گیا۔ وہ خسرو کی شرافت اور پارسائی کی قائل ہو گئی۔ اب وہ رات کے

کھانے کے بعد ہنسی خوشی کمرے میں آجاتی تھی۔ دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد اپنے لیے فرش پر چٹائی بچھاتی تھی۔ پھر ایک تکیہ رکھتی تھی اور بڑے اعتماد سے لیٹ جاتی تھی۔ خسرو پلنگ پر رات گزارتا تھا۔

رات تو گزر جاتی تھی۔ اعتماد بھی بحال ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ایسے شریفانہ ماحول کے پروردہ تھے کہ گناہ کی ترغیب پہ مر سکتے تھے مگر گنہگار نہیں بن سکتے تھے۔ نہ وہ بہک سکتے تھے نہ ایک دوسرے کو بہکا سکتے تھے۔ تاہم انھیں بڑی مشکلوں سے نیند آتی تھی۔ وہ ادھر سے اُدھر کروٹیں بدلتے رہتے تھے کبھی یہ دائیں کروٹ ہوتی اور وہ بائیں کروٹ بدلتا تو دونوں کی نظریں ٹکرا جاتی تھیں۔ وہ پلنگ پر سے اور یہ فرش پر سے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے جیسے زمین آسمان کو اور آسمان زمین کو دیکھ رہا ہو۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ساڑی کو ادھر اُدھر سے درست کرنے لگی۔ خسرو پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

وہ سر جھکا کر بولی: "بڑی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا: "یوں لگتا ہے جیسے ہم دونوں کو چولہے میں جھونک دیا گیا ہو۔"

"جب تک ہم یہاں رہیں گے۔ جلتے رہیں گے۔"

"بڑو دیدی نے کہا ہے کہ ایک ہفتے بعد ہی وہ ہمارے ساتھ ہندوستان جائیں گی پھر ہمیں وہاں سے..."

نیمن تارا نے بات کاٹ کر کہا: "وہ نہیں جائیں گی۔ آج صبح کہہ رہی تھیں کہ ہریا پر مقدمہ چل رہا ہے اور اس مقدمے میں ان کی پیشی بھی ہوتی ہے۔"

خسرو نے کہا: "دیدی نے تحریری بیان دے دیا ہے۔ اب ان کی پیشی نہیں ہوگی۔"

"ہو یا نہ ہو۔ جب تک مقدمہ چلتا رہے گا ششی کو یہاں رہنا پڑے گا اور دیدی اسے تنہا چھوڑ کر ہندوستان نہیں جائیں گی۔"

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم کیسے جائیں گے؟"

"پوچھا تھا کہنے لگیں۔ کسی بھروسے کے آدمی کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں ہندوستان سے نیپال بھیج دیا جائیگا۔"

"پھر تو ہمیں اطمینان رکھنا چاہیے۔"

"مجھے اطمینان نہیں ہوگا۔ اس قید خانے میں ذہنی اذیتیں مل رہی ہیں۔"

"نیمن تارا! چونکہ ہم میاں بیوی نہیں ہیں۔ اس لیے یہ کمرہ قید خانہ لگ رہا ہے۔ ہمارے دماغوں پر بوجھ ہے۔ اصل بات احساسات کی ہے۔"

"بات احساسات کی نہیں حالات کی ہے۔ یہ گھر ہمارا نہیں ہے' یہ زمین پاکستان کی زمین نہیں ہے۔ یہ لوگ ہمارے ہیں مگر ہمارے رشتے دار نہیں ہیں۔ حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے سروں پر ننگی تلواریں لٹک رہی ہیں۔ احساسات دراصل حالات کے تابع ہوتے ہیں۔ کوئی یہ ننگی تلواریں ہٹا دے پھر ہمارے سروں پر ہمارے وطن کا آسمان ہو تو احساسات یکسر بدل جائیں گے۔ تم دیدی سے کہتے کیوں نہیں؟ وہ فوراً ہماری روانگی کا انتظام کر دیں گی۔"

"میں نے دیدی اور جیجا جی دونوں سے کہا تھا۔ وہ کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے لیے فکر مند ہیں۔"

"تم اپنی طرح سبھی کو فکر مند سمجھنے لگتے ہو۔ میرا تو یہاں ایک ذرا جی نہیں لگتا۔ کھاتی ہوں تو کھایا نہیں جاتا۔ لقمہ حلق میں پتھر کی طرح اٹکتا ہے۔ نیند نہیں آتی ہے اگر آتی ہے تو بھیانک خواب آتے ہیں۔"

"نیمن تارا! ہم آگ اور خون کے دریا سے گزر کر آئے ہیں۔ کیا تم کچھ دنوں تک حالات سے سمجھوتہ نہیں کر سکتیں؟"

"نہیں' یہاں ہر لمحہ جھوٹے الزامات اور سازشوں کا ڈر لگتا ہے۔ تم نے یہاں آکر اناج فروخت کیا۔ تمھارے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ گنہگار ہریا تھا مگر الزام تم پر آیا۔ لوگوں نے تمھیں کس بُری طرح مارا پیٹا۔ تمھیں ذہنی اور جسمانی اذیتیں پہنچائیں ہیں۔ دیدی نے یہ سب تماشا دیکھا لیکن چپ رہیں۔ بعد میں انھیں غلطی کا احساس ہوا۔ انھوں نے معافی مانگ لی۔ ہم نے بھی صاف دل سے معاف کر دیا ہے لیکن دل کے آئینے میں جو بال پڑ گیا ہے۔ وہ کبھی نہیں جائے گا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ ششی سے سامنا ہوتا ہے تو میری گردن جھک جاتی ہے۔ میں نے گناہ نہیں کیا ہے لیکن گناہ کا حوالہ دے کر مجھے اس سے منسوب کیا گیا۔ یہ ایسی شرمناک بات ہے کہ میں اس سے نظریں نہیں ملا سکتا۔ ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں دن رات سامنا ہوتا ہی رہتا ہے پھر جیجا جی اور دیدی کے سامنے اس کے ساتھ اتفاقاً بیٹھنا پڑتا ہے اور یہ بات مجھے ایک ذرا اچھی نہیں لگتی۔ جی چاہتا ہے کہیں بھاگ جاؤں۔"

"ہاں مجھے چھوڑ کر بھاگ سکتے ہو۔ دراصل میں تمھارے پاؤں کی زنجیر ہوں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"سچ کہہ رہی ہوں۔ اگر میں نہ ہوتی تو تم مردانہ وار کسی راستے سے بھی ہندوستان کی طرف یا برما کی طرف نکل جاتے۔"

"تنہا سرحدوں کو پار کرنا مردانگی نہیں ہے۔ مرد وہ ہوتا ہے جو اپنے رشتوں اور اپنی محبتوں کو اپنے ساتھ سمیٹ کر ہر خطرے

سے گزرتا ہے۔ میں تمھیں چھوڑ کر جاؤں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے میں اپنی جان یہاں چھوڑ دوں اور زندہ لاش کو گھسیٹتے ہوئے یہاں سے لے جاؤں۔ آئندہ ایسی بات نہ کہنا۔"

"نہیں کہوں گی لیکن میں نے دل میں ایک فیصلہ کر لیا ہے جب تک دیدی ہماری روانگی کا انتظام نہیں کریں گی۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

دوسری صبح خسرو کمرے سے نکل کر غسلخانے میں گیا۔ کمرے کے ساتھ ہی ایک غسلخانہ بنا ہوا تھا۔ وہاں کا یہ دستور تھا کہ صبح اٹھتے ہی غسل کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد ہی بڑو دیدی کسی کو بھی رسوئی میں آنے کی اجازت دیتی تھی۔ نین تارا نے کمرے کی کھڑکی کے پاس آکر سلاخوں کے پار دیکھا۔ صحن کے دوسری طرف رسوئی گھر تھا۔ خسرو وہاں پہنچ کر کہہ رہا تھا: "دیدی! بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ جلدی کھانا دیجیے۔"

رسوئی گھر سے پوریاں تلنے کی آواز آرہی تھی۔ خالص گھی کی مہک نتھنوں تک پہنچ رہی تھی۔ بڑو دیدی پوچھ رہی تھی۔

"بھوجائی نے غسل کر لیا؟"

"نہیں، وہ غسل نہیں کرنا چاہتی ہے۔ مجھ سے جھگڑ رہی ہے۔"

"تم اسے پریشان کیوں کرتے ہو۔ جاؤ اسے منا کر لاؤ۔"

"مجھ سے نہیں مانے گی۔ آپ ہی جا کر اسے منائیں۔"

"ہائے رام، کیا تم نہیں جانتے۔ جب تک تم میں سے کوئی غسل نہ کرے۔ میں سامنے نہیں جاتی۔ اگر چلی جاؤں تو پھر پوجا نہیں کر سکتی۔ چھی چھی۔"

"پھر تو مجھے نین تارا کے سامنے نہیں جانا چاہیے کیونکہ میں نے بھی غسل کر لیا ہے۔ آپ کی طرح مجھے بھی دور سے چھی چھی کہنا چاہیے۔" بڑو دیدی خسرو کا مذاق نہیں سمجھ سکیں۔

"ارے دور سے اپنی روٹھی ہوئی بیوی کو منا تو سکتے ہو۔ اسے غسل کرنے کے لیے کہہ سکتے ہو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ رسوئی گھر سے باہر آئیں پھر بیچ صحن میں پہنچ کر کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں: "نین تارا! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ جاؤ، غسل کیوں نہیں کرتی ہو؟"

اس نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا: "میں نہ تو غسل کروں گی نہ کچھ کھاؤں گی۔"

"خسرو کا غصہ ہم پر کیوں اتار رہی ہو؟"

"مجھے غصہ کسی پر نہیں، صرف اپنے حالات پر ہے۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ مجھے سوتے جاگتے اپنے رشتے داروں کا خیال آتا رہتا ہے۔ میں جب تک اپنے بھائیوں کے پاس نہیں پہنچوں گی۔ مجھے کھانا اچھا لگے گا نہ سونا۔ آپ نے مجھے نئی ساری خرید کر دی تھی۔ میں نے بہانہ کر دیا تھا کہ کل پہنوں گی لیکن دیدی! وہ کل کبھی نہیں آئے گا۔ نیا لباس خوشی کی علامت ہے۔ جب تک مجھے اپنے بھائیوں کے درمیان پہنچنے کی خوشی حاصل نہیں ہوگی میں وہ ساری نہیں پہنوں گی۔"

تلسی رام نے غسل خانے سے نکلتے ہوئے تولیہ اپنے کاندھوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا: "کیا بات ہو گئی۔ نند بھاوج میں لڑائی ہو رہی ہے؟"

شانتا نے کہا: "ابھی تو نہیں ہو رہی ہے لیکن آپ ہمارے درمیان ضرور لڑائی کرائیں گے۔ میں ایک ہفتے میں دس بار آپ سے کہہ چکی ہوں۔ ان کے جانے کا بندوبست فوراً کر دیں لیکن آپ اس کان سے سنتے ہیں۔ اس کان سے نکال دیتے ہیں۔"

تلسی رام نے تولیے سے اپنے سر کے گیلے بالوں کو پونچھتے ہوئے کہا: "شانتا! میں بنیے کا بیٹا ہوں۔ کوئی کام کرتا ہوں تو اس میں اپنا فائدہ بھی دیکھتا ہوں۔ خسرو اور نین تارا کو کھلنا سے یہاں بھیجا تو ان کے ساتھ اناج کا ویگن بھی یہاں پہنچ گیا۔ اب یہ دونوں ہندوستان جائیں گے۔ تو میں ان کے ساتھ ساتھ اپنی چاندی بناؤں گا۔"

خسرو نے پوچھا: "کیا اس بار بھی ہمیں کچھ مال لے کر جانا ہوگا؟"

"ہاں، کوئی بھاری بھرکم مال نہیں ہے۔ میں ایک ہفتے سے بھاگ دوڑ کر کے یہاں کے لوگوں سے چاندی خرید رہا ہوں۔ معاملہ یہ ہے کہ میں یہاں پاکستان اور بنگلہ دیش کی کرنسی میں کما رہا ہوں۔ یہ کرنسی ہندوستان بھیجوں گا تو سو روپے کے بدلے ساٹھ روپے ملیں گے اور چاندی خرید کر بھیجوں گا تو اسے بیچنے پر سو کی جگہ سوا سو روپے ملیں گے۔"

"لیکن جیجا جی! ہندوستان میرے لیے اجنبی ملک ہے۔ میرے لیے قدم قدم پر وہاں خطرات ہوں گے۔ میں چاندی لے جا کر کہاں فروخت کروں گا؟"

"تمھیں کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ یہ سب میرے آدمی کریں گے اور میرے آدمی تم دونوں کو نیپال تک پہنچا دیں گے۔ اسے بھی

برفالٹ اپنی تصنیف MAKING OF HUMANITY میں صاف صاف الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ اہلِ مغرب نے سائنس اور سائنٹیفک طریقوں کو پہلی بار مسلمانوں سے سیکھا۔

نین تارا! تمھارے لیے خوشخبری ہے کل تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ گے۔ اب غسل کرو۔ خوب پیٹ بھر کر کھاؤ اور ہنستی بولتی رہو۔ خوش رہو۔"

وہ خوش ہو گئی۔ فوراً ہی غسل کرنے چلی گئی۔ شام کے وقت بڑو دیدی نے دونوں کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ کمرے میں پہنچے تو دیکھا بستر کی سفید چادر پر زیورات کے ڈبے کھلے ہوئے رکھے تھے۔ انھوں نے پوچھا "خسرو! تم نے مجھے کتنے روپے رکھنے کے لیے دیے تھے؟"

"دیدی! دو برس ہو گئے۔ میں بھول گیا ہوں۔ شاید دس ہزار روپے دیے تھے۔"

"کل تم جانے والے ہو۔ اس لیے حساب صاف ہونا چاہیے تم نے بارہ ہزار دیے تھے۔ یہ جانتے ہی ہو کہ وہ بنیے ہیں تو میں بنیے کی بیوی ہوں۔ ہمارے ہاں پیسے کو تجوری میں بند کر کے نہیں رکھا جاتا۔ اسے آگے بڑھایا جاتا ہے۔ تمھاری رقم کو میں نے ایک چھوٹے سے کاروبار میں لگایا تھا۔"

وہ ایک بہی کھاتہ کھولتے ہوئے کہنے لگیں "اس میں کمائی اور لاگت کا پورا حساب لکھا ہوا ہے۔ تم اسے دیکھ لو۔"

"نہ تو میں کاروبار کرتا ہوں اور نہ ہی میں نے وہ رقم آپ کو کسی کاروباری منافع کے لیے دی تھی۔"

انھوں نے کھاتے کو بند کرتے ہوئے کہا "ہمارے ہاں باپ بیٹے، بھائی بھائی اور میاں بیوی میں بھی کاروباری لین دین ہوتا ہے۔ کوئی اپنا منافع نہیں چھوڑتا۔ تم صرف اتنا سمجھ لو کہ دو برس میں تمھارے بارہ ہزار، ستر ہزار روپے بن گئے ہیں۔ تمھارے جیجا جی تمھیں اس میں سے دس ہزار روپے منافع کے طور پر دے رہے ہیں۔ بارہ ہزار تمھارے اپنے ہیں۔ آٹھ ہزار میں دے رہی ہوں۔ اس طرح تمھیں یہاں سے جاتے وقت تیس ہزار روپے ملیں گے۔"

وہ مسکرا کر بولا "مجھے خوشی ہے کہ میرے بارہ ہزار سے آپ لوگوں نے چالیس ہزار کمائے اور مجھے بھی تیس ہزار دے رہے ہیں۔"

بڑو دیدی نے کہا "وہ بھی اس طرح کہ ہم نقد روپے نہیں دیں گے کیونکہ ہندوستان جانے کے بعد ان روپوں کی قیمت گر جائے گی۔ میں سونے کے زیورات دے رہی ہوں۔ انھیں ہندوستان یا پاکستان جا کر فروخت کرو گے تو تیس ہزار سے زیادہ ملیں گے۔"

نین تارا نے آگے بڑھ کر کہا "دیدی! آپ کتنی اچھی ہیں ہم یہاں سے جانے کے بعد بھی آپ کو کبھی نہیں بھول سکیں گے۔"

"بھوجی! میں بھی تمھیں کبھی نہیں بھولنا چاہتی لیکن تم نے مجھے کبھی دلہن کا روپ نہیں دکھایا۔ یہاں میرے بھائی کی دلہن بن کر آئیں بھی تو اجڑی ہوئی سی۔ کتنی بار کہا۔ نئے کپڑے پہنو مگر تم نے نہیں پہنے۔ اب جانے سے پہلے میری یہ خواہش پوری کر دو۔ آج رات تم سرخ جوڑا پہنو گی۔ میں تمھیں یہ گہنے پہناؤں گی، تمھارا سنگھار کروں گی اور تمھیں دلہن بنا کر اپنے بھائی کے کمرے تک پہنچاؤں گی کیونکہ نئی دلہن کو بہنیں اپنے بھائی کے کمرے تک پہنچاتی ہیں۔"

نین تارا نے ایک دم سے گھبرا کر خسرو کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں چرا رہا تھا۔ بھلا کیا کہہ سکتا تھا۔ یہ کچھ کم نہ تھا کہ دونوں کو ہر رات ایک کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا۔ آج کچھ زیادہ ہی زیادتی ہونے والی تھی۔

⁂

روانگی کا وقت ہو چکا تھا۔ چار آدمیوں کا مختصر سا قافلہ چاٹگام سے برما کی طرف جانے والا تھا۔ منظور فٹبال پلیئر کے مکان کے سامنے جوانوں اور بوڑھوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ بنگالی جوان اس کے لیے ایک گاڑی لے کر آئے تھے۔ دلال نے کہا تھا کہ ان سب کو آٹھ یا نو بجے تک سفینہ ہوٹل پہنچ جانا چاہیے اور اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ کلیم الدین بھوتیاں جس دن سے سردار بہادر کالونی آیا تھا۔ اس دن سے ایک بہاری فیملی کے ساتھ وہیں دن گزار رہا تھا۔ ڈاکٹر غلام انبیاء نے ان کے لیے راشن پہنچا دیا تھا اور انھیں نقد روپے بھی دیے تھے تاکہ بھوتیاں اس فیملی پر بوجھ نہ بنے۔

دوسری طرف سید پور سے آنے والے کامریڈز عظمیٰ کو کسی بہاری کے مکان میں رکھنا چاہتے تھے لیکن عظمیٰ نے بھوتیاں کو دیکھتے ہی اس کے ساتھ رہنے کی ضد کی۔ زبان سے ضد کرتی تو کوئی نہ سمجھتا۔ اس نے اشاروں سے سمجھایا کہ جہاں یہ ہوگا وہاں میں رہوں گی۔ لہٰذا اسے بھی بھوتیاں کے ساتھ اسی فیملی میں چھوڑ دیا گیا۔

وہاں کے لوگ عظمیٰ کی بولی کو حیرانی سے سنتے تھے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کلیم الدین بھوتیاں اس کی باتیں سنتا تھا اور یوں مسکرا کر سر ہلاتا تھا جیسے سمجھ رہا ہو۔ ایک ہی مکان میں رہنے کے بعد جب عظمیٰ کو کچھ کہنے کا موقع ملا تو اس نے کہا "تم بھوڑا اڑے ہو (تم بہت اچھے ہو)"

اس مکان میں رہنے والے حیرانی سے اس کی بولی سن رہے تھے۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے وہ بولتی جا رہی تھی "بھوتیاں تم بہت اچھے ہو۔ میں جانتی ہوں تم مجھے اچھے لوگوں کی حفاظت میں چھوڑنا چاہتے تھے۔ اس لیے اس ٹرین سے دور کہیں جا کر گم ہو گئے تھے۔"

وہ خاک نہیں سمجھ رہا تھا مگر سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا سوچ رہا تھا۔ جب ایک لمبا سفر ٹھہرا اور اس کے بعد بھی عظمٰی اسی اعتماد سے اس کے ساتھ رہنا چاہے گی تو پہلے وہ اس کی کٹی ہوئی زبان کی بولی سمجھے گا۔ اسے لانے والے لوگوں نے بتا دیا تھا کہ اس کا نام عظمٰی ہے۔ کلیم الدین بھوتیاں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب وہ عظمٰی کہتی ہے تو اس کے منہ سے اوڑما کا لفظ ادا ہوتا ہے۔ تو ان میں کون سے حروف ایسے ہیں جو صحیح ادا نہیں ہوتے؟

وہ چھ دنوں تک اس مکان میں رہے۔ بھوتیاں اس کی باتوں کو کسی حد تک سمجھنے لگا۔ ساتویں دن صبح ان کی روانگی تھی۔ منظور فٹبال پلیئر کے مکان کے سامنے ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ محلے کے لوگ جمع تھے اور انھیں رخصت کر رہے تھے۔ کلیم الدین بھوتیاں نے کہا: ”میں آپ لوگوں کے ساتھ اس گاڑی میں نہیں جاؤں گا۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں۔ یہاں میرے کچھ دشمن ہیں۔ جنھیں میں دیکھ چکا ہوں لیکن انھوں نے مجھے نہیں دیکھا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس گاڑی میں سفر کے دوران وہ مجھے دیکھ لیں پھر میرے ساتھ ساتھ آپ لوگ بھی کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔“

ایک نے پوچھا: ”تو کیا تم سفینہ ہوٹل نہیں جاؤ گے؟“

”جاؤں گا مگر دوسرے راستے سے اور تنہا جاؤں گا۔“

”کیا تم یہاں کے راستوں سے واقف ہو؟“

”میں یہاں ایک سال تک رہ چکا ہوں۔ راستوں کو پہچانتا ہوں۔“

ایک نے کہا: ”یہ درست کہہ رہا ہے۔ ایک کی وجہ سے دوسروں کو نہیں پھنسنا چاہیے۔ پھر یہ جوان، صحت مند اور دلیر ہے۔ سفینہ ہوٹل تک پہنچ جائے گا۔ تم لوگ گاڑی میں چلے جاؤ۔“

عظمٰی تیزی سے چلتے ہوئے بھوتیاں کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی: ”میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“

اس کی گڑبڑ زبان کو سن کر ایک نے پوچھا: ”یہ کیا کہہ رہی ہے؟“

کلیم الدین بھوتیاں نے پوچھنے والے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: ”تم فکر نہ کرو۔ میں نو بجے تک سفینہ ہوٹل پہنچ جاؤں گا۔ عظمٰی یاد رکھو۔ ہمارے ساتھ جو دلال جا رہا ہے۔ اس کی ذمے داری بس اتنی ہے کہ وہ سرحد تک ہماری رہنمائی کرے لیکن ہر قدم پر تمھاری حفاظت کرنا میری ذمے داری ہے۔ اسی لیے میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھا رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ راستے میں میرے دشمن تمھارے دشمن بن جائیں۔ جہاں موقع دیکھوں گا۔ تمھارے قریب آؤں گا اور دور ہی سے تمھاری حفاظت کرتا رہوں گا۔ اب جاؤ دیر نہ کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ وہاں تک ضرور پہنچ جاؤں گا۔“

عظمٰی نے سر کو جھکا لیا۔ وہ اسے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ خود کو تنہا پایا تھا۔ رشتے دار اپنے نہیں تھے۔ ایک منعم باللہ نے اسے اپنایا تھا لیکن دشمنوں سے بدتر سلوک کیا تھا۔ نین تارا اور خسرو نے بھرپور محبتیں دی تھیں لیکن دنیا والوں کی الزام تراشی نے ان سے الگ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ کلیم الدین بھوتیاں ایک بار پھر اسے مل گیا تھا۔ جیسے ڈوبتی ہوئی امید پھر ابھر آئی ہو۔ اس سے گہری شناسائی نہیں تھی لیکن اس پر گہرا اعتماد تھا۔

بھوتیاں نے اس کے بازو کو تھام کر اسے گاڑی تک پہنچا دیا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ منظور بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں میں پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ انھیں لے جانے والا دلال پچھلی سیٹ پر تھا۔ اس کے ساتھ ان کا بوڑھا ہمسفر بیٹھا ہوا تھا۔ عظمٰی اس بوڑھے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

جب وہ گاڑی وہاں سے روانہ ہو گئی تو کلیم الدین بھوتیاں اپنے میزبانوں سے رخصت ہو کر پہاڑی کی طرف چل پڑا۔ سردار بہادر کالونی کے پیچھے سرسبز و شاداب پہاڑی تھی جس کی بلندی پر مشرقی پاکستان کے سابق گورنر ذاکر حسین کا بنگلہ تھا۔ اب وہ بنگلہ ویران تھا۔ دو چار نوکر وہاں رہتے تھے۔ دور دور تک سناٹا چھایا رہتا تھا۔ بھوتیاں اس بنگلے سے دور کا چکر لگا کر پہاڑی کی پگڈنڈیوں پر چلتا رہا اور تصور میں عظمٰی کو دیکھتا رہا۔ ان حروف کو یاد کرتا رہا۔ جو عظمٰی کی کٹی ہوئی زبان سے صحیح ادا نہیں ہوتے تھے۔ انھیں یاد رکھنے کے بعد ہی اس کی باتیں سمجھ میں آتی تھیں۔

کافی دور جانے کے بعد وہ پہاڑی سے اتر گیا۔ ایک پختہ سڑک پر چلنے لگا۔ آگے جا کر ایک بے بی ٹیکسی (آٹو رکشا) مل گئی۔ وہ اس میں بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف جانے لگا۔ دام پاڑہ سے گزرتے وقت اسے ایک سرکٹ ہاؤس نظر آیا۔ یہ وہی سرکٹ ہاؤس تھا جہاں بعد میں بنگلہ دیش کے صدر ضیاالرحمٰن کو گولی ماری گئی تھی۔ اسی سرکٹ ہاؤس میں کبھی پاکستان آرمی کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ سڑک کے دوسری طرف چٹاگانگ کا مشہور نیاز اسٹیڈیم نظر آ رہا تھا۔ وہ قاضی ڈیوڑھی سے گزرتا ہوا تین پل ماتھا کے سہ راہے پر پہنچ گیا۔ آگے جوبلی روڈ تھا۔ اس کے اطراف ہارڈ ویئر کی دکانیں نظر آ رہی تھیں۔ تھوڑی دور پر ہی گرانڈ ہوٹل اور سفینہ ہوٹل نظر آ رہے تھے۔ دلال اسے سفینہ ہوٹل کے باہر ہی مل گیا۔ وہ بھوتیاں کو ساتھ لے کر ہوٹل کے اندر ایک فیملی کیبن میں پہنچا۔ وہاں عظمٰی اپنے بوڑھے ہمسفر کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی

میز کے دوسری طرف منظور نظر آیا۔ کلیم الدین بھوئیاں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا: "منظور بھائی! کیسی طبیعت ہے۔ پاؤں میں تکلیف زیادہ تو نہیں ہے؟"

وہ مسکرانے لگا لیکن مسکراہٹ تھکی تھکی سی تھی۔ اس نے اپنی تھکن کو چھپاتے ہوئے کہا: "بالکل خیریت سے ہوں۔ انشاءاللہ پاکستان پہنچنے کے بعد بھی ہم سب بخیریت رہیں گے۔"

بوڑھے نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا: "آمین۔" منظور نے پوچھا: "آپ کو کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

بھوئیاں نے کہا: "میں اپنے طور پر محتاط رہ کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ اب کسی نے دیکھا ہو تو یہ خدا ہی جانتا ہے۔"

دلال نے ایک آدمی کو وہاں لا کر ان سے تعارف کراتے ہوئے کہا: "یہ امارا بھائی ہے۔ اِدھر سے یہ تم لوگ کو لے کر جائے گا۔ ہمارا ڈیوٹی اِدھر سے فنیش (ختم) ہو گیا ہے۔"

اس کے ساتھ آنے والے نے کہا: "ہماری گاڑی ٹھیک ساڑھے دس بجے ہوٹل کے سامنے پہنچ جائے گی۔ میں نے آپ لوگوں کا سامان، فرسٹ ایڈ بکس اور کھانے کی کچھ خشک چیزیں کار کی ڈگی میں رکھ دی ہیں۔ میرا مشورہ ہے، یہاں بھی آپ لوگ پیٹ بھر کر کھا لیں۔"

کلیم الدین بھوئیاں نے عظمیٰ سے پوچھا: "کچھ کھاؤ گی؟"

عظمیٰ نے انکار میں سر ہلایا۔ آنے والے نئے دلال نے کہا۔ "بہن جی! نال میں پانی بہت ملتا ہے۔ کھانا نہیں ملتا۔ میرا مشورہ ہے۔ یہاں پیٹ بھر کر کھا لیں۔ آگے جانے ہمارے نصیب میں کیا لکھا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا۔ عظمیٰ کھانا نہیں چاہتی تھی۔ کلیم الدین بھوئیاں نے اصرار کیا: "اپنے لیے نہ سہی میرا ساتھ دینے کے لیے کچھ کھاتی رہو۔"

وہ مجبور ہو کر کھانے لگی۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے دلال نے آ کر کہا: "منظور صاحب! پہلے آپ چلیں۔ گاڑی آ گئی ہے۔"

منظور بڑی آہستگی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سب اس کے پیروں کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ ایک قدم آہستگی سے رکھنے کے بعد دوسرے قدم کو آگے بڑھاتا تھا پھر اسے بھی آہستگی سے زمین پر رکھ کر چلنے کی کوشش کرتا تھا۔ دلال نے اسے سہارا دیا۔ وہ کسی بیمار آدمی کی طرح اس کے سہارے چلنے لگا۔ ہوٹل کے بڑے ہال میں کچھ لوگوں نے اس کی طرف دیکھا لیکن زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کے بعد بوڑھے شخص نے اٹھ کر کہا: "بیٹی! میں جا رہا ہوں، میرے ساتھ چلو۔"

عظمیٰ نے بھوئیاں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی زبان میں کہا۔ "میں ان کے ساتھ جاؤں گی۔"

بوڑھا زبان تو نہ سمجھ سکا مگر مفہوم سمجھ میں آ گیا۔ وہ زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے جانے لگا: "اسی لیے تو قیامت پر قیامت آ رہی تھی۔ یہ لڑکیاں کسی جوان کو دیکھ کر اس سے چپک ہی جاتی ہیں۔ توبہ توبہ ان کا آپس میں کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔ بے شرمی کی حد ہو گئی۔"

بڑے میاں کے جانے کے بعد بھوئیاں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا: "آؤ، اب ہم چلیں۔"

وہ کیبن سے نکل آئے۔ عظمیٰ نے ساری پہنی ہوئی تھی ماتھے پر بندیا چمک رہی تھی۔ اس کے انداز سے، اس کے پہناوے سے پتا چلتا تھا کہ وہ بنگالن ہے۔ کلیم الدین بھوئیاں نے تنگ پائنچے کی پتلون اور شرٹ پہنی تھی۔ شرٹ پر چمڑے کی جیکٹ تھی۔ اب اس کے سر پر ہپیوں جیسے لانبے بال نہیں تھے۔ بالوں کو تراش کر چھوٹا کر لیا گیا تھا۔ شیو کرنے کے بعد چہرہ بھی نکھر آیا تھا دونوں ہی خوبصورت اور اسمارٹ لگ رہے تھے۔ دیکھنے والے انہیں میاں بیوی سمجھ رہے ہوں گے۔

ہوٹل کے باہر سرخ رنگ کی اسکوڈا کھڑی ہوئی تھی۔ دلال نے انہیں دیکھتے ہی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ عظمیٰ اندر جا کر بیٹھنا چاہتی تھی کہ کسی اجنبی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ کلیم الدین بھوئیاں نے بھی دیکھا۔ پچھلی سیٹ کے آخری سرے پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس وہی بڑے میاں تھے۔ بڑے میاں کے بعد عظمیٰ کے لیے جگہ خالی تھی۔ بھوئیاں نے پوچھا: "یہ کون ہے؟"

دلال نے کہا: "پانچواں مسافر۔"

پانچویں مسافر نے عظمیٰ کو دیکھتے ہی ایک گہری سانس لی۔ پھر کہا: "میں نے سنا تھا، راستے میں کانٹے ہی کانٹے ہوں گے۔ یہاں تو آغازِ سفر سے ہی پھول کھلنے لگے ہیں۔"

بھوئیاں نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ جلد سے جلد کار کے اندر بیٹھ جانا چاہتا تھا۔ تاکہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ اس نے عظمیٰ سے کہا: "پہلے میں بیٹھتا ہوں۔ تم یہاں کھڑکی کے پاس بیٹھو گی۔"

دلال نے کہا: "نہیں، دونوں طرف کی کھڑکیوں کے پاس ایسے لوگوں کو بیٹھنا چاہیے جو بنگلہ بھاشا روانی سے بولتے ہوں۔"

اس نے مجبوراً عظمیٰ کو پہلے بٹھایا پھر خود کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ دلال نے دروازے کو بند کرنے کے بعد ایک اخبار بڑھاتے ہوئے کہا: "اسے کھول کر پڑھتے رہو یا یونہی دیکھتے رہو اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ گزرنے والوں کی نظروں سے تمہارا چہرہ چھپا رہے گا۔"

اس نے دوسری طرف سے گھوم کر اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال لی۔ جب کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی تو پانچویں مسافر نے ذرا سا جھک کر عظمیٰ کو دیکھتے ہوئے کہا "میرا نام بابر ہے تمھارا نام؟"

عظمیٰ نے اسے ناگواری سے دیکھا پھر گڑبڑ گڑبڑ زبان میں کچھ بولنے لگی۔ اس نے بوکھلا کر اسے دیکھا پھر حیران ہو کر کہا "بھئی! میں نے اتنا لمبا نام تو نہیں پوچھا تھا۔"

منظور اگلی سیٹ پر دلال کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سر گھما کر کہا "مسٹر بابر! پلیز آپ کسی کو چھیڑنے کا انداز اختیار نہ کریں۔"

بابر نے جواب دیا "مسٹر! شاید آپ کو نہیں معلوم کسی بھی عورت کو تنہائی میں چھیڑا جاتا ہے۔ چار آدمیوں کے سامنے اس سے بات کی جائے تو بات کرنے والے کی نیت میں کھوٹ نہیں ہوتا۔"

کلیم الدین بھوتیاں نے کہا "تمھارے من میں کھوٹ ہو یا نہ ہو۔ عظمیٰ کے تیور سے سمجھ لینا چاہیے کہ یہ تم سے بات کرنا گوارا نہیں کرتی ہے۔"

بابر نے مسکرا کر عظمیٰ کو دیکھا پھر کہا "اچھا تو عظمیٰ نام ہے۔ بہت مختصر ہے مگر یہ بہت دیر تک بتاتی رہیں۔"

دلال نے ہنستے ہوئے کہا "بھئی آپ لوگ بُرا نہ مانیں بابر ذرا من موجی ہے، بولتا بھی بہت ہے۔"

کسی نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ خاموشی رہی۔ کار تیز رفتاری سے کاکس بازار کے راستے پر کالوگھاٹ کی طرف جا رہی تھی۔ جانے والے مسافروں کو منزل کا پتا معلوم تھا مگر راستے کی پہچان نہیں تھی۔ وہ سب اس دلال کے محتاج تھے۔ سب اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے، کچھ اپنے رشتے داروں کو یاد کر رہے تھے اور کچھ پیش آنے والے خطرات کے متعلق اندیشوں میں گرفتار تھے۔ انھیں بتایا گیا تھا کہ بنگال اور برما کے درمیانی جنگلوں میں زہریلے سانپ پائے جاتے ہیں۔ اب تک وہ بچوں کو شیر بھالو سے ڈراتے رہے تھے اب ان خطرناک جانوروں سے سامنا ہونے والا تھا۔ سنا تھا کہ جنگلی ہاتھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ان مسافروں میں سے کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ صرف سنا تھا اور سنی سنائی بات کہاں تک درست ہے یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا ہے۔

تقریباً پون گھنٹے کی خاموشی کے بعد بابر نے اکتا کر اِدھر اُدھر دیکھا پھر اپنے پاس بیٹھے ہوئے بڑے میاں سے مخاطب ہوا "چچا جان! آپ کا نام کیا ہے اور کس سے ملنے جا رہے ہیں؟"

"میرا نام احسان الحق ہے۔ میرا اس دنیا میں اپنا کوئی نہیں رہا۔ سب مر کھپ گئے۔ میں سخت جان ہوں۔ بھٹکنے کے لیے زندہ رہ گیا ہوں۔"

"بھٹکنے کی ضرورت کیا تھی۔ آپ بنگلہ دیش میں ہی رہتے آپ کی عمر کتنی رہ گئی ہے۔ خواہ مخواہ راستے میں ہمارے لیے مصیبت بنیں گے۔"

منظور نے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم جیسے جوانوں کو بزرگوں کا سہارا بننا چاہیے انھیں بخیریت منزل تک لے جانا چاہیے اور تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔"

اس نے کہا "مسٹر منظور! تمھارے بھی دو پاؤں بیکار ہیں صاف کیوں نہیں کہتے کہ صرف بزرگوں کو نہیں، تمھیں بھی ہمارا سہارا ملنا چاہیے۔"

"اگر کوئی ایسا وقت آیا تو میں مر جاؤں گا مگر تمھارا سہارا کبھی نہیں لوں گا۔"

بڑے میاں احسان الحق نے کہا "بیٹے! یہ سرپھرا جوان ہے۔ اس کے منہ نہ لگو۔ جب یہ بوڑھا ہوگا اور جب کوئی جوان اس کے منہ پر ایسی ہی باتیں کرے گا تو پتا چلے گا کہ کوئی ہمیشہ جوان نہیں رہتا۔ آئندہ نسل کے جوانوں کے طعنے سننے کے لیے وہ بھی ایک دن بوڑھا ہو جاتا ہے۔"

بابر ہنستے ہوئے بولا "حقیقت کو سب سمجھتے ہیں مگر کوئی یاد نہیں رکھتا۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ ہمیں مرنا ہے لیکن ہم موت کو بھول جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک دن آنے والے بڑھاپے کو ایک ذرا یاد نہیں کرتے اور جب یاد کرتے ہیں تو اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہمارے جوان بچے ہمیں سہارا دیں گے۔"

"یہ کیا بات ہوئی، خود تو بوڑھے ہونے کے بعد جوانوں کا سہارا تلاش کرنا چاہتے ہو اور ابھی جو تمھارے سامنے بوڑھے ہیں۔ انھیں بیزاری سے دیکھ رہے ہو۔"

بابر نے کار کی چھت کو دیکھتے ہوئے کہا "یہی ہوتا آیا ہے انسان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں بڑھ چڑھ کر ہے۔ وہ ذہانت سے بڑھ کر ذہین ہے۔ عظمت سے بڑھ کر عظیم ہے۔ طلب سے بڑھ کر طالب ہے۔ پیٹ سے بڑھ کر پیٹو ہے اور شرم سے زیادہ شرمیلا ہے۔"

اس نے کہنے کے دوران عظمیٰ کو دیکھا پھر کہا "یعنی جو کر گزرنا چاہیے، اس پر شرماتا ہے۔ اتنا بڑا ہے کہ دوسروں کی بزرگی تسلیم نہیں کرتا۔ ابھی آپ نے کہا تھا کہ اپنے بڑھاپے میں سہارا لو گے اور دوسروں کے بڑھاپے کو دھتکارتے ہو تو بڑے میاں! میں انسانی سوچ کا المیہ ہی بیان کر رہا ہوں۔ انسان اتنا مصلحت اندیش ہے کہ خود ڈوبے تو پکارتا ہے، مجھے بچاؤ۔ دوسرا ڈوبے تو آواز لگاتا ہے۔ اُسے بچاؤ۔"

کلیم الدین جھوتیاں نے گھور کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یعنی راستے میں تم پر کوئی مصیبت آئے گی تو تم مدد کے لیے پکارو گے اور ہم میں سے کوئی تھک کر گر پڑے گا تو ہمیں اٹھانے کے لیے کسی دوسرے کو آواز دو گے؟"

اس نے ہنستے ہوئے کہا: "مجھے اتنی فرصت نہیں ملے گی کہ جنگل میں تم لوگوں کے لیے کسی کو آوازیں دیتا پھروں۔ اگر بڑے میاں کہیں بیٹھ گئے یا دونوں پاؤں سے اپاہج منظور بھائی چلنے سے معذور ہو گئے تو میں انھیں چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤں گا۔"

سب اسے ناگواری سے دیکھنے لگے۔ دلاّل نے اچانک کار کی رفتار سست کرتے ہوئے کہا: "وہ دیکھو، فوجی گاڑیاں آ رہی ہیں۔ چلو فوراً تالیاں بجانا، ہنسنا بولنا اور گانا شروع کر دو۔ یہ تاثر دو کہ چھاترو (طالبعلم) پکنک منانے جا رہے ہیں۔"

وہ سب فوراً ہی زور زور سے تالیاں بجانے اور ہنسنے بولنے لگے۔ بابر نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا: "ہائے ہائے، یہ بڑے میاں طالبعلم کیسے نظر آئیں گے اور طلبا کے درمیان یہ گڑبڑ گڑبڑ بولنے والی کی موجودگی کا کیا جواز ہے؟"

کلیم الدین جھوتیاں نے عظمیٰ کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا: "تم دونوں سیٹوں کے درمیان بیٹھ جاؤ۔"

اس نے جھوتیاں کی ہدایت پر عمل کیا۔ سکڑ کر دونوں سیٹوں کے درمیان دبک گئی۔ جھوتیاں نے اخبار کا ایک بڑا سا صفحہ اس پر رکھا۔ دوسرا صفحہ بڑے میاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "آپ اسے پڑھنا شروع کریں۔ اس طرح آپ کا چہرہ چھپ جائے گا۔ کوئی آپ کے بڑھاپے کو نہیں دیکھ سکے گا۔"

بڑے میاں نے بھی اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ منظور، جھوتیاں اور بابر کھڑکیوں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ زور زور سے تالیاں بجا کر گانے اور شور مچانے لگے۔ اس وقت تک فوجی گاڑیاں ان کے قریب سے گزر رہی تھیں۔ وہ تینوں کھڑکیوں سے ہاتھ نکال کر دو انگلیوں سے وی بنا کر وکٹری (فتح) کا نشان دکھاتے ہوئے کہہ رہے تھے: "جے بنگلہ، جے بنگلہ باہنی . . ."

بنگلہ دیش کے سپاہی مسکراتے ہوئے ان کے قریب سے گزر گئے لیکن وہ اس وقت تک تالیاں بجاتے اور شور مچاتے رہے جب تک کہ بی ڈی آر کے سپاہی اور ان کی گاڑیاں نظروں سے اوجھل نہ ہو گئیں۔ اس کے بعد انھوں نے اطمینان کی سانس لی۔ عظمیٰ سیٹوں کے درمیان سے اٹھ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بڑے میاں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا: "اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ آئی بلا کو ٹال دیتا ہے۔"

بابر نے اچانک گھبرا کر کہا: "وہ فوجی واپس آ رہے ہیں۔"

سب گڑبڑا گئے۔ بڑے میاں نے ایک دم سے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ بابر قہقہے لگانے لگا۔ کلیم الدین جھوتیاں نے گرج کر پوچھا: "تمھیں شرم نہیں آتی جھوٹ بول کر سب کو ڈراتے ہو؟"

وہ بدستور ہنستے ہوئے بولا: "میں انسانی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دیکھو نا، آدمی جب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اپنی جان بچانے کی دھن میں خدا اور دعا کو بھول جاتا ہے۔ جب مصیبت ٹلنے لگتی ہے تو خدا بھی یاد آتا ہے اور دعا کے لیے ہاتھ بھی اٹھ جاتے ہیں جیسے ہی میں نے کہا۔ پھر مصیبت آ گئی تو بڑے میاں دعا بھول کر اس مصیبت کی طرف دیکھنے لگے۔"

منظور نے کہا: "اگر تم ماہرِ نفسیات نہ بنو تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ پلیز بابر! دوست بنو۔ دشمنوں کی طرح مذاق نہ اڑاؤ۔"

اس نے کہا: "تم میرے سچ کو مذاق بنا کر اڑا رہے ہو۔ سفر کے دوران ہم سب کو جانے کتنی مشکلات سے گزرنا ہوگا لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ تم سب کے لیے سب سے بڑی مشکل میری سچائی ہوگی۔ جو دیکھوں گا، جو سمجھوں گا جو میرا ذہن کہے گا۔ میں اسے بے خوف و خطر کہہ دوں گا۔ تم لوگ کیسے انسان ہو اگر میں جھوٹ کہہ دوں کہ تمھاری مصیبتوں میں کام آؤں گا تو خوش ہو جاؤ گے اور سچ کہہ دوں کہ مصیبتوں میں چھوڑ کر بھاگنے والا انسان ہوں تو مجھے دشمن سمجھنے لگو گے حالانکہ میری سچائی کی قدر کرنی چاہیے، اوہ گاڈ، تیرے بندے سمجھ میں نہیں آتے۔"

ان سب کو پھر چپ لگ گئی۔ وہ خاموشی سے راستہ طے کرتے رہے۔ دوپہر کو ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب سے گزرنے لگے۔ دلاّل نے گاڑی کو تیز رفتاری سے چلاتے ہوئے کہا: "یہ آخری گاؤں ہے۔ اس کے بعد برما کی سرحد تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ سرحد پار پہنچنے تک شاید کھانا بھی نہ ملے بہتر ہے ہم آگے جا کر قیام کریں اور پیٹ بھر کر کھانا کھا لیں۔"

تقریباً دو میل کے فاصلے پر ایک سڑک سے بہت دور جھونپڑی نظر آئی۔ وہ دلاّل کی رہنمائی میں اس جھونپڑی تک پہنچے وہاں۔ دو عورتیں، کچھ بچے اور چار مرد نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں لانبے پھل کے تلوار نما ہتھیار نظر آ رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی عظمیٰ، کلیم الدین جھوتیاں کے بازو سے لگ گئی۔ بڑے میاں زیرِ لب کچھ پڑھنے لگے۔ بابر نے ان کے قریب ہو کر کہا: "بوڑھے چونکہ کمزور اور بے بس ہوتے ہیں، اس لیے کچھ پڑھتے رہتے ہیں۔ جوان ایسے وقت اپنے بچاؤ کی تدبیروں سوچتے ہیں۔ میں نے ٹھیک کہا تھا نا؟ جب جان بچنے کی صورت نظر آئے گی تب ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے۔ اس سے پہلے ہم کسی کا احسان مانتے ہی نہیں۔"

وہ تمام ہتھیار والے اور ان کی عورتیں منظور کے پیروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دلال نے آگے بڑھ کر ایک ہتھیار والے کا ہاتھ پکڑا۔ پھر اسے دور لے جا کر کچھ باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتیں سن کر وہ انکار میں سر ہلا رہا تھا۔ دلال نے جیب سے دس روپے نکال کر دیے۔ وہ پھر انکار میں سر ہلانے لگا۔ اس نے جیب سے اور پانچ روپے نکال کر دیے۔ پندرہ روپے دیکھتے ہی وہ خوش ہو گیا۔ وہیں سے چیخ کر اپنے باقی ساتھیوں سے کہنے لگا: "انھیں گھر میں بٹھاؤ، کھانے کا بندوبست کرو۔ یہ بہت دور جانے والے ہیں۔"

ایک منٹ کے بعد ہی وہ سب جھونپڑی کے اندر گھاس کے بستر پر آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے لیے مرغیاں ذبح کی جا رہی تھیں۔ دال بھات پکایا جا رہا تھا۔ پندرہ روپے میں چھ آدمی کا کھانا مرغ کے سالن کے ساتھ بہت سستا تھا لیکن دور افتادہ غریب بنگالیوں کے لیے پندرہ روپے بہت تھے۔ اس لیے وہ خوش ہو کر میزبانی کے فرائض ادا کر رہے تھے۔

دلال نے ان کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے کہا: "ہم یہاں سے اندھیرا ہونے کے بعد روانہ ہوں گے۔ رات کو صرف زہریلے سانپوں اور کیڑے مکوڑوں کا ڈر رہتا ہے لیکن جنگلی ہاتھی اور دوسرے درندے بہت کم نظر آتے ہیں۔ اسی لیے ہم اکثر رات کو سفر کرتے ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا پھر کہنے لگا: "یہ کس کی گاڑی ہے؟ کون آ رہا ہے؟"

یہ بات سنتے ہی سبھی گھبرا گئے۔ کلیم الدین بھوئیاں فوراً ہی بانس کی کھپچیوں سے بنی ہوئی دیوار کے پاس آ کر اس کے سوراخ سے جھانکنے لگا پھر اس نے کہا: "ایک جیپ ہے اور اس میں سے دو آدمی اتر کر اِدھر آ رہے ہیں۔"

اس وقت تک دلال جھونپڑی سے باہر چلا گیا تھا۔ بڑے میاں نے پوچھا: "بیٹا! وہ کون لوگ ہیں؟ کیا فوجی ہیں یا مکتی باہنی کے جوان؟"

کلیم الدین بھوئیاں نے ننھے سوراخ سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "صاف طور سے نظر نہیں آ رہا ہے۔ پہلے اتنا ہی دکھائی دیا کہ دو آدمی جیپ سے اتر رہے ہیں پھر جھاڑیاں آڑے آ گئیں۔"

عظمیٰ بھی اس کے قریب آ کر بانس کی دیوار سے لگ گئی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر کسی سوراخ سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی وقت باہر سے کوئی گرج کر کہنے لگا: "منشو دادا! یہاں کون لوگ آئے ہیں۔ ان سب کو باہر لاؤ نہیں تو ان کے ساتھ اس جھونپڑی کو بھی آگ لگا دوں گا۔"

اس کی آواز سنتے ہی عظمیٰ یکبارگی لرز گئی۔ چہرہ اچانک ہی زرد پڑ گیا۔ وہ یوں سہم کر بانس کی دیوار سے ہٹ گئی جیسے وہاں بچھو دیکھ لیا ہو۔ اس نے کلیم الدین بھوئیاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "مُنعم بلّا۔ یہ یہاں کیڑے آگیا؟ (منعم باللہ۔ یہ یہاں کیسے آگیا؟)"

کلیم الدین بھوئیاں خود تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ بھی منعم باللہ کو جانتا تھا۔ وہ سب دیناج پور کے رہنے والے تھے۔ دیناج پور بنگلہ دیش کے انتہائی شمال مغرب میں ہے اور وہ لوگ انتہائی جنوب مشرقی علاقے میں تھے۔ سوال پیدا ہوتا تھا کہ منعم باللہ اتنا طویل فاصلہ طے کر کے شمال سے جنوب کی طرف کیوں آیا تھا۔ جواب سمجھ میں آتا تھا کہ عظمیٰ اور کلیم الدین بھوئیاں بھی اتنی ہی دور سے آئے تھے۔ وہ دونوں مجبوراً آئے تھے اور منعم باللہ دوسروں کی مجبوریوں سے کھیلتا آیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جن کی تلاش میں ہے، وہ دونوں وہاں پائے جا سکتے ہیں۔ اگر جانتا تو سب سے پہلے انھیں مخاطب کر کے للکارتا۔

وہ جھونپڑی کی طرف دیکھتا ہوا دلال سے کہہ رہا تھا: "تم بہت چالاک بنتے ہو۔ تم نے پاس والے گرام (گاؤں) میں گاڑی نہیں روکی۔ روکتے تو بستی والے تمھارے بہاریوں کو تاڑ لیتے۔ تم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہاں مجھ جیسا جیپ گاڑی والا موجود ہوگا۔ تاڑا تاڑی بولو کتنے آدمی لائے ہو؟"

دلال کی آواز سنائی دی: "پانچ — پانچ جون آچھے۔"

منعم باللہ نے قہقہہ لگایا: "پانچ ہیں اور میرے ریوالور میں چھ گولیاں ہیں۔ یعنی ایک گولی فالتو ہے۔"

اچانک اس کا قہقہہ رک گیا۔ اس نے گرج کر کہا: "اے پانچو! سنو اور فالتو گولی کی آواز سنتے ہی باہر آ جاؤ۔"

کلیم الدین بھوئیاں نے سوراخ سے جھانک کر دیکھا۔ اسی لمحہ منعم باللہ نے ریوالور کو اپنے سر سے بلند کر کے آسمانی فائر کیا۔ ٹھائیں کی دل ہلا دینے والی آواز جنگل کی ہر چہار سمت گونجتی جا رہی تھی۔

اب پانچ گولیاں اور پانچ آدمی رہ گئے تھے۔

◆

اس بھاری بھرکم ٹرک کی ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔ مگر وہ ٹرک آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ جب آدمی نقاب پہن کر اور گاڑی کی روشنی بجھا کر آگے چلے تو نیت ہمیشہ مجرمانہ ہوتی ہے۔ اس وقت سات بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔ دور ایک لالٹین اس ٹرک کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا اس لالٹین کے ساتھ ایک گودام میں پہنچ گیا۔ اس کے اندر آتے ہی گودام کے بڑے سے دروازے کو اندر سے بند کر دیا گیا۔

گودام میں گھپ اندھیرا تھا۔ ایک نے کہا: "دوسری لالٹین جلاؤ۔"

تلسی رام اگروال نے اعتراض کیا: "نہیں۔ ایک کافی ہے

زیادہ روشنی ہوگی تو گودام کے پاس سے گزرنے والوں کو شبہ ہوگا۔"

"اگروال جی! ایک لالٹین سے کام کیسے ہوگا۔ اُدھر سے مال اٹھا کر لانا اور یہاں رکھنا ہے۔"

"تم ابھی نئے رنگروٹ ہو۔ اسمگلنگ کے دھندے میں الّو کی آنکھ سے اندھیرے میں دیکھنا پڑتا ہے۔ چلو ایک لالٹین سے شروع ہو جاؤ۔ پہلے ٹرک میں مال جانے کا راستہ نکالو پھر اِدھر سے مال لے کر آؤ۔"

وہ سب لوگ اس کی ہدایت کے مطابق کام میں لگ گئے۔

تلسی رام ایک طرف کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس کے آدمی ٹرک کے پچھلے فرش کو بڑی مہارت سے الگ کر رہے تھے۔ تلسی رام اپنے چار ماتحتوں پر بڑا بھروسہ کرتا تھا۔ ان کی کارکردگی سے خوش ہو کر زیادہ سے زیادہ نقد رقمیں دیا کرتا تھا۔ وہ چاروں اسمگلنگ کے دوران مال کے ساتھ رہتے تھے۔ طرح طرح کے خطرات سے کھیلنا جانتے تھے۔ بارڈر پولیس سے فائرنگ کا تبادلہ ہو تو ان کا نشانہ چوکتا نہیں تھا۔ وہ میکینک بھی تھے۔ گاڑیاں خراب ہوں تو منٹوں میں درست کر لیتے تھے۔ ان کا گینگ لیڈر ہوشیار اور تعلیم یافتہ تھا۔ بنگال کے شمال سے جنوب تک تمام سرحدوں کا نقشہ اس کے ذہن میں محفوظ رہتا تھا۔ وہ تمام دریائی اور خشکی کے راستوں اور سرحدی چوکیوں کی تعداد سے واقف تھا۔

یوں بھی بھارت اور بنگلہ دیش کی درمیانی سرحدیں اب زیادہ دشوار گزار نہیں رہی تھیں۔ بھارت میں پٹ سن اور باسمتی چاول کی بڑی کھپت تھی۔ بنگلہ دیش سے آنے والے ایسے مال کو سرحدی چوکیوں میں روکا نہیں جاتا تھا۔ تھوڑی سی رشوت لے کر اسے آگے جانے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔

اس ٹرک کے پچھلے فرش کو کھول کر الگ رکھ دیا گیا۔ اس کے نیچے ایک اور فرش تھا یعنی ٹرک کے پچھلے حصے میں دوہرا فرش بنایا گیا تھا۔ دونوں کے درمیان خلا تھا جہاں مال چھپا کر رکھا جاتا تھا۔ چھ آدمی لالٹین لے کر گودام کے دورافتادہ حصے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں واپس آئے تو وہ سب سونے اور چاندی کی پتریاں اٹھائے ہوئے تھے۔ وہاں پتریوں کو نچلے فرش پر بچھا کر رکھنے لگے۔

تلسی رام نے کپڑے کی ایک چھوٹی سی گٹھڑی کھولی۔ اس میں سے سونے کے زیورات نکال کر اپنے خاص ملازم کو دیتے ہوئے کہا: "انھیں بھی یہاں چھپا دو۔ یہ خسرو اور اس کی پتنی کا مال ہے۔ ہندوستان پہنچنے کے بعد انھیں دے دینا۔"

"اگر وہ یہ زیورات فروخت کرنا چاہیں تو؟"

"تو بازار کے بھاؤ سے کچھ کم کر کے رقم دے دینا۔ اس طرح ہمیں بھی منافع ملے گا۔ انھیں بھی کسی دردسری کے بغیر انڈین کرنسی مل جائے گی۔"

ایسا کہتے وقت وہ دل ہی دل میں نفع و نقصان کا حساب کر رہا تھا۔ سید پور میں اس نے ایسے ملازم رکھے تھے جو اس کی عدم موجودگی میں عوام کی بھوک، بیماریوں اور مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ انھیں اناج اور دواؤں کے لیے روپے دیتے تھے اور ان کے سونے چاندی کے زیورات رہن رکھتے تھے۔ ریلوے کے مزدور محدود آمدنی میں تین وقت مہنگا اناج خرید کر نہیں کھا سکتے تھے۔ اس لیے رہن رکھا ہوا زیور چھڑا نہیں سکتے تھے۔ بالآخر رہن رکھنے والوں کے پاس اونے پونے بیچ دیتے تھے۔

اس شہر میں ریلوے کے مزدور اور چھوٹی پونجی کے دکاندار تھے۔ ان کی طرزِ رہائش دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ بظاہر غریب نظر آنے والے بہاری اپنی عورتوں کے لیے اتنے سارے سونے چاندی کے زیورات بنواتے رہے ہیں۔ اس وقت تلسی رام پچیس سیر سونے کی پتریاں اور ایک من چاندی کی پتریاں چھپا کر لے جانے والا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دوسرے ہندو بنیے وہاں کے مسلمانوں کو کس طرح کھوکھلا کر کے بنگلہ دیش کا سونا بھارت پہنچا رہے ہوں گے۔

ٹرک کے نچلے فرش پر تمام مال احتیاط سے رکھنے کے بعد انھوں نے لکڑی کے تختے سے بنے ہوئے اوپری فرش کو اٹھا کر اس کی پہلی جگہ رکھ دیا۔ تمام مال دوہرے فرش کے درمیان چھپ گیا۔ اب وہ لوہے کی پتریوں اور اسکرو وغیرہ کے ذریعے اوپری فرش کو مضبوطی سے جما رہے تھے۔ چیکنگ کرنے والے اس کے اوپر چڑھ کر یا ٹرک کے نیچے سے جھانک کر اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ فرش اندر سے کھوکھلا ہے۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو ملازم باسمتی چاول کی بوریاں لا کر اس پر لادنے لگے۔ تلسی رام نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا: "جلدی کرو ساڑھے دس ہو چکے ہیں۔"

خسرو حویلی کے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ بڑو دیدی نے شام سے نین تارا کو چھپا رکھا تھا۔ اس سے کہہ دیا تھا: "اب تم اسے دلہن کے روپ میں ہی دیکھ سکو گے۔ تب تک وہ پردہ کرے گی۔"

اس نے صحن میں آکر آواز دی: "بڑو دیدی ذرا میرے کمرے کا تالا ہی کھول دیجیے۔ میں جا کر سونا چاہتا ہوں۔"

بڑو دیدی نے کمرے کے اندر سے کہا: "ذرا صبر کرو۔ آج میری بھوجائی کو دیکھو گے تو نیند اڑ جائے گی۔"

ساڑھے گیارہ بجے اس نے دیکھا۔ بڑو دیدی اور ششی اپنے درمیان ایک دلہن کو تھامے کمرے سے نکل رہی تھیں۔ دلہن سرخ جوڑے میں چھپی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں ذرا سے جھلک رہے تھے۔ ان میں مہندی کی سرخی تھی۔ سونے کے زیورات بھی نظر آرہے تھے

بڑو دیدی زیرِ لب گنگنا رہی تھیں۔ شاید سہاگ کا گیت گا رہی تھیں۔ ششی خاموش تھی۔ اس کا اپنا دکھ ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ تاہم وہ اداس نہیں تھی۔ قہقہے بھی نہیں لگا رہی تھی۔ بس وہ اپنی شانتا بھابی کی خوشی میں سنجیدگی سے ساتھ دے رہی تھی۔

وہ تینوں خسرو کے سامنے سے گزر گئیں۔ پھر اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئیں۔ اس نے پوچھا: "دیدی! میں آؤں؟"

"ابھی نہیں۔" انھوں نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پتا نہیں اندر کیا ہو رہا تھا۔ خسرو کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ پونے بارہ بجے تلسی رام حویلی کے دروازے اندر سے بند کر کے صحن کی طرف آیا۔ خسرو کو تنہا دیکھ کر پوچھا: "یہاں اکیلے کیوں کھڑے ہو؟ یہ عورتیں کہیں گئی ہیں کیا؟"

"سب کے سب میرے کمرے میں ہیں۔ دیدی مجھے پریشان کر رہی ہیں۔ شام سے نین تارا کو چھپا رکھا ہے۔ ابھی اپنے کمرے سے دلھن بنا کر میرے کمرے میں لے گئی ہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا: "اچھا تو ہماری بھاوج کو دلھن بنایا گیا ہے۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں، دلھن کے روپ میں کیسی لگتی ہے۔"

اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ پھر آواز دی۔ شانتا نے اپنے پتی کی آواز سنتے ہی دروازہ کھول دیا۔ ششی اپنے بھائی کو دیکھتے ہی وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ خسرو اپنے کمرے میں آنا چاہتا تھا۔ بڑو دیدی نے ڈانٹ کر کہا۔ "ابھی نہیں۔ جب بلاؤں گی تب آنا۔ پہلے تمھارے جیجا جی دلھن کو منہ دکھائی دیں گے۔"

تلسی رام نے کہا: "منہ دکھائی ضرور دوں گا۔ پہلے منہ تو دکھاؤ۔"

دونوں میاں بیوی اندر چلے گئے۔ خسرو دروازے کے ب دیوار سے لگا کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جیجا جی کی آواز سنائی دی۔ "وان قسم میں نے ایسا روپ اور ایسی سندرتا پہلے نہیں دیکھی۔ دیکھا ہو تو یاد نہیں ہے۔ میں آشیرواد دیتا ہوں۔ بھگوان تمھاری اور خسرو کی جوڑی ہمیشہ سلامت رکھے اور مصیبتوں سے بچائے۔"

پھر اس نے بیوی سے پوچھا: "شانتا! منہ دکھائی کیا دوں؟ میرے ہاتھ میں یہ سونے کی انگوٹھی ہے۔ کیا اس سے کام چل جائے گا؟"

"آپ اپنی خوشی سے جو چاہیں دے سکتے ہیں۔ ایسے وقت بیچاری دلھن کچھ بول نہیں سکتی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا، میں کچھ نہ دے کر جاؤں۔ تب بھی یہ نہیں بولے گی۔"

شانتا نے کہا: "میں اپنی بھاوج کی طرف سے لڑوں گی۔ چلیے انگوٹھی دے دیجیے۔"

تھوڑی دیر بعد تلسی رام کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے خسرو کے شانے پر ہاتھ مار کر پوچھا: "کیوں میاں! بہت بے چین ہو۔ میں دلھن کو دیکھ کر آ رہا ہوں۔ وہاں میری تو صرف انگوٹھی اُتری ہے۔ تمھاری تو اب مستقل کھال اترتی رہے گی۔ عورت شادی سے پہلے معصوم ہوتی ہے۔ شادی کے بعد قصائی کی بیٹی بن جاتی ہے۔"

شانتا نے قریب آ کر پوچھا: "اچھا تو آپ میرے بھائی کو بھکا رہے ہیں۔ چلو خسرو! اندر آ جاؤ۔"

وہ خسرو کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئی۔ بڑے سے پلنگ کی سفید چادر پر گلاب کی پنکھڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ پلنگ کو چاروں طرف سے پھولوں کی لڑیوں سے سجایا گیا تھا۔ کمرے میں تیز روشنی تھی۔ تاکہ دلھن ہر زاویے سے جلوہ نما رہے۔ وہ شادی کے سرخ جوڑے میں سمٹی، سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑو دیدی نے خسرو کو اس کے پاس بٹھاتے ہوئے کہا: "نین تارا! میں تمھارے جیون ساتھی کو لے آئی ہوں۔ یہ میرا منہ بولا بھائی ہے۔ بھابیاں آ کر بھائی کو چھین لیتی ہیں۔ کل تم بھی اسے چھین کر لے جاؤ گی۔ لیکن میرا دل کہتا ہے کہ ہزاروں میل دور جانے کے بعد بھی بھائی بہن کا مقدس رشتہ قائم رہے گا۔"

خسرو نے ان کا ہاتھ تھام کر فرطِ عقیدت سے کہا: "دیدی! ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے بعد قومیتیں بدلتی ہیں، محبتیں کبھی نہیں بدلتیں۔ میں اور نین تارا آپ کو کبھی نہیں بھول سکیں گے۔"

انھوں نے دولہا اور دلھن کے سروں پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ پھر ان سے رخصت ہو کر باہر آ گئیں۔ دروازے کو باہر سے بند کر دیا لیکن وہیں کھڑی رہیں۔ کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرتی رہیں اور زیرِ لب مسکراتی رہیں۔

خسرو کچھ بوکھلایا ہوا تھا۔ کبھی یوں لگتا تھا کہ سچ مچ شادی ہو گئی ہے پھر یاد آتا تھا، زمین آسمان کبھی نہیں ملتے۔ صرف انسانی آنکھ کا فریب انھیں دور افق پر ملاتا ہے۔ وہ سامنے بیٹھی ہوئی دلھن کو بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے پر بڑا مستحکم اعتماد تھا۔

وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے نین تارا کے پاس سے اٹھ گیا۔ دلھن کی طرح سجے ہوئے کمرے کو دیکھ کر کہنے لگا: "دیدی نے خوب مذاق کیا ہے۔ آج تک ہمیں میاں بیوی بنا کر کمرے میں بند کرتی رہیں۔ آج دولہا دلھن بنا کر اتنے سارے پھولوں کی خوشبو میں بسا دیا ہے۔ ہمیں بھڑکا رہی ہیں۔ پر سچ پوچھو تو اس میں دیدی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم نے میاں بیوی کا ڈھونگ رچایا! وہ بیچاری ہمارے جھوٹ کو سچ سمجھ کر تمھیں ایک بھابی کا مان دے

رہی ہیں۔"

باہر دروازے سے لگی ہوئی شانتا کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ یک لخت بجھ گئی۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ سن کر بھی یقین نہیں کر رہی ہو، ذرا اچھی طرح کچھ اور سننے کے بعد یقین کرنا چاہتی ہو۔

کمرے کے اندر خسرو بولتا ہوا دروازے تک آیا۔ پھر اس نے کہا: "تم میری [illegible] نگر میں گھونگھٹ اٹھا کر دلہن کا روپ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں ایک اندازہ کر سکتا ہوں کہ آج تمہارے حسن کا عالم کیا ہو گا۔ لیکن یہ دروازہ دیدی نے باہر سے بند کیا ہے۔ کہیں وہ شرارت سے پھر نہ آ جائیں۔"

شانتا کو ایک کھٹکا سا سنائی دیا۔ وہ اندر سے دروازہ بند کرنے کی آواز تھی۔ وہ غصے سے ہونٹ بھینچنے لگی۔ یہ صدمہ اسے مار رہا تھا کہ خسرو بھائی بن کر اب تک دھوکا دیتا رہا۔ اس وقت وہ بہت اور اعتماد کی بلندی سے بے اعتمادی کے گڑھے میں خود کو گرتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ دوسری طرف خسرو نے مین تارا کے پاس بیٹھ کر آہستگی سے کہا: "میں نے دانستہ کبھی تمہیں ہاتھ نہیں لگایا۔ آج بھی میں تمہارا اعتماد قائم رکھوں گا۔ صرف گھونگھٹ کو ہاتھ لگانے کی اجازت دو۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے گھونگھٹ کو تھام لیا۔ اُسے آہستہ آہستہ اٹھانے لگا۔ آہستہ آہستہ حسن طلوع ہونے لگا۔ تاریکی سے اچانک روشنی میں آؤ تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ سامنے نور ہی نور ہو تو دیدۂ بینا سوچتی رہ جاتی ہے کیا دیکھے؟ کہاں سے دیکھنا شروع کرے؟ حسن کے بھرے میلے میں اس کی نگاہیں یوں بھٹک رہی تھیں جیسے کوئی بچہ میلے میں گم ہو کر بھٹک رہا ہو۔

سرخ جوڑے میں گورا گورا گلابی گلابی مکھڑا، مکھڑے پر حیا کی لالی، اس پر سونے کے زیورات کا جگمگاتا ہوا عکس غضب ڈھا رہا تھا۔ یہ عجیب تضاد ہے کہ کبھی چہرے کی کسی کمی کو چھپانے کے لیے میک اپ اور سنگار کیا جاتا ہے اور کبھی سنگار کی زیادتی چہرے کے حسن کو گہنا دیتی ہے۔ خسرو نے سورج گہن تو دیکھا ہی تھا۔ وہ اتنے گہنے پہنے ہوئے تھی کہ صورت گہن بھی دیکھ لیا۔

اچانک خسرو اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ مین تارا گھبرا کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ بڑو دیدی صحن میں کھڑی غصے سے کہہ رہی تھیں: "دنیا میں سب رشتے جھوٹے ہیں۔ جس بھائی سے خون کا رشتہ تھا، اس کے گناہ نے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔ جس بھائی کے ساتھ زبان اور دل سے رشتہ کیا، وہ میرے ہی گھر میں بیٹھ کر بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہا ہے۔ جانے کس کی بہن یا بیٹی کو بھگا لایا ہے۔ ہمارے سامنے بیوی کہتا ہے۔ چھی چھی چھی۔ کیسا کلجگ ہے۔ ارے خسرو! بھگوان کرے ابھی میرے سامنے تجھے موت آئے۔ جس زبان سے تو نے مجھے بہن کہا۔ وہ زبان جل جائے۔"

تلسی رام نے ڈانٹ کر کہا: "اری مورکھ اتنی رات کو شور کیوں مچا رہی ہے۔ ایک بار تو نے خسرو کو غلط سمجھا، بعد میں معافی مانگ لی۔ اچھی طرح سوچ لے، یہ دوسری غلطی نہ ہو۔"

"میں نے اچھی طرح سنا ہے۔ خسرو کہہ رہا تھا، دونوں نے میاں بیوی کا ڈھونگ رچایا ہے اور میں مورکھ ان کے جھوٹ کو سچ سمجھ کر اس کی سگی کو بھابی کا مان دے رہی ہوں۔"

تلسی رام نے آواز دی: "ارے بھئی خسرو! یہ کیا معاملہ ہے۔ اپنی بہن کی غلط فہمی دور کرو۔"

صحن کی طرف کھڑکی کھل گئی۔ خسرو کمرے کے اندر نظر آیا۔ وہ کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے سر جھکائے کھڑا تھا۔ بڑو دیدی نے کہا: "اس سے پوچھیے، مجھے اپنی صورت نہ دکھائے۔ جو مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا ہے، وہ بھلا اپنی صفائی میں کیا کہے گا؟"

خسرو نے سر اٹھا کر کہا: "دیدی! آپ نے جو کچھ سنا، وہ صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ ہماری شادی ہوئی تھی مگر آدھی ہوئی تھی۔"

بڑو دیدی نے اس کی طرف انگلی اٹھا کر اپنے پتی سے کہا: "دیکھیے دیکھیے، یہ کیسی بکواس کر رہا ہے۔ ہماری اتنی عمر ہو گئی، ہم نے آج تک دیکھا نہ سنا کہ شادی آدھی بھی ہوتی ہے۔"

تلسی رام نے پوچھا: "ہاں میاں یہ کیا بے تکی بات کہہ رہے ہو۔ پہلے ہی سیدھی طرح کیوں نہ بتایا کہ شادی نہیں ہوئی۔ ہم شادی کرا دیتے۔ ہمارے ہاں آ کر ایک کمرے میں رہتے ہوئے کچھ تو شرم آنی چاہیے تھی۔"

وہ صحن کے فرش پر پاؤں پٹخ کر بولیں: "بے شرموں کو کبھی شرم نہیں آتی۔ ذرا صورت تو دیکھو۔ یہی گناہگاروں کا منہ لے کر کل یہاں سے پاکستان جانا چاہتے تھے۔ ذرا جا کر تو دکھائیں۔ میں نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا ہے۔"

"دیدی! ایسا غضب نہ کریں۔ آپ کو جیجا جی کا واسطہ ہمیں پاکستان جانے سے نہ روکیں۔"

"بکواس مت کرو۔ جس گھر میں گناہ ہوتا ہے، اس گھر میں ہونے والی عبادت یا پوجا قبول نہیں ہوتی۔ جب سے تم دونوں آئے ہو میرے گھر کی پاکیزگی خاک میں ملتی رہی ہے۔ میری پوجا بھرشٹ بے اثر ہوتی رہی ہے۔"

وہ کھڑکی کی طرف ایک قدم آگے بڑھ کر بولیں: "مجھے بتاؤ، جب تم اپنے وطن کو پاک کہتے ہو تو پھر تم دونوں کون سی پاکیزگی لے کر وہاں جا رہے ہو؟"

بڑو دیدی نے بڑی ہی معقول اور سخت بات کہہ دی تھی۔ خسرو کا سر شرم سے جھک جانا چاہیے تھا لیکن بعض حالات میں ایک شخص اپنی سمجھ کے مطابق جو معقول بات کہتا ہے، وہی بات دوسرے شخص کی دانست میں نہایت ہی نامعقول ہوتی ہے۔ خسرو نے سینہ تان کر سر اٹھا کر کہا: "بڑو دیدی! آپ یقین نہیں کریں گی لیکن ہم جانتے ہیں اور ہمارا خدا جانتا ہے کہ ہم آپ کے ہاں آ کر سخت آزمائشوں سے گزرتے رہتے تھے۔ ہم اپنی صفائی میں بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم گناہ گار نہیں ہیں...... اس کے لیے اگر آپ کہیں تو میں کلام پاک اٹھا کر قسم کھا سکتا ہوں۔"

تلسی رام نے آگے بڑھ کر اپنی بیوی سے کہا: "اری بھاگوان! سن رہی ہے؟ خسرو بہت بڑی بات کہہ رہا ہے۔ یہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ ہم اسے آج سے نہیں برسوں سے جانتے ہیں۔ معلوم تو ہو یہ قصہ کیا ہے۔ میاں بیوی نہیں تھے تو یہ ڈھونگ کیوں رچایا؟"

خسرو نے کھڑکی کی سلاخوں کو دونوں ہاتھ سے تھام کر کہا۔ "چچا جی! ہم نے ڈھونگ رچایا لیکن اس ڈھونگ میں آدھی صداقت بھی ہے۔ ہمارے ساتھ حالات نے عجیب مذاق کیا ہے۔ گھلن کے کیمپ میں میرا اور زمین تارا کا نکاح پڑھایا گیا تھا۔ ہمارے ہاں مسلمانوں کے دستور کے مطابق پہلے لڑکی نکاح قبول کرتی ہے۔ اس کے بعد لڑکے کی باری آتی ہے۔ جب میری باری آئی تو اچانک ہی چاروں طرف سے ہم پر گولیاں برسنے لگیں۔ مکتی باہنی کے جوانوں نے یکبارگی ہمیں گھیر کر حملہ کیا تھا۔ ان حالات میں میں ہاں نہ کہہ سکا، کارروائی پوری نہ ہو سکی۔ وہ نکاح نامہ بھی پتا نہیں کہاں گم ہو گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ زمین تارا نے نکاح قبول کر لیا تھا۔ مجھے اپنا شوہر قبول کر لیا تھا۔ چونکہ میں قبول نہ کر سکا، اس لیے یہ نکاح شریعت کی رُو سے ادھورا رہ گیا ہے۔"

بڑو دیدی نے غصے سے کہا: "یہی تو ہم پوچھ رہے ہیں۔ یہاں میاں بیوی بن کر کیوں آ گئے؟ کیوں مجھے دھوکا دیتے رہے؟"

"بڑو دیدی! خدا کے لیے میری پوری بات سن لیجیے۔ اس کے بعد آپ جو چاہیں، ہمارے متعلق فیصلہ کریں۔"

تلسی رام نے کہا: "ہاں۔ ہاں بولو۔ اے شانتا! خبردار، جو اب بیچ میں بولیں۔"

"جیجا جی! آپ اسی رات کیمپ میں مجھ سے ملنے آئے۔ آپ مجھے وہاں سے لے جانا چاہتے تھے۔ دیدی کے پاس بھیجنا چاہتے تھے۔ میں نے نین تارا کا ذکر کیا تو آپ نے کہا۔ مجھے ہزاروں لڑکیاں مل جائیں گی۔ میں آپ کے ساتھ تنہا چلوں۔ وقت بہت کم ہے۔ تب میرے دماغ میں یہ بات آئی، اگر میں نین تارا کو اپنی بیوی ظاہر کروں گا تو آپ مجبور ہو جائیں گے۔ اسے بھی ساتھ لے چلیں گے۔ دوسری بات یہ کہ آئندہ کے حالات ہم نہیں جانتے تھے۔ ہمیں کہاں جانا ہے؟ کن لوگوں کے درمیان رہنا ہے؟"

"خسرو ٹھیک کہتا ہے۔"

بڑو دیدی نے اپنے پتی کو گھور کر دیکھا۔ پھر پوچھا: "کیا ٹھیک کہتا ہے؟ جب آپ اسے میرے پاس بھیج رہے تھے تو میرے پاس آکر جھوٹ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا تو کیا میں اس کا نکاح نہ پڑھوا دیتی۔"

"دیدی! یہی تو آپ نہیں جانتیں۔ اس وقت ہمارا نکاح نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ نین تارا کے والدین کا انتقال ہوئے چالیس دن بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ ایسی صورت میں شادی کیسے ہو سکتی تھی۔ آپ فرض کریں کہ میں آپ سے سچ کہہ دیتا لیکن جب ہم یہاں سے نکل کر شیر بلڈنگ میں رہنے کے لیے گئے تو وہاں بھی یہ بات پھیل جاتی کہ ہمارا نکاح مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ حالات کو کوئی نہیں دیکھتا۔ وہاں ہم کس طرح رہ سکتے تھے؟"

"خسرو ٹھیک کہتا ہے۔"

بڑو دیدی نے پھر اپنے پتی کو گھور کر پوچھا: "کیا ٹھیک کہتا ہے؟ میں اسے بھائی کہتی تھی، مگر بیٹا سمجھتی تھی۔ اس نے مجھ پر بھروسا نہیں کیا۔ اسے بیوی بنا کر ناٹک کرتا رہا۔"

"دیکھو شانتا! تم اس طرح سوچو کہ خسرو نے تم سے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہا ہے۔ اس نے بالکل سچ کہا ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب کے مطابق ان کا پورا نکاح نہیں ہوا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ جب لڑکا اور لڑکی راضی ہو گئے ہیں اور کسی کی گواہی کے بغیر مندر میں جا کر میاں بیوی بن گئے ہیں تو ہم انھیں میاں بیوی تسلیم کر لیتے ہیں۔"

"بھارتی فلموں کی باتیں نہ کریں۔ دھرم میں ایسا نہیں ہوتا۔"

"ایسا ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ اب تو ہو سکتا ہے؟ میں ابھی جا کر چار معزز مسلمانوں کو ایک مولوی صاحب کے ساتھ لے آتا ہوں۔ اب تو ایسا ہو سکتا ہے؟"

بڑو دیدی اونہہ کہہ کر خسرو کی طرف سے منہ پھیر کر وہاں سے چلی گئیں۔ ذرا دیر بعد ہی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ خسرو نے کھڑکی کی طرف سے پلٹ کر دیکھا، وہاں دیدی کھڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ہاتھ سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "چلو نکلو یہاں سے۔ دلھن کے کمرے میں کیا کر رہے ہو۔ شرم نہیں آتی؟"

وہ سر جھکا کر باہر چلا گیا۔ ایک گھنٹے کے اندر نکاح پڑھا دیا گیا۔ جس طرح اسے باہر نکالا گیا تھا، اسی طرح اب مذہبی اور قانونی طور پر اسے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ رات کے دو بجے تھے۔ شانتا صحن میں بیٹھ کر چپکے چپکے رونے لگی۔ تلسی رام نے حیرانی سے پوچھا: "کیا ہوا؟"

وہ آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی: "کچھ نہیں۔"

"تم ایسے رو رہی ہو جیسے اپنی بیٹی کو رخصت کیا ہو۔ بھئی! تم نے اپنے بھائی کی شادی کی ہے۔ ایک طرح سے بہو گھر آئی ہے۔ بھائی تو کہیں نہیں گیا؟"

"نہیں گیا ہے تو صبح چلا جائے گا۔ ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا۔" وہ آنچل میں منہ لپیٹ کر پھر رونے لگی۔

"روتی کیوں ہے۔ ایک دن تو اسے جانا ہی تھا۔ وہ مسلمان ہے۔ ہم ہندو ہیں۔ وہ پاکستانی ہے، ہم ہندوستانی ہیں۔"

وہ روتے ہوئے بولی: "اب تک یہی سنا تھا کہ آدمی مرنے کے بعد جدا ہوتا ہے لیکن یہ سیاست جیتے جی ہمیشہ کے لیے جدا کر دیتی ہے، سرحدیں کھڑی کر دیتی ہے۔"

"شانتا! سرحدیں بنتی نہیں ہیں، بنائی جاتی ہیں۔ پہلے ہندوستان تقسیم ہوا تو پاکستان کے درمیان ہندوستان کی سرحدیں قائم ہو گئیں۔ اب بنگلہ دیش بن گیا ہے تو سرحدوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ جب کوئی ملک ٹوٹتا ہے یا تقسیم ہوتا ہے تو اس کے ساتھ رشتے بھی تقسیم ہو جاتے ہیں۔ تم ایک رشتے کے لیے رو رہی ہو۔ تاریخ کے اس اہم موڑ پر بہاریوں کا کوئی خاندان شاید ہی کہیں مکمل ہو۔ کتنی ہی بہنیں اپنے بھائیوں سے بچھڑ گئی ہیں۔ کتنی ہی مائیں اپنے بچوں کو پوچھتی پھر رہی ہیں۔ وہ زندہ بھی ہیں یا خدانخواستہ مر گئے؟ اگر زندہ ہیں تو کس شہر اور کس ملک میں ہیں۔ تنہا عورتیں اپنے بچوں کو سمیٹ کر اپنے گھر والوں کے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہیں کہ وہ ہندوستان یا پاکستان بخیریت پہنچ جائیں پھر وہاں سے وہ کسی طرح انھیں بلا لیں۔ مگر کب بلائیں گے آج جو بچے ہیں، یہ دعائیں مانگتے مانگتے جوان ہو جائیں گے لیکن انھیں کسی ملک میں اخلاقی پناہ نہیں ملے گی۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ انسانی تاریخ نفرتوں، عداوتوں اور ملکوں کی تقسیم سے بھری پڑی ہے لیکن پوری تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ لاکھوں خاندان کے افراد تین ملکوں میں تقسیم ہو گئے

ہوں اور تینوں ملکوں کی سرحدیں انھیں ملنے سے روک رہی ہوں۔ جانور قربان ہوں تو ان کا گوشت گھر گھر تقسیم ہو جاتا ہے لیکن بہاریوں کی قربانیاں کسی کھاتے میں نہیں تھیں۔ یہ قربانیاں دینے کے بعد ہڈیاں اور چھیچھڑے بن گئے تھے جنھیں حالات کے چیل اور کوّے ایک ملک سے دوسرے ملک لیے پھر رہے تھے۔

نین تارا اور خسرو اس رات سو نہ سکے۔ انسان اپنی مرضی سے سو نہیں سکتا۔ جذبے اسے سُلاتے اور جگاتے رہتے ہیں۔ مصائب کی مار پڑتی رہے تو نیند نہیں آتی اور مسرتیں آغوش میں بھر جائیں، تب بھی نیند بھاگ جاتی ہے۔ خسرو نے کہا: "کل سے ہم انجانے راستوں پر سفر کرنے والے ہیں۔ تم تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔ ورنہ راستے میں اونگھتی رہوگی۔"

"میں کہیں بھی سو جاؤں مجھے کوئی اندیشہ نہیں رہے گا کیونکہ تم پہلے سے زیادہ اب میری ذمّے داری قبول کرو گے۔ مجھے ہر آفت سے بچاؤ گے۔ دراصل مرد کو آرام کرنے کے بعد تازہ دم رہنا چاہیے۔ تاکہ وہ سفر کے دوران چوکنّا رہے۔ میں تمھارے پاؤں دابتی ہوں۔ بالوں میں کنگھی کرتی ہوں، تم سو جاؤ۔"

وہ سر سہلانے آئی تو نگاہوں کے عین مقابل اور زیادہ روشن ہو گئی۔ زیادہ روشنی میں نیند نہیں آتی۔ اس لیے وہ سو نہ سکا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے جو سُلانے آتے ہیں، وہی جگانے لگتے ہیں۔ مثلاً محلے میں چوکیدار اس لیے رکھا جاتا ہے کہ اس کی موجودگی میں رات کو آرام سے نیند آئے لیکن وہی چوکیدار ہر آدھے گھنٹے، ایک گھنٹے کے بعد دروازے پر آ کر سیٹی بجاتا ہے یا آواز نکالتا ہے: "ہوشیار، خبردار، جاگتے رہو۔"

یعنی نائٹ چوکیدار کی ڈیوٹی بے کھٹکے سونے کے لیے نہیں بلکہ رات کو وقفے وقفے سے جاگتے رہنے کے لیے ہے۔ خسرو اب اس کا محافظ تھا۔ وہ آرام سے سو سکتی تھی اور وہ اس کی چوکیداری کر سکتا تھا مگر بات وہی تھی۔ چوکیدار کی موجودگی میں نیند اور جاگ جاتی تھی۔

بڑو دیدی کے دستور اور دھرم کے مطابق رسوئی گھر میں آنے سے پہلے دونوں نے غسل کرنے کے بعد لباس تبدیل کر لیا تھا۔ تلسی رام نے نین تارا سے کہا: "اپنے تمام زیورات مجھے دے دو۔ یہ سب کے سب تمھیں ہندوستان پہنچنے کے بعد مل جائیں گے۔"

نین تارا نے تمام زیورات لا کر دے دیے۔ تلسی رام انھیں لے کر چلا گیا۔ جاتے جاتے تاکید کی: "تمھاری بڑو دیدی اور ششی تم دونوں کو رکشا میں بٹھا کر اس کالج تک آئیں گی۔ وہاں سے تم لوگوں کو رخصت کر دیا جائے گا کسی کو اس بات کا پتا نہیں ہے کہ تمھیں سرحد پار بھیجا جا رہا ہے۔ اپنے چہرے سے پریشانی ظاہر نہ کرنا۔ ہنستے بولتے رہنا۔"

اس کے جانے کے بعد بڑو دیدی اور ششی ان دونوں سے خوب باتیں کرتی رہیں۔ بڑو دیدی کی باتوں سے اور محبتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بھائی کے جانے پر خوش نہیں ہیں۔ وہ بار بار کہہ رہی تھیں: "پاکستان پہنچنے کے بعد مجھے بھولنا نہیں مجھے ہندوستان کے پتے پر خط لکھنا۔ وہ خط مجھے یہاں مل جایا کریں گے۔"

ناشتہ کرنے کے ایک گھنٹے بعد ان کے مکان کے سامنے دو رکشے آ گئے۔ خسرو نے ایک چھوٹی سی اٹیچی میں اپنے اور نین تارا کے دو دو جوڑے رکھ لیے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ضروری سامان تھا۔ ایک رکشے میں وہ بڑو دیدی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دوسرے رکشے میں نین تارا اور ششی بیٹھ گئیں۔ پھر وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ مارواڑی پٹی کی سڑک شہر سے باہر جاتی تھی۔ سڑک کے اطراف بہت سے مکانوں کے لوگ انھیں دیکھ رہے تھے۔ کچھ عورتوں نے بھی انھیں دیکھا لیکن کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ شہر کے باہر چھوٹے سے پُل کے اس پار ایک مندر تھا۔ انھوں نے یہی سوچا کہ بڑو دیدی اور ششی پوجا کے لیے جا رہی ہیں اور اپنے ساتھ ان مسلمانوں کو بھی محض ہوا خوری کے لیے لے جا رہی ہیں۔

وہ قائدِاعظم کالج کے سامنے پہنچ گئے۔ خسرو نے دیکھا۔ کالج تو اپنی جگہ موجود تھا مگر اس کی پیشانی پر سے قائدِاعظم کا نام کھرچ دیا گیا تھا۔ ان دنوں سید پور کے ہندو اور بنگالی اس کالج کا نام رکھنے کے لیے مختلف تجاویز پیش کر رہے تھے۔ ایک خیال تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے نام پر اس کالج کا نام بونگو بوندھو کالج رکھا جائے گا۔

پُل کے اس پار مندر کے پیچھے وہ ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر بڑو دیدی رونے لگیں۔ ششی کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ انھوں نے نین تارا کو گلے لگا کر دعائیں دیں۔ بڑو دیدی نے خسرو کی پیشانی کو چوم کر کہا: "بہن کو یاد رکھنا۔"

"دیدی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ جیسی محبت کرنے والی ہستیوں کو بھولنے کے بعد آدمی آدمی نہیں رہتا اور میں آدمی رہنا چاہتا ہوں۔ اپنی زندگی کے آخری سانس تک کبھی آپ کو بھلا نہیں سکوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ آپ کو خط لکھتا رہوں گا۔"

آخر وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ ٹرک کے اگلے حصے میں ڈرائیور کے ساتھ خسرو اور نین تارا بیٹھ گئے۔ پچھلے حصے

میں باسمتی چاول کے بورے لدے ہوئے تھے اور وہ بنگلہ دیش سے ہندوستان لے جائے جا رہے تھے۔ کوئی اعتراض کرنے والا نہیں تھا۔ اعتراض جس پر ہوتا، وہ مال ٹرک کے چور حصے میں چھپا ہوا تھا۔ نوزائیدہ بنگلہ دیش میں فوج اور پولیس کا عملہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ ہر سمت سرحدوں پر پہرے لگائے جاسکتے اور اگر ایسا ہوتا بھی تو اسمگلنگ کو روکنا تقریباً ناممکن تھا۔

اب سے پہلے پاکستانی حکمران بھی اسمگلنگ کو روکنے میں ناکام رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب معلوم کرنے کے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان کو ابتدا ہی سے کس طرح اسمگلنگ کے ذریعے کھوکھلا کیا جاتا رہا ہے۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) ایم امراؤ خان (ستارۂ پاکستان) نے اس سلسلے میں لکھا ہے۔

” جب میں مشرقی پاکستان کا آخری بار جی او سی تھا (۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۰ء) تو اسمگلنگ کی رپورٹیں برابر آتی رہیں، ۱۹۵۷ء کے بعد تو حالات بہت ہی بگڑ چکے تھے۔ مشرقی پاکستان کی تمام پیداوار ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کے استعمال کے لیے ہے۔ چاول پٹ سن، مچھلی، انڈے سبھی چیزیں کلکتہ پہنچ جاتی تھیں۔ اسمگلنگ کی روک تھام کرنے والے ادارے اسمگلروں سے ملے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ بیشتر سیاستداں بھی بڑے ہندو تاجروں سے پتی وصول کرتے تھے اور ان کی اس کام میں پشت پناہی کرتے تھے۔

جب میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر یہی حال رہا تو چند دنوں میں ہماری معیشت بالکل تباہ ہو جائے گی تو میں نے ایک مفصل رپورٹ تیار کی اور جی ایچ کیو کو روانہ کر دی۔ ساتھ ہی میں یہ بھی جانتا تھا کہ میری رپورٹ پر جی ایچ کیو فوج کے استعمال کی سفارش سینٹرل گورنمنٹ کو نہیں کرے گا لیکن مجھے یہ یقین ہو گیا کہ بغیر فوج کے اسمگلنگ کو روکنا ناممکن تھا۔ اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ عوامی لیگ کو اعتماد میں لیا جائے اور ان ہی کے ذریعے فوج کے استعمال کی درخواست سینٹر کو پہنچائی جائے۔ سب سے پہلے میں نے مرحوم تفضل حسین (مانک میاں) ایڈیٹر اتفاق کو اپنا ہم نوا بنایا۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ ان دنوں مانک میاں عوامی لیگ میں کنگ میکر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی مرضی کے خلاف سہروردی، مجیب الرحمٰن یا عطاالرحمٰن ہرگز کوئی کام نہیں کرتے تھے۔

بعد ازاں میں نے اپنی رپورٹ کی کاپی عطاالرحمٰن خان کو پیش کی اور صاف صاف بتا دیا کہ اگر اس ملک کو بچانا ہے تو اس کالے دھندے سے نجات حاصل کرنا ہو گی اگر ہندوؤں کی خوشنودی منظور ہے تو ملک سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔

عطاالرحمٰن خان ایک مخلص پاکستانی اور دیانتدار سیاستداں تھے۔ جب انھوں نے رپورٹ پڑھی تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے تجویز پیش کی کہ وہ وزیرِاعظم پاکستان سے درخواست کریں کہ ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ کراچی میں بلائی جائے جس میں فوج کے کمانڈر انچیف بھی موجود ہوں اور وہ مشرقی پاکستان کے حالات کا جائزہ لے کر یہ فیصلہ کریں کہ اسمگلنگ کی لعنت کو ختم کرنے کے لیے کیا انتظامات کرنے چاہئیں۔ چنانچہ ۱۲ یا ۱۳ دسمبر، ۱۹۵۷ء کو یہ میٹنگ مسٹر آئی آئی چندریگر کی زیرِ صدارت کراچی میں منعقد ہوئی۔ میں بھی موجود تھا اور ایوب خان کے برابر بیٹھا تھا تاکہ اگر مجھ سے کچھ پوچھنا چاہیں تو بتا سکوں۔ ایوب خان کے عین پیچھے عتیق الرحمٰن (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل اور سابق گورنر پنجاب) بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ان دنوں جی ایچ کیو میں وائس چیف آف اسٹاف کے عہدے پر فائز تھے اور ایوب خان کے ساتھ بطور سینئر اسٹاف افسر موجود تھے۔ عطاالرحمٰن صاحب پی آئی اے کا طیارہ لیٹ ہونے کے سبب دیر سے پہنچے۔ جلدی میں ان کا سوٹ کیس بھی گم ہو گیا۔ اچھی خاصی پریشانی کی حالت میں آئے۔

بہرحال انھوں نے مشرقی پاکستان کی تباہی کا نہایت ہی تفصیل سے نقشہ کھینچا۔ جس سے تمام حاضرین متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ملک کو بچانا ہے تو فوج کو میدان میں آنا پڑے گا۔ ورنہ کوئی صورت نہیں کہ مشرقی پاکستان کی پیداوار وہیں رکھی جاسکے کیونکہ قریب قریب تمام ہندو بیوپاری اور صنعتکار اپنی اولاد اور رشتے داروں کو مغربی بنگال بھیج چکے ہیں۔ ان کے خرچ کے لیے اور مغربی بنگال میں نئی صنعتکاری کے لیے یہ ضروری ہے کہ جو روپیہ مشرقی پاکستان میں کمایا جائے، اس کا بیشتر حصہ ہندوستان پہنچ جائے (بد قسمتی یہ تھی کہ تمام ہندوؤں کو اس کام میں مسلمان سیاستدانوں خاص کر عوامی لیگ کے لیڈروں کی حمایت حاصل تھی۔ قریباً سب نے اس دھندے میں اپنی پتی رکھی ہوئی تھی) ان حالات میں کسی سرکاری ادارے کی مجال نہیں تھی کہ ان ڈاکوؤں کو گرفت میں لے سکے۔

جب عطاالرحمٰن خان یہ بھیانک رُوداد سنا رہے تھے تو اس وقت بریگیڈیر عتیق الرحمٰن نے ایک کاغذ کا پرزہ ایوب خان کے سامنے چپکے سے رکھ دیا۔ ایوب خان نے اس کو پڑھا اور میں نے بھی دیکھ لیا۔ اس میں درج تھا کہ فوج کو کسی حالت میں بھی ملوث نہ کیا جائے۔ یہاں یہ بتانا مناسب ہو گا کہ جی ایچ کیو فوج کے استعمال کے خلاف کیوں تھا۔ اکثر لوگوں کو یاد ہو گا کہ ۱۹۵۶ء میں ہندو ذخیرہ اندوزوں نے قحط کے سے حالات پیدا کر دیے تھے۔ چاول کی پیداوار بھی کم ہوئی تھی لیکن ذخیرہ اندوزوں نے ملک کا تمام چاول اسٹاک کر لیا تھا اور اس کو

آہستہ آہستہ بیچنا شروع کیا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ چاول کی قیمت بارہ روپے سے بڑھ کر چالیس روپے تک پہنچ گئی۔ ملک میں کہرام مچ گیا۔ یہاں یہ بتانا بھی مناسب ہوگا کہ چاول پر کنٹرول تھا لیکن عوامی لیگ کے عہدیداروں کو پرمٹ دینے کا اختیار تھا۔ انھوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ تمام بڑے بڑے ہندو تاجروں کو پرمٹ دیے گئے اور اس طرح ملک کا تمام چاول ان کے ہاتھ میں چلا گیا۔ پرمٹ دینے والوں کو مناسب معاوضہ مل گیا۔

جب حکومت کے خلاف جلسے جلوس شروع ہوئے اور لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہوگیا، تب فوج کو بلایا گیا اور ذخیرہ اندوزوں کے خلاف کارروائی کا حکم صادر ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز کے اندر اندر چاول کی قیمت اپنی اصلی سطح پر آگئی۔ ظاہر ہے کہ یہ اقدام ہندوؤں کو پسند نہیں آیا۔ انھوں نے سیاسی دباؤ ڈالا اور فوج کو واپس بیرکوں میں بھجوا دیا۔

یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ آخر ہندو ایک اقلیت ہوتے ہوئے اتنا بااثر کیوں تھا۔ بات یہ ہے کہ ان دنوں مشرقی پاکستان میں مسلمان دو دھڑوں میں تقسیم تھے۔ عوامی لیگ اور مولوی فضل حق کی 'کے ایس پی' ہندوؤں کے کل تیس ممبر صوبائی اسمبلی میں تھے۔ یہ سب کے سب عوامی لیگ کے ساتھ تھے۔ ان کے بغیر عوامی لیگ اپنی وزارت ایک دن بھی قائم نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس لیے وہ ان کے رحم و کرم پر تھی۔ اُدھر سینٹر میں ری پبلکن پارٹی کی حکومت تھی جو عوامی لیگ کے بغیر نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ اس لیے ہندو مشرقی پاکستان اور سینٹر کی حکومت پر چھایا ہوا تھا (بحوالہ آپریشن کلوز ڈور سے آپریشن فیئر پلے تک)

میجر جنرل (ریٹائرڈ) ایم امراؤ خان (ستارۂ پاکستان) نے اب سے بہت برس پہلے یہ بات کہی تھی جب مشرقی پاکستان نہیں ٹوٹا تھا لیکن بعد میں وہ ٹوٹ گیا۔ کہنے کو میجر جنرل صاحب کی بات پرانی ہوگئی لیکن جو بات سچ ہوتی ہے، وہ پرانی نہیں ہوتی بلکہ تاریخ کا ایک اٹوٹ حصہ بن جاتی ہے۔ آج بھی وہی ہندو مشرقی پاکستان کی طرح بنگلہ دیش کی معیشت پر چھائے ہوئے تھے۔ آج بھی کھلے عام اسمگلنگ ہو رہی تھی اور اسی اسمگلنگ کے ایک ٹرک میں نین تارا اور خسرو وہاں سے روانہ ہو رہے تھے۔

تلسی رام اگروال ایک دان پُن کرنے والا یعنی خیرات کرنے اور نیکی کمانے والا ہندو تھا لیکن اسے حماقت سمجھتا تھا کہ اناج کا بھاؤ کم کر کے عوام سے نیکی کمائی جائے۔ یہ حماقت خسرو نے کی تھی۔ پہلی بار تلسی رام کا اناج سید پور لانے کے بعد بازار کے بھاؤ کے خلاف اسے سستا فروخت کیا تھا۔ اس کے باوجود تلسی رام کا منافع رکھا تھا لیکن بیوپاری دوسروں کی کھال کھینچنے کی حد تک منافع کمانے کے عادی ہوتے ہیں۔ تلسی رام نے خسرو کی اس حماقت پر تبصرہ نہیں کیا تھا۔ یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ خسرو اور نین تارا کے سامنے وہ اپنی گنہگار طبیعت کے باعث بھی شرمندہ تھا۔ زیادہ زبان کھول نہیں سکتا تھا۔ اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں وہ شانتا کے سامنے پھٹ نہ پڑیں۔ اس کا پول نہ کھول دیں۔

دوسری بات یہ کہ انھوں نے خسرو کی رقم اپنے کاروبار میں لگائی تھی۔ اس کا منافع اس حد تک حاصل ہوا تھا کہ ادھر خسرو نے اناج فروخت کرنے میں نقصان کیا تھا تو دوسری طرف سے فائدہ پہنچایا تھا۔ وہ منافع تلسی رام نے اپنے پاس رکھا تھا اور اس کا کچھ حصہ خسرو کو دیا تھا۔ یہ بھی اس کی مہربانی تھی۔

دراصل ایک ہی سماج میں رہ کر شریف اور سمجھ دار لوگ ایک دوسرے کو چیلنج کر کے کبھی نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ اپنی سہولتیں زیادہ سے زیادہ حاصل کرتے اور دوسروں کو اپنے راستے سے ہٹائے رکھنے کے لیے مختلف چالیں چلتے ہیں۔ جیسا کہ اب تلسی رام کر رہا تھا۔ اس سے بڑی نیکی اور کیا ہوتی کہ نین تارا اور خسرو کو پاکستان پہنچانے کے لیے وہ انھیں ہندوستان کے راستے نیپال پہنچا رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ان دو مصیبتوں کو محبت سے گلے لگا کر رخصت کر رہا تھا۔

ایک ہی سماج میں رہ کر محبت سے یوں بھی اُلّو سیدھا کیا جاتا ہے۔

◆

وہ پانچوں جھونپڑی کے اندر تھے۔ عظمیٰ اور کلیم الدین بھوئیں دیوار سے ٹیک لگائے منعم باللہ کی آواز سن رہے تھے۔ وہ باہر کھڑا اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے انھیں گنتی سمجھا رہا تھا۔ ایک ہوائی فائر کے بعد اس کے ریوالور میں پانچ گولیاں رہ گئی تھیں اور اس کے پانچ شکار جھونپڑی کے اندر چھپے ہوئے تھے۔

جس جھونپڑی میں وہ چھپے ہوئے تھے، اس کے مکین عام بنگالیوں کی طرح نہایت ہی غریب تھے۔ وہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے متعلق بہت کم جانتے تھے۔ ملک کوئی سا بھی ہو، حکمراں کوئی ہو، وہ جنگل کے کنارے ایک جھونپڑی میں آباد تھے۔ انھیں اپنے بنگالی بھائیوں سے دشمنی تھی نہ بہاریوں سے۔ وہ امن و امان سے رہنے کے لیے ہی آبادیوں سے بہت دور وہاں آباد تھے۔ ایسے موقع پر نہ تو وہ آنے والے بنگالی بھائیوں سے لڑ سکتے تھے نہ بہاری مہمانوں کی حفاظت کر سکتے تھے۔ ان کے پاس تلوار نما لانبے پھل کے چاقو تھے جنھیں رام داؤ کہا جاتا تھا۔ وہ رام داؤ سے

جنگل کی جھاڑیوں کو کاٹ کر راستہ بناتے تھے۔ یا پھر جنگلی جانوروں کا ان سے مقابلہ کرتے تھے۔ انھوں نے آج تک اس ہتھیار سے کسی انسان کو قتل نہیں کیا تھا۔

بابر نے کلیم الدین بھویاں کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا: ”کیا تمھارے یہ میزبان بنگالی ایسے وقت اپنے مہمانوں کی حفاظت کے لیے کچھ کر سکتے ہیں یا دوسرے بنگالیوں کی طرح منافق ہیں؟“

کلیم الدین بھویاں نے دانت پیس کر کہا: ”بنگالی منافق نہیں ہیں۔ اگر ہیں بھی تو اتنی ہی تعداد میں جتنی کہ کسی دوسری قوم میں ہو سکتے ہیں اور منافقت ہوتی کیا ہے؟ انسان کو تینوں وقت کی روٹیاں ملیں، زندگی گزارنے کے لیے ضرورت کے اسباب مہیا ہوں، تو اس کے دل سے لالچ ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں لالچ حرص، جھوٹ اور فریب نہیں ہوتا، وہاں منافقت نہیں ہوتی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم لوگوں نے دیکھا تھا، جب ہم اس جھونپڑے کی طرف آ رہے تھے، تو یہی میزبان بنگالی اپنے اپنے ہاتھوں میں رام داؤ لے کر یوں کھڑے ہو گئے تھے جیسے ہمیں قتل کر دیں گے لیکن چند روپے ملتے ہی، ان کی عزت کا علاج ہوتے ہی ان کی دشمنی دوستی میں بدل گئی۔ دراصل یہ دولت، یہ اقتدار کی ہوس انسان کو انسان سے دور کرتی ہے۔“

باہر سے منعم باللہ نے گرجتے ہوئے کہا: ”اب میں تین تک گنتا ہوں۔ اگر کوئی باہر نہیں آئے گا تو میں اس جھونپڑے کو آگ لگا دوں گا۔“

جھونپڑی کے رہنے والے مرد، عورتیں اور بچے سب ہی باہر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر رونے اور گڑگڑانے لگے۔ ان کے لیے سر چھپانے کی وہی ایک جگہ تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ اپنے مہمانوں سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کریں گے کہ باہر آ جائیں۔

منظور فٹبالر نے کہا: ”ہم زیادہ دیر یہاں چھپے نہیں رہ سکتے۔ آخر باہر نکلنا ہی ہوگا۔ کیوں ان بے چارے غریبوں کی جھونپڑی کو جلنے دیا جائے؟“

بڑے میاں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا: ”میری زندگی کتنی رہ گئی ہے۔ پہلے میں ہی جاتا ہوں۔ شاید میرے خون سے ان کی پیاس بجھ جائے اور وہ تم لوگوں کو معاف کر دیں۔“

منظور فٹبالر نے اپنے زخمی تلووں پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا: ”نہیں جناب! آپ بزرگ ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ آخر وقت تک آپ کی حفاظت کریں۔ آپ سب سے آخر میں چلیں گے۔ پہلے میں جاؤں گا۔“

وہ آہستہ آہستہ مٹی کے فرش پر پاؤں رکھتے ہوئے دروازے کی طرف گیا۔ پھر دروازے کو کھول کر برآمدے میں آ گیا۔ باہر کھڑے ہوئے لوگ اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگے۔ پاؤں پر نظر پڑتے ہی وہیں رُک جاتی تھی۔ منظور، منعم باللہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ریوالور کی پانچ گولیاں گنوائی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی ہیرو کی طرح صرف پانچ گولیوں پر اکتفا کرے گا۔ اپنے نشانے پر اسے ناز ہوگا اور پانچوں کو پانچ گولیوں سے بغیر نشانہ خطا کیے ہلاک کر دے گا لیکن اس کی کمر سے پستول کی گولیوں کی پیٹی بندھی ہوئی تھی۔

منعم باللہ کے پیچھے اس کے دو جوان ساتھی کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کھلے چاقو تھے اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا: ”منعم دا! یہ تو منظور فٹبالر ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اسے چیئرمین بلڈنگ لے جا کر اس کے پاؤں کے دونوں تلوے چھیل دیے گئے تھے۔ ہم اسے جان سے مار ڈالنا چاہتے تھے لیکن اس کی فٹبال ٹیم کے جوان وہاں آ پہنچے تھے۔ بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ بڑی بحث کے بعد وہ اسے زندہ بچا کر لے گئے۔“

منعم باللہ نے اس کے پیروں کو چبھتی ہوئی سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر پوچھا: ”کیا زخم بھر گئے ہیں؟“

منظور نے کہا: ”نہیں۔“

وہ پھر اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا: ”پھر تم کس طرح کھڑے ہوئے ہو؟“

”میں چل بھی سکتا ہوں۔“

”اس کا مطلب یہ ہے، زخم بھر گئے ہیں۔“

منظور نے برآمدے کے سرے پر بیٹھتے ہوئے اپنے ایک پاؤں کی پٹیاں کھولتے ہوئے کہا: ”میں ابھی دکھاتا ہوں۔“

وہ پٹیاں کھولنے لگا۔ سب چپ چاپ کھڑے ہوئے تھے۔ کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ دونوں تلوے ایک سرے سے دوسرے تک چھیل دیے گئے اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑا بھی رہ سکے۔ آخر پٹیاں کھل گئیں۔ منظور نے اس پاؤں کو منعم باللہ کی طرف اٹھایا۔ اسے دکھایا۔ وہاں سرخ گوشت نظر آ رہا تھا۔ تلووں پر زور دے کر کھڑے ہونے اور چلنے کے باعث وہ سرخ سرخ گوشت ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ تلوے کے اطراف سے خون رس رہا تھا۔ عورتیں اور بچے اسے دیکھ نہ سکے۔ انھوں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ میزبان مردوں نے سر کو جھکا لیا۔ منعم باللہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ وہ قہقہے لگاتے ہوئے اِدھر سے اُدھر ٹہلنے کے انداز میں چل رہا تھا اور کہہ رہا تھا: ”کمال ہو گیا۔ یہ آدمی اس حالت میں ایسے

خطرناک جنگل سے گزر کر برما جائے گا۔ اس کا تو باپ بھی نہیں جاسکے گا۔"

اس کے ایک ساتھی نے پوچھا: "کیا تم اسے زندہ چھوڑ دوگے؟"

"ہاں، یہ اگر یہاں سے چل کر سرحد پار جاسکتا ہے تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ کیونکہ ہمارے دیش میں پہلے ہی گھسٹ گھسٹ کر سڑکوں پر بھیک مانگنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ جس طرح اب تک ہٹے کٹے بہاری ہماری روٹی، کپڑا اور مکان میں حصہ دار بنتے آئے ہیں، اسی طرح یہ دونوں پاؤں کا لنگڑا بہاری بنگالی بھیک منگوں کی روزی میں حصہ دار بنے گا۔ اس لیے اسے یہاں نہیں رہنا چاہیے اور مارنا اس لیے نہیں چاہیے کہ یہ آدھا مرچکا ہے اور اپنی زندگی کی آدھی لاش خود اٹھا کر یہاں سے جانے والا ہے۔ اسے جانے دو۔"

پھر اس نے جھونپڑی کی طرف منہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اے دوسرا کون ہے؟ باہر آؤ۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جھونپڑی کا دروازہ پھر کھلا۔ بڑے میاں باہر آئے۔ برآمدے میں پہنچ کر وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان کی کمر کسی قدر جھکی ہوئی تھی۔ منعم باللہ نے ہنستے ہوئے پوچھا: "بڑے میاں! اتنی عمر گزار چکے ہو۔ اب موت کے ڈر سے کیوں کانپ رہے ہو؟"

"بیٹے! موت سے نہیں خدا کے خوف سے کانپ رہا ہوں۔ سوچتا ہوں، ابھی دنیا سے رخصت ہو کر وہاں پہنچوں گا تو اپنے اعمال کا کیا حساب دوں گا۔"

منعم باللہ نے غصے سے کہا: "میں اپنی بنگالی بھاشا بول رہا ہوں اور تم جواب میں بھونک رہے ہو اگر چند لمحوں کے لیے بھی زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہماری بھاشا بولو۔ اگر زندگی کی بھیک مانگنا ہو تب بھی ہماری بھاشا میں گڑگڑاؤ۔"

بڑے میاں نے کہا: "سچ بات تو یہ ہے کہ بنگالی تہذیب میرے مزاج کے خلاف رہی۔ اس لیے میں نے آج تک تمھاری زبان نہیں سیکھی۔"

"کیوں مزاج کے خلاف رہی۔ ہماری تہذیب میں کون سی خرابی یا کون سا ننگا پن تم لوگوں نے دیکھا؟ رقص و موسیقی، شعر و ادب، مصوری اور سنگ تراشی، ہماری گھٹی میں پڑی ہیں۔ فنونِ لطیفہ جس قدر ہماری تہذیب و ثقافت میں ہے، اتنا برصغیر کے کسی صوبے میں، کسی قوم میں نہیں ہے۔ پورے برصغیر میں بنگالی اور تامل ایسی دو زبانیں ہیں جن میں ہسٹری، جغرافیہ، سائنس، ارتھمیٹک اور الجبرا کے تمام متبادل الفاظ موجود ہیں۔ یہ فخر یہاں کی کسی زبان کو حاصل نہیں ہے پھر ہماری زبان میں کس چیز کی کمی ہے اور اگر محبت کی کمی ہے تو رابندر ناتھ ٹیگور سے لے کر نذر الاسلام کی شاعری تک ایک ایک لفظ کا تجزیہ کرکے دیکھ لو۔ ان میں محبت ہی محبت ملے گی پھر ہم سے نفرت کیوں کرتے رہے۔ کیوں تم نے ہماری زبان نہیں سیکھی؟"

ایک ساتھی نے کہا: "منعم دا! اس بوڑھے کو تو مار ہی ڈالنا ہے۔ پھر اس کے سامنے نصیحت آمیز تقریر کرنے کا فائدہ کیا ہے؟"

اس نے منظور کی طرف دیکھتے ہوئے، اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا: "یہ شخص تو زندہ رہے گا۔ شاید یہ اپنے حوصلے کی بنا پر یہاں سے پاکستان پہنچ جائے۔ وہاں جا کر کم از کم یہ تو کہہ سکے گا کہ تالیاں دونوں ہاتھوں سے بجتی ہیں۔ اگر بنگالیوں کی کچھ غلطیاں تھیں تو بہاریوں کی بھی بے شمار غلطیاں تھیں۔ ٹھیک ہے ہم اپنی زبان سے یہ نہیں کہتے کہ انھیں ہماری زبان سیکھنی چاہیے لیکن یہ انصاف سے کہہ سکتے ہیں۔ یہاں سے یہ برما جا کر رہیں گے تو انھیں اپنی مادری زبان کے علاوہ کچھ برمی زبان سیکھنا پڑے گی۔ جب یہ مغربی پاکستان پہنچیں گے تو شاید کراچی اور لاہور کے علاوہ یہ جس صوبے میں بھی رہیں گے، انھیں وہاں کی بولی کو کسی حد تک سیکھنا ہوگا۔ اس کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے لاکھوں، کروڑوں مسلمان جس صوبے میں رہتے ہیں وہاں اپنی مادری زبان کے علاوہ علاقائی بولیاں سیکھتے ہیں پھر بنگالی میں ایسی کیا قباحت ہے کہ ان لوگوں نے تمھیں اپنا دشمن سمجھا یا ہمیں طیش دلانے کے لیے ہماری تہذیب سے دور رہے۔ ہماری زبان کو منہ نہیں لگایا۔"

وہ جھنجلاتے ہوئے بڑے میاں کی طرف پلٹ کر بولا: "میں بھی ایسے لوگوں کو منہ لگانا پسند نہیں کرتا۔ بلکہ زندہ دیکھنا پسند نہیں کرتا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ریوالور سے بڑے میاں کا نشانہ لیا۔ اسی وقت دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ کلیم الدین بھوئیاں نے باہر نکلتے ہوئے کہا: "دڑاؤں (رک جاؤ)"

منعم باللہ نے پہلے تو اسے حیرانی سے دیکھا پھر ایک قہقہہ لگا کر کہا: "اوہو، مجسٹریٹ سلیم الدین بھوئیار چھیلے، کلیم الدین بھوئیاں تمی ایکھانے، بھئی کمال ہو گیا۔ ہم سب تمھیں دیناج پور میں تلاش کرتے رہے۔ ہم نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ تمھارے پورے خاندان کے ساتھ تمھیں بھی کسی نے ہلاک کر دیا ہے مگر تم تو ابھی تک سانس لے رہے ہو۔ شاید میرے ہاتھوں سے مرنے کے لیے زندہ رہ گئے تھے۔ بائی دی وے، یہ بوڑھا تمھارا کون لگتا ہے۔

تم تو چھپے ہوئے تھے۔ اس کے لیے تڑپ کر باہر کیوں آ گئے؟"

"میں کسی بھی انسان کے لیے تڑپ سکتا ہوں۔ ابھی تم نے پوچھا تھا کہ ان لوگوں نے تمھاری زبان کیوں نہیں سیکھی۔ بیشک انھیں سیکھنا چاہیے تھا لیکن تم کسی پر زور زبردستی نہیں کر سکتے۔ زبان محبت سے سیکھی جاتی ہے اور محبت سے سکھائی جاتی ہے۔ یہ بتاؤ تم نے نفرت کرنے کے سوا کبھی کسی کو اپنی زبان سکھانے کی کوشش کی۔ کوئی ایسا ادارہ قائم کیا، جس سے بہاریوں کو بنگالی زبان سیکھنے کی ترغیب دی جاتی؟ میں مانتا ہوں، ان لوگوں کو خود سیکھنا چاہیے تھا۔ تم بھی مان لو کہ تمھیں بھی سکھانے کا کوئی ذریعہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ جب ایسا نہیں ہوا تو پھر اسے شخصی آزادی پر چھوڑ دو۔ یہ اپنے مزاج اور اپنی پسند کی بات ہے جو جس زبان کو سیکھنا چاہے، جس تہذیب کو اپنانا چاہے۔ اس کے لیے کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ کتنے ہی بنگالیوں نے بہاری عورتوں سے شادی کی اور کتنے ہی بہاریوں نے بنگالی عورتوں سے شادی کی۔ یہ شادی کرانے کے لیے کسی نے بین الصوبائی شادی دفتر نہیں کھولا تھا۔ یہ تو اپنی اپنی پسند اور اپنی اپنی مرضی کی بات تھی۔"

منعم باللہ نے طنزیہ انداز میں کہا: "اور یہ تمھاری اور تمھارے باپ کی شخصی آزادی تھی کہ تم لوگوں نے بنگلہ دیش کی مخالفت کی؟"

"ہاں، ہر شخص کا اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ ہم نظریہ پاکستان کے حامی تھے اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ اگر میں بخیریت پاکستان پہنچ جاؤں اور کچھ عرصے بعد پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہو جائیں، تم ایک سفارت کار کی حیثیت سے پاکستان آؤ تو میں تم سے کبھی یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے بنگلہ دیش کا نظریہ کیوں اختیار کیا تھا۔ اسی طرح میں سفارتی تعلقات کی بنا پر بنگلہ دیش آؤں تو تم یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کرو گے کہ میں نظریۂ پاکستان کا حامی کیوں تھا۔ اس وقت تم مجھے گولی نہیں مار سکو گے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آج جو مخالفتیں ہیں یہ محض وقتی اور جذباتی ہیں۔ ہمیں ایسی حماقتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔"

منعم باللہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "سنو، سنو! یہ پاگل کا بچہ کیا کہہ رہا ہے۔ جن پاکستانیوں نے ہمارا استحصال کیا، ہم ان سے سفارتی تعلقات رکھیں گے۔ ہرگز نہیں، ہم کبھی ایسا نہیں کریں گے اور ایسا وقت آئے گا یا نہیں آئے گا۔ ابھی تو تم ہمارے سامنے آ گئے ہو۔ اس لیے میں وقت ضائع کیے بغیر تمھیں تمھارے ماں باپ کے پاس پہنچا دینا چاہتا ہوں۔"

اس نے ریوالور کا نشانہ لیا۔ اس وقت کوئی اس کے ارادوں سے اسے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ اگر کوئی اسے رُکنے کے لیے بھی کہتا تو اس کے کہنے سے پہلے ہی ٹھائیں سے گولی چل جاتی لیکن اچانک ہی اس کا ریوالور والا ہاتھ کانپ گیا۔ عظمیٰ کی چیخ سنائی دی تھی۔ وہ چیخ ایسی تھی جسے وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ دوڑتے ہوئے دروازے کے پاس آئی تھی۔ پھر وہاں سے دوڑتے ہوئے کلیم الدین بھوئیاں کے سامنے پہنچ کر ڈھال بن گئی تھی۔ وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی: "رحمی، رحمی، پہشرے موڑے مارڈو (نہیں نہیں پہلے مجھے مارو) تمھارے ریوالور میں جتنی گولیاں ہیں۔ وہ سب میرے سینے میں بھر دو۔ میں اس سینے کو محبت کرنے والوں سے خالی نہیں ہونے دوں گی۔ ان سب کے لیے اپنی جان دے دوں گی۔"

منعم باللہ حیرانی اور پریشانی سے اس کی بولی سن رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا: "یہ تم کیا بول رہی ہو؟ تمھاری زبان ایسی کیوں ہو گئی؟ صاف طور سے کیوں نہیں بولتی ہو؟"

وہ کلیم الدین بھوئیاں کے پاس سے ہٹ گئی۔ برآمدے سے اتر کر منعم باللہ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ اس نے پھر پوچھا۔ "خاموش کیوں ہو؟ بولتی کیوں نہیں ہو؟"

کلیم الدین بھوئیاں نے کہا: "کسی ظالم نے اس کی زبان کاٹ دی ہے۔"

منعم باللہ یہ سنتے ہی لرز گیا۔ غصے سے چیخ کر بولا: "کس نے کاٹی ہے؟ کون ہے، وہ ظالم؟ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

اس وقت تک عظمیٰ اس کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اس نے دونوں بازوؤں کو تھام کر اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا: "تم اچھی طرح جانتی ہو، میں تمھیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ تمھیں کبھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ تمھیں اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا۔ بتاؤ کس نے تمھارے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے؟"

عظمیٰ نے اپنا منہ کھول کر زبان باہر نکالی۔ زبان موجود تھی۔ زبان کی نوک نہیں تھی پھر اس نے انگلی سے منعم باللہ کی طرف اشارہ کیا اور کہا: "ژوم ژے (تم نے)"

اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ پیچھے ہٹ کر انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا: "نہیں، نہیں عظمیٰ میں اتنا ظالم نہیں ہو سکتا کہ اپنی محبت کی زبان کاٹ دوں۔"

وہ اپنی کٹی ہوئی زبان سے بولنے لگی: "یاد کرو اس رات تم نے کتنی زیادہ پی لی تھی جب نشے کی زیادتی سے ہوش نہیں رہتا

تو محبت بھی نہیں رہتی۔ ایسی حالت میں غصہ اور جھنجلاہٹ غالب آتا ہے اور تم نے غصے میں جو کچھ کیا، وہ تمھارے سامنے ہے۔“

وہ اس کی بات نہیں سمجھ رہا تھا لیکن اب اسے بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ اس نے عظمیٰ کی زبان سے اُردو الفاظ سن کر غصے میں اسے کاٹ لیا تھا۔ کیسے کاٹا تھا؟ یہ اسے یاد نہیں رہا تھا۔ پھر اس نے بوتل اٹھا کر منہ سے لگا لی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد نہیں تھا کہ رات کو اور کیا ہوا تھا۔ بس وہ پینے کے دوران بےہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو کمرہ خالی تھا۔ عظمیٰ نہیں تھی۔ زمین پر سونے کے زیورات بکھرے پڑے تھے۔ انھی زیوروں کے درمیان گوشت کا ننھا سا ٹکڑا نظر آیا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ پھر قریب ہو کر اور غور سے دیکھا۔ اگر کوئی اناڑی ہوتا تو زبان کے اس ننھے ٹکڑے کو سمجھ نہ پاتا لیکن اس نے اتنے قتل کیے تھے اتنے جسموں میں گولیاں اتاری تھیں اور چاقو پھیرے تھے کہ وہ انسانی گوشت کے ایک ایک ٹکڑے کو پہچان سکتا تھا۔ اس نے زبان کے اس ٹکڑے کو پہچان تو لیا تھا لیکن پھر بھی یاد نہیں آیا کہ یہ عظمیٰ کی کٹی ہوئی زبان ہو سکتی ہے۔ آج وہ بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔

اس نے سر کے بالوں کو ایک مٹھی میں جکڑ کر بڑے کرب سے کہا: ”او خدا میاں! اللہ میاں! یہ میں نے کیا کیا؟ عظمیٰ! میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے دشمنی سے ایسا نہیں کیا۔ میں مانتا ہوں کہ مجھے تم لوگوں کی مادری زبان سے نفرت ہے۔ اس نفرت کی وجہ بھی بیان کر چکا ہوں۔ لیکن میں کسی موقع پر تمھارے جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر پھینک دوں۔ یہ میرا دل کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت کرتا ہوں کہ تمھارے جانے کے بعد دیوانہ وار تمھیں تلاش کرتا رہا۔ اب سمجھ میں آیا، کہ تم مجھ سے خوفزدہ ہو کر بھاگ گئی تھیں۔“

وہ پیچھے ہٹ کر نفرت سے بولی: ”میں خوفزدہ ہو کر نہیں بلکہ نفرت کی انتہا سے مجبور ہو کر غائب ہو گئی تھی۔ اب بھی تمھارے سائے میں کھڑے رہنا پسند نہیں کرتی۔“

وہ اس کی گڑبڑ بولی سمجھ تو نہ سکا لیکن نفرت کو سمجھ گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا: ”مجھ سے نفرت مت کرو۔ یہ سمجھ لو کہ میں نے کچھ نشے میں کچھ جنون کی حالت میں یہ غلطی کی۔ میں اس غلطی کی تلافی کروں گا۔ تم جو کہو گی وہ کروں گا۔“

عظمیٰ نے اسے چونک کر دیکھا۔ یہ خیال فوراً اس کے دماغ میں آیا کیا میں اس سے اپنی بات منوا سکتی ہوں؟ میرے ساتھ جو لوگ آئے ہیں، ان کی جانیں بچا سکتی ہوں؟

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر سوچنے لگی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا: ”مجھ سے نفرت مت کرو۔ میں وہ آدمی ہوں جو کسی سے التجا نہیں کرتا۔ جو چاہتا ہوں اس سے چھین لیتا ہوں لیکن میں عاجزی سے کہہ رہا ہوں کیونکہ میں ایک غلطی کر بیٹھا ہوں اگر تم مجھے معاف نہیں کرو گی، تو میں تمھیں زبردستی اٹھا کر لے جاؤں گا۔“

کلیم الدین بھوتیاں نے برآمدے سے اتر کر ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا: ”میں سارا قصہ سمجھ گیا۔ یہ تم ہو جو اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ اسے زبردستی اپنے ساتھ رکھا اور جب یہ تم سے محبت کرنے لگی تو اس کی زبان کاٹ ڈالی۔ آج پھر اس کے ساتھ وہی ناٹک کھیلنے آئے ہو۔“

منعم باللہ نے غصے سے کہا: ”بکواس مت کرو۔ ہم سے دور رہو۔ یہ ہمارا معاملہ ہے۔“

عظمیٰ نے کلیم الدین بھوتیاں کو محبت سے اور حسرت سے دیکھا پھر منعم باللہ کی طرف گھوم کر اپنی کٹی ہوئی زبان سے کہا۔ ”میں تمھارے ساتھ ہنسی خوشی چلنے کے لیے تیار ہوں۔ شرط یہ ہے کہ ان سب کو یہاں سے جانے دو۔ انھیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤ۔“

وہ زبان سے بھی کہہ رہی تھی اور اشاروں سے بھی سمجھا رہی تھی۔ منعم باللہ نے کہا: ”میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں، اپنی غلطی کی تلافی کے لیے تم جو کہو گی وہ کروں گا۔ ان سب کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ انھیں جانے کی اجازت دوں گا۔ بس تم میرے ساتھ چلو۔“

کلیم الدین بھوتیاں ان کے درمیان آ کر بولا: ”نہیں میں ایسی زندگی نہیں چاہتا جو ایک عورت کو قربان کرنے کے بعد ملے۔“

”دیکھو عظمیٰ! معلوم ہوتا ہے یہ غدار بنگالی مرنا چاہتا ہے اس کی حسرت پوری کر دو۔ میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ اسے زندہ چھوڑ سکتا ہوں لیکن اگر یہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو اسے مارنے کے بعد تمھارے باقی ساتھیوں کو چھوڑ دوں گا۔“

عظمیٰ فوراً کلیم الدین بھوتیاں کو ایک طرف دھکا دے کر ہٹاتے ہوئے بولی: ”یہاں سے چلے جاؤ۔ اپنے ساتھیوں کو لے کر چلے جاؤ۔ میری پروا مت کرو۔ میں تو عورت ہوں۔ عورت پانی کی طرح ہوتی ہے جس شکل کے برتن میں ڈالا جاتا ہے، وہی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے لیے زندگی گزارتی آئی ہے۔ تم لوگ میری پروا مت کرو۔ چلے جاؤ یہاں سے۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔ یہ میری لاش پر سے گزر کر ہی تمھیں لے جا سکے گا۔“

منعم باللہ نے ریوالور تان کر کہا: ”تو پھر تمھاری لاش پر سے گزر کر اسے لے جاؤں گا۔“

عظمیٰ نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اس کے ریوالور والے ہاتھ کو تھام لیا۔ اسے فائر کرنے سے منع کرنے لگی۔ اس نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے، تم بھی اسے چاہنے لگی ہو۔ ایسی صورت میں یہ میرا رقیب ہوا اور رقیب کو زندہ چھوڑنا بہت بڑی نادانی ہے۔ یہ یہاں سے جائے گا مگر راستے سے پلٹ کر آجائے گا۔ میرے لیے کہیں بھی مصیبت بن سکتا ہے پھر اس کی تلاش تو ہمیں دیناج پور سے ہے۔ عظمیٰ! میں تمھیں سمجھاتا ہوں، اپنے باقی ساتھیوں کی جان بچا لو۔ یہ مجھ سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔"

عظمیٰ فوراً ہی کلیم الدین بھویاں کے سامنے ایک بار پھر ڈھال بن گئی۔ اپنی کٹی ہوئی زبان سے کہنے لگی: "اگر اسے مارنا ہی ہے تو پہلے مجھے مارو۔ میں ان سب کی زندگی چاہتی ہوں۔ یا پھر ان کے ساتھ مر جانا چاہتی ہوں۔"

اس کی حرکتوں سے بہت سی باتیں سمجھ میں آجاتی تھیں۔ اس نے کہا: "اس سے جان دینے کی حد تک محبت کر رہی ہو۔ بنگالی میں سچ کہتے ہیں، عورت گھوڑی ہوتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں لگام ہو اسی کے ساتھ چلتی ہے۔ میرے ہاتھ سے لگام چھوٹ گئی تو بھویاں کے ساتھ چل رہی ہو۔ ابھی یہ تمھارے سامنے تڑپ تڑپ کر مرے گا تو تمھاری لگام پھر میرے ہاتھ میں آجائے گی۔"

اس کی بات پوری ہوتے ہی ایک بڑا سا پتھر اس کے منہ پر آکر لگا۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا۔ وہ اتنی دیر تک باتوں کے دوران پانچویں شکار کو بھول گیا تھا۔ پانچواں شکار بابر تھا جو اس دوران جھونپڑی کی چھت پر چڑھ کر کسی مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ موقع ملتے ہی اس نے پتھر کھینچ کر مارا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، اس نے جھونپڑی کی بلندی پر سے اس پر چھلانگ لگائی۔ منعم باللہ کے دونوں ساتھی چاروں طرف دیکھتے رہ گئے تھے کہ پتھر کس نے پھینک کر مارا ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پتھر جھونپڑی کی چھت پر سے آیا ہوگا۔ جب تک وہ سمجھتے اس وقت تک منعم باللہ پر دو طرفہ حملے ہو چکے تھے۔ چھت کی بلندی سے بابر نے چھلانگ لگائی تھی اور دوسری طرف سے کلیم الدین بھویاں نے اس کے ریوالور والے ہاتھ پر ایک زبردست ٹھوکر ماری تھی۔ ریوالور جہاں جا کر گرا، بھویاں بھی وہاں چھلانگ لگا کر گر پڑا۔ ریوالور لیتا ہوا زمین پر لڑھکتا ہوا ایک جگہ ٹھہر کر اس نے نوے ڈگری پر فائر کر دیا۔

گولی چلنے کی آواز سنتے ہی سب منتشر ہوگئے۔ جہاں تھے وہاں سے ذرا دور بھاگ کر کھڑے ہوگئے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ گولی کس نے چلائی۔ ریوالور دوست کے ہاتھ میں ہے یا دشمنوں کے؟

منعم باللہ اور بابر گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ وہ بھی فائرنگ کی آواز پر الگ ہوگئے۔ جب بابر نے دیکھا کہ ریوالور کلیم الدین بھویاں کے ہاتھ میں ہے تو اس نے پھر منعم باللہ پر حملہ کیا۔ بھویاں نے کہا: "رک جاؤ بابر! لڑنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ اس کے پاس جتنے بلٹ ہیں، انھیں اپنے قبضے میں لے لو۔"

بابر نے فوراً ہی اس کی کمر سے وہ پیٹی کھول لی جس میں بلٹ لگے ہوئے تھے۔ بھویاں نے کہا: "منعم باللہ! تمھاری اور عظمیٰ کی شناسائی کا علم ہوا تو تمام باتیں میری سمجھ میں آگئیں۔ ہم سب ہی جانتے ہیں کہ تمھاری والدہ زبان کے مسئلے پر جدوجہد کرتے ہوئے شہید ہوگئی تھیں۔ ہم تمام بنگالی تمھاری ماں کو اپنی ماں سمجھتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں لیکن تمھاری والدہ نے کبھی یہ نہیں چاہا ہوگا کہ اردو بولنے والے قتل کیے جائیں۔ ان کی زبان کاٹی جائے۔ ہم جب بھی کہیں کسی کے سامنے کوئی مسئلہ پیش کرتے ہیں تو اس مسئلے کا حل چاہتے ہیں۔ اگر زبان کا مسئلہ تھا تو ہماری ایک ہی مانگ تھی کہ اکثریت کی زبان بنگالی ہے۔ پاکستانی آبادی کے لحاظ سے بنگالی سب سے زیادہ بولی، سب سے زیادہ لکھی، سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے لہٰذا اسے قومی زبان ہونا چاہیے۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ بنگالی زبان کو قومی زبان نہیں بنایا جا رہا ہے لہٰذا اردو بولنے والوں کو قتل کیا جائے یا اردو زبان کو کچل دیا جائے۔"

اس نے پوچھا: "تم ریوالور دکھا کر کیا منوانا چاہتے ہو؟"

"ہر بات ہتھیاروں کے زور پر منوائی نہیں جاتی۔ میں صرف دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ عظمیٰ کے ساتھ تم نے جو سلوک کیا، اسے کوئی بھی سمجھ دار بنگالی پسند نہیں کرے گا بلکہ تم پر چھی چھی، تھو تھو کرے گا۔ دوسری بات اگر تم روحانیت کے قائل ہو تو یقین کرلو کہ تمھاری ماں کی روح کو تمھاری اس حرکت کی وجہ سے سخت تکلیف پہنچ رہی ہوگی۔"

بابر نے کلیم الدین بھویاں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "اے بھائی! یہ تم نصیحتیں کرنے میں وقت ضائع کیوں کر رہے ہو۔ ان تینوں کو گولی مارو اور یہاں سے بھاگ چلو۔"

بھویاں نے ہاتھ اٹھا کر اسے قریب آنے سے روکتے ہوئے کہا: "بابر! میں اسے قتل نہیں کروں گا۔ اس کی ماں شہید ہوگئی تھی، تب سے یہ ذہنی مریض بن گیا ہے۔ میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ انھیں زندہ

رکھوں گا۔ یہ دیکھیں گے کہ ہم کتنی مصیبتیں اٹھا رہے ہیں۔ یہ بھی ہمارے ساتھ مصیبتیں اٹھاتے ہوئے برما کی سرحد تک جائے گا۔ جب ہم دوسرے ملک پہنچ جائیں گے تو میں اس کا خالی ریوالور اسے واپس کر دوں گا۔"

منعم باللہ نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا "میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ تم مجھے زبردستی نہیں لے جا سکتے۔"

"تم جاؤ گے اور نہیں جاؤ گے تو پہلے تمہاری ایک ٹانگ پر گولی ماروں گا تم لنگڑاتے ہوئے گھسٹتے ہوئے چلنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ تمہارے ساتھیوں کا بھی یہی حشر ہو گا۔ سوچ لو۔"

بڑے میاں نے کہا "یہ کیا حماقت ہے۔ دشمنوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ گے تو راستے میں یہ کہیں بھی ہمارے بے خطرہ بن سکتے ہیں۔"

بھوئیاں نے جواب دیا "شیر اگر پنجرے میں ہو تو اسے کہیں بھی لے جایا جا سکتا ہے۔ دشمنوں کو ریوالور کی زد پر رکھا جائے تو وہ چوہے بن کر رہتے ہیں۔"

بابر نے جھنجھلا کر کہا "صاف کیوں نہیں کہتے تم بنگالی ہو اور اپنے بھائیوں کو مارنا نہیں چاہتے۔"

"میں پاکستانی ہوں مگر بنگالی بھی ہوں۔ خواہ مخواہ اپنے کسی بھائی کو مارنا نہیں چاہتا۔ بہت مجبور ہو کر ایک بنگالی منشو دادا کو ہلاک کیا تھا۔ وہ سچویشن ہی کچھ ایسی تھی۔ اس کے بعد مجھے لانچ میں کئی مکتی باہنی کے جوانوں کو ہلاک کرنے کا موقع ملا لیکن میں نے وہ ساری گولیاں ہوائی فائر کے ذریعے ضائع کر دیں۔ میں جانتا تھا کہ لانچ کے تمام مسافر میری حمایت کر رہے ہیں اور اس بچے کو ہلاک نہیں ہونے دیں گے۔ آج یہ تین بنگالی میرے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔ میں انہیں بھی ہلاک نہیں کروں گا۔ آخر وقت تک زندہ چھوڑنے کی کوشش کروں گا۔ انھیں سرحد تک لے جاؤں گا اور وہاں سے واپس کر دوں گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ کان لگا کر سننے لگے۔ درخت اور جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ دور سے آنے والی گاڑی نظر نہیں آ سکتی تھی۔ جھونپڑی سے کچھ فاصلے پر وہ اسکوڈا کھڑی ہوئی تھی جس میں پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والے آئے تھے۔ اس کے پیچھے جیپ کار تھی جس میں منعم باللہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور جیپ کار آ کر رک گئی۔ اس میں بنگلہ دیش کے مسلح فوجی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں اور رائفلیں تھیں۔ وہ جیپ سے اتر کر تیزی سے ان کی طرف دوڑتے آ رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی منعم باللہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بھوئیاں کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ریوالور اب تمہارے کسی کام کا نہیں رہا۔ تم مجھے سرحد کی طرف کیا لے جاؤ گے ابھی دیکھتے ہی دیکھتے میں تم سب کو زندگی کی سرحد کے پار پہنچا دوں گا۔"

اس کی باتوں کے دوران بی ڈی آر کے جوانوں نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ چاروں طرف اسٹین گنیں نظر آ رہی تھیں۔ کلیم الدین بھوئیاں نے بے بسی سے ایک گہری سانس لی۔ اور ریوالور کو فوجی افسر کے قدموں کی طرف پھینک دیا۔

⁂

وہ ٹرک سرحد کی طرف جا رہا تھا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ خسرو بیٹھا ہوا تھا۔ خسرو کے ساتھ نین تارا بیٹھی ہوئی تھی۔ پچھلے حصے میں چاول کی بوریوں پر ایک کلینر کے ساتھ تلسی رام کا خاص آدمی بیٹھا ہوا تھا جو خسرو اور نین تارا کو نیپال تک پہنچانے کا ذمے دار تھا۔

نین تارا سونا نہیں چاہتی تھی لیکن تمام رات کی جاگی ہوئی تھی۔ جاگتے رہنے کی کوشش کرنے کے باوجود اونگھنے لگتی تھی۔ اونگھتے وقت سامنے ڈیش بورڈ سے ٹکرانے لگتی تھی۔ خسرو نے کہا "میرے کاندھے پر سر رکھ لو۔"

وہ بھلا سر کیسے رکھتی؟ وہ نئی دلھن تھی۔ پھر ایک اجنبی ڈرائیور ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مشرقی عورت کسی کی موجودگی میں اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بھی شرماتی ہے۔ پھر وہ اس کے کاندھے پر سر رکھ کر کیسے سو سکتی تھی؟ لیکن وہ تھوڑی دیر بعد کیسے سو گئی وہ خود سمجھ نہ سکی۔ نیند کا غلبہ ایسا تھا کہ آنکھیں بند ہونے کے بعد اس کا سر آپ ہی آپ خسرو کے شانے کی طرف ڈھلک گیا تھا۔

حسن اور دولت دو ایسی چیزیں ہیں جنھیں دیکھ کر اکثر لوگوں کی نیت پل بھر میں بدل جاتی ہے۔ خسرو نے محسوس کیا کہ ڈرائیور کبھی کبھی کن انکھیوں سے نین تارا کی طرف دیکھ لیتا ہے۔ کبھی بڑی بڑی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہے اور کبھی گنگنانے لگتا ہے۔ اس نے نین تارا کے سر پر چادر ڈال دی۔ اس کے چہرے کو ڈھانپ دیا۔ مرد خواہ کتنا ہی برتر ہو، شادی کے بعد عورت کا باڈی گارڈ بن کر رہ جاتا ہے۔

وہ دوپہر کو پونچا گڑھ پہنچ گئے۔ ان کا راستہ بستی کے درمیان سے گزرتا تھا۔ ڈرائیور نے ٹرک کو ٹھیک تھانے کے سامنے لے جا کر روک دیا۔ تلسی رام کا خاص آدمی ٹرک سے اتر کر تھانے کے اندر چلا گیا۔ وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ جسے پولیس والے تھانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ٹرک کی آواز سنتے ہی تھانیدار جلدی سے باہر آیا تھا۔ پھر تلسی رام کے

آدمی کو دیکھتے ہی دونوں ہاتھ پھیلا کر خوشی سے بغل گیر ہو گیا تھا۔ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ان دونوں کے درمیان پہلے سے سمجھوتہ ہے۔ نہ مال رُکے گا اور نہ ہی خسرو اور نین تارا کو روکا جائے گا۔

وہ دونوں تھانے کے اندر چلے گئے۔ ڈرائیور ٹرک سے اتر کر انجن چیک کرنے کے لیے سامنے کی طرف آیا۔ بونٹ اٹھانے کے بہانے اس نے نین تارا کی طرف دیکھا مگر اس کا چہرہ چادر میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے بونٹ کو اٹھایا پھر ایک زوردار دھماکے کی آواز کے ساتھ اسے گرا دیا۔ نین تارا یکبارگی چیخ مار کر بیدار ہو گئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے آس پاس دیکھنے لگی۔ خسرو نے اسے تھام لیا۔ پھر ایک ہاتھ سے تھپکتے ہوئے بولا۔ "گھبراؤ نہیں، میں تمہارے پاس ہوں۔"

ڈرائیور نے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ "ہی ہی ہی۔ ڈر گئی۔ بے چاری سو رہی تھی۔"

تھانیدار نے جھونپڑی سے باہر نکل کر پوچھا "یہ کیسی آواز تھی؟"

ڈرائیور نے کہا "حضور! میرے ہاتھ سے بونٹ چھوٹ گیا تھا۔ کوئی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے۔"

خسرو اسے گھور کر دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا۔ سب ٹھیک نہیں ہے۔ بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے لیکن یہ بات اس نے نین تارا سے نہیں کہی۔ اسے تسلی دینے لگا "ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ سے بونٹ چھوٹ گیا تھا۔ تم سو جاؤ۔"

وہ اپنے آپ میں حیا سے سمٹتے ہوئے بولی "میں کیسے سو گئی تھی؟"

"نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ فکر نہ کرو۔ سو جاؤ۔"

نیند کی مدہوشی الگ سی بات ہے۔ وہ ہوش میں رہ کر کبھی اس طرح سو نہیں سکتی تھی۔ منہ پھیر کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ تھانیدار تلسی رام کے آدمی کے ساتھ ان کی طرف آ رہا تھا۔ تلسی رام کے آدمی نے کہا "خسرو بھائی! آپ لوگ باہر آجائیں پیچھے داروغہ صاحب کی جھونپڑی ہے وہاں چل کر آرام کریں۔"

وہ دونوں باہر آگئے۔ خسرو نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا "کیا یہاں زیادہ دیر تک رکنا ہوگا؟"

"ہاں یہ بنگلہ دیش کی آخری بستی ہے۔ اس کے بعد تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد سرحد ہے اور سرحد کو رات کی تاریکی میں ہی پار کیا جا سکتا ہے لہٰذا اندھیرا ہونے تک یہاں آرام کرنا مناسب ہے۔"

داروغہ نے کہا "میرے گھر میں بیوی ہے اور جوان بیٹیاں ہیں۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ تم دونوں وہاں چل کر اشنان کرو، پھر بھوجن کرو۔ اس کے بعد چاہو تو سو جاؤ۔ ہم وقت پر جگا دیں گے۔"

خسرو نے کہا "ہم اشنان کر کے آئے ہیں۔ بھوجن کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ پیٹ بھرا ہوا ہے۔ ہاں تھوڑی دیر آرام کریں گے۔"

وہ داروغہ کے مکان میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر کی عورت اور دو جوان لڑکیوں نے خوش دلی سے نین تارا کا استقبال کیا جب وہ ان کے ساتھ ایک کمرے میں چلی گئی تو خسرو نے تلسی رام کے آدمی سے کہا "رام اوتار! ذرا ادھر آؤ۔ میں تم سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔"

رام اوتار نے کہا "بھائی جی! جو کہنا ہے، داروغہ صاحب کے سامنے کہہ دیں۔ ان سے ہمارا کوئی پردہ نہیں ہے۔"

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "وہ ڈرائیور تمہاری تارا دیدی کو لفنگوں کے انداز میں دیکھتا ہے۔ کچھ ایسی شرارتیں کرتا ہے جن پر میں کھل کر اعتراض نہیں کر سکتا۔ نہ ہی اس کی شرارتوں کو ثابت کر سکتا ہوں۔"

رام اوتار نے کہا "ہوں، سمجھ گیا۔ وہ پکا بدمعاش ہے جس تھال میں کھاتا ہے، اس میں چھید کرے گا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ یہاں اندھیرا ہونے تک نیند پوری کریں۔"

"میں اس ڈرائیور کی موجودگی میں اطمینان سے نہیں سو سکوں گا۔"

داروغہ نے ہنستے ہوئے کہا "اچھا میرے ساتھ آؤ۔"

وہ اس کے ساتھ جھونپڑی کے ایک کمرے میں پہنچا۔ داروغہ دوسرے کمرے میں چلا گیا پھر واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے خسرو کو دیتے ہوئے کہا "تم لوگ ایسے حالات سے گزر رہے ہو کہ رام اوتار اور مجھ پر بھی بھروسا نہیں کر سکتے۔ اس ریوالور کو رکھ لو۔ یہ پوری طرح لوڈ ہے۔ دروازے اور کھڑکیوں کو اندر سے بند کر لینا۔ رات کو ہماری آواز پر ہی دروازہ کھولنا۔"

خسرو نے اپنے اطمینان کے لیے ریوالور لے کر رکھ لیا۔ تھوڑی دیر بعد نین تارا کمرے میں آگئی۔ ان لوگوں نے ایک بار پھر انھیں کھانے پینے کے لیے کہا لیکن وہ کھانے کے بجائے اطمینان سے نیند پوری کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔ "ہم نیند پوری کرنے کے بعد کھائیں گے۔"

وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد انھوں نے دروازے اور کھڑکیوں کو اندر سے بند کر لیا۔ کمرے میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک پر نین تارا جا کر بیٹھ گئی۔ خسرو جب تک جاگتا رہتا۔ وہ لیٹنا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی تک شرماتی تھی۔ وہ ریوالور کو چیک کر رہا تھا۔ پھر اسے تکیے کے نیچے رکھنے کے بعد نین تارا پر ایک نظر ڈالی۔ خسرو کی آنکھیں سرخ تھیں۔ یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ آنکھیں پیار کے جذبوں سے رنگ بدل رہی ہیں یا ان پر نیند کی مار پڑ رہی ہے۔ نین تارا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سر پر آنچل کو سنبھالتے ہوئے کہا: ”آپ نے ایک ذرا آنکھ نہیں جھپکائی ہے۔ میں تو ذرا دیر کے لیے راستے میں سو گئی تھی۔ اب آپ آرام سے سو جائیں۔ ان انجانے راستوں پر دماغی طور پر بیدار رہنے کے لیے آپ کا سونا لازمی ہے۔“

خسرو چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ اس کے سر کو سہلانے لگی۔ اپنی مخروطی انگلیوں سے اس کے سر کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی اس کے خراٹے سنائی دینے لگے۔

آہ! یہ کیسی ازدواجی زندگی شروع ہوئی تھی۔ دنیا والے ان کے درمیان آتے جا رہے تھے۔ یہ سو رہی تھی، تو وہ جاگ رہا تھا۔ اب وہ سو رہا تھا، تو یہ جاگ رہی تھی۔ یوں تو اس نے دن رات اسے دیکھا تھا لیکن تب وہ ایک ساتھی تھا۔ اب جیون ساتھی بن گیا تھا۔ اب وہ نظر بھر کر اسے دیکھ رہی تھی۔ یہی دیکھنے کا موقع تھا۔ محبت کرنے والے جب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو دیکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ دوسروں کو ان آنکھوں کی زبان سمجھ میں نہیں آتی

نگاہیں بولتی ہیں بے تحاشا، محبت پاگلوں کی گفتگو ہے۔

وقت گزر رہا تھا۔ جب اندھیرا ہونے لگا تو ڈرائیور نے رام اوتار سے کہا: ”آپ کہتے ہیں ہم رات کے گیارہ بجے یہاں سے چلیں گے۔ ایک بجے تک بارڈر کراس کریں گے۔ اتنی رات کو ڈرائیونگ کرنے کے لیے ایک بوتل دارو پینا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر گاڑی نہیں چلا سکوں گا۔“

”اس کے بغیر بھی گاڑی چلاؤ گے۔ تم دیکھ رہے ہو، ہمارے ساتھ ایک عورت ہے اور وہ اگروال جی کی امانت ہے۔ اگر انھیں تم سے کوئی شکایت ہوئی تو میں ہمیشہ کے لیے تمھاری چھٹی کر دوں گا۔“

وہ دونوں کان پکڑتے ہوئے بولا: ”میں قسم کھاتا ہوں دارو پینے کے بعد ہنگامہ نہیں کروں گا بھلے مانس کی طرح گاڑی ڈرائیو کروں گا۔“

”میں نے کہہ دیا ہے، تم دارو نہیں پیو گے۔ جب یہ مال ہمارے دوسرے گودام میں پہنچ جائے گا تو تمھیں چھٹی دے دوں گا۔ کل تمام دن پیتے رہنا۔“

وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ رات کے نو بجے رام اوتار نے دروازے پر دستک دے کر خسرو کو بیدار کیا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ نین تارا سر پر آنچل سنبھالتے ہوئے عورتوں میں چلی گئی۔ خسرو نے داروغہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کا ریوالور واپس کر دیا۔ برآمدے میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور اور کلینر اسے دیکھ رہے تھے اور خسرو سوچ رہا تھا، یہاں تو ریوالور کی موجودگی میں نیند آ گئی۔ اب کسی ہتھیار کے بغیر باقی راستہ کیسے طے ہوگا۔ وہ پریشان تھا لیکن اس پریشانی کا کوئی حل نہیں تھا۔ سید پور چھوڑ کر وہ بہت دور آ گئے تھے۔ نہ پیچھے جا سکتے تھے، نہ آگے جانے سے انکار کر سکتے تھے۔

وہ دونوں منہ ہاتھ دھو کر ایک کمرے میں آئے۔ ان کے سامنے مچھلی بھات کھانے کے لیے رکھ دیا گیا۔ جو بھی میسر آیا، انھوں نے اس سے پیٹ بھر لیا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے پھر ان کا سفر شروع ہو گیا۔ وہ ایک اندھیرا سفر تھا۔ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ آنکھیں رکھنے کے باوجود کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دور تک راستہ دکھائی دیتا تھا مگر اس کے آگے پھر تاریکی تھی۔ ڈرائیور اور رام اوتار کس طرح راستہ پہچان رہے تھے اور کس طرح راستے بدل کر چل رہے تھے، وہی خوب سمجھتے تھے۔

اگرچہ خسرو کے پاس اپنی حفاظت کے لیے کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ تاہم اچھی طرح نیند پوری کر لینے کے بعد وہ اور نین تارا ذہنی اور جسمانی طور پر تازہ دم ہو گئے تھے۔ وہ ڈرائیور کے پاس بیٹھا ہوا خود کو ہر طرح سے مستعد پا رہا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے ڈرائیور نے ہیڈ لائٹس بجھا دیں۔ تاریکی میں اندازے سے ڈرائیو کرنے لگا۔ شاید وہ ہندوستانی سرحد پر پہنچ رہے تھے۔ مزید آدھ گھنٹے بعد پیچھے سے رام اوتار نے اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ انجن کو بند کر دیا۔

نین تارا نے خسرو کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اوپر خدا تھا۔ نیچے اسی ایک ہاتھ کا سہارا تھا۔ چاروں طرف جھینگر بول رہے تھے اور مینڈک ٹرا رہے تھے۔ وہ سب خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ پتا نہیں کیوں یہ خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ کسی ملک کی سرحد پار کرنے کے ہتھکنڈوں کو وہی جانتے تھے۔

رام اوتار ٹرک کے پچھلے حصے سے اتر کر سامنے کی طرف جانے لگا۔ چند قدم آگے چل کر وہ بھی تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔ خسرو کے پاس بیٹھے ہوئے ڈرائیور نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے

کہا: "گدھا دھونس جماتا ہے۔"

خسرو نے پوچھا: "کون ہے؟"

"شش! ایک دم آہستہ بولو۔ اندھیرے میں اور اس ویرانے میں ہماری آواز تیر کی طرح دور تک جائے گی۔ میں رام اوتار کی بات کر رہا ہوں۔ اس نے مجھے پینے سے منع کر دیا ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ ایسے جان جوکھم کے کاموں میں تھوڑی سی شراب کی مستی ہونی چاہیے۔"

اس نے اسٹیئرنگ پر سر جھکا کر بین تاریکی . . . . . . طرف دیکھا۔ اندھیرے میں صاف طور سے نظر تو نہیں آ رہا تھا۔ لیکن خسرو اس کی شرارتوں کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا: "کیا تم مسلمان ہو؟"

"ہاں جی۔ میرا نام بڈھن ہے۔ نام تو فضل کریم ہے لیکن میرے کو سب بڈھن بولتے ہیں۔"

"بڈھن! یہ کیا بات ہے کہ ایسے وقت ہندو ہمارا ساتھ دے رہے ہیں اور تم مسلمان ہو کر محض ایک مسلمان عورت کی عزت کرنا نہیں چاہتے؟"

"میں نے کیا کیا ہے جی؟ میں تو اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھا ہوا ہوں۔"

"کیا تم اپنی ماں اور بہن کے سامنے شراب پینے کا ذکر کر سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔ میں تو پی کر جاتا ہوں اور اپنی گھر والی کے ساتھ ساتھ اپنی ماں اور بہنوں کی بھی پٹائی شروع کر دیتا ہوں۔ بابو جی! تم نے کبھی پی ہو تو جانو۔ مرد یوں بھی شیر ہوتا ہے۔ پینے کے بعد سوا شیر ہو جاتا ہے۔ عورتوں پر بڑا رعب پڑتا ہے۔"

ٹرک کے قریب رام اوتار کی آواز سنائی دی: "بڈھن! تمھیں کتنی بار سمجھایا ہے، ایسی جگہ پہنچ کر زبان بند رکھا کرو۔ آواز دور تک جاتی ہے۔"

"میں تو چپ ہوں۔ یہ بابو جی میرے سنگ بات . . ."

رام اوتار نے ڈانٹ کر کہا: "شٹ اپ۔"

وہ چپ ہو گیا۔ رام اوتار پھر دبے قدموں آگے جانے لگا۔ ونڈ اسکرین کے پار وہ اسی طرح سائے کی مانند نظر آیا۔ پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ خسرو سوچنے لگا، ہندوستان میں مسلم کش فسادات ہوتے ہیں تو چند اسلامی ممالک کے اخبارات بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ یہ خبریں شائع کرتے ہیں، ہندوؤں کو لعن طعن کرتے ہیں اور مظلوم مسلمانوں کی حمایت کرتے ہیں لیکن بنگلہ دیش کے قتل عام میں ہندوؤں کا براہ راست کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ مسلمانوں نے مسلمانوں کو لاکھوں کی تعداد میں ہلاک کیا تھا۔ خواہ وہ بہاری ہوں یا بنگالی ہوں۔ اس سلسلے میں یقیناً بہت سے اسلامی ممالک کے اخبارات نے خبریں شائع کی ہوں گی، خسرو نہیں جانتا تھا کیونکہ باہر کے اخبارات پڑھنے کو ملتے نہیں تھے اور ریڈیو کبھی کبھی سننے کا موقع ملتا تھا لیکن ایک بات جو سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ وہ یہ تھی کہ عالم اسلام سے ایک بھی امدادی پارٹی بنگلہ دیش نہیں آئی تھی۔ اس کے برعکس عیسائیت کی تبلیغ کرنے والی جماعتیں بنگلہ دیش کے ایک سرے سے دوسرے تک پہنچی ہوئی تھیں۔ ان میں آئی سی آر سی (انٹرنیشنل کمیٹی آف ریڈ کراس) دوسری ایم سی سی (مینونائٹ کرلیاٹیٹ کمیٹی) تیسری ایچ ای اے ڈی (ہیڈ) اور چوتھی سالویشن آرمی تھی۔ یہ آرمی یا کمیٹیاں براہ راست عیسائیت کی تبلیغ نہیں کرتی تھیں لیکن وہ کھانا، کمبل، کپڑا، دوائیں اور دکھ بیماریوں میں دن رات کام آتے رہنے کا اخلاقی ثبوت پیش کرتی رہتی تھیں۔ وہ لوگ زبان سے احسان نہیں جتاتے تھے کہ دیکھو ہم عیسائی ہیں مگر تم مسلمانوں کی امداد کے لیے آئے ہیں۔ وہ اپنے عمل سے متاثر کرتے رہتے تھے پھر بھلا آدمی ان سے متاثر کیوں نہ ہوگا؟ جب آخری وقت حلق میں پانی ڈالنے والا عیسائی ہو۔ بھوکوں کو روٹیاں کھلانے والا، ننگوں کو کپڑے پہنانے والا بیماروں کو دوائیں دینے والا اور لہو کے پیاسے دشمنوں سے جان بچانے والا عیسائی ہو تو لوگ کیسے ان کے گن نہیں گائیں گے؟ کوئی بھی امدادی پارٹی سالہا سال تک کسی ملک میں نہیں رہ سکتی۔ ایک نہ ایک دن سب کو چلے جانا تھا۔ صرف سالویشن آرمی بیشتر ممالک میں رہ جاتی ہے اور یہ وہی وقت ہوتا ہے جب مائیں اپنے بچوں کو بھوکا مرتے نہیں دیکھ سکتیں۔ بیماریوں سے کسی کو دم توڑتے نہیں دیکھ سکتیں اور انھیں زندگی سے محبت ہوتی ہے تو وہ عیسائیت کی طرف سالویشن آرمی میں پہنچ جاتی ہیں اور یہ وقت بنگلہ دیش کے بہاریوں پر آنے والا تھا۔ لیکن کوئی اسلامی امدادی پارٹی آنے والی نہیں تھی۔

خسرو خیالات سے چونک گیا۔ دور بہت دور تاریکی میں ایک ہلکی سی روشنی نظر آ رہی تھی جو کبھی جل رہی تھی کبھی بجھ رہی تھی۔ رام اوتار کو دوسری طرف سے سگنل مل رہا تھا۔ جواب میں ٹرک کے قریب ہی ایک ٹارچ جلنے بجھنے لگی۔ ادھر سے رام اوتار سگنل کا جواب دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ کر ٹرک کی چھت پر چڑھ گیا۔ ڈرائیور کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی پھر آگے بڑھنے لگی۔ ہیڈ لائٹس ابھی تک بجھی ہوئی تھیں۔ تلسی رام نے بڈھن کو شاید اسی لیے ملازم رکھا تھا کہ وہ ایسے راستوں پر آنکھیں بند کر کے ڈرائیونگ کر سکتا تھا۔

ڑی کبھی کیچڑ میں دھنستی تھی پھر نکل جاتی تھی کبھی کسی جگہ پانی نا ہوتا تھا کہ پہیے تک ڈوب جاتے تھے۔ کہیں گڑھا ہوتا تھا۔ ڑی زور سے اچھلتی تھی۔ نین تارا اور خسرو ایک دم سے بیٹھے ٹھے اچھل پڑتے تھے۔ ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ ایک وسرے کو سنبھالتے تھے۔ کبھی گھنے درختوں کی شاخیں اچانک رک کے اطراف یوں آکر لگتی تھیں جیسے نہ جانے کتنے منوں نے یکبارگی حملہ کر دیا ہو۔ وہ دونوں ایسے حالات سے کبھی نہیں گزرے تھے۔ اس لیے سہمے ہوئے تھے۔

گاڑی اسی طرح آہستہ آہستہ ڈگمگاتی ہوئی اور جھٹکے کھاتی ہوئی چلتی رہی۔ وہ دونوں پریشان تھے۔ دعائیں مانگ رہے تھے کہ وہ ناہموار راستہ کسی طرح جلد گزر جائے۔ جھٹکے کھا کھا کر بدن کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا۔ وہ بار بار ٹکراتے تھے۔ سنبھلتے جاتے تھے اور ڈیش بورڈ کو مضبوطی سے تھام کر بیٹھے رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ جدھر سے انھیں روشنی کا سگنل ملا تھا، وہ راستہ کب کا گزر گیا ہوگا لیکن وقفے وقفے سے اتنی ہی دور پر پھر روشنی کا سگنل ملتا تھا اور گاڑی اسی طرح بڑھتی جاتی تھی۔

تقریباً تین بجے وہ ایک جگہ رک گئی۔ قریب ہی کوئی دیہاتی ہاتھ میں لاٹھی اور ٹارچ لیے کھڑا ہوا تھا۔ رام اوتار گاڑی سے اتر کر اس کے پاس آیا۔ پھر اس سے پوچھا ”کیا تم مطمئن ہو؟ باڈر پولیس کو شبہ تو نہیں ہوگا؟“

اس دیہاتی نے جواب دیا ”بالکل ناہی سرکار! پھیرا مارنے والی پارٹی بڑی ندی کے ایٹی پار اگیارہ بجے آتی رہی۔ پھن چھ کوس آگے ساڑھے ایک بجے پھیرا مارت رہیں۔ ہم اچھی طرح جانت ہیں۔ اب بھور سمے تک کو نو کھترا ناہی ہے۔“

رام اوتار نے اپنی جیب سے پانچ پانچ کے چار نوٹ نکال کر اسے دیے۔ وہ بیس روپے لے کر ایک دم سے خوش ہوگیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے دعائیں دینے لگا۔ اسی دوران ڈرائیور گاڑی کی نمبر پلیٹ تبدیل کر رہا تھا۔ اب وہ نمبر پلیٹ [illegible] موٹر وہیکل کے جاری کردہ نمبروں کے مطابق تھی۔ ٹرک کی پیشانی پر انگریزی میں پبلک کیریئر لکھا ہوا تھا۔ وہ تختی ہٹا کر وہاں ہندی زبان میں لکھی ہوئی ایک تختی لگا دی گئی۔ اس کے بعد گاڑی پھر آگے بڑھ گئی۔

پھر وہی جھٹکے لگنے لگے۔ اتنی دیر میں خسرو نے سمجھ لیا تھا کہ وہ گاڑی کھیتوں میں سے گزر رہی ہے۔ جب تک پکے یا کچے راستے پر نہیں چلے گی یونہی جھٹکے لگتے رہیں گے۔ ویسے بجلی کے جھٹکے بھی لگتے رہتے تو وہ کیا کر سکتے تھے۔ مصیبتیں آتی ہیں تو اپنا وقت پورا کر کے ہی جاتی ہیں۔

وقت پورا ہوگیا۔ جب گاڑی صحیح طرح سیدھے راستے پر چلنے لگی تو اس وقت صبح کی ہلکی ہلکی سی جھلک نظر آرہی تھی۔ بدھن نے رفتار تیز کر دی۔ موج میں آکر سیٹی بجانے لگا۔ کبھی کبھی کن انکھیوں سے نین تارا کی طرف بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ خسرو نے اسے گھور کر دیکھا پھر نین تارا کی طرف دیکھا۔ وہ بدھن کی شرارتوں سے بے خبر دوسری طرف کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ راستے میں کئی کئی میل کے فاصلوں پر چھوٹے چھوٹے دیہات نظر آرہے تھے۔ ایسی کوئی پولیس پارٹی راستے میں نہیں ٹکرائی جو ان سے کسی طرح کی پوچھ گچھ کرتی۔ وہ ساڑھے آٹھ بجے رام گڑھ پہنچ گئے۔

سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق وہاں تلسی رام کے گودام میں لوگ ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹرک کو دیکھتے ہی بڑا سا آہنی گیٹ کھول دیا گیا۔ ٹرک گودام کے اندر چلا گیا پھر اس گیٹ کو اندر سے بند کر دیا گیا۔ نین تارا اور خسرو ٹرک سے اتر گئے۔ رام اوتار نے کہا ”آپ دونوں یہاں بوریوں پر ذرا دیر آرام سے بیٹھیں۔ میں ابھی فارغ ہو کر آتا ہوں پھر آپ کو اپنے گھر لے چلتا ہوں۔“

”کیا یہاں کچھ دن رہنا ہوگا؟“

”جی ہاں، آج ایک دن اور ایک رات رام گڑھ میں گزاریں گے پھر یہاں سے آگے جائیں گے۔ جب تک میں تلسی رام جی کا مال ٹھکانے لگا دوں گا۔“

خسرو نے چاول کی بوریوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکی ہیں۔ کیا انھیں منڈی میں بیچنے کے بعد یہاں سے نکلیں گے؟“

”میں اس مال کی بات نہیں کر رہا ہوں۔“

”کیا اور بھی کچھ مال ہے؟“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”بھائی جی! یہ ہمارے دھندے کی باتیں ہیں۔ آپ پوچھ کر کیا کریں گے۔ اپنے خدا کا شکر ادا کریں کہ یہاں تک خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔ نیپال تک بھی پہنچ ہی جائیں گے۔“

وہ اپنے آدمیوں کے پاس چلا گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ بدھن نے اس سے کہا ”اب میں جا رہا ہوں۔ جب تک بوتل کو منہ نہیں لگاؤں گا۔ نیند نہیں آئے گی۔“

ایسا کہتے وقت وہ نین تارا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رام اوتار سے سو روپے لے کر وہ ان کے پاس آیا۔ ایک بار خسرو کو دیکھا پھر ایک بار نین تارا کو دیکھا۔ پھر وہ وہاں سے پلٹ کر چلا گیا۔ خسرو نے اطمینان کی سانس لے کر کہا ”یہ کمبخت کل

سے میرے ذہن پر بوجھ بنا ہوا تھا۔"

ایک گھنٹے بعد رام اوتار انھیں اپنے گھر لے گیا۔ وہاں اس کے بیوی بچے تھے۔ نین تارا اور خسرو وہ تمام دن بڑے مطمئن رہے۔ انھیں گھر جیسا ماحول ملا۔ رات کو رام اوتار ایک گٹھری لے کر آیا پھر ان کے سامنے کھولتے ہوئے بولا: "یہ آپ لوگوں کے زیورات ہیں۔ ایک ایک کر کے دیکھ لیں۔ کوئی کمی ہو تو بتا دیں اور کمی نہ ہو تو ابھی اگروال جی کے نام ایک چٹھی لکھ دیں کہ تمام زیورات اور دو ہزار روپے نقد مل گئے تھے۔ مالکن نے کہا تھا کہ یہاں پہنچتے ہی میں آپ کو دو ہزار روپے دے دوں۔"

اس نے وہ رقم بھی ان کے سامنے رکھ دی۔ نین تارا نے کہا: "بڑو دیدی نے پرسوں یہ تمام زیورات ہمارے سامنے رکھ دیے تھے اور کہا تھا کہ یہ سب ہمارے ہیں۔ انھوں نے ان میں سے ایک سیٹ مجھے پہنایا تھا۔ باقی میں نے سمیٹ کر رکھ دیے تھے پھر انھیں دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جیجا جی نے دوسری صبح ہم سے زیورات مانگے تو ہم نے اٹھا کر دے دیے۔ اوتار بھیا! اگر ہمیں اس گٹھری کا حساب معلوم ہوتا تب بھی ہم یہاں بیٹھ کر حساب نہ کرتے۔ آپ نے ہمیں یہاں تک خیریت سے پہنچا دیا۔ یہ احسان کیا کم ہے۔"

خسرو نے رام اوتار کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "تم ہمارے سامنے جو کچھ رکھ رہے ہو، وہی مال سچا اور کھرا ہے۔ کاغذ اور قلم لاؤ۔ میں جیجا جی کے نام خط لکھ دیتا ہوں۔"

اس نے خط لکھ دیا۔ رام اوتار نے کہا: "اگر رام گڑھ کی سیر کرنا چاہیں یا بھارتی فلمیں دیکھنا چاہیں تو تارا دیدی کو میرے بیوی بچوں کے پاس چھوڑ دیں اور آپ میرے ساتھ چلیں۔"

نین تارا نے فوراً ہی پیچھے سے خسرو کی قمیص کے دامن کو تھام لیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی، تب بھی وہ اپنی شریک حیات کو اس پردیس میں نئے شناساؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر تفریح کے لیے نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے کہا: "میں تھکا ہوا ہوں ہم آرام کرنا چاہتے ہیں۔"

رام اوتار انھیں کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ رات انھوں نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ دلوں کو اطمینان نہیں تھا۔ رام اوتار پر پوری طرح بھروسہ کرنے کے باوجود دھڑکا سا لگا رہا تھا۔ جانے کس وقت کیا ہو جائے۔

اور جو ہونی ہوتی ہے، وہ ہو کر ہی رہتی ہے۔ رام اوتار زیورات اور نقد روپے ان کے حوالے کرنے کے بعد دارو بھٹی چلا گیا تھا۔ اپنی دھرم پتنی سے کہہ گیا تھا، رات کو چونکہ نشے میں رہے گا اس لیے اپنے مہمانوں کے سامنے نہیں آئے گا۔ صبح انھیں یہاں سے لے جائے گا۔

لیکن رام اوتار دوسری صبح نہ دیکھ سکا۔ آدھی رات سے پہلے ہی اس کی لاش گھر لائی گئی۔ معلوم ہوا نشے کی حالت میں کسی شرابی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ نتیجے کے طور پر وہ شرابی بُری طرح زخمی ہوا لیکن رام اوتار مارا گیا تھا۔ جس گھر میں ابھی تک سکون تھا، وہاں ماتم ہونے لگا۔ رونے پیٹنے کی آواز بلند ہونے لگی۔ محلے پڑوس کے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ عورتیں بھی گھر میں آنے والی تھیں۔ اس سے پہلے ہی رام اوتار کے بڑے لڑکے نے خسرو سے کہا: "بھائی صاحب! آپ اپنی دھرم پتنی کو لے کر پچھلے راستے سے نکل جائیں۔ میں کسی ہوٹل میں آپ کے ٹھہرنے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ یہاں عورتیں آئیں گی تو آپ لوگوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔"

خسرو نے اٹیچی سنبھالی، نین تارا کا ہاتھ پکڑا، پھر اس لڑکے کے ساتھ پچھلے دروازے سے نکل گیا۔ یہ اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ ان کا محسن مارا گیا اور وہ اس بے چارے کے کریا کرم تک بھی وہاں نہ ٹھہر سکے۔ مجبوری تھی کسی اور مصیبت میں گرفتار ہونے سے پہلے ہی نکل جانا دانشمندی تھی۔ باہر نکل کر خسرو نے کہا: "ہم کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے تو ہمیں وہاں اپنا نام پتا لکھوانا ہوگا۔ پولیس والے انکوائری کر سکتے ہیں۔"

لڑکے نے کہا: "ابھی مجھے پتا جی کی ارتھی اٹھانے کا بندوبست کرنا ہے۔ میں آپ کے ساتھ زیادہ وقت نہیں رہ سکتا۔ ایک مشورہ دیتا ہوں۔ یہاں سے کشن گنج چلے جائیں۔ ریل گاڑی کشن گنج سے گزرتی ہے۔ آپ وہاں سے مظفر پور اور پھر وہاں سے نیپال جا سکتے ہیں۔"

اس نے خسرو کا جواب سنے بغیر سامنے سے گزرنے والے ایک رکشے کو روک دیا۔ پھر رکشے والے سے کہا: "یہ مسافر کشن گنج جائیں گے۔ انھیں بس اسٹاپ تک پہنچا دو۔"

وہ دونوں رکشے پر سوار ہو گئے۔ لڑکا وہاں سے دوڑتا ہوا اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی مجبور تھا۔ باپ کی موت کا صدمہ بھی تھا اور محلے و پڑوس والوں کے سامنے اس کی موجودگی بھی ضروری تھی۔ بہرحال وہ رکشے میں بیٹھ کر بس اسٹاپ پہنچ گئے۔ کشن گنج جانے والی بسیں ہر ایک گھنٹے بعد وہاں سے روانہ ہوتی تھیں۔ وہ ایک بس میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے

اب ان کا کوئی رہنما نہیں تھا۔ پہلے ایک آسرا تھا کہ کوئی راستہ دکھانے والا ہے۔ انھیں کہاں جانا ہے۔ کہاں ٹھہرنا ہے کسی نے ان پر شبہ کیا اور سوالات کی بوچھار کی تو انھیں کیا جواب دینا ہے، ان باتوں کا انھیں نہ تو کچھ علم تھا اور نہ ہی

انھوں نے اب تک اس کے بارے میں کچھ سوچا تھا۔ وہ اب تک یہی سوچ کر مطمئن تھے کہ جو ہوگا، اس سے رام اوتار نمٹ لیا کرے گا۔

وہ دونوں اندر ہی اندر سہمے ہوئے تھے۔ وہ بہاری تھے اور اب سچ مچ بہار میں تھے۔ اب سے پہلے انھوں نے نہ تو بہار کا کوئی علاقہ دیکھا تھا اور نہ ہی بہار کے لوگوں سے کبھی ان کا سامنا ہوا تھا۔ وہ جگہ، وہاں کی بولی، وہاں کا لباس، وہاں کی تہذیب سب کچھ ان کے لیے اجنبی تھی۔ انھوں نے آج تک صرف اپنے والدین کی زبان سے بہار کے متعلق سنا تھا۔ اس کے باوجود وہ بنگلہ دیش، پاکستان اور ہندوستان بلکہ بی بی سی تک سے بہاری کہلاتے تھے۔ ان کے آس پاس بیٹھے ہوئے مرد اور عورتیں علاقائی زبان میں باتیں کر رہی تھیں۔ پیچھے بیٹھا ہوا ایک دیہاتی اپنے کسی مسافر ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ "کا بولی ہو بھیا! آج بجار گئے۔ خالی پیٹ میں ماتھا گھورائی دام شسن کے متھوسے گھورکئی۔"

نین تارا نے خسرو کی طرف ذرا جھک کر آہستگی سے کہا۔ "ہمارے گھر والے بھی کچھ اسی قسم کی زبان بولتے تھے لیکن یہ زبان تو کچھ عجیب ہے۔ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ کیا آپ بہاری بولی جانتے ہیں؟"

"نہیں، میں تو بچپن ہی سے گھر چھوڑ کر نکل گیا تھا۔ خالص پور میں میری پرورش ہوئی۔ وہیں میں نے تعلیم حاصل کی۔ میں صرف بنگالی، اردو اور انگریزی جانتا ہوں۔"

"یہاں ہم انگریزی بول نہیں سکتے ہماری اردو زبان ایسی ہے کہ فوراً ہی پاکستانی کی حیثیت سے ہماری شناخت ہو جائے گی۔ ہندی زبان ہم جانتے نہیں ہیں اور بہاری علاقائی زبان بھی ہم بول نہیں سکتے بس ایک ہی راستہ ہے کہ ہم بنگالی بنے رہیں۔"

خسرو نے تائید میں سر ہلا کر کہا: "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ لہٰذا اب ہم بنگالی میں گفتگو کریں گے کیوں ٹھیک ہے نا؟"

نین تارا نے اثبات میں سر ہلایا۔ بس تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ باہر رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

رات کے دو بجے وہ بس کسی آبادی میں پہنچ کر رک گئی۔ کچھ مسافر اترنے لگے کچھ چڑھنے لگے۔ نئے مسافروں میں ایک پولیس انسپکٹر نظر آیا۔ اس کے ہولسٹر میں ریوالور تھا۔ ہاتھ میں چھڑی پکڑے ہوئے تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں جدھر دیکھتی تھیں، گھورتی ہوئی سی لگتی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ کسی پر نظر ڈالتے ہی اس کے اندر کی بات معلوم کر لیتا ہے اور مجرموں کو اس طرح چھانٹ کر نکال لیتا ہے جس طرح دودھ میں سے مکھی نکال لی جاتی ہے۔

اس نے بس کے اندر آتے ہی چاروں طرف گھور کر دیکھا۔ ایک ایک مسافر پر نظر ڈالی پھر خسرو کو دیکھتے ہوئے اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ راہداری کے ادھر قانون تھا اور ادھر مجرم تھے۔

انسپکٹر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکالی۔ اس ڈبیہ کو پہلے دو بار ایک انگلی سے بجایا پھر اس کا ڈھکن کھول کر ڈبیہ خسرو کی طرف بڑھا دی۔ اس ڈبیہ میں گل رکھا ہوا تھا۔ گل ایک نیم نشیلا سفوف ہوتا ہے۔ نسوار کی طرح برائے نام نشہ ہوتا ہے لیکن اس کی عادت پڑ جانے کے بعد پھر یہ منہ سے نہیں چھوٹتا۔

عادی لوگ گل کو ایک انگلی میں لے کر جبڑے کے اندر دبا لیتے ہیں۔ اس عمل سے اتنی ہی تسکین ہوتی ہے جتنی کہ سگریٹ پینے والے یا پان کھانے والے کو ہو سکتی ہے۔ خسرو اکثر اسے استعمال کیا کرتا تھا لیکن وہ عادی نہیں تھا۔ اگر یہ نہ ملے تو اس کی طلب نہیں ہوتی تھی اور جب نگاہوں کے سامنے آ جائے تو ایک چٹکی لے کر منہ میں رکھنے کو دل مچلتا تھا۔

اس نے ڈبیہ کو دیکھا پھر انسپکٹر کو دیکھا۔ دماغ نے سمجھایا، قانون کا ایک محافظ دوستی کی پیشکش کر رہا ہے۔ اسے ٹھکرانا دانشمندی نہیں ہے۔ جب یہ اپنی طرف متوجہ ہو ہی گیا ہے تو اسے دوست بنا کر رکھنا چاہیے۔ یہ سوچتے ہی اس نے مسکراتے ہوئے ڈبیہ قبول کی۔ اس میں انگلی ڈال کر تھوڑا سا سفوف نکالا اور اپنے جبڑے میں اسے رکھ لیا پھر ڈبیہ اسے واپس کر دی۔

انسپکٹر نے بھی اسی طرح گل کو استعمال کیا پھر ڈبیہ بند کر کے جیب میں رکھتے ہوئے خسرو سے پوچھا: "تو کیہواں سے آئی لا ہا؟"

خسرو نے ہچکچاتے ہوئے بنگالی زبان میں کہا: "آمی آپ نار بھاشا بوجھتے پاری نا۔"

انسپکٹر نے سر ہلا کر کہا: "اوہ تو تم بنگالی ہو۔"

خسرو نے ہاں ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ انسپکٹر نے پوچھا: "اردو تو بول لیتے ہو گے؟"

"ہم اردو تھوڑا تھوڑا زانتا ہے۔"

وہ مسکرانے لگا۔ پھر اس نے پوچھا: "بھلا بوجھو تو، میں کیوں مسکرا رہا ہوں۔"

خسرو نے قدرے پریشان ہو کر کہا: "ہم کیا بولے گا۔

آپ کا من کا بات آپ نانتا ہے۔"

انسپکٹر نے کہا: "میں اڑتی چڑیا کے پَر گن لیتا ہوں۔ بہاریوں کی ایک اہم پہچان یہ ہے کہ ان میں سے کتنے ہی لوگ گل استعمال کرتے ہیں۔ جب مشرقی پاکستان تھا تب بنگالی اور بہاری ساتھ رہا کرتے تھے۔ چوبیس برس کے عرصے میں بھی آج تک کسی بنگالی نے بہاریوں کا یہ نشہ کبھی نہیں اپنایا۔ تم آج بھی بنگلہ دیش میں کسی بنگالی کو گل استعمال کرتے ہوئے نہیں دکھا سکتے پھر تم بنگالی کیسے ہو گئے؟"

خسرو جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ انسپکٹر نے اسے بڑی چالاکی سے جکڑ لیا تھا

◆

فوجی افسر نے قدموں کے پاس پڑے ہوئے ریوالور کو اٹھایا۔ اس کے چیمبر کو چیک کیا، اس کی نال کو سونگھ کر دیکھا پھر کہا: "اس میں سے دو فائر ہوئے ہیں۔ چار گولیاں رہ گئی ہیں۔ دو گولیوں سے کن لوگوں کو ہلاک کیا گیا ہے؟"

منعم باللہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا، اس سے پہلے کلیم الدین بھوتیاں نے اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا: "پہلا ہوائی فائر اس نے کیا۔ ریوالور یہ لے کر آیا تھا۔ ہمیں مارنے کے لیے اس جھونپڑی سے باہر آنے پر مجبور کر رہا تھا۔ پھر یہ ریوالور میرے قبضے میں آ گیا۔ اس سے ابھی تک کسی شخص کو ہلاک نہیں کیا گیا ہے۔ میں نے بھی انھیں دھمکانے کے لیے ہوائی فائر کیا تھا۔"

منعم باللہ نے ہنستے ہوئے کہا: "تم دھمکی دینے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ بزدل کے ہاتھ میں تلوار دے دی جائے تو وہ اسے کبھی نہیں چلا سکتا۔"

فوجی افسر نے چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگوں پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ عظمیٰ کو، منظور کو، بابر کو اور بڑے میاں کو دیکھا پھر کلیم الدین بھوتیاں سے پوچھا: "تم بنگالی ہو؟"

"جی ہاں، میں بنگالی ہوں مگر ان کے ساتھ پاکستان جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں جانا چاہتے ہو؟"

منعم باللہ نے کہا: "اس لیے کہ یہ اور اس کا پورا خاندان غدار ہے۔ بنگلہ دیش کا مخالف ہے۔ یہ دیناج پور کے مجسٹریٹ سلیم الدین بھوتیاں کا لڑکا ہے۔"

افسر نے سوال کیا: "تمھارے خاندان کے دوسرے لوگ کہاں ہیں؟"

کلیم الدین بھوتیاں نے پھر منعم باللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "ان کے ساتھیوں نے میرے والدین کو، میرے بھائی بہنوں کو، میرے خاندان کے ایک ایک فرد کو چن چن کر قتل کر دیا۔ ایک میں زندہ رہ گیا ہوں۔ یہاں رہوں گا تو ان کی یاد ستائے گی۔ میں یہاں کسی قیمت پر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

منعم باللہ نے طنزیہ انداز میں کہا: "رہا ہوں نہیں رہا تھا کہو۔ کیا اب بھی تمھیں یقین ہے کہ یہاں سے زندہ جا سکو گے؟"

فوجی افسر نے منعم باللہ کی طرف رُخ کرتے ہوئے پوچھا: "تم انھیں کیوں روک رہے ہو؟"

منعم باللہ نے حیرانی سے فوجی افسر کی طرف دیکھا۔ پھر پوچھا: "یہ آپ کیسا سوال کر رہے ہیں۔ کیا ان غداروں کو یہاں سے ہم جانے دیں گے۔ ان بہاریوں نے ہمارے لوگوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے ہیں؟"

فوجی افسر نے کہا: "بس زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوئی نادان بچّہ نہیں ہوں۔ پاکستان سے بنگلہ دیش بننے تک جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب میری نظروں میں ہے لیکن سرکاری طور پر بار بار یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ دیش میں امن و امان بحال کیا جائے۔ مکتی باہنی کے لیڈروں اور جوانوں سے بار بار التجا کی گئی ہے کہ وہ اپنے ہتھیار واپس کر دیں۔ تقریباً سبھی نے ایسا کیا کچھ ایسے ہیں جنھوں نے ہتھیار چھپا لیے یا خود ہی روپوش ہو گئے۔ ان میں تم اور تمھارے یہ دو ساتھی بھی ہیں۔ بائی دی وے، تمھارا نام کیا ہے؟"

"منعم باللہ۔"

"مسٹر منعم باللہ! ہم مکتی باہنی کے تمام لیڈروں اور جوانوں کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ بنگلہ دیش بنانے میں تم سب نے سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا ہے لیکن بنگلہ دیش بنانے کے بعد اپنی ہی حکومت کے قانون کو تسلیم نہ کرنا اور ان پر عمل نہ کرنا تقریباً اسی طرح کی غداری ہے۔ جس طرح مجسٹریٹ سلیم الدین بھوتیاں کے خاندان والوں نے غداری کی تھی۔"

"غدار اسے کہتے ہیں جو دیش کو نقصان پہنچاتا ہے۔ میں نے اپنے دیش کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔"

"تم ایک ریوالور لے کر ان سب کو ہلاک کر کے دیش کی کون سی خدمت انجام دے رہے ہو؟"

"میں انھیں اپنے ملک کے لاکھوں بنگالیوں کے قتل کی سزا دے رہا ہوں۔"

"جب تم نے ایک حکومت بنا لی اور اس کا اپنا ایک قانون ہو گیا تو پھر سزا دینے والے تم کون ہوتے ہو۔ کیا قانون کو تم ہاتھ میں رکھو گے؟"

اس نے ریوالور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "قانون تو اب آپ کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ میں تو نہتا ہوں۔"

"صرف باتیں بنانے سے کام نہیں چلتا۔ تم اور تمہارے دونوں ساتھی ہمارے ساتھ چلو گے اور تحریری بیان دو گے کہ تم لوگوں نے بنگلہ دیش کے قانون کے مطابق ہتھیار جمع کیوں نہیں کیے اور اپنی حاضری کی رپورٹ کیوں نہیں دی۔"

وہ جھلا کر بولا: "آپ ان بہاریوں اور غداروں کے سامنے ہمیں اس طرح حکم دے رہے ہیں جیسے صرف ہم مجرم ہیں اور یہ سب بے گناہ ہیں۔"

فوجی افسر نے کلیم الدین بھوئیاں، عظمیٰ اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو دیکھا پھر چٹکی بجا کر منعم باللہ سے کہا: "ادھر آؤ۔"

وہ ان لوگوں سے دور چلا گیا۔ منعم باللہ جب اس کے قریب پہنچا تو اس نے پوچھا: "کیا تم سمجھتے ہو کہ دنیا میں نشر و اشاعت کے جتنے ادارے ہیں، وہ سب اندھے بہرے اور اتنے ناکارہ ہیں کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، باہر اس کی خبر نہیں پہنچ رہی ہے۔ کیا دنیا میں تمام پریس خاموش ہیں۔ بے لاگ تبصرہ کرنے والے مبصرین گونگے بن گئے ہیں؟"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"وہی جو تم سمجھنا نہیں چاہتے۔ بنگال میں پاکستان کا خاتمہ اس کی بدنامی کے ساتھ ہوا۔ جو پریس ہماری حمایت کر رہے تھے انھوں نے پاکستان کے خلاف ایک ایک خبر شائع کی۔ ہم پر ہونے والے مظالم کی داستانوں کے ساتھ ثبوت کے طور پر تصاویر بھی شائع کیں، اسی طرح جو پریس پاکستان کی حمایت میں ہیں، وہ ہمارے خلاف تصویری ثبوت کے ساتھ خبریں شائع کر رہے ہیں۔"

"پاکستان کی حمایت کرنے والے پریس جھوٹے ہیں۔ من گھڑت داستانیں شائع کر رہے ہیں۔"

"یہ طوفان جب تھمے گا۔ جب پاکستان اور بنگلہ دیش کے حمایتی اپنی اپنی جگہ چیخ چیخ کر تھک جائیں گے تو اس کے بعد دنیا والے صرف ان ذرائع پر اعتماد کریں گے جو بالکل غیر جانبدار ہوتے ہیں جو تاریخ کے اصولوں کے مطابق حالات کے صحیح سیاق و سباق کے ساتھ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرتے ہیں۔ تب ہم اپنی جگہ اور پاکستانی اپنی جگہ چیختے چلاتے رہیں گے۔ لیکن ایک حقیقت ضرور سامنے آئے گی اور وہ یہ کہ اگر بنگال میں پاکستان کا "دی اینڈ" اس کی بدنامی کے ساتھ ہوا ہے تو بنگلہ دیش کا آغاز ہماری بدنامی سے ہو رہا ہے۔ انھوں نے آخر میں جو ظالمانہ وارداتیں کیں وہی وارداتیں ہم اپنی ابتدا میں کر رہے ہیں۔ پھر ہماری انتہا کیا ہو گی؟"

منعم باللہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ بے بسی سے کہنے لگا: "آپ عجیب باتیں کر رہے ہیں۔ کیا آپ انھیں چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ انھیں یہاں سے جانے کا موقع دیں گے؟"

"دیکھو! تم لوگوں نے بھی جی بھر کر انتقام لیا ہے۔ اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔ یہ اگر جا رہے ہیں تو ان سے منہ پھیر لینا چاہیے۔ انجان بن جانا چاہیے۔ اچھا ہے، یہ ہماری زمین چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ہمارا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے، یہ بنگالی دلال جو مختلف سرحدوں سے بہاریوں کو لے جا رہے ہیں، تو کیا ہم ان سے بے خبر ہیں۔ کیا یہ ہم سے زیادہ چالاک ہیں۔ نہیں ہم ان کی طرف سے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔"

منعم باللہ نے کہنا چاہا: "لیکن . . ."

فوجی افسر نے سخت لہجے میں کہا: "مجھ سے بحث نہ کرنا۔ اتنا سمجھ لو کہ بہاریوں کو سرحد پار کرانے والے ہمارے بنگالی دلال ہماری نظر میں جھاڑو کی طرح ہیں۔ وہ ہمارے گھر کا کچرا باہر جا کر پھینک رہے ہیں۔ دانشمندی یہی ہے کہ چپ چاپ گھر کی صفائی کو دیکھو۔ کچرے کو باہر جانے دو۔ بس اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ آ میرے ساتھ چلو۔"

پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو وہاں سے چلنے کا حکم دیا۔ منعم باللہ نے بھی اپنے ساتھیوں سے چلنے کے لیے کہا۔ کلیم الدین بھوئیاں اور دوسرے تمام ساتھی ان لوگوں کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے اور حیرانی سے سوچ رہے تھے۔ ہم غیر قانونی طور سے بنگلہ دیش کی سرحد کو پار کرنے کے لیے جا رہے ہیں پھر یہ ہمیں روکتے کیوں نہیں ہیں۔ کیوں چپ چاپ واپس جا رہے ہیں۔

وہ لوگ دونوں جیپ گاڑیوں میں جا کر بیٹھ گئے تو کلیم الدین بھوئیاں تیزی سے چلتا ہوا ان کے قریب پہنچا پھر اس نے فوجی افسر سے پوچھا: "سر! آپ نے ہمارے متعلق کیا سوچا ہے؟"

گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ واپس گھومنے لگی پھر آگے بڑھنے سے پہلے ہی فوجی افسر نے کہا: "ہمیں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قدرت تم لوگوں کو سزائیں دے رہی ہے۔ جاؤ ایک ملک سے دوسرے ملک بھٹکتے رہو۔"

گاڑیوں کی رفتار اچانک تیز ہو گئی۔ وہ کیچڑ اور پانی کے چھینٹے اڑاتے ہوئے چلے گئے۔ کلیم الدین بھوئیاں جھونپڑی کی طرف واپس آنے لگا۔ بابر نے آگے بڑھ کر پوچھا: "وہ کہاں گئے ہیں۔ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ انھوں نے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا ہے۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے جھونپڑی کے برآمدے میں پہنچے۔ عظمیٰ، منظور، بڑے میاں بھی انھیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دلال نے بھی سوال کیا۔ کلیم الدین جھوتیاں نے کہا: "وہ ہمیں سزائیں نہیں دینا چاہتے۔ کہتے ہیں، قدرت کی طرف سے سزا مل رہی ہے۔ انھوں نے ہمیں ایک ملک سے دوسرے ملک بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔"

دلال نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "اندھیرا ہو چکا ہے۔ بادل گھر کر آ رہے ہیں۔ جب بارش زوروں سے ہونے لگے گی، تب ہم یہاں سے روانہ ہوں گے۔ اس سے پہلے جنگلوں سے گزرنا مناسب نہیں ہے۔"

بڑے میاں نے پریشان ہو کر کہا: "بارش میں ہم کیسے سفر کریں گے۔ ایسے وقت تو لوگ کہیں پناہ لیتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا: "آگے جنگلی ہاتھی اور زہریلے سانپ ہیں۔ اس جنگل سے گزرنے والے ایسی ہی بارشوں کا انتظار کرتے ہیں۔ جب موسلا دھار بارش ہوتی ہے تو جنگلی جانور اور زہریلے کیڑے مکوڑے سب اپنی اپنی پناہ گاہوں میں چھپے رہتے ہیں۔ ایسے ہی وقت جنگل کے راستوں سے گزرا جا سکتا ہے۔"

اس نے اونچی آواز میں اپنے ایک میزبان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "ممدو میاں! فوراً کھانا تیار کرو۔ ہم کسی بھی وقت یہاں سے چلے جائیں گے۔"

کھانا ایک گھنٹے بعد تیار ہوا۔ وہ سب جھونپڑی کے اندر کھانے بیٹھ گئے۔ اگرچہ دشمن وہاں سے چلے گئے تھے۔ پھر بھی اطمینان نہیں تھا۔ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی واپس آ کر پھر انھیں پریشان کر سکتا ہے یا جانی نقصان پہنچا سکتا ہے۔

کھانے کے بعد بارش ہونے لگی جب سر چھپانے کی جگہ ہو۔ آرام سے سونے کے لیے سوکھی گھاس کا گرم بستر ہو، باہر بارش ہو رہی ہو، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو۔ پیٹ بھرا ہو تو آرام سے سو جانے کو جی چاہتا ہے۔ بڑے میاں نے پریشان ہو کر کہا: "ایسا لگ رہا ہے جیسے آسمان پھٹ پڑا ہے اور اس کا تمام پانی آج ہی ہم پر گر کر رہے گا۔ ایسے وقت کیسے سفر کر سکتے ہیں۔"

بابر نے ناگواری سے کہا: "بڑے میاں! اسی لیے منع کیا گیا تھا۔ جو تھوڑی بہت زندگی رہ گئی ہے اسے بنگلہ دیش میں ہی گزار لیں۔"

وہ سب چلنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ کلیم الدین جھوتیاں نے اپنے ایک میزبان سے کہا: "اپنا رام داؤ مجھے دے دو اور مجھ سے دو روپے لے لو۔"

اس نے انکار کیا۔ جھوتیاں نے اسے پانچ روپے کی پیشکش کی پھر سات روپے میں اس نے رام داؤ اس کے حوالے کر دیا۔ بابر نے بھی سات روپے دے کر ایک اور میزبان سے رام داؤ خرید لیا۔ تیسرا رام داؤ دلال کے پاس تھا۔ عظمیٰ اور جھوتیاں نے اپنے چند کپڑے اور ضروری سامان ایک ہی اٹیچی میں رکھ لیا تھا۔ وہ اٹیچی جھوتیاں نے اٹھالی۔ عظمیٰ نے ایک میزبان عورت کو دو روپے دے کر پٹ سن کا ایک بوریا خرید لیا، تاکہ اسے اوڑھ کر بارش سے کسی قدر محفوظ رہا جا سکے۔ منظور فٹبالر نے اپنی لاٹھی سنبھالی اور فرسٹ ایڈ بکس کو شانے سے لٹکا لیا۔ اس کے کپڑے اور ضروری کاغذات بابر نے اپنے پاس رکھ لیے۔

وہ لوگ جھونپڑی سے نکل کر برآمدے میں آئے۔ باہر گہری تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ بارش زوروں پر تھی۔ کبھی کبھی بجلی چمکنے لگتی تھی۔ دلال نے کہا: "ایک ٹارچ میرے پاس ہے مگر کوئی مجھے راستے میں روشنی کے لیے نہ کہے۔ میں موقع دیکھ کر ٹارچ کو روشن کیا کروں گا۔"

بڑے میاں نے پریشان ہو کر پوچھا: "مگر اتنے اندھیرے میں راستہ کیسے معلوم ہوگا؟ راستے میں پانی ہوگا، کیچڑ، دلدل ہوگی، گڑھا ہوگا، سانپ بچھو ہوں گے۔ اور کیا کچھ ہوگا۔ ہمیں کیسے پتا چلے گا؟"

کسی نے بڑے میاں کی باتوں پر توجہ نہیں دی۔ عظمیٰ نے اپنی کٹی ہوئی زبان سے کہا: "آپ یہ ٹاٹ کا بوریا اوڑھ لیں۔ پانی میں ہر طرح سے بھیگنا ہی ہے لیکن اسے اوڑھ لینے سے آپ کے بوڑھے جسم کو پانی کی براہِ راست مار نہیں پڑے گی۔"

بڑے میاں نے اس کی زبان تو نہیں سمجھی لیکن اس کی محبت اور اخلاق کو سمجھ لیا۔ وہ ان پر بوریا ڈال رہی تھی پھر اس نے سہارا دینے کے لیے ان کا ایک ہاتھ پکڑ لیا پھر چونک کر بولی: "ارے آپ کو تو بخار ہے۔"

کلیم الدین جھوتیاں نے سوالیہ نظروں سے عظمیٰ کی طرف دیکھا۔ اس نے بڑے میاں کا ہاتھ جھوتیاں کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ تب سمجھ میں آیا۔ اس نے کہا: "بھائیو! چچا میاں کو تو تیز بخار ہے۔ یہ کیسے سفر کریں گے؟"

بابر نے پریشان ہو کر کہا: "کیا مصیبت ہے۔ ابھی سفر شروع نہیں ہوا ہے اور بڑے میاں عذاب جان بن گئے ہیں۔"

منظور نے آگے بڑھ کر ان کی کلائی تھام لی۔ نبض ٹٹولی، پھر کہا: "واقعی آپ ایسی حالت میں سفر نہیں کر سکیں

گے اور آپ کی عمر بھی ایسی نہیں ہے کہ حوصلے سے کام لے سکیں۔ بہتر ہے آپ یہاں ٹھہر جائیں۔ یہ ایجنٹ ہمیں سرحد پار پہنچانے کے بعد واپس آئے گا تو آپ کو چاٹگام لے جائے گا۔“

بڑے میاں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا: ”نہیں بیٹے! نہیں۔ میں جاؤں گا، ضرور جاؤں گا۔ میرا بیٹا، میری بہو، میرا پوتا مجھے سب یاد آتے ہیں۔ وہ میرے لیے پریشان ہوں گے۔ میں جب تک ان کے پاس نہیں جاؤں گا، میرے دکھ بیماریاں بڑھتی رہیں گی۔ میری دوا میرے بچے، میرے پوتے پوتیاں ہیں۔“

دلال نے کہا: ”نو بج رہے ہیں۔ جلدی فیصلہ کریں اگر یہاں دیر ہو گئی تو صبح سے پہلے جنگل کو پار نہیں کر سکیں گے۔ بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیں گے۔“

منظور نے فرسٹ ایڈ بکس سے اسپرو کی دو گولیاں نکال کر پانی کے ساتھ بڑے میاں کو کھلا دیں اور ان کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر کہا: ”ہم نہیں جانتے کہ وہ کیسے بیٹے، بہو، پوتے اور پوتیاں ہیں جو برسوں پہلے آپ کو دوسرے رشتے داروں کے رحم و کرم پہ چھوڑ کر مغربی پاکستان چلے گئے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ آپ ان کے پاس پہنچ جائیں۔ چلیے!“

وہ یکے بعد دیگرے برآمدے سے اتر کر آگے بڑھنے لگے۔ سب سے آگے دلال اور بابر تھے۔ ان کے پیچھے بھوتیاں نے عظمیٰ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ بڑے میاں بوریا اوڑھے لاٹھی کے سہارے ان کے پیچھے چلنے لگے۔ سب سے پیچھے منصور تھا۔ وہ مجبور تھا۔ اپنے پیروں پر اپنی مرضی کے مطابق نہیں چل سکتا تھا۔ بہت آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا لاٹھی ٹیکتا ہوا چل رہا تھا۔ وہ جھونپڑی سے دو کچی سڑک پر اسکوڈا کے پاس آئے۔ اس گاڑی کو وہیں چھوڑ دیا۔ پیدل آگے بڑھ گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد جھونپڑی کے دروازے سے نظر آنے والی لالٹین کی روشنی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کچا راستہ بھی ختم ہو گیا۔ وہ گھاس کے میدان میں چل رہے تھے۔ ان کے سامنے گھنی جھاڑیاں اور بڑے بڑے درخت تھے جو رات کی تاریکی میں اور اضافہ کر رہے تھے۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ ان کے سامنے جھاڑی ہے، درخت ہے، گڑھا ہے۔ کیا کچھ ہے۔ انہیں کسی بات کا پتا نہیں تھا۔ صرف دلال سمجھ رہا تھا کہ اسے کس طرف سے گزرنا ہے، کس راستے پر چلنا ہے۔ اس کے پیچھے چلنے والے ایک دوسرے کی آہٹ پر آگے بڑھ رہے تھے۔ کبھی بجلی چمکتی تھی تو وہ ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔ ورنہ پہلے سے زیادہ گہری تاریکی چھا جاتی تھی۔ اب وہ جہاں سے گزر رہے تھے، وہاں ان کا کوئی انسان دشمن نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ دشمنوں کو پیچھے چھوڑ کر آ گئے تھے۔ اب جنگلی درندوں اور سانپ بچھوؤں سے خوف آ رہا تھا۔ ویسے دلال نے تسلی دی تھی کہ جب تک بارش ہوتی رہے گی، حشرات الارض یا درندے ان کے راستے میں نہیں آئیں گے۔ سب اپنی پناہ گاہوں میں چھپے ہوں گے۔

کلیم الدین بھوتیاں نے آہستگی سے دلال کو مخاطب کیا۔ ”صدر الدین، ذرا رک جاؤ۔ شاید بڑے میاں اور منظور بھائی بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔“

پھر اس نے پلٹ کر آواز دی: ”چچا میاں! آپ کہاں ہیں؟“

وہ یقیناً کراہتے ہوئے آ رہے ہوں گے لیکن بارش کی آواز اتنی تیز تھی کہ ان کی آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ کلیم الدین بھوتیاں نے کہا: ”ٹارچ روشن کر کے دیکھو۔ یہ لوگ کہاں رہ گئے ہیں؟“

صدر الدین نے کہا: ”بڑی مصیبت ہے۔ میں موقع بے موقع ٹارچ روشن نہیں کر سکتا۔ ذرا ٹھہرو۔ مجھے سمجھنے دو۔“ وہ سوچنے لگا۔ عظمیٰ، بھوتیاں کا بازو تھامے آنکھیں

”تم ہی نے تو کہا تھا کہ میں بچہ بدل دوں مجھے کیا خبر تھی کہ قسمت میں لڑکی ہی لکھی ہے۔“

پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اس کے پیچھے آنے والے بڑے میاں اور منظور کسی طرح بھی اس تاریکی میں نظر نہیں آسکتے تھے۔ پھر دلال صدرالدین نے اپنی ٹارچ کے شیشے پر چار انگلیاں رکھ کر اسے روشن کیا تاکہ کم سے کم روشنی ہو اور آنے والے نظر آجائیں۔

بڑے میاں نظر آئے۔ وہ آہستہ آہستہ لاٹھی ٹیک کر آرہے تھے مگر منظور نظر نہیں آیا۔ بھوتیاں نے کہا "صدرالدین! ٹارچ مجھے دو۔ میں پیچھے جاکر دیکھتا ہوں۔"

اس نے ٹارچ لے لی۔ عظمیٰ کو وہیں چھوڑ کر اسی طرح شیشے پر انگلیاں رکھ کر ٹارچ کو روشن کرتے ہوئے جانے لگا۔ ایک خیال تھا کہ اس تاریکی میں منظور بہت زیادہ پیچھے رہ جانے کے باعث راستے سے بھٹک گیا ہوگا لیکن تھوڑی دور پر ہی وہ نظر آگیا۔ وہ صحیح راستے پر چلا آرہا تھا۔ اس کے چلنے کا انداز دیکھ کر اس پر ترس آتا تھا۔ بڑی آہستگی سے پاؤں رکھ کر اپنے بدن کو آگے کی طرف لے جاکر لاٹھی ٹیک کر پھر دوسرا پاؤں اتنی ہی آہستگی سے زمین پر رکھتا تھا اور اس طرح قدم قدم کچھوے کی چال سے آگے بڑھ رہا تھا۔

بابر نے کہا "مسٹر کلیم الدین بھوتیاں! یہ انسانی ہمدردی بہت مہنگی پڑے گی۔ جو ساتھ چلتے ہیں، انھیں چلنے دو۔ جو پیچھے رہ جاتے ہیں، انھیں چھوڑتے چلو۔"

بھوتیاں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ٹارچ کی روشنی میں تیزی سے چلتا ہوا منظور کی طرف جانے لگا۔ بابر نے بڑے میاں سے کہا "مسٹر احسان الحق! آپ بھی ہم پر بڑا احسان کر رہے ہیں۔ ارے ہاں، یاد آیا۔ ابھی دن کے وقت آپ نے کہا تھا کہ آپ کا دنیا میں کوئی نہیں ہے اور تھوڑی دیر پہلے کہہ رہے تھے کہ بیٹے ہیں، بہوئیں ہیں، پوتے ہیں، پوتیاں ہیں۔ یہ بڑھاپے میں جھوٹ بولتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔"

بڑے میاں نے ہانپتے ہوئے کہا "دیکھو مجھے پریشان نہ کرو۔ میں آہستہ آہستہ چل رہا ہوں۔ تم لوگوں کے پیچھے آرہا ہوں۔ مجھے آنے دو۔"

"آپ ایک بات بتائیں۔ اگر آپ کے بیٹے اور پوتے ابھی اس جنگل میں اس موسلا دھار بارش میں رات کی تاریکی میں درندوں کے خوف سے سہمے ہوئے آپ کے ساتھ چلتے ہوتے اور آپ ان کے ساتھ نہ چل سکتے تو کیا وہ آپ کو کاندھے پر بٹھا کر لے جاتے؟"

بڑے میاں ہانپتے ہوئے تاریکی میں دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا "میرا یہ سوال احمقانہ ہے اگر انھیں لے جانا ہی ہوتا تو ہمارے لیے مصیبت بنا کر کیوں چھوڑ جاتے۔"

عظمیٰ نے سخت لہجے میں کہا "تم کیسے آدمی ہو۔ بزرگوں کو حوصلہ دینا چاہیے۔ ان کی مدد کرنا چاہیے لیکن تم اپنی طنزیہ باتوں سے انھیں ہلکان کر رہے ہو۔ تم سے اچھی تو موت ہے جو یکبارگی آتی ہے۔ تمھاری طنزیہ باتوں کی طرح نہ آدھا مارتی ہے نہ آدھا زندہ رکھتی ہے۔"

بابر نے کہا "پتا نہیں کیا پٹر پٹر بولتی جاتی ہو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے جیسے اسکوٹر سائلنسر کے بغیر اسٹارٹ ہو گیا ہو۔ سارا رومانس غارت ہو جاتا ہے میں تمھاری طرف دیکھا کروں تو تم چپ رہا کرو۔ صرف مسکراتی رہا کرو۔"

عظمیٰ سختی سے ہونٹوں کو بھینچ کر اس کی باتوں کو برداشت کر رہی تھی۔ پہلے تو جی میں آیا تھا، کلیم الدین بھوتیاں سے شکایت کرے پھر عقل آگئی کہ دو مرد آپس میں ٹکرائیں گے تو یہ سفر ملتوی ہو جائے گا یا دونوں میں سے ایک مارا جائے گا۔ منزل کی طرف چلتے ہوئے صرف پاؤں میں کانٹے نہیں چبھتے۔ دل اور دماغ میں بھی چبھتے ہیں۔ انھیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔

بھوتیاں منظور کو سہارا دے کر لے آیا۔ صدرالدین نے کہا۔

"ایسے ہم سفر جاری نہیں رکھ سکیں گے۔"

بھوتیاں نے کہا "کوئی فرق نہیں پڑے گا ہم منظور بھائی کے لیے اتنی دیر ٹھہر گئے۔ اگر اپنی رفتار ذرا سست کرلیں تو یہ منظور بھائی ہمارے ساتھ ساتھ چل سکیں گے۔"

بابر نے جھلا کر کہا "رفتار سست نہیں ہوگی۔ میں صدرالدین کو لے کر آگے بڑھتا جاؤں گا جسے ہمارے ساتھ آنا ہو، آجائے۔"

"صدرالدین کو صرف تم نے رقم نہیں دی ہے۔ ہم سب نے دی ہے۔ لہٰذا یہ ہمارے ساتھ چلے گا۔ تم اسے اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا خیال چھوڑ دو۔"

بابر نے بھوتیاں کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے کی طرف دھکیلتے ہوئے پوچھا "کیا تم تیس مار خان ہو؟"

بھوتیاں نے اپنا رام داؤ والا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

"دوسری بار مجھے دوستوں کی طرح ہاتھ لگانا۔ ورنہ . . ."

"ورنہ کیا؟" جواب میں بابر نے بھی رام داؤ والا ہاتھ بلند کیا۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل تن گئے۔ موسلا دھار بارش میں درخت کی شاخیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ پتے شور مچا رہے تھے۔ تاریکی میں کوئی دیکھ نہ سکا کہ وہ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہے ہیں لیکن جیسے ہی بجلی چمکی روشنی

کا ایک جھماکا سا ہوا تو دور رام داؤ کے پھل اس روشنی میں بجلی کی طرح چمک کر بجھ گئے۔ تب سمجھ میں آیا کہ بارش میں خون کے چھینٹے اڑنے والے ہیں۔

یکبارگی عظمیٰ چیختے ہوئے آگے بڑھی۔ منظور لاٹھی ٹیکتا ہوا گرتا پڑتا ان کی طرف آیا۔ بڑے میاں بھی ان کے ساتھ ہی دونوں کے درمیان پہنچ گئے۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر کہنے لگے۔ "رک جاؤ۔ خدا کے لیے رک جاؤ۔ یہ کوئی ملک نہیں ہے، یہاں کوئی سیاست نہیں ہے، کوئی بنگالی اور کوئی بہاری نہیں ہے۔ پھر بھی یہ خونریزی ختم کیوں نہیں ہوتی۔ اگر نہیں ہوتی تو آج مان لو کہ صرف ایک انسان دوسرے انسان سے لڑتا ہے جیسے ایک جانور دوسرے جانور سے لڑتا ہے۔ ورنہ بنگالی بہاری سے اور مسلمان ہندو سے نہیں لڑتا۔ لڑائی انسان کی گھٹی میں پڑی ہے اور وہ اپنی اپنی لڑائی کو جائز ثابت کرنے کے لیے مذہبوں، قوموں، فرقوں اور سیاسی پالیسیوں کا سہارا لیتا ہے۔ رک جاؤ تھوڑی دیر کے لیے اپنے انسان ہونے پر شرمندہ ہونے کے لیے رک جاؤ۔"

⁂

بس میں بیٹھے ہوئے مسافر ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ کبھی وہ پولیس انسپکٹر کو اور کبھی خسرو کو دیکھ رہے تھے۔ عورتیں خسرو کے ساتھ بیٹھی ہوئی نین تارا کو تک رہی تھیں۔ ایک مسافر نے پوچھا "کیا یہ ہندی بولنے والے ہیں؟ کیا بنگلہ دیش سے بھاگ کر آئے ہیں؟"

انسپکٹر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس مسافر کو گھورتے ہوئے دیکھا۔ پھر تمام مسافروں پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "ابھی میں نے ان سے سوال نہیں کیا ہے۔ وہ تو تھانے پہنچ کر پوچھ گچھ ہوگی لیکن اتنا سمجھ میں آگیا ہے کہ یہ پاکستانی ہیں۔ بنگلہ دیش سے بھاگ کر ہمارے دیش میں آئے ہیں اور یہاں سے ضرور نیپال جائیں گے۔"

انسپکٹر نے خسرو سے پوچھا "کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟"

وہ سر جھکائے مجرموں کی طرح خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ انسپکٹر نے تمام دیہاتی مسافروں کو دیکھتے ہوئے اس سے کہا "ہم یہ ناہی پوچھت ہیں کہ تم سریف ہو یا بدماس۔ ہم تو یہ جانت ہیں کہ ہمارے تمہارے ملوک کے بیچ پاسپورٹ اور ویزا لاگی ہے۔ پھر تم کیسن آئے؟ کون راستے سے آئے؟"

ایک مسافر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "یہ سسرا جاسوس ہو سکتا ہے۔"

انسپکٹر نے تائید میں سر ہلا کر کہا "ہو سکتا ہے۔ ضرور ہو سکتا ہے۔ سسرا کے ساتھ سسری بھی ہے۔ ہم دونوں کا لے جائی کے لاک اپ میں ڈال دے ای۔"

نین تارا نے پریشان ہو کر خسرو کو دیکھا۔ وہ بے چارہ کیا کر سکتا تھا۔ تسلیاں دے سکتا تھا۔ اس نے آہستگی سے کہا۔ "پریشان ہوتے رہنے سے دماغ پر بوجھ پڑتا ہے۔ یہ سمجھ کر اپنے آپ کو تسلی دو کہ ہم انتہا پسند ہندوؤں کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ ہمیں کبھی زندہ نہ چھوڑتے۔ اچھا ہوا قانون کی گرفت میں آئے ہیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ ہمیں جیل میں ڈال دیں گے۔ کسی بھی ملک کا قانون غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے والوں کو موت کی سزا نہیں دے سکتا۔ ہمیں خاصی پریشانی ہوگی لیکن نہ تو ہماری عزت پر آنچ آئے گی۔ نہ ہی جانی نقصان ہوگا۔"

وہ چار بجے کشن گنج پہنچ گئے۔ مسافر بس سے اترنے لگے۔ انسپکٹر نے چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "اے تم دونوں میرے پیچھے آؤ۔"

وہ اٹیچی اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ نین تارا اس کے پیچھے چلنے لگی۔ ابھی چار بجے تھے۔ رات کا اندھیرا باقی تھا۔ ایسے وقت سارا عالم سوتا ہے لیکن بس اسٹاپ پر بڑی رونق تھی۔ مسافر مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے اپنی اپنی منزلوں کی طرف آنے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ایک ہوٹل کا مالک داروغہ کو دیکھتے ہی اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا باہر آیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا "حجور، مائی باپ! گرم گرم چائے، حلوا پوری ہے۔"

داروغہ نے کہا "تم تو جانتے ہو، میں اپنی جیب سے ہوٹل میں نہیں کھاتا۔ مرغا پھانس کر لاتا ہوں۔ تو کھاتا ہوں مگر یہ بھیا کے ساتھ ایک مہرارو ہے۔ پاکستانی مہرارو ہوٹل میں بیٹھ کر نہیں کھاتی ہے۔ اس لیے پھر کبھی۔"

وہ آگے بڑھ گیا۔ خسرو اور نین تارا اس کے ساتھ چلنے لگے۔ کچھ آگے جا کر انسپکٹر نے اس کی اٹیچی کو اپنی چھڑی سے بجاتے ہوئے پوچھا "اس میں کیا ہے؟"

"ہماری ضرورت کے کپڑے اور کچھ ضروری کاغذات ہیں۔"

"مال کتنا ہے؟"

نین تارا نے چلتے چلتے چپکے سے خسرو کے ہاتھ کو دبایا۔

اس نے کہا "ایک ہزار روپے ہیں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ کچھ اور بڑھاؤ۔"

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "ایک ہزار اٹیچی میں ہیں اور پانچ سو میری مہرارو کے پاس ہیں۔"

"یہاں تک کیسے پہنچے؟"

خسرو اسے مختصر طور پر بتانے لگا تھا۔ تھانہ قریب ہی تھا۔ وہ پیدل چلتے ہوئے پہنچ گئے۔ داروغہ نے اپنے خاص

کمرے میں پہنچ کر میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: ”اٹیچی کو میز کے اوپر رکھ دو اور سامنے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔“

انھوں نے حکم کی تعمیل کی۔ اٹیچی کو اس کے سامنے میز پر رکھ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس نے کہا: ”جب سکندر نے پورس سے پوچھا تھا: تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے تو پورس کا جواب مجھے معلوم ہے۔ تمھارا کیا جواب ہے؟“

خسرو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا: ”وہی سلوک جو ایک قانون کا محافظ کسی مجبور کے ساتھ کرتا ہے۔“

اس نے سر ہلاتے ہوئے سپاہی کو آواز دی۔ جب سپاہی آگیا تو اس نے کہا: ”بھیا سے پیسے لے کے سامنے والے ہوٹل سے گرما گرم حلوا پوری لے آؤ۔“

خسرو نے یہ سنتے ہی اٹیچی کو اپنی طرف سرکایا۔ پھر اسے کھولا۔ ان کے سامنے کھولنے میں ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ زیورات نیچے کپڑوں میں دبے ہوئے تھے۔ ایک ہزار روپیہ اوپر ہی رکھے ہوئے تھے۔ اس نے بیس روپے کا ایک نوٹ نکال کر سپاہی کی طرف بڑھا دیا پھر اٹیچی بند کرنے لگا۔ داروغہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا: ”جب یہ کھل ہی چکی ہے تو بند نہ کرو۔“

وہ اور مین تارا پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پریشانی کی بات ہی تھی۔ اگر وہ اٹیچی کے کپڑے اٹھا اٹھا کر دیکھتا تو نیچے زیورات کا ڈھیر نظر آتا۔ یہ پتا چل ہی گیا تھا کہ وہ لالچی اور رشوت خور ہے۔ خسرو نے ہمت کرتے ہوئے آہستگی سے کہا: ”ہم مجبور ہیں مگر آپ کی کچھ سیوا کر سکتے ہیں۔“

اس نے سر ہلا کر کہا: ”ہوں۔ دیکھا جائے گا۔ ابھی بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے کچھ کھا لینے دو۔“

حلوا اور بھاجی پوریاں آگئیں۔ داروغہ نے پوچھا: ”کتنے کی ہیں؟“

سپاہی نے جواب دیا: ”چار روپے پچاس پیسے۔“

”یہاں کتنے سپاہی ہیں؟“

”چار ہیں۔“

”اچھا۔ پانچ روپے پچاس پیسے رکھ لو اور دس روپے بھیا کو واپس کر دو۔ بے چارے بہت دور سے آئے ہیں۔ بہت دور جانا ہے۔ ان پر زیادہ بوجھ مت ڈالو۔“

اس نے دس روپے واپس کر دیے پھر وہاں سے چلا گیا۔ داروغہ نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا: ”تم دونوں کتنی پوریاں کھاؤ گے؟“

”ہم ابھی نہیں کھائیں گے۔“

مین تارا نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ اکیلا کھانے لگا۔ خسرو نے اپنی درد بھری داستان شروع کی۔ تاکہ اسے کچھ ترس آئے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا: ”مجھ سے کسی کا دکھ سنا نہیں جاتا۔ کھاتے کھاتے رونے لگتا ہوں۔ مجھے کھا لینے دو۔“

وہ دونوں خاموش بیٹھے اس کے کھانے کا منظر دیکھنے لگے۔ جتنی پوریاں تھیں، وہ صاف کر گیا۔ ڈکار لینے کے بعد بولا: ”میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ناشتے کے بعد چائے ضروری ہوتی ہے۔“

اس نے پھر سپاہی کو آواز دی۔ خسرو نے جیب سے وہی دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ داروغہ نے کہا: ”گرما گرم چائے لے آؤ۔“

سپاہی کے جانے کے بعد اس نے پوچھا: ”کیا تمھارے ماں باپ بھارت سے پاکستان گئے تھے؟“

”ہاں، جب پاکستان بنا تو ہمارے خاندان کے کتنے ہی افراد بھاگل پور سے پاکستان سید پور چلے گئے۔“

”ہندوستان سے پاکستان جانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا وہاں سے دھکے کھا کر آنے کے لیے گئے تھے؟“

خسرو نے جواب دیا: ”آدمی کا گھر، زمین اور جائداد سب کچھ چھن جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔“

”تمھارے مسلمان لیڈروں نے ہندوستان تقسیم کرنے کے لیے انگریز بہادر سے کہا تھا: ہندوستان میں دو مختلف قومیں رہتی ہیں۔ مسلمان اور ہندو۔ اور یہ ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، اس لیے پاکستان بن گیا آج کروڑوں مسلمان ہم ہندوؤں کے ساتھ یہاں رہتے ہیں لیکن تم مسلمان اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے ساتھ نہ رہ سکے۔ ہمارے ہاں ہندو مسلم فسادات ہوتے ہیں مگر کوئی مسلمان اپنا گھر، اپنا شہر اور اپنا ہندوستان چھوڑ کر نہیں جاتا۔ کیونکہ ان کی جڑیں یہاں کی دھرتی میں گہرائی تک ہیں۔ تمھارے باپ دادا نے اپنی جڑیں یہاں سے اکھاڑ ڈالی تھیں۔ اس کا خمیازہ تم لوگ بھگت رہے ہو۔“

”ہم مایوس نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو پھر ایک بار پاکستان کی طرف ہجرت نہ کرتے۔“

اس نے ہنستے ہوئے پوچھا: ”کیا تم سمجھتے ہو، تم لوگوں کو آسانی سے مغربی پاکستان میں جگہ مل جائے گی؟“

”کیوں نہیں ملے گی؟“

”ہم یہاں سے نیپال تک کے حالات جانتے ہیں۔ کھٹمنڈو میں ہزاروں بہاری کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ بھٹو حکومت کا قانون یہ ہے کہ جن بہاریوں کے رشتے دار

مغربی پاکستان میں ہیں، انھیں وہاں بلایا جائے گا باقی بہاریوں کو ان کے پاکستان میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟“

”کیا ہوا؟“

”یہی کہ مغربی پاکستان والوں کے رشتے داروں کو یہاں سے بلایا جا رہا ہے اور جو لاکھوں بہاری مشرقی پاکستان گئے تھے، ان کا تو شاید ہی کوئی رشتے دار مغربی پاکستان میں ہوگا یعنی ان بہاریوں کا وہاں جانے کے لیے پاکستانی ہونا ضروری نہیں ہے۔ کسی مغربی پاکستانی کا رشتے دار ہونا ضروری ہے۔“

اس کے لیے چائے آگئی۔ وہ پینے لگا۔ خسرو پریشان ہو کر سوچ رہا تھا۔ اگر نیپال پہنچنے کے بعد ایسی رکاوٹیں پیدا ہوں گی تو بڑی مشکلات پیش آئیں گی۔ اس نے نین تارا کی طرف دیکھا۔ بس ایک ہی آسرا تھا۔ نین تارا کے بھائی وہاں موجود تھے اگر وہ تحریری بیان دیتے تو انھیں مغربی پاکستان جانے کے لیے کلیئرنس مل سکتا تھا۔

اس نے چائے پینے کے بعد کہا: ”اگر میں تم دونوں کے خلاف رپورٹ لکھوں تو اس رپورٹ کے مطابق تم لوگ غیر ملکی جاسوس کہلاؤ گے اور تمھیں جیل بھیج دیا جائے گا۔ پتا نہیں کتنے برس تک وہاں سڑتے رہو گے اور یہ تمھاری اٹیچی میں جو کچھ ہے وہ سب ہمارا ہو گا۔ اب تم بتاؤ نیپال جانے کے لیے ہمیں کیا دے سکتے ہو؟ اگر یہ چاہتے ہو کہ اٹیچی کی تلاشی نہ لی جائے تو اس کی فیس الگ ہو گی۔“

”داروغہ صاحب! ہمارے پاس جو کچھ ہے ہم نے بتا دیا۔ آپ ہمارے ڈیڑھ ہزار روپے میں سے جو لینا چاہیں لے لیں مگر ہمیں چھوڑ دیں۔ ہم بہت پریشان ہیں۔“

”میں آدمی ہوں۔ میرے سینے میں بھی دل ہے۔ تم لوگوں کی پریشانیوں کو سمجھتا ہوں۔ اسی لیے تو حوالات میں نہیں بھیجا ہے۔ اپنے سامنے کرسیوں پر بٹھا رکھا ہے۔ ایسا کرو پہلے سو کا ایک پتا نکالو۔“

خسرو نے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے جیب میں رکھتے ہوئے کہا: ”اب میں اٹیچی کی تلاشی نہیں لوں گا۔ یہ بتاؤ۔ نیپال جانے کے لیے کیا دے سکتے ہو؟“

خسرو نے تھوڑی دیر سوچا۔ پھر دو سو روپے نکال کر اسے دے دیے۔ اس نے لیتے ہوئے کہا: ”دو سو میں تمھاری مہرارو نیپال چلی جائے گی۔ کیا تم اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتے؟“

خسرو نے اور دو سو نکال کر دے دیے۔ پورے پانچ سو روپے لینے کے بعد اس نے سپاہی کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ ”ارے جا کے دیکھ، ریل کتنے بجے آتی ہے۔ یہ بے چارے بھلے لوگ ہیں۔ انھیں بھک بھک اڈے تک پہنچا دینا۔“

پھر اس نے خسرو سے پوچھا: ”کیا پہلے تم کبھی اِدھر آئے ہو؟“

”ہم پہلی بار ہندوستان آئے ہیں۔“

”دیکھو، یہاں سے ریل گاڑی میں بیٹھ کر بیھ پور تھانہ چلے جانا۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا: ”کیا آپ ہمیں کسی اور تھانے بھیج رہے ہیں؟“

”ارے نہیں۔ بیھ پور تھانہ ایک ریلوے اسٹیشن کا نام ہے۔ وہ جنکشن بھی ہے۔ وہاں سے دوسری گاڑی پکڑ کے منہیاری گھاٹ چلے جاؤ۔ گھاٹ کے او پار ایک ٹرین ملے گی۔ اس ٹرین میں بیٹھ کے بھاگل پور پہنچ جاؤ گے۔ وہاں تاتار پولیس اسٹیشن میں شیر علی داروغہ ہے۔ اس نے تم جیسے بہاریوں کے لیے ایک ریلیف کمیٹی قائم کی ہے۔ وہاں سے تم لوگوں کو نیپال پہنچا دیا جاتا ہے۔“

خسرو نے حیرانی سے پوچھا: ”کیا بھارتی حکومت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ غیر قانونی طور پر آئے ہوئے مہاجرین کو یہاں برداشت کیا جائے اور ریلیف کمیٹی قائم کی جائے؟“

”ہماری سرکار تم لوگوں کو برداشت کرنا ہی نہیں چاہتی اسی لیے تو تم لوگ اِدھر آتے ہو، اُدھر تمھیں نیپال پہنچا دیا جاتا ہے۔ اپنے ہاں رہنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ رہ گئی ریلیف کمیٹی کی بات تو یہ تمھارے مسلمان بھائی بھاگل پور میں ایسا کر رہے ہیں۔ یہ سرکار کی طرف سے نہیں ہو رہا ہے۔“

”ابھی آپ کہہ رہے تھے، ہم مہاجروں کو جاسوس سمجھ کر جیل پہنچا دیا جاتا ہے۔“

”یہ تو ہماری رپورٹ پر ہے اگر میں یہ لکھ دوں کہ تم دونوں میاں بیوی کو رام گڑھ کی فوجی چھاؤنی کے آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھا گیا ہے تو زندگی بھر ہماری جیل سے باہر نہیں نکل سکو گے۔ یہ تو میں تم لوگوں پر مہربانی کر رہا ہوں۔“

”ہم آپ کی مہربانی کبھی نہیں بھولیں گے۔“

”ایک بات یاد رکھنا۔ شیر علی داروغہ میرا یار ہے۔ اسے یہ نہ بتانا کہ میں نے تم سے کوئی رقم لی ہے۔“

”میں نہیں بتاؤں گا۔“

”اور وہ پوچھے تو کہنا، میں نے تم لوگوں کی اچھی طرح

خاطر کی تھی۔ تم لوگوں کو کھلایا پلایا تھا۔“

”اچھی بات ہے۔ ہم یہی کہیں گے۔“

”اگر میرے خلاف کچھ کہو گے تو بات نہیں چھپے گی۔ شیر علی مجھ سے شکایت کرے گا۔ میں تمھارا بدلہ تمھارے بعد آنے والے مہاجروں سے لوں گا۔ کسی کو یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔ جیل میں سڑا دوں گا۔“

خسرو نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے خلاف کسی سے کچھ نہیں کہے گا۔ داروغہ نے انھیں چھوڑ دیا۔ وہ کشن گنج سے ریل گاڑی میں بیٹھ کر بیھ پور تھانہ جنکشن پہنچے۔ وہاں سے ٹرین بدل کر منہیاری گھاٹ آ گئے۔ سفر کے دوران مسافر ایک دوسرے سے پوچھتے ہی رہتے ہیں کہ کون کہاں سے آ رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ ان دونوں سے بھی طرح طرح کے سوالات کیے گئے۔ وہ بنگالی بنے رہے اور یہی جواب دیتے رہے کہ بنگلہ دیش میں ان دنوں حالات سازگار نہیں ہیں لہٰذا وہ روزگار کے لیے دہلی کی طرف جا رہے ہیں۔

وہ دوسری صبح بھاگل پور پہنچ گئے۔ وہاں کے ایک علاقے تاتار پور میں شیر علی داروغہ کو ڈھونڈ نکالنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کیا شریف، کیا بدمعاش سبھی اپنے علاقے کے تھانیدار کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ لہٰذا انھیں اس کے پاس پہنچا دیا گیا۔ شیر علی نے انھیں اپنے دفتری کمرے میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے پریشان ہو کر بولا: ”ایک بڑی مصیبت ہے۔ بنگلہ دیش سے جو لوگ آتے ہیں، وہ میرا نام لے کر یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ میں اپنے بڑے افسروں کو جواب دیتے دیتے تھک گیا ہوں۔ انھیں بارہا سمجھا چکا ہوں کہ وہاں سے آنے والوں کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کوئی رشتے داری نہیں ہے۔“

”ہم نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ آپ کا نام لینے سے آپ اپنے حکام بالا کے سامنے جوابدہ ہوتے رہتے ہیں۔“

”تم لوگوں کو میرا نام کس نے بتایا؟“

”کشن گنج کے تھانیدار نے آپ کا ذکر کیا تھا۔“

”یقیناً داروغہ دین دیال ہو گا۔ وہ کمبخت وہاں آنے والوں کو سیدھا میرے پتے پر بھیج دیتا ہے۔ کیا اس نے تم لوگوں سے کچھ وصول کیا ہے؟“

خسرو نے جھوٹ کہہ دیا: ”نہیں، وہ تو بڑا اچھا آدمی تھا۔ ہماری بڑی خاطر کی اور یہاں تک آنے کا راستہ سمجھا دیا۔ کہہ رہا تھا۔ یہاں ریلیف کمیٹی قائم کی گئی ہے جو۔۔۔“

شیر علی داروغہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا: ”آہستہ بولو۔ یہ ریلیف کمیٹی کوئی قانونی نہیں ہے۔ یہاں کے ہندو عوام سے ان معاملات کو راز میں رکھا جاتا ہے۔ جو لوگ آتے ہیں، انھیں دوسرے مسلمان گھروں میں یہ کہہ کر بھیج دیا جاتا ہے کہ ان کے رشتے دار ہیں۔ ہندوستان کے کسی دوسرے شہر سے آئے ہیں لیکن سی آئی ڈی اور پولیس والے سب جانتے ہیں۔ اس لیے وہ تحقیقات نہیں کرتے۔ مجھے سمجھا دیتے ہیں کہ میں جلد سے جلد یہاں آنے والوں کو نیپال کی طرف روانہ کر دوں۔“

”جب قانون کے تمام متعلقہ افسران یہ حقیقت جانتے ہیں تو پھر آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں؟“

”پریشانی یہ ہوتی ہے کہ مجھے ان کی زبان سے طعنے سننے پڑتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ یہاں آ رہے ہیں، پہلے ان کے مکانات یہاں تھے، یہاں زمینیں تھیں، کھیت تھے، کاروبار تھا۔ ملازمتیں تھیں۔ آج یہ کیا لینے آ رہے ہیں۔ بات صرف اتنی نہیں ہے۔ میں ہر وقت اس اندیشے میں مبتلا رہتا ہوں، کہیں ہندو مسلم فساد برپا نہ ہو جائے۔ یہ الزام عائد کریں گے کہ جو مسلمان ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں کے خون سے ہولی کھیل کر پاکستان گئے تھے آج وہی پاکستان سے واپس آ کر پھر وہی خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔ ایسے میں تم سب کو پاکستانی جاسوس بھی کہا جا سکتا ہے اور پاکستان کی طرف سے آنے والے تخریب کار بھی کہا جا سکتا ہے۔ جب یہاں کے ہندو عوام کو تم لوگوں کے متعلق پتا چلتا ہے تو وہ سخت برہم ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں جب مشرقی پاکستان تھا تب لاکھوں کی تعداد میں بنگالی وہاں سے فرار ہو کر ادھر آئے اور یہاں کی معیشت پر بوجھ بن گئے۔ ان کے جانے کے بعد بہاری آ رہے ہیں۔“

خسرو نے کہا: ”۱۹۷۱ء میں جب لاکھوں بنگالی ہجرت کر کے یہاں آئے تو بھارتی حکومت نے ان کے لیے بڑے پیمانے پر کیمپ قائم کر دیے۔ انھیں کھانا کپڑا دیا۔ مفت علاج کرتے رہے۔ ان کے لیے خصوصی ضمیمے شائع کیے گئے۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعے ان پر ہونے والے مظالم کی داستانیں بیان کی گئیں۔ ان کے لیے بہت کچھ کیا گیا۔ ہمارے لیے اتنی ہی مہربانی کی جا رہی ہے کہ نیپال تک پہنچنے کا راستہ صاف کر دیا گیا ہے۔ یہ مہربانی کم نہیں ہے۔ ہم آج ہی جا سکتے ہیں۔ آپ صرف رہنمائی کر دیں۔“

ان کی رہنمائی کر دی گئی۔ وہ وہاں سے مظفر پور گئے۔ مظفر پور سے بس پر سوار ہو کر رکسول ریلوے اسٹیشن کے قریب اتر گئے۔ وہاں سے سائیکل رکشا پر بیٹھ کر بیر گنج پہنچ گئے۔ بیر گنج نیپال کی ترائی کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہ چیک پوسٹ

بھی ہے۔ باہر سے آنے والوں کے پاسپورٹ اور ضروری کاغذات چیک کیے جاتے ہیں۔ خسرو اور نین تارا غیر قانونی طور پر آئے تھے۔ اس نے رکشا والے سے پوچھا: "کیا وہ ہمیں یہاں سے گزرنے دیں گے؟"

رکشا والے نے کہا: "صاحب! پانچ روپے دے دیجیے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس نے پانچ روپے دے دیے۔ رکشا والے نے کہا۔ "آپ چپ چاپ بیٹھے رہیں۔ کسی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سر جھکائے رہیے۔"

انھوں نے رکشا والے کی ہدایت پر عمل کیا لیکن کن انکھیوں سے آس پاس دیکھتے رہے۔ ایک جگہ بڑے سے بورڈ پر لکھا ہوا تھا: "پورٹ آف انٹری۔ امیگریشن آفس" لیکن کسی نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ رکشا میں اس عورت کے ساتھ بیٹھ کر ایک لڑکی لیے کہاں جا رہے ہو؟

آفس کے باہر غیر ملکی سیاح نظر آ رہے تھے۔ ان میں ہپیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ سب نیپال میں داخل ہونے کے سلسلے میں ضروری کارروائیوں سے گزر رہے تھے۔ ان کے رکشے کی طرف کسی نے نہیں دیکھا۔ دیکھا بھی ہو تو رکنے کے لیے نہیں کہا۔ جب وہ لوگ دفتر سے بہت دور نکل گئے تو خسرو نے حیران ہو کر پوچھا: "کیا بات ہے ہمیں کیوں نہیں روکا گیا؟"

وہ رکشا چلاتے ہوئے ہانپتے ہوئے بولا: "آپ لوگوں کا حلیہ دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ بنگلہ دیش سے بھاگ کر آ رہے ہیں۔ نیپال کے راجہ نے آپ لوگوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔"

اس نے بس اسٹینڈ تک انھیں پہنچا دیا۔ وہاں سے بس کھٹمنڈو جاتی تھی۔ کرنسی تبدیل کرنے والے کتنے ہی لوگ گھومتے پھرتے نظر آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے خسرو کے پاس جا کر کہا: "جو کچھ تبدیل کرنا ہو یہاں کریں!"

اس نے پوچھا: "کیا کسی بینک کے ذریعے کرنسی تبدیل نہیں ہو سکتی؟"

اس نے خسرو کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر نین تارا پر ایک نظر ڈال کر کہا: "تم لوگوں کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے۔ ہم یہاں آنے جانے والوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو۔ یہ بتانا کیا ضروری ہے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ کھٹمنڈو میں راشٹریہ بینک میں کرنسی تبدیل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لیے پہلے کرنسی ڈیکلریشن فارم پُر کرنا پڑتا ہے اور پاسپورٹ وغیرہ دکھانا پڑتا ہے اور تمھارے پاس کچھ نہیں ہے۔"

خسرو نے اسی ایجنٹ سے معاملات طے کر لیے۔ انڈیا کے سو روپے دینے سے قانوناً نیپال کے ایک سو اُنتالیس روپے ملتے تھے لیکن ایجنٹ نے سو پر صرف دس روپے زیادہ دیے۔ خسرو کے پاس جتنی رقم تھی، اس نے تبدیل کرا لی۔ صبح آٹھ بجے وہ بس میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ بس پہاڑ کی بلندیوں پر جانے لگی۔ کھٹمنڈو سطح سمندر سے ساڑھے چار ہزار فٹ کی بلندی پر ہے اور بیرگنج سے دو سو تین کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ جب انھوں نے سفر کا آغاز کیا تو موسم معتدل تھا۔ نہ سردی زیادہ تھی نہ گرمی۔ جیسے جیسے وہ بلندی پر پہنچنے لگے، سردی بڑھنے لگی۔ یوں دیکھا جائے تو سید پور سے یہاں تک انھیں کسی خاص مصیبت سے دوچار ہونا نہیں پڑا تھا۔ رام اوتار بحفاظت ہندوستان تک لے آیا تھا۔ کشن گنج میں داروغہ دین دیال ان کے لیے ذرا پریشانی کا سبب بنا لیکن اس نے بھی شیر علی داروغہ تک ان کی رہنمائی کر دی۔ نیپال کے چیک پوسٹ سے بھی وہ کسی روک ٹوک کے بغیر گزر گئے۔ اب اسے فکر تھی کہ کھٹمنڈو میں نین تارا کے ساتھ کہاں قیام کرے گا؟ کوئی مناسب جگہ مل سکے گی یا نہیں؟

وہاں ہزاروں کی تعداد میں بہاری اپنی بیوی بچوں کے ساتھ موجود تھے۔ کچھ بہاریوں نے رہائشی مسئلہ حل کرنے کے لیے کاروبار شروع کر دیا تھا۔ مقامی باشندوں سے بڑے بڑے ہال نما کمرے کرائے پر حاصل کر لیے تھے۔ اب ان کمروں میں ایسے بہاری مہاجروں کے رہنے کی جگہ بن جاتی تھی جن کے ساتھ بیوی بچے نہیں ہوتے تھے۔ ایک ایک ہال میں دو دو، ڈھائی سو افراد رات کو سوتے تھے اور ایک رات کا کرایہ ایک روپیہ ادا کرتے تھے۔ دن کو رہنے کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے شہر میں مارے مارے پھرتے تھے۔ جو اچھی خاصی رقمیں لے کر آئے تھے وہ ہوٹلوں اور پارکوں میں وقت گزارتے تھے۔ کھٹمنڈو ایک نہایت ہی صاف ستھرا شہر ہے۔ وہاں کے قانون کے مطابق وقت بے وقت پارکوں اور چوراہوں پر بیٹھنا یا کھڑے رہنا ممنوع ہے۔ بہاریوں کو کئی بار وارننگ دی جا چکی تھی کہ وہ اس طرح راستے کے کنارے اور چوراہوں پر جمع نہ رہیں۔ بہت سے مسلمان وہاں کے ہوٹلوں میں کھانے سے ہچکچاتے تھے کیونکہ کئی ہوٹلوں میں سُور کا گوشت پکتا تھا اور شراب ہر جگہ عام تھی۔ ہپی مرد، عورتیں چرس کا دم لگاتے تھے۔ پولیس جب پکڑنے آتی تو وہ بھاگ کر اپنی پناہ گاہوں یا مندروں میں چھپ جاتے تھے۔

خسرو اور نین تارا نے بس سے اتر کر دیکھا۔ انھیں کتنے

ہی ہماری نظر آئے۔ وہ بس سے اترنے والے مسافروں سے کہہ رہے تھے: "ہمارے ساتھ آئیے۔ ہم آپ کے لیے رہائش کا بندوبست کر دیں گے جو تنہا ہیں ان کے لیے باغ بازار کے علاقے میں رات کو ایک بستر سونے کے لیے مل سکتا ہے۔ ایک بستر کا ایک روپیہ اور جو بیوی بچے والے ہیں انھیں پانی پوکری کے علاقے میں رہنا چاہیے۔ وہاں پاکستانی سفارت خانہ ہے آنے جانے میں آسانی ہوگی۔"

خسرو اور نمین تارا کو کتنے ہی لوگوں نے گھیر لیا تھا۔ ان کے درمیان ایک عورت آگئی۔ اس نے نمین تارا کا ہاتھ تھام کر کہا: "تم میرے ساتھ چلو۔ میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ پانی پوکری میں رہتی ہوں۔ وہاں ہم نے ایک کمرہ کرائے پر لیا ہے لیکن اب ہمارے پیسے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم اس کمرے کا پورا کرایہ ادا کرنے کے قابل نہیں رہے۔ بہن! ہم بڑی مصیبت میں ہیں اگر تم اس کمرے میں حصے دار بن کر رہو آدھا کرایہ تم دے دیا کرو تو ہم پر بڑا احسان ہوگا۔ مصیبت کے یہ دن کس طرح کٹ جائیں گے۔"

اس عورت نے کچھ اس انداز میں اپنی مصیبتیں بیان کیں کہ خسرو اور نمین تارا اس کے ساتھ چلنے کے لیے راضی ہو گئے۔ راستے میں اس عورت نے بتایا: "کمرے کا کرایہ روز پانچ روپے لیے جاتے ہیں۔ بجلی کا خرچ الگ ہے۔"

خسرو نے کہا: "اگر دو چار دن کی بات ہوتی تو ہم کسی ہوٹل میں رہ جاتے۔ پتا نہیں ہمیں سفارت خانے کے ذریعے کب پاکستان پہنچایا جائے گا۔"

اس عورت نے ایک سرد آہ بھر کر کہا: "ہم اسی انتظار میں ایک مہینے سے یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس جو پونجی تھی وہ ختم ہو گئی۔ باغ بازار کے ایک کمرے میں ڈیڑھ سو بہاری رہتے ہیں۔ میں وہاں جا کر ان کے لیے کھانا پکاتی ہوں تو مجھے تین وقت کا کھانا مل جاتا ہے۔ وہ میں اپنے بچوں کے لیے لے آتی ہوں۔ میرے شوہر یہاں کے ایک درزی خانے میں کام کرتے ہیں کسی طرح گزارہ ہو رہا ہے لیکن ایسا کب تک ہوگا۔ یہ سوچ سوچ کر ہم فکر سے آدھے ہو گئے ہیں۔"

وہ اس مکان میں پہنچ گئے۔ وہ ایک نیپالی کا مکان تھا اس نے ایک کمرہ انھیں کرائے پر دے دیا تھا۔ کمرہ بڑا تھا وہاں نمین تارا اور خسرو گزارہ کر سکتے تھے۔ وہاں بیٹھنے کے بعد نمین تارا نے پوچھا: "آپ لوگوں کے پاکستان جانے میں کیا رکاوٹ ہے؟"

"ایک رکاوٹ ہو تو بتاؤں۔ یہاں [illegible] نے میں طرح طرح کے سوالات کیے جاتے ہیں؟ پہلے پوچھا جاتا ہے ہم پاکستانی ہیں بھی یا نہیں؟ ہو سکتا ہے ہم ہندوستان کے کسی شہر سے بھاگ کر آئے ہوں یا برما سے چلے آئے ہوں۔"

ان دنوں شناختی کارڈ کا رواج نہیں تھا۔ سرکاری ملازمین اپنے کاغذات کے ذریعے پاکستانی ہونے کا ثبوت دے سکتے تھے۔ کاروباری حضرات مغربی پاکستان میں اپنے دوستوں رشتے داروں کو خط لکھتے تھے۔ وہاں سے ان کی تصدیق ہوتی رہتی تھی لیکن ہزاروں افراد ایسے تھے جن کے پاس کوئی شناختی کارڈ، کوئی سرکاری کاغذ نہیں تھا۔ ان کے رشتے دار بھی مغربی پاکستان میں نہیں تھے ایسے میں وہ کیا ثبوت پیش کر سکتے تھے؟

اس عورت نے کہا: "اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم اردو بولتے ہیں اور پاکستان سے محبت کا دم بھرتے ہیں۔ ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی اور ہماری زبان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان کی اردو زبان میں ہندی شامل ہوتی ہے۔ ہماری زبان ان سے مختلف ہے پھر ہمارا رہن سہن، ہمارا لباس، ہمارا حلیہ، ہمارا لب ولہجہ سب کچھ گواہی دیتا ہے کہ ہم مشرقی پاکستانی ہیں اور اب بنگلہ دیش بننے کے بعد یہاں آئے ہیں لیکن ایسے ثبوت سفارت خانے میں تسلیم نہیں کیے جا رہے ہیں۔"

باہر شام کی ڈوبتی ہوئی روشنی تھی۔ کمرے میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ عورت سر جھکائے اداس بیٹھی ہوئی تھی جیسے حوصلہ ہار رہی ہو پھر اس نے سر اٹھا کر پوچھا: "مسلمانوں کے قول وفعل میں تضاد کیوں ہے؟ پاکستان کے بڑے بڑے لیڈروں نے کہا تھا۔ پاکستان مسلمانوں کے لیے بنا ہے اور یہاں اسلام کا بول بالا رہے گا۔ جب مسلمانوں نے ہندوستان کو تقسیم کرایا اور پاکستان بنایا اور پاکستان مسلمانوں کے لیے ہے تو کیا ہم مسلمان نہیں ہیں۔ پھر ہم سے ہماری پاکستانی شناخت کیوں پوچھی جاتی ہے؟"

اور جب تم کہتے ہو۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ۔ تو پھر ہماری زبان لا الٰہ الا اللہ کا نا قابل انکار سرٹیفکیٹ ہے۔ اگر تم اس سرٹیفکیٹ سے انکار کرتے ہو تو پاکستانی تو ہم ہوئے، تم کیا ہوئے؟

* * *

وہ ایک دوسرے پر حملہ نہ کر سکے۔ ان کے راہ داؤ فضا میں لہرا کر رہ گئے۔ عظمیٰ، منظور اور بڑے میاں ان کے درمیان آگئے تھے۔ بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ آسمان کی حالت بتا رہی تھی کہ صبح تک بارش ہوتی رہے گی۔

صدرالدین نے آگے بڑھ کر کہا: "اگر تم لوگ آپس میں اس طرح لڑتے رہو گے تو اسی جنگل میں مارے جاؤ گے۔"

بابر نے غصے سے پوچھا: "صدرالدین! تم کس کے ساتھ چلو گے؟"

"میں سب کے ساتھ چلوں گا اور تم بھی سب کے ساتھ ہی چلو گے۔ آؤ۔"

بابر مجبور تھا۔ جنگل کا راستہ نہیں جانتا تھا۔ اگر جانتا تو تنہا آگے نکل جاتا۔ مجبور ہو کر ان کے ساتھ چلنے لگا۔ اس ان کی رفتار پہلے سے سست تھی۔ منظور اور بڑے میاں کی وجہ سے وہ لوگ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

منظور نے کہا: "صدرالدین! اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ کس طرح اندھیرے میں راستہ پہچان کر چل رہے ہو۔ تو میں بڑے میاں کو اپنے ساتھ لے کر آہستہ آہستہ چلا آؤں گا۔ تم باقی لوگوں کو لے کر آگے نکل جاؤ۔"

اس نے کہا: "جہاں تک بانسوں کے جھنڈ نظر آتے رہیں گے مجھے راستہ معلوم ہوتا رہے گا۔ میں دن رات یہاں سے گزرتا ہوں۔ ان راستوں کو بھول نہیں سکتا۔ میں تمھیں کیسے بتاؤں کہ آگے کن راستوں سے گزرنا ہے۔ تم تنہا یہاں سے نہیں نکل سکو گے۔ جنگل میں بھٹک جاؤ گے۔"

وہ سب کتنی دور چلے آئے ہیں؟ ان میں سے کسی نے صدرالدین سے نہیں پوچھا۔ فاصلوں کا حساب کیا جائے اور منزل دور بہت دور تک بھی نظر نہ آئے تو مایوسی ہوتی ہے۔ وہ گرتے پڑتے اور سنبھلتے جا رہے تھے۔ راستہ ناہموار تھا۔ کہیں گڑھے تھے اور کہیں کٹے ہوئے بانسوں کی جڑیں تھیں۔ جن سے ٹھوکریں لگتی تھیں۔ کلیم الدین بھوتیاں نے عظمٰی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ بُری طرح بھیگ رہی ہے۔ اس نے چمڑے کی جیکٹ اتار کر اس کے سر پر ڈال دی۔ عظمٰی نے اسے بڑی اپنائیت سے دیکھا۔ اندھیرے میں وہ ایک سیاہ پری کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ بولی: "تم مجھے بارش سے بچانے کے لیے خود بھیگ رہے ہو۔"

کلیم الدین بھوتیاں نے اس کا ہاتھ دوبارہ تھام کر آگے بڑھتے ہوئے کہا: "شاید تم کہہ رہی ہو کہ میں بھیگتا جاؤں گا۔"

عظمٰی نے کہا: "ہاں۔"

"میں تمھارے لیے تمام عمر اسی طرح بھیگ سکتا ہوں میں چاہتا ہوں، تمھاری زندگی کی تمام برساتیں میرے نام ہو جائیں۔"

آگے آگے چلنے والے بابر نے کہا: "یہاں جان پر بنی ہے اور لیلیٰ مجنوں رومانس فرماتے چلے آ رہے ہیں۔"

متحرک تصویر

ایک شخص۔ "نرس! کیا میری بیوی کے جبڑے کا ایکسرے لیا گیا ہے؟"

نرس۔ "کوشش تو بہت کی گئی لیکن صرف "متحرک تصویر" ہی ملی۔"

مرسلہ: جمیل احمد لودھی، راولپنڈی

کلیم الدین بھوتیاں نے اس کی باتوں کو نظرانداز کر دیا۔ عظمٰی کا ساتھ یوں لگ رہا تھا جیسے جنگل کے تاریک راستوں پر کہکشاں بچھی ہوئی ہے۔ اس کے پیچھے بڑے میاں ہانپتے کانپتے آ رہے تھے پہلے وہ کبھی کبھی کراہتے تھے لیکن اب ان کے منہ سے عجیب بے ہنگم سی آواز نکلتی جا رہی تھی۔ کلیم الدین بھوتیاں نے پلٹ کر ان کے ہاتھ کو تھام لیا۔ تب پتا چلا بخار تیز ہے۔ دوا اسپرو کی گولیاں بھلا کیا اثر کر سکتی تھیں جبکہ وہ مسلسل بارش میں بھیگتے آ رہے تھے۔

اس نے آہستگی سے کہا: "چچا میاں! آپ کیسے سفر کر سکیں گے۔ اگر میں ان لوگوں کو بتا دوں کہ آپ کا بخار تیز ہوتا جا رہا ہے۔ آپ چلنے کے قابل نہیں ہیں تو بابر غصے میں واہی تباہی بکنے لگے گا۔"

وہ کراہتے ہوئے بولے: "بیٹا! مجھے ذرا سہارا دو۔ شاید تھوڑی دیر میں بارش ختم ہو جائے۔ شاید تھوڑی دور جا کر یہ جنگل بھی ختم ہو جائے۔ اگر راستے میں کوئی جھونپڑی مل جائے ایک ذرا کمر سیدھی کرنے کا موقع مل جائے تو میری طبیعت سنبھل جائے گی۔"

عظمٰی نے ان کے دوسرے بازو کو تھام لیا۔ وہ دونوں سہارا دے کر انھیں لے جانے لگے۔ بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جنگل ختم نہیں ہو رہا تھا۔ سر چھپانے کے لیے کوئی جھونپڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اب وہ بڑی طرح کانپ رہے تھے۔ شاید وہ بابر سے سہمے ہوئے تھے۔ خاموش رہنا چاہتے تھے لیکن ہزار ضبط کے باوجود ان کے منہ سے آوازیں نکلنے لگتی تھیں۔

پتا نہیں، وہ لوگ کب تک چلتے رہے۔ آدھی رات گزر گئی ہوگی۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گئے۔ صدرالدین نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، آگے دریا کی طرح پانی بہہ رہا تھا لیکن اس کا پاٹ چوڑا نہیں تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں دوسرا کنارا نظر

آ رہا تھا۔ اس نے کہا: "یہ ندی نہیں نالے کی طرح ہے۔ زیادہ گہرائی نہیں ہے۔ ہم اس میں اتر کر پار ہو سکتے ہیں۔ اس کی چوڑائی زیادہ سے زیادہ پندرہ گز ہوگی۔"

عظمیٰ پریشان ہو کر بھوتیاں کو دیکھنے لگی۔ دیکھنے سے کیا ہوتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں ہی کچھ نظر آ رہا تھا۔ ورنہ وہ ایک دوسرے کو وضاحت سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کلیم الدین بھوتیاں نے کہا: "پانی کا بہاؤ تیز ہے عظمیٰ! اور چچا میاں اسے پار نہیں کر سکیں گے۔"

"ہم انھیں سہارا دیتے جائیں گے۔ میں آگے چلتا ہوں۔ تم لوگ میرے پیچھے چلے آؤ۔"

صدرالدین یہ کہتا ہوا پانی میں اتر گیا۔ اس نے رام داؤ کو اپنی کمر میں اڑس لیا تھا۔ ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ دوسرے ہاتھ میں لاٹھی۔ وہ لاٹھی کو آگے پانی میں مارتا جا رہا تھا تاکہ گہرائی کا اندازہ ہوتا جائے۔ اس کے پیچھے بابر چلا آ رہا تھا۔ بابر کے پیچھے منظور پانی میں اتر گیا تھا۔ وہ بھی لاٹھی ٹیکتا ہوا جا رہا تھا۔

کلیم الدین بھوتیاں نے کہا: "چچا میاں! آپ یہاں بیٹھے رہیں۔ پہلے میں عظمیٰ کو پار کراتا ہوں۔ اس کے بعد آپ کو سہارا دے کر لے جاؤں گا۔"

اس نے یہی کیا۔ عظمیٰ کے ساتھ پانی میں اتر گیا۔ اس نے بڑے میاں کی لاٹھی لے لی تھی اور اسے ٹیکتا ہوا جا رہا تھا۔ عظمیٰ نے اس کے پیچھے کمر کے بیلٹ کو تھام لیا تھا۔ سنبھل سنبھل کر بڑھتی جا رہی تھی۔ درمیان میں گہرائی زیادہ تھی۔ پانی کا بہاؤ بھی تیز تھا۔ قدم جمانے کے باوجود یوں لگتا تھا، جیسے کوئی زوردار لہر آئے گی اور ان کے قدم اکھاڑ دے گی۔ ایسا ایک آدھ بار ہوا لیکن عظمیٰ کے قدم اکھڑنے سے پہلے ہی بھوتیاں نے اسے سنبھال لیا۔ آخر وہ کسی طرح اس پار پہنچ گئے۔ دوسری بار کلیم الدین بھوتیاں پھر بڑے میاں کے پاس آیا۔ صدرالدین نے کہا: "بابر! تم بھی چلے جاؤ۔ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ بڑے میاں کو آسانی سے لے آؤ گے۔"

"کیا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بہاؤ اتنا تیز ہے کہ کئی بار میرے قدم اکھڑتے اکھڑتے رہ گئے۔ اگر تم میرے آگے نہ ہوتے اور میں تمھارا سہارا نہ لیتا تو تنکے کی طرح بہہ کر چلا جاتا۔"

صدرالدین نے ٹارچ روشن کی۔ کلیم الدین بھوتیاں اس روشنی میں بڑے میاں کو سہارا دے کر لا رہا تھا۔ عظمیٰ دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھے چپ چاپ ان کی سلامتی کے لیے دعا مانگ رہی تھی۔ وہ تیز بہاؤ سے گزر کر آئی تھی۔ اچھی طرح سمجھتی تھی اگر بھوتیاں کے قدم اکھڑ گئے تو بڑے میاں بھی نہیں بچیں گے۔ دونوں ہی بہہ کر کہیں سے کہیں چلے جائیں گے۔ لیکن دعا قبول ہو گئی۔ وہ بڑے میاں کو لے کر صحیح سلامت دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔

وہ تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ بڑے میاں ایک تو اتنی دیر سے بارش میں بھیگ رہے تھے۔ دوسرے کمر تک پانی میں ڈوب کر آئے تھے۔ بخار نے اور شدت اختیار کر لی۔ وہ پٹ سن کا بوریا اوڑھنے کے باوجود تھر تھر کانپ رہے تھے۔ بوریا بھی بھیگ کر وزنی ہو گیا تھا۔ جو بڑے میاں کے لیے ایک بوجھ سے کم نہیں تھا۔

صدرالدین نے کہا: "یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔" وہ سب پھر چلنے کے لیے اٹھ گئے۔ کلیم الدین بھوتیاں نے بڑے میاں کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اب وہ کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں تھے لیکن گھسٹ رہے تھے۔ اس کا سہارا لے کر کسی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے حلق سے طرح طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ رو رہے ہوں۔ بابر نے کہا: "کیا مصیبت اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔ کیا یہ صبح تک ہمارا ساتھ دے سکیں گے؟"

اس بار بابر کی بات کا کسی نے برا نہیں مانا۔ سب اپنی اپنی جگہ سوچتے ہوئے چل رہے تھے۔ بڑے میاں کا کیا بنے گا؟ نہ انھیں چھوڑ سکتے تھے نہ آگے لے کر بڑھ سکتے تھے جس انداز میں بڑھ رہے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دو چار قدم اور چل سکیں گے پھر گر پڑیں گے۔

آگے بڑھنا ہو تو گاڑی کے لیے پٹرول اور آدمی کے لیے حوصلہ لازمی ہوتا ہے۔ منظور قطب الر نے بڑے میاں کے دوسرے بازو کو تھام کر ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا: "انکل! ہم آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کر چکے ہیں۔ منزل دور نہیں ہے۔ آپ یہ سوچتے رہیں کہ اپنے بیٹے اور پوتے پوتیوں کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ دیکھیے، سامنے دیکھتے ہوئے چلیے۔ آپ کو اپنے بچوں کی صورتیں نظر آئیں گی۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر چل رہے تھے۔ ان کے دیدے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ تاریکی میں یوں دیکھ رہے تھے، جیسے بچوں کی صورتیں نظر آ رہی ہوں۔ پاکستان کی ہریالی میں ان کے پوتے پوتیاں کھیلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کے بیٹے اور بہوئیں ہنس رہی تھیں بول رہی تھیں۔ اچھے اچھے لباس پہنے دونوں بانہیں پھیلائے ان کے استقبال کے لیے کھڑی ہوئی تھیں۔

وہ ڈگمگاتے ہوئے سنبھلتے ہوئے کراہنے لگے جیسے بول

رہے ہوں؟ پاکستان! اے میرے خوابوں کی سرزمین! تو اور کتنی دور ہے؟ تیرا راستہ تو ہمارے لیے بہت آسان تھا۔ ہم چاٹگام سے بحری جہاز کے ذریعے جا سکتے تھے۔ طیارے کے ذریعے راستہ اور آسان ہو جاتا۔ اگر ہندوستان کی سرحدیں کھول دی جاتیں تو ہم ٹرین کے ذریعے وہاں پہنچ جاتے۔ جتنے آسان ذرائع ہیں، جتنے انسانی ذرائع ہیں، ان پر پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔ صرف چور دروازے کھول دیے گئے ہیں۔ یہ کیسا ناقابلِ فہم انسانی رویہ ہے کہ محبتوں کو گلے لگانے کے لیے چور دروازوں سے جانے کی [illegible] جا رہی ہے لیکن ضمیر کا کوئی راستہ نہیں کھل رہا ہے۔"

وہ چلتے چلتے ایکدم سے گر پڑے۔ عظمیٰ نے گھبرا کر پوچھا۔

"[illegible] (کیا ہوا)؟"

منظور اور کلیم الدین بھوئیاں ان پر جھک گئے۔ بابر نے ناگواری سے پوچھا: "کیا ان کا ایندھن ختم ہو گیا ہے؟"

صدر الدین نے ٹارچ روشن کی۔ وہ گھاس پر چاروں شانے چت پڑے ہوئے تھے۔ بُری طرح کانپتے ہوئے ہاتھ پاؤں سکوڑ رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن ملیریا بخار جیسی شدید سردی کا حملہ تھا۔ ان کے منہ سے آواز نکل رہی تھی۔ بات نہیں نکل رہی تھی۔

شاید وہ کچھ اوڑھنے کے لیے مانگ رہے تھے۔ کسی کے پاس کمبل یا لحاف نہیں تھا۔ سب مختصر سا سامان لے کر نکلے تھے۔ دیگچی اور فرسٹ ایڈ بکس کے اندرونی سامان کے علاوہ جو کچھ تھا، وہ بارش میں تر بتر ہو چکا تھا۔ ان چیزوں سے کسی بیمار کو محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اچانک ہی عظمیٰ تمام لوگوں کو ہٹاتے ہوئے بڑے میاں پر چھا گئی۔ وہ ایک بیٹی کے مقدس جذبے سے اپنے بزرگ کو حرارت پہنچانا چاہتی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے چیخ مار کر الگ ہو گئی۔ ایک انگلی سے ان کی طرف اشارہ کرنے لگی۔ سب نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، بڑے میاں کی گردن اور ہاتھوں سے جونکیں چپکی ہوئی تھیں اور ان کا خون چوس رہی تھیں۔

جونکیں عام طور پر مٹیالے یا بھورے رنگ کی ہوتی ہیں۔ جسامت میں مٹی کے اندر رینگنے والے کیچوے کی طرح پتلی اور دو ڈھائی اینچ لانبی ہوتی ہیں لیکن بڑے میاں سے چپکی ہوئی خون آشام جونکیں تین چار اینچ لانبی اور رسّی کی طرح موٹی تھیں۔ تتلیوں کی طرح رنگ برنگی تھیں۔ اگر بچوں کے کھیلنے کی چیزیں ہوتیں تو ان کی رنگینیوں کو بوتل میں بند کر کے رکھ لیا جاتا مگر انھیں دیکھتے ہی بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوتی تھی یوں لگتا تھا جیسے ہمارا ہی لہو چوس رہی ہوں۔

صدر الدین انھیں چٹکی سے پکڑ پکڑ کر بڑے میاں کے جسم سے الگ کرنے لگا۔ انھیں دور پھینکنے لگا۔ وہ الگ ہو رہی تھیں مگر اپنے پیچھے زخم چھوڑ رہی تھیں۔ بڑے میاں کی گردن اور ہاتھوں کا کچھ حصہ سوج گیا تھا اور وہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ منظور فرسٹ ایڈ بکس کھول کر زخموں پر مرہم کرنے لگا۔ اب بابر کی طرح صدر الدین بھی بیزار ہو رہا تھا۔ اس نے کہا: "بھئی! صاف بات کہتا ہوں، ایسے تو ہم کبھی سرحد پار نہیں کر سکیں گے۔ چچا میاں سے ہمدردی ہے تو انھیں اٹھا کر لے چلو۔"

سوال پیدا ہوا کون اٹھا کر لے جائے گا؟ بڑے میاں بچے نہیں تھے، اچھے ڈیل ڈول کے وزنی بزرگ تھے۔ کلیم الدین بھوئیاں کتنی دور تک کاندھے پر لاد کر لے جا سکتا تھا؟ منظور دونوں پاؤں سے مجبور تھا۔ صدر الدین دھان پان سا آدمی تھا۔ بڑے میاں کو اٹھاتے ہی ان کے نیچے دب جاتا۔ بابر نے غصے سے کہا: "ہٹ جاؤ، دور ہو جاؤ۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ اور ہم سرحد پار نہیں کر سکیں گے۔ ہم واپس نہیں جا سکتے، یہاں ٹھہر بھی نہیں سکتے۔ ہمیں آگے بڑھنا ہے آگے۔"

یہ کہتے ہی اس نے بڑے میاں کے ہاتھ کو پکڑ کر کھینچا۔ وہ بیچارے زمین پر پڑے ہوئے تھے، ایک جھٹکے سے بیٹھ گئے۔ اس سے پہلے کہ اس ظالمانہ حرکت پر کوئی اعتراض کرتا، بابر نے پلک جھپکتے ہی انھیں اٹھا کر کھڑا کیا اور اپنے کاندھے پر لاد لیا۔ پھر آگے بڑھتے ہوئے کہا: "صدر الدین چلو۔ راستہ دکھاؤ۔"

وہ لوگ پھر آگے بڑھ گئے۔ بابر اور صدر الدین تیزی سے چل رہے تھے۔ کچھ دور جا کر کلیم الدین بھوئیاں نے کہا: "منظور بھائی کا کچھ خیال کرو۔ وہ پیچھے رہ گئے ہیں۔"

"تم منظور بھائی کو کاندھے پر بٹھا لو۔ ہماری رفتار تیز رہے گی۔"

بابر نے بڑے میاں کے بوجھ سے ہانپتے ہوئے کہا۔ "بوجھ اٹھانے والے مزدور ہمیشہ تیز چلتے ہیں۔ کھڑے رہنے سے وزن زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ یقین نہ ہو تو مسٹر منظور کو اٹھا کر چلو، پتا چل جائے گا۔"

اس وقت تک منظور ان کے قریب پہنچ رہا تھا۔ اس نے کہا: "میں معذور ہوں، مجبور نہیں ہوں۔ کسی کے کاندھے پر نہیں جاؤں گا۔ تم لوگ آگے بڑھتے رہو۔ میں بہت زیادہ پیچھے نہیں رہوں گا۔"

وہ پھر چلنے لگا۔ اب بابر کی تیز رفتاری میں فرق پڑ گیا تھا۔ کچھ دور جا کر اس کی رفتار سست ہوئی اور کچھ دور جا کر اس نے بڑے میاں کو گھاس پر لٹا دیا۔ ہانپتے ہوئے بولا: "واہ! آپ نے تو مجھے قلی سمجھ لیا ہے۔ ذرا ہمت کریں، کچھ دور تو چلیں۔"

کلیم الدین بھوتیاں نے کہا: "اب میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔ مگر یہ تو دیکھ لیں، بخار کچھ کم ہوا ہے یا نہیں ہے؟"

صدرالدین نے ٹارچ روشن کی۔ وہ روشنی ٹھیک بڑے میاں کی آنکھوں پر پڑی۔ ان کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ پلک نہیں جھپک رہے تھے۔ سب ان کے قریب چلے آئے۔ عظمیٰ نے ہولے سے شانے کو ہلا کر انھیں مخاطب کیا۔ منظور نبض ٹٹولنے لگا۔ بھوتیاں ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دھڑکنوں کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ بابر نے کہا: "یہ تو گئے۔ انھیں ٹٹولنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھتے نہیں؛ انھیں اب سردی نہیں لگ رہی ہے۔ یہ پلک نہیں جھپک رہے ہیں۔"

عظمیٰ نے ان کی آنکھوں پر اپنی ہتھیلی رکھی۔ جب اُسے ہٹایا تو آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ رونے لگی۔ سبھی کے سر جھک گئے۔ وہ ایک منٹ تک خاموش بیٹھے رہے پھر صدرالدین نے کہا: "وہی ہوا جو تقدیر کو منظور تھا۔ اب چلنا چاہیے۔"

عظمیٰ نے روتے ہوئے کلیم الدین بھوتیاں کو دیکھا۔ بھوتیاں نے کہا: "انھیں دفن کرنے کے بعد آگے بڑھنا چاہیے۔"

"کیا دماغ چل گیا ہے۔ قبر کھودنے اور دفن کرنے تک صبح ہو جائے گی۔ یا بارش ختم جائے گی تو درندے اپنی پناہ گاہوں سے نکل آئیں گے۔ ان کے ساتھ ہمیں بھی اپنی اپنی قبریں کھود لینا چاہیے۔"

قریب ہی ایک گھنی شاخ، درخت سے ٹوٹ کر زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ بابر نے اسے گھسیٹ کر لاتے ہوئے کہا: "انھیں پتوں کے نیچے چھپا دیا جائے گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

وہ سب خاموش تھے مگر خاموشی نہیں تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ کبھی کڑک دار آواز سے بجلیاں چمک رہی تھیں۔ بڑے میاں گھنے پتوں کے نیچے چھپ گئے تھے۔ منظور اور بھوتیاں ہاتھ اٹھا کر مرحوم کے حق میں دعائیں مانگ رہے تھے۔ بابر نے کہا۔ "ہم چلتے چلتے بھی دعائیں مانگ سکتے ہیں۔ خدا کے لیے دیر نہ کرو۔"

وہ اپنا اپنا سامان سنبھالتے ہوئے گھنے پتوں کی قبر کو دیکھنے لگے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک بزرگ ہم سفر اچانک ہی جدا ہو گیا ہے۔ وہ بوجھل قدموں سے چلنے لگے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے کتنے اپنی منزل تک پہنچ سکیں گے۔ بڑے میاں اپنے بیٹوں اور پوتے پوتیوں کے پاس تصور میں پہنچتے پہنچتے زندگی کے راستے سے بھٹک گئے تھے۔ اب اپنے بچوں کے پاس کسی چور دروازے سے بھی نہیں جا سکتے تھے۔

وہ چلتے چلتے ٹھٹک گئے۔ پیچھے سے اونچی آواز میں کسی کی کراہ سنائی دی تھی۔ وہ پلٹ کر گھنے پتوں کی قبر کو دیکھنے لگے بادل گرج رہے تھے۔ درختوں کی شاخیں اپنے پتوں کی زبان سے شور مچا رہی تھیں۔ اتنے شور میں بھی انھوں نے پتوں کے نیچے سے کوئی آواز سنی۔ منظور نے کہا: "شاید ہم موت کی تصدیق نہ کر سکے۔ شاید وہ زندہ ہیں۔"

کلیم الدین بھوتیاں نے کہا: "ہاں۔ میں نے انسانی آواز سنی ہے۔"

بابر نے کہا: "تمھارے کان بج رہے ہیں۔"

اسی لمحے گھنے پتوں کی تہ سے آواز ابھری: "میں آ۔ آ۔ آ رہا ہوں۔ عتیق، پپو، گڑیا، منی۔ مم۔ مم میں آ۔ آ۔ آ۔۔۔"

بابر نے صدرالدین کے ہاتھ سے ٹارچ جھپٹ لی۔ دوڑتا ہوا اس ٹوٹی ہوئی گھنی شاخ کے پاس گیا پھر دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اسے ذرا دور پھینک دیا۔ ٹارچ روشن کی۔ بڑے میاں نظر آئے۔ اگرچہ عظمیٰ نے ایک بار ان کی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ اس کے باوجود وہ کھلی ہوئی نظر آئیں پھر ان کے دیدے پھیل گئے تھے اور وہ پلکیں نہیں جھپک رہے تھے۔ بابر نے کہا: "آؤ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھو۔ یہ مر چکے ہیں۔"

وہ سب اپنے اپنے طور پر گہری توجہ سے ان کا معائنہ کرنے لگے۔ پہلے وہ بخار میں تپ رہے تھے۔ اب جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ نبض نہیں مل رہی تھی۔ موت کا یقین ہو رہا تھا۔ مگر وہ یقین نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بابر نے ٹارچ بجھا دی۔ تاریکی میں بڑے میاں کی آنکھیں بند کر دیں۔ ان کی ناک پر ہاتھ رکھا۔ سانس کی گرمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا ہاتھ چہرے پر سے سرکتا ہوا ٹھوڑی پر آیا: "وہ زندہ ہیں؟ نہیں ہیں؟ ہیں؟ نہیں ہیں؟"

اس تذبذب نے انھیں گھر کا رکھا تھا، نہ گھاٹ کا۔ نہ واپس جا سکتے تھے اور نہ ہی بڑے میاں آگے جانے کا موقع دے رہے تھے: "وہ زندہ ہیں؟ نہیں ہیں؟ ہیں؟ نہیں ہیں؟"

اس کا ہاتھ ٹھوڑی پر سے سرک کر حلق پر آ گیا۔ اس کی مٹھی بند ہو گئی۔ انگوٹھا یوں نکل آیا جیسے آہنی پھل، چاقو کے دستے سے نکل آتا ہے۔ تاریکی گہری تاریکی بھوتیاں نے پوچھا: "ٹارچ کیوں بجھا دی؟ روشن کرو۔"

اسی لمحے بابر نے انگوٹھے کو نرخرے پر رکھ کر دبا دیا۔ بڑے میاں کے ساکت جسم میں کمزور سی تڑپ پیدا ہوئی۔ یکبارگی بجلی کی کڑک دار آواز سنائی دی۔ اس کی لمحاتی روشنی میں عظمیٰ نے کچھ دیکھا۔ پھر وحشت زدہ ہو کر چیخ پڑی۔ مگر اس سے زیادہ موسم چیخ رہا تھا اور اس سے زیادہ برسات رو رہی تھی۔

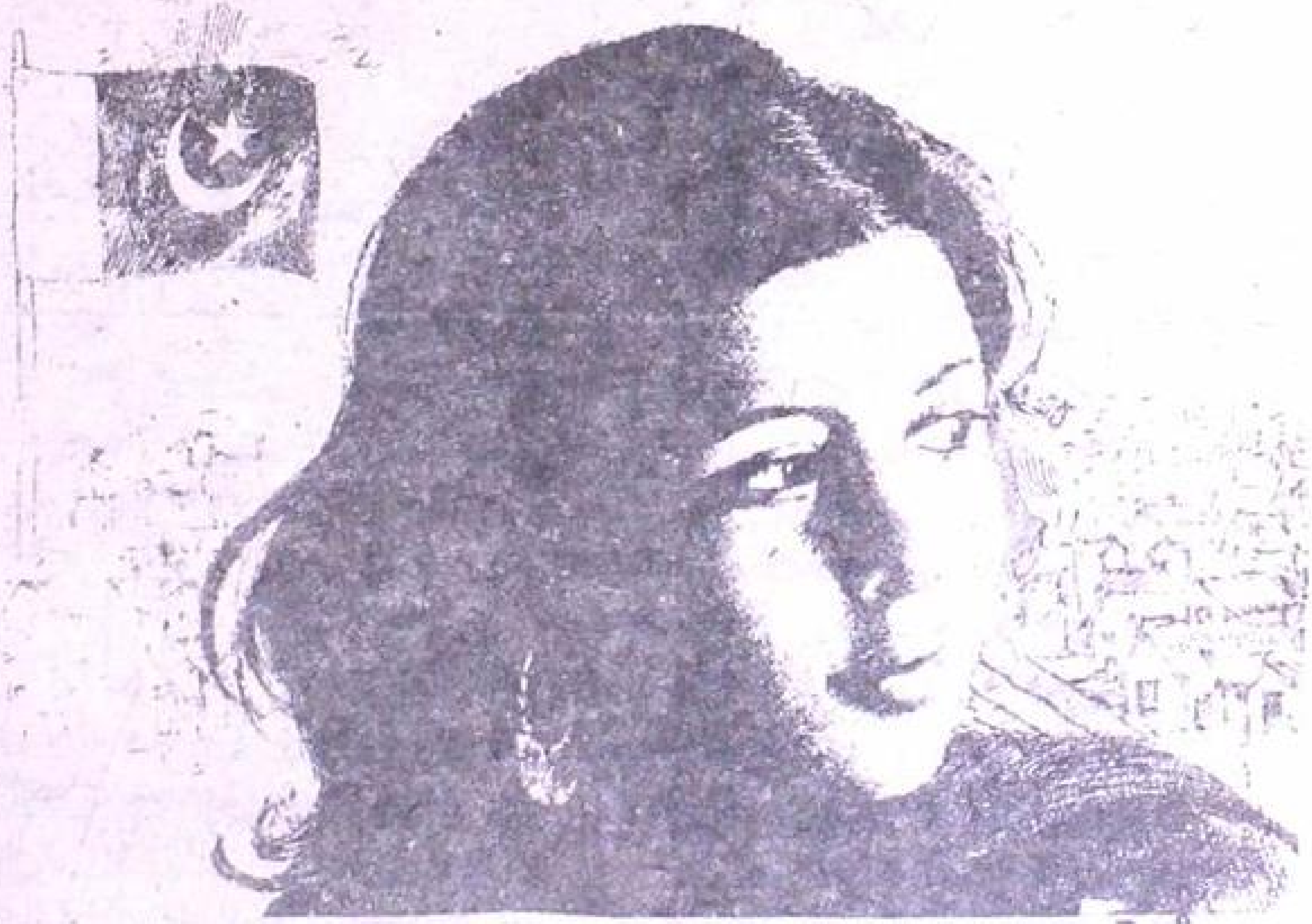

عظمیٰ پر جیسے چیخنے کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ بڑے میاں کے پاس سے اٹھ کر بھاگنا چاہتی تھی لیکن کلیم الدین بھریاں نے اسے پکڑ لیا۔ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھنے لگا۔ "کیا بات ہے؟ کیوں چیخ رہی ہو؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

وہ جیسے اپنی گڑبڑ گڑبڑ زبان بھی بھول گئی تھی۔ ہذیانی انداز میں چیختی جا رہی تھی۔ صدرالدین نے بابر سے ٹارچ لے کر اس پر روشنی ڈالی۔ اس کے آس پاس دیکھا۔ شاید اس نے کسی سانپ کو دیکھا ہو۔ کوئی جنگلی جانور نظر آ گیا ہو۔ ایسے میں وہ بول سکتی تھی یا اشاروں کی زبان میں سمجھا سکتی تھی لیکن اس نے کھلی آنکھوں کے سامنے ابھی ابھی موت کا چہرہ دیکھا تھا۔ ایسی موت جو آئی نہیں تھی۔ جبراً لائی گئی تھی۔ جنگل کی تاریکی میں بس ایک ہی منظر دکھائی دے رہا تھا۔ بڑے میاں کے نرخرے پر بابر کے انگوٹھے کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ وہ چیختے ہوئے ادھر سے ادھر سر جھٹک رہی تھی تاکہ اس منظر کی طرف سے منہ موڑ لے۔ بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ بڑے میاں کی آخری ہچکی نہ سن سکے لیکن جنگل کی گہری تاریکی میں بھی وہ منظر آنکھوں کے سامنے سے نہیں ہٹ رہا تھا۔ اس لیے وہ پریشان ہو کر۔ وحشت زدہ ہو کر جنونی انداز میں چیخے جا رہی تھی۔

ایسے وقت نفسیاتی علاج یہی ہے کہ ذہنی انتشار میں مبتلا چیخنے والے کے منہ پر زوردار طمانچہ رسید کیا جاتا ہے تو وہ یک لخت ساکت ہو جاتا ہے۔ چیخنا بھول جاتا ہے لیکن اس علاج میں سراسر سنگ دلی ہے۔ کلیم الدین بھریاں گلاب کے پھول کو محبت کی انگلیوں سے چھو سکتا تھا، طمانچہ نہیں مار سکتا تھا۔ اس نے صدرالدین سے ٹارچ لے کر بجھاتے ہوئے کہا: "تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

ٹارچ بجھ گئی تھی۔ تاریکی اور گہری ہو گئی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ عظمیٰ کی چیخوں سے صرف اتنا پتا چل رہا تھا کہ بھریاں اسے دور لے جا رہا ہے۔ دور جانے کے بعد بھی ذرا دیر تک اس کی چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر یک لخت وہ چپ ہو گئی۔

وہ سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ گہری تاریکی میں دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس کے باوجود آدمی فطرتاً متجسس ہوتا ہے۔ کوئی بات دل میں ہو اور نظر نہ آتی ہو تو اسے دیکھنے کے لیے اندھیرے کے باوجود آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

صدرالدین نے کہا: "آمی بُوجھتے پاری نا (میں سمجھ نہیں سکتا) کہ یہ اچانک چپ کیسے ہو گئی۔ یہ تو پاگل ہو رہی تھی۔"

منظور نے کہا: "یہ سمجھنے کے لیے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ فریادی چیخوں کا گلا گھونٹنے کے لیے کتنے انسانی اور غیر انسانی طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔"

بابر کے منہ سے بے اختیار نکلا: "گلا دبا دو۔ چھٹی ہو جاتی ہے۔"

صدرالدین نے کہا: "سر پر دو دھاری تلوار لٹکا دی جائے۔ یہ تلوار گھڑی کے پنڈولم کی طرح ٹک ٹک کرتے ہوئے ہلتی رہتی ہے۔ دھمکی دیتی رہتی ہے۔ ٹک۔ یہ نہ ہو۔ ٹک۔ وہ نہ ہو۔ ٹک ٹک۔ اے پاگل لڑکی۔ تو کیوں چلا رہی ہے؟"

لیکن وہ تو چپ ہو گئی تھی۔ اچانک ہی چپ ہو گئی تھی۔ جیسے حکم زبان بندی ملا ہو۔ مگر تاریکی میں ان کی خاموشی کہہ رہی تھی۔

لیجیے، یہ آپ کا حکم زبان بندی قبول
آپ اب پہرہ بٹھائیں میرے احساسات پر
بے نیازِ مصلحت بن کر جنوں ہے کامیاب
عقل بیٹھی کر رہی ہے غور امکانات پر

بابر، منظور اور صدرالدین تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر غور کر رہے تھے۔ پھر صدرالدین نے کہا: "بہت دیر ہو رہی ہے۔ اگر ہم اسی طرح وقت ضائع کرتے رہے تو صبح سے پہلے اس جنگل کو پار نہیں کر سکیں گے:"

بابر نے جھنجلا کر چیختے ہوئے کہا: "اے بھوتیاں! تم کہاں ہو؟ کیا تم نے اس کا گلا دبا دیا ہے؟"

منظور نے کہا: "صدرالدین! ذرا اپنی ٹارچ روشن کرو۔"

اس نے کہا: "میری ٹارچ بھوتیاں لے گیا ہے:"

"کتنا چالاک ہے:"

وہ پُرسکون ہو گئی تھی۔ کلیم الدین بھوتیاں ابھی تک اس کے سر کو یوں سہلا رہا تھا۔ جیسے ننھی سی بچی کو اپنی شفقت سے متاثر کر رہا ہو۔ کبھی اسے تھپک رہا تھا۔ کبھی پچکار رہا تھا۔ اس کا دھیان بٹا رہا تھا۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے بڑے میاں کی موت کا منظر نہیں تھا وہ بھوتیاں سے متاثر ہو گئی تھی۔ موت کا منظر دوبارہ تصور میں آتا، تب بھی وہ خود کو سنبھال لیتی کیونکہ بھوتیاں اسے سنبھال رہا تھا۔

پھر اس نے آہستگی سے پوچھا: "عظمیٰ! مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟ تم پاگلوں کی طرح کیوں چیخ رہی تھیں؟"

عظمیٰ نے چونک کر سر اٹھاتے ہوئے بھوتیاں کی طرف دیکھا۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن محبت سے دھڑکتا ہوا دل سمجھا رہا تھا جو کچھ اس نے دیکھا ہے، اگر وہ بیان کرے گی تو ابھی دو جوانوں میں تصادم ہو گا۔ دو میں سے کسی ایک کی لاش گرے گی اور اگر بھوتیاں کو کچھ ہو گیا تو؟

دو گھڑی ہی لمحے اس نے تڑپ کر اس کے بازو کو مضبوطی سے تھام لیا۔ پھر "نہیں نہیں" کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں بولنے لگی: "کچھ نہیں۔ مجھ سے بڑے میاں کی آخری ہچکی نہیں دیکھی گئی۔ اسی لیے میری یہ حالت ہو گئی تھی:"

وہ کسی حد تک اس کی باتیں سمجھنے لگا تھا۔ اس نے کہا: "وہ لوگ آگے بڑھنے کے لیے ضد کر رہے ہیں۔ ہمیں چلنا چاہیے۔"

پھر ٹارچ کی روشنی ہوئی۔ بڑے میاں کو پہلے کی طرح پتوں سے چھپا دیا گیا۔ اس کے بعد وہ سر جھکا کر آگے بڑھ گئے۔ آسام اور بنگال کی بارش جب شروع ہوتی ہے تو اس کے تھمنے کے آثار نظر نہیں آتے۔ محکمہ موسمیات کے ماہرین بھی اس سلسلے میں کوئی پیشگوئی نہیں کر سکتے۔ اس لیے بارش ہو رہی تھی۔ ہوائیں اسی طرح تیزی سے چل رہی تھیں۔ درختوں کے پتے شور مچا رہے تھے اور تاریک راہوں کے وہ مسافر سر جھکائے اپنی منزل کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔

عظمیٰ دھیرے دھیرے بڑبڑا رہی تھی: "آدمی کو آدمی کیوں مار ڈالتا ہے۔ بڑے میاں کو کسی بنگالی نے تو نہیں مارا۔ وہ تو ایسے قتل ہوئے جیسے باپ اپنے بیٹے کے ہاتھوں سے اور بھائی بھائی کے ہاتھوں سے قتل ہوتا ہے۔ ایک ہی خون کے رشتے دار اور ایک ہی برادری کے لوگ آپس میں مرتے مارتے رہتے ہیں۔ بڑے میاں بہاری تھے۔ بابر بہاری ہے۔ ایک بہاری نے دوسرے بہاری کا گلا دبا دیا۔ لہٰذا قتل کوئی کرے، کہیں کرے، کسی وجہ سے کرے، نفرت کی بنیاد یہ نہیں ہونی چاہیے کہ ایک بہاری نے قتل کیا۔ یا ایک بنگالی نے قتل کیا۔ قتل صرف قاتل کرتے ہیں اور قاتل کبھی ذہنی طور پر نارمل نہیں ہوتے، جو نارمل نہیں ہوتے وہ مکمل انسان نہیں ہوتے اور نامکمل انسان سے قتل کا فعل سرزد ہو جائے تو اسے قومی سطح پر نفرت کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے:"

کلیم الدین بھوتیاں اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس کی دھیمی دھیمی بڑبڑاہٹ کو سن رہا تھا۔ موسم نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے سوچا، شاید وہ بڑے میاں کے لیے دعائے مغفرت مانگ رہی ہے یا بے رحم حالات پر بے بسی سے دھیمی آواز میں تبصرہ کر رہی ہے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ جو لوگ کھل کر احتجاج نہیں کر سکتے، حرفِ شکایت زبان پر نہیں لا سکتے، وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے دل کا غبار نکالتے ہیں۔

اب وہ کسی روک ٹوک کے بغیر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ منظور کی وجہ سے کبھی کبھی رفتار سست ہو جاتی تھی۔ آگے جانے والے کہیں بھی سستانے کے لیے بیٹھ جاتے تو اتنی دیر میں منظور ان کے قریب پہنچ جاتا تھا۔ وہ جنگل ایک طویل عمر کی طرح ان کے ساتھ دور تک چلا جا رہا تھا۔ ویسے عمر کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، ایک دن اس کا اختتامی سرا آ ہی جاتا ہے۔ آخر بارش کا زور کم ہونے لگا۔ درختوں کے شور مچاتے ہوئے پتے آہستہ آہستہ اپنی آوازوں کے ساتھ گم ہونے لگے۔ جنگل گزرتا جا رہا تھا۔ رات کی تاریکی چھٹ رہی تھی۔ وہ ایک جگہ رک گئے۔ صبح کی ملگجی روشنی میں دور دور پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہاں صدرالدین نے کہا: "یہ برما کی پہاڑیاں ہیں۔ انہیں پار کرنے کے بعد ہم برما پہنچ جائیں گے:"

پہاڑیاں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ ان کی بلندی کو آسانی سے سر کیا جا سکتا تھا۔ وہ ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد وہاں پہنچے۔ پہاڑی کے دامن میں ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ پانی صرف ٹخنوں تک تھا۔ بارش خواہ کتنی ہی تیز ہو۔ وہاں پانی ٹھہرتا نہیں تھا۔ تیزی سے گزر جاتا تھا اس لیے نالہ گہرا نہیں تھا لیکن اس پہاڑی پر چڑھنا بہت دشوار تھا۔ وہ مٹی کی پہاڑی تھی۔ نہ تو اس پر گھاس اُگی ہوئی تھی۔ نہ ہی چٹانیں اور پتھر

نظر آرہے تھے۔ مٹی بھی چکنی تھی۔ پہلے بابر نے چڑھنے کی کوشش کی۔ اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے، پاؤں اس مٹی پر جماتے ہوئے دو قدم اوپر گیا۔ پھر سنبھل کر چلنے کے باوجود پھسل کر گر پڑا۔

صدرالدین کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ کلیم الدین بھوتیاں بھی مسکرانے لگا۔ بابر نے عظمیٰ کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر زمین پر سے اٹھتے ہوئے۔ اپنے کپڑوں کو صاف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا: "اے تم مجھے گھور کر کیوں دیکھتی ہو؟"

بھوتیاں نے پوچھا: "تم اپنے گرنے کا غصہ عظمیٰ پر کیوں اتار رہے ہو؟"

عظمیٰ اسے مسلسل گھور کر دیکھ رہی تھی۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولا: "دیکھو یہ اب بھی مجھے گھور رہی ہے۔ صبح ہوتے ہی میں نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس وقت بھی یہ مجھے ایسے ہی دیکھ رہی تھی۔"

کلیم الدین بھوتیاں نے عظمیٰ کے شانے کو ہولے سے ہلاتے ہوئے پوچھا: "کیا بات ہے عظمیٰ؟"

"آں؟" وہ چونک گئی۔ جیسے کہیں دور پہنچ گئی تھی۔ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ پھر اس نے انکار میں سر ہلایا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ کوئی بات نہیں ہے۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

صدرالدین نے کہا: "پہلے ایک آدمی اوپر جائے گا۔ میں بتاتا ہوں کیسے جائے گا؟ اس کے بعد دوسرے آسانی سے پہنچ جائیں گے۔" اس نے بابر سے کہا: "اپنا رام داؤ مجھے دو۔"

اس نے کہا: "تمہارے پاس ایک ہے۔ پھر مجھ سے کیوں مانگ رہے ہو؟"

"میں دونوں ہاتھوں میں رام داؤ پکڑ لوں گا۔ اوپر چڑھنے کے لیے ایک کے بعد دوسرے رام داؤ کو چکنی مٹی میں گھونپتا جاؤں گا۔ ہم اسی طرح اوپر جا سکتے ہیں۔"

بھوتیاں نے کہا: "ہم تینوں مرد ہیں۔ ہتھیار کو اس ترتیب سے مٹی میں پیوست کرتے ہوئے اوپر چڑھتے جائیں گے لیکن عظمیٰ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔"

بابر نے کہا: "بھوتیاں! تم اپنا رام داؤ صدرالدین کو دے دو اور اس کی طرح اوپر چلے جاؤ۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تمہاری محبوبہ کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

اس نے ناگواری سے اسے دیکھتے ہوئے کہا: "ہم دونوں کے پاس ہتھیار نہیں رہیں گے۔ تینوں رام داؤ صدرالدین رکھے گا اور وہی پہلے اوپر جائے گا۔ اس کے بعد منظور بھائی جائیں گے۔ منظور بھائی کے بعد عظمیٰ کو پہنچایا جائے گا۔ پھر میں جاؤں گا۔ آخر میں تم۔"

وہ جھلا کر بولا: "کیا تم مجھے احمق سمجھتے ہو۔ مجھے یہاں چھوڑ کر بھاگنے کی پلاننگ کر رہے ہو۔ ہرگز نہیں۔ سب سے پہلے میں جاؤں گا۔"

منظور نے کہا: "چلو، پہلے تم ہی جاؤ لیکن ترتیب یہ ہوگی کہ پہلے تم جاؤ گے۔ پھر میں۔ میرے بعد بھوتیاں۔ بھوتیاں کے بعد عظمیٰ کو اوپر لایا جائے گا۔ آخر میں صدرالدین اوپر آئے گا۔ بولو، منظور ہے؟"

بھوتیاں نے کہا: "مجھے منظور نہیں ہے۔ یہ دو رام داؤ لے کر پہاڑی پر چڑھے گا۔ اوپر چڑھتے ہی بھاگ جائے گا۔ برما کی سرحد پر پہنچ چکا ہے۔ آگے راستہ معلوم کرنا اس کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔"

صدرالدین نے ہنستے ہوئے کہا: "یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ برما کی سرحد پر جو پہلا گاؤں ہے، اس کا نام کماچی ہے۔ میں بابر کی اطلاع کے لیے تفصیل بتا رہا ہوں۔ اس میں بھاگنے کا حوصلہ ہے تو بھاگ جائے۔ کماچی کے بعد ہم لانچ کے ذریعے مونڈو پہنچیں گے۔ مونڈو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہاں سے ہم کسی موٹر گاڑی یا ٹرک کے ذریعے بوتھی ڈانگ پہنچیں گے۔ پھر وہاں سے بڑی لانچ کے ذریعے اکیاب جائیں گے۔ اکیاب میں پاکستانی سفارت خانہ ہے۔ یہ سب اراکان ڈویژن میں ہیں۔ میرے بغیر ان تمام مقامات سے گزرنا تقریباً ناممکن ہے۔ جگہ جگہ میرے دوست ہیں اور کئی جگہ ایسے لوگ بھی ہیں جو مجھے چہرے سے نہیں پہچانتے ہم کوڈ ورڈز کے ذریعے یا کسی نشانی کے ذریعے ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرتے ہیں اور یہ سب کچھ بابر کے پاس نہیں ہے۔ یہ لو، میں اپنا رام داؤ تمہیں دے رہا ہوں۔"

صدرالدین نے اپنا ہتھیار اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے چند لمحوں تک اس ہتھیار کو دیکھا۔ پھر اپنا رام داؤ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "نہیں، پہلے تم جاؤ۔ میں آخر میں آؤں گا۔"

کلیم الدین بھوتیاں نے بابر کی تسلی کے لیے اپنا ہتھیار صدرالدین کو دے دیا۔ پھر اس نے اٹیچی کھولی۔ اس کے اپنے کپڑوں کے علاوہ وہاں عظمیٰ کی کچھ ساڑیاں تھیں۔ ہر ساڑی ساڑھے پانچ گز کی تھی۔ اس نے ایک ساڑی کے سرے کو دوسری ساڑی کے سرے سے باندھتے ہوئے کہا: "صدرالدین! تم اس کے پہلے سرے کو اپنی کمر سے باندھ کر اوپر جاؤ۔ بلندی پر پہنچنے کے بعد وہاں مضبوطی سے پاؤں جمائے کھڑے رہنا۔ تمہارے بعد منظور بھائی اسی ساڑی کو پکڑ کر اوپر آئیں گے۔ ان کے پاؤں بری طرح زخمی ہیں۔ یہ رام داؤ کے ذریعے اوپر نہیں چڑھ سکیں گے۔ ان کے بعد عظمیٰ کو اوپر بھیجوں گا۔"

وہ اسی تدبیر پر عمل کرنے لگے۔ صدرالدین ہتھیاروں کو ہاتھوں میں لیے یکے بعد دیگرے انہیں چکنی مٹی میں پیوست کرتے ہوئے ان کے بل پر اوپر چڑھنے لگا۔ بڑی مشکل ہو رہی تھی۔ وہ مٹی میں پاؤں جما کر اوپر کی طرف اٹھنا چاہتا اور پھسل جاتا تھا۔ عظمیٰ، کلیم الدین بھوتیاں، منظور اور بابر اسے سر اٹھائے ایک ٹک دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ کسی ڈرامے کا سسپنس سے بھرپور منظر دیکھ رہے ہوں۔ وہ چڑھتے چڑھتے کبھی یکبارگی پھسلتا تھا۔ لیکن رام داؤ کو فوراً ہی مٹی میں پیوست کرتے کرتے رک جاتا تھا۔

وہ پہاڑی تقریباً چالیس یا پینتالیس فٹ اونچی ہوگی۔ اتنا کم فاصلہ اس نے بڑی مشکل سے پندرہ منٹ میں طے کیا۔ آخر بلندی پر پہنچ ہی گیا۔ اس کی کمر سے بندھی ہوئی ساڑی کا نچلا سرا بھوتیاں کی طرف تھا۔ اسے منظور نے تھام لیا۔ پھر وہ چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ابتدا میں دشواری ہوئی۔ وہ پاؤں ٹیک نہیں سکتا تھا۔ گھٹنے ٹیکنا چاہتا تو پھسل جاتا تھا۔ صدرالدین نے کہا: "منظور بھائی! اس طرح اوپر آؤ جیسے رسّی خلا میں لٹک رہی ہو۔ رسّی کو تھام کر صرف ہاتھوں کی قوت سے اوپر چڑھا جا سکتا ہے۔ ایسے وقت پاؤں کام نہیں آتے۔"

منظور اپنے ہاتھوں کی قوت سے ہی ساڑی کو تھام کر اوپر چڑھنے لگا۔ کلیم الدین بھوتیاں نے عظمیٰ کو دیکھا۔ پھر پوچھا: "کیا تم اس طرح اوپر چڑھ سکو گی؟"

وہ پریشان ہو کر منظور کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے اثبات کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے گڑبڑ زبان میں کہا: "کوشش کروں گی۔"

پھر اس کی باری آئی۔ وہ ساڑی کو تھام کر چڑھنے لگی۔ ہاتھوں کی قوت سے چڑھتے ہوئے ذرا اوپر گئی تھی۔ پھر تھک گئی۔ ہانپتے ہوئے، پریشان ہو کر نیچے کھڑے ہوئے کلیم الدین بھوتیاں کو دیکھنے لگی۔ منظور نے اوپر سے کہا: "میں اور صدرالدین ساڑی کو مضبوطی سے تھام کر رکھتے ہیں۔ بھوتیاں! تم عظمیٰ کے پیچھے آؤ اور اسے سہارا دیتے رہو۔"

اس نے ساڑی کے آخری سرے کو تھام لیا۔ اوپر چڑھنے لگا۔ جب عظمیٰ کے قریب پہنچا تو اس نے اپنے دونوں پاؤں بھوتیاں کے کاندھوں پر رکھ دیے۔ اب وہ برائے نام سہارے کے لیے ساڑی کو پکڑے ہوئے تھی ورنہ اس کے بدن کا سارا بوجھ بھوتیاں کے کاندھوں پر تھا۔ وہ ساڑی کو مضبوطی سے تھام کر اوپر کی طرف اٹھتا تو عظمیٰ اس سے پہلے اوپر پہنچ جاتی تھی۔ وہ اسی طرح ایک ایک، دو دو فٹ کے حساب سے بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ جب وہ کچھ اوپر پہنچے تو بابر نے ساڑی کے نچلے حصے کو تھام لیا۔ منظور نے کہا: "ابھی رک جاؤ۔ ہم یہاں سے عظمیٰ اور بھوتیاں کا بوجھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ تمہیں سنبھال نہیں سکیں گے۔"

بابر گھبرا رہا تھا۔ جیسے ایک مجرم ہمیشہ سزا کے خوف سے پریشان رہتا ہے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سب بلندی پر پہنچ رہے ہیں اور اسے پستی میں چھوڑ رہے ہیں اور اسی طرح چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

پھر کچھ ایسا ہی ہوا۔ جیسے ہی کلیم الدین بھوتیاں عظمیٰ کے بعد اوپر پہنچا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ساڑی کو اوپر کی طرف کھینچا۔ بابر نے فوراً ساڑی کی طرف اوپر چھلانگ لگائی لیکن اس کا آخری سرا اتنا اوپر ہو گیا تھا کہ وہاں تک پہنچ نہ سکا۔ چکنی مٹی اور کیچڑ میں پھسلتا ہوا پھر نیچے چلا گیا۔ نیچے گرتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ پھر چیخ چیخ کر، جھنجھلا کر کہنے لگا: "یہ کیا حرکت ہے۔ تم نے ساڑی کو اوپر کیوں کھینچ لیا؟"

پہاڑی کی بلندی پر منظور نے بھی حیرانی سے پوچھا: "بھوتیاں! یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"منظور بھائی اور صدرالدین! آپ دونوں خاموش رہیں اور ہماری باتیں سنتے رہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ساڑی کو ذرا اور اوپر کھینچتے ہوئے کہا: "بابر! میں تمہیں اوپر آنے دوں گا لیکن پہلے یہ بتاؤ، عظمیٰ تمہیں گھور گھور کر کیوں دیکھتی ہے؟"

وہ بوکھلا کر سر اٹھاتے ہوئے بلندی پر کھڑی ہوئی عظمیٰ کو دیکھنے لگا۔ وہ اس وقت بھی اسی کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر کہا: "نہیں، نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ پتا نہیں۔ اسے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے خواہ مخواہ دشمنوں کی طرح دیکھ رہی ہے۔"

بھوتیاں نے کہا: "جب تک یہ دشمنوں کی طرح دیکھتی رہے گی، میں دوستوں کی طرح تمہیں یہاں نہیں آنے دوں گا۔"

منظور نے حیران ہو کر پوچھا: "آخر بات کیا ہے؟ بابر! تم بتاتے کیوں نہیں ہو؟"

بھوتیاں نے کہا: "کل رات عظمیٰ جنونی انداز میں چیخیں مار رہی تھی۔ اس پر دورہ پڑا تھا۔ وہ کیوں پڑا تھا؟ اسے کیا ہو گیا تھا؟ اس بات کو یا تو یہ جانتی ہے یا پھر بابر۔"

منظور نے کہا: "عظمیٰ! تم ہی بتا دو۔"

وہ پھر بابر کو دیکھنے لگی اور سوچنے لگی: "اب دو جوان ایک دوسرے کے مقابل نہیں ہیں۔ ایک بہت بلندی پر ہے، دوسرا بہت پستی میں ہے۔ اب ان کے تصادم کا اندیشہ نہیں ہے۔ فیصلہ اسی وقت ہو جائے۔ جو مجرم ہے اس کے لیے ضرور کوئی سزا تجویز کی جانی چاہیے۔"

یہ سوچ کر اس نے اپنے ہاتھ کو فضا میں بلند کیا۔ مٹھی باندھی پھر اپنے انگوٹھے کو یوں نکالا جیسے چاقو کے دستے سے آہنی پھل نکلتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی بابر نے ایک دم سے چیخ کر کہا: "نہیں!"

یہ کہتے ہی وہ تڑپ کر پہاڑی کے اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چڑھتے چڑھتے پھسلنے لگا۔ پھسلتے پھسلتے چیخنے لگا: "نہیں، نہیں، میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ وہ تو بڑے میاں کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ وہ تو مر رہے تھے۔ وہ تو مر چکے ہیں اور جو مر چکا ہو اسے بھلا کوئی کیا مار سکتا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

وہ گھبراہٹ اور بدحواسی میں بار بار اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر کیچڑ اور چکنی مٹی میں پھسلتا ہوا نیچے چلا جاتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ بھوتیاں اس سے ضرور انتقام لے گا اور وہ سب سزا کے طور پر اسے نیچے ہی چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

اوپر کھڑے ہوئے وہ سب کچھ سمجھ رہے تھے اور کچھ نہ سمجھنے کے لیے کبھی بابر اور کبھی عظمیٰ کو دیکھ رہے تھے۔ بھوتیاں نے کہا: "بابر! یاد رکھو، اگر ہم تمہیں چھوڑ کر چلے گئے تو تم اس وقت تک یہاں نہیں آ سکو گے جب تک دھوپ تیز نہیں ہو گی اور پہاڑی خشک نہیں ہو گی۔ ویسے کالے

"بادل بتاتے ہیں کہ دھوپ نہیں نکلے گی۔ پھر بارش ہوگی۔ ہمارے برما پہنچنے کے بعد تم تنہا اراکان کے ان مقامات سے نہیں گزر سکو گے، جن کا ذکر صدرالدین کر چکا ہے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ سچ سچ بتا دو بڑے میاں کی موت طبعی تھی یا تم نے انہیں مارا ہے؟"

مغلی نے کلمے کی انگلی اس کی طرف کر دی۔ وہ چڑھتے چڑھتے یکبارگی چیخ کر پھسلتے ہوئے نیچے گرا۔ پھر لڑھکتے ہوئے نالے کے پانی میں چلا گیا۔ وہاں سے ہڑبڑا کر اٹھا۔ اسی طرح چیختے ہوئے کہنے لگا: "نہیں نہیں، میں نے اُسے نہیں مارا۔ یہ جھوٹ بولتی ہے۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم نے بڑے میاں کو قتل کیا ہے اور یہ چشم دید گواہ ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ اس پر جنونی کیفیت کیوں طاری ہوگئی تھی۔ یہ کیوں ہذیانی انداز میں چیخیں مار رہی تھی۔"

وہ تھک ہار کر کیچڑ میں بیٹھ گیا، ہاتھ اٹھا کر کہنے لگا: "خدا کے لیے مجھے اوپر آنے دو۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ ہاں، کچھ نہیں کیا ہے۔"

"اچھا، تو ہم جا رہے ہیں۔ تم وہاں نیچے بیٹھے رہو۔"

بھوتاں ساریوں کو پوری طرح اپنی طرف کھینچنے کے بعد ایک دوسرے سے بندھے ہوئے سروں کو کھولنے لگا۔ بابر نے ایک دم سے کھڑے ہو کر کہا: "نہیں، نہیں، اسے نہ کھولو۔ میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں لیکن اپنے دل سے خود کو مجرم نہیں سمجھتا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ تم سب اپنے اپنے دل میں جھانک کر دیکھو۔ کیا وہ بڑے میاں ہمارے لیے بوجھ نہیں بن گئے تھے؟ تم لوگوں نے اخلاقاً ان کا ساتھ دیا لیکن تمہارے دلوں کے اندر یہ تکلیف دہ سوال تھا کہ اتنے گھنے جنگل کو، اتنے طویل راستے کو کس طرح طے کریں گے۔ کس طرح بڑے میاں کو اٹھا کر لے جائیں گے؟"

وہ پہاڑی کی پستی میں ادھر سے اُدھر اضطراب کی حالت میں جیسے ٹہل رہا تھا اور کہہ رہا تھا: "تم سب گواہ ہو۔ سب سے پہلے میں نے بڑے میاں کو بازوؤں میں اٹھایا۔ بہت دور تک انہیں اٹھائے چلتا رہا۔ کیا میں نے ان سے ہمدردی نہیں کی؟ لیکن میں تم سے پوچھتا ہوں۔ صدرالدین تم خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہو، تم ہمارے رہنما تھے۔ کیا تمہارے دل میں یہ بات نہیں تھی کہ بڑے میاں جب مرنے والے ہیں تو جلد ہی مر جائیں؟"

صدرالدین نے سر کو جھکا لیا۔ پھر آہستگی سے کہا: "میں ایجنٹ ہوں۔ اپنی رقم کا حساب کرتا ہوں اور اپنے وقت کا خیال رکھتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں، جلد سے جلد اپنے آدمیوں کو سرحد پار کرا دوں۔ پھر واپس جاؤں۔ ایک دن آرام کروں، دوسرے دن پھر کسی پارٹی کو لے کر چل پڑوں۔ میرا پیشہ یہی ہے۔ چاٹگام میں میرے آدمی نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ ہم بیماروں کو، بوڑھوں کو، معذوروں کو اپنے ساتھ نہیں لے جاتے۔ انہیں لے جانے میں بڑا نقصان ہے۔ ہم تیزی سے سفر کرتے ہیں اور ایسے میں کوئی رستے میں مصیبت بن جائے تو یہی سوچتے ہیں کہ اسے چھوڑ دیا جائے یا کسی طرح واپس بھیج دیا جائے۔ میں تسلیم کرتا ہوں" بڑے میاں میرے

"کتاب والا" آفاقی تحفے پیش کر کے انسانی زندگی کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ اللہ کے حکم سے روشناس کرا رہا ہے:

۱۔ کلام پاک کا بامحاورہ اردو ترجمہ "روشن چراغ" عربی نہ جاننے والے اردو داں حضرات کے لئے قدرتی تحفہ ہے مکمل تیس پارے۔ اس میں عربی متن نہیں ہے۔ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی "روشن چراغ" کے ذریعہ کلام پاک کو سمجھ کر زندگی سنوار سکتا ہے۔ ہدیہ بتیس روپے

۲۔ مکمل قرآن پاک۔ جس کا طول ایک انچ عرض پون انچ، موٹائی نصف انچ تیس پارے، حروف روشن، مکمل مجلد، بمعہ ڈبیہ، وزن صرف دس گرام، ہدیہ صرف دس روپیہ۔

۳۔ الگ الگ کلام پاک کے تیس پارے جلی حروف، عکسی طباعت، خوبصورت جلد چوڑائی ساڑھے سات انچ، لمبائی دس انچ، ہدیہ مکمل سیٹ ساٹھ روپے۔

۴۔ جلی حروف میں کلام پاک۔ سفید کاغذ، عمدہ کتابت، عکسی طباعت بہترین جلد، سائز ساڑھے سات انچ چوڑا دس انچ لمبا۔ اور ہدیہ صرف پینتیس روپیہ

بے مصیبت بن گئے تھے:

نیچے سے بابر نے ہاتھ اٹھا کر کہا: "سن لیا؟ تم لوگوں نے سن لیا؟ اب میں منظور بھائی سے پوچھتا ہوں، وہ بھی خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ سچ بتائیں۔ جب ہم نے سفر شروع کیا، اس وقت بڑے میاں جھونپڑی میں بیمار ہو گئے تھے۔ ان کا بخار دیکھ کر، انہیں اسپرو کی دو ٹکیہ کھلاتے وقت کیا آپ کے دل میں یہ بات نہیں تھی کہ بڑے میاں کو ہمارے ساتھ نہیں چلنا چاہیے۔ انہیں کسی طرح چاٹگام واپس چلا جانا چاہیے یا پھر اسی جھونپڑی میں انہیں چھوڑ دینا چاہیے؟"

منظور نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "ہاں، میرے دل میں یہ بات تھی لیکن اگر وہ مصیبت بن بھی گئے تھے، تو میں خود مر جاتا، انہیں مارنے کے متعلق کبھی نہ سوچتا:

بابر نے انکار میں ہاتھ ہلا کر کہا: "نہیں نہیں، میں مارنے، قتل کرنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ صرف اس بات کا اعتراف کرو کہ وہ بوجھ بن گئے تھے:

اس نے بھوئیاں کی طرف انگلی اٹھا کر کہا: "اب تم بتاؤ، کیا ہماری تمہاری زندگی میں ایسا وقت نہیں آیا، جب ہم نے دل سے دعا مانگی ہے کہ ہماری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں عزت سے مر جائیں۔ دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھیں یا ہمیں اتنا موقع ملے کہ ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کا گلا گھونٹ ڈالیں۔ کیا مجسٹریٹ سلیم الدین بھوئیاں کے مکان پر مکتی باہنی والوں نے حملہ کیا تھا تو تمہارے باپ نے یا تم نے اپنی بہنوں کے متعلق ایسا نہیں سوچا ہوگا اور اگر تمہیں موقع مل جاتا تو کیا تم اپنی بہنوں کو عزت کی موت اپنے ہی ہاتھوں سے نہ مار ڈالتے؟"

بھوئیاں نے تائید میں سر ہلا کر کہا: "کبھی کبھی وقت ہمیں اس طرح بھی مجبور کر دیتا ہے:

"اب بتاؤ، اگر جنگل میں کوئی درندہ نکل آتا۔ بارش تھم جاتی۔ کوئی شیر یا جنگلی ہاتھی ہمارے پیچھے چلا آتا اور تم عظمیٰ کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے بھاگتے تو بھاگتے وقت عظمیٰ کو سنبھالتے یا بڑے میاں کو؟ تمہارے لیے کون بوجھ ہوتا، عظمیٰ یا وہ بڈھے میاں؟ دیکھو یہی وقت ہم پر آن پڑا ہے۔ میرا احسان مانو کہ میری وجہ سے تم لوگ صبح ہونے سے پہلے یہاں پہنچ گئے۔ ہم سب نے آسانی سے جنگل پار کر لیا۔ اگر وہ جاں کنی کی حالت میں رہتے اور ہم ان کے دم توڑنے کا انتظار کرتے رہتے تو اب تک اسی جنگل میں پھنسے رہتے:

اس نے عظمیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "مجھے دشمن کی نظر سے دیکھو مگر یہ تو سوچو کہ میں نے کیا برا کیا۔ وہ مر رہے تھے وہ کسی صورت سے بچ نہیں سکتے تھے۔ صرف اپنے بیٹوں اور پوتے پوتیوں کے لیے ان کی جان اٹکی ہوئی تھی۔ سچ پوچھو تو ہم سے پہلے ان کے بیٹوں نے انہیں مار ڈالا تھا۔ انہیں پھٹا پرانا جوتا سمجھ کر اپنے پاؤں سے اتار کر یہاں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ جو انسانوں کی بھری آبادی میں چھوڑ کر انہیں چلے گئے، اگر وہ جنگل میں ان کے ہم سفر ہوتے تو کیا اپنے باپ کا، یا اپنے دادا کا ساتھ دیتے یا اسی طرح انہیں جنگل میں چھوڑ کر چلے جاتے؟ میں دعوے سے کہتا ہوں، خون کا رشتہ بھی انہیں بوجھ سمجھتا۔ کسی طرح اپنے کاندھے سے اتار پھینکنے کی کوشش کرتا۔ میں نے تم سب کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا:

اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا: "ہاں میں قاتل ہوں۔ میں مجرم ہوں۔ مجھے کیا سزا دوگے؟ کیا یہاں چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ یا میں اوپر آؤں گا تو جواباً مجھے قتل کر دوگے؟ تم انسانی آبادی میں پہنچ کر قانون کے سامنے کیا جواب دوگے کہ میں قاتل تھا؟ کس کا قاتل تھا؟ اس سے پہلے میں نے بنگالیوں کو قتل کیا۔ کسی نے مجھے سزا نہیں دی۔ کوئی قانون میرے خلاف نہیں تھا۔ جب بنگلہ دیش بن گیا اور میں نے وہاں سے بھاگنے کے دوران جنگل میں اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ایک دم توڑتے ہوئے بہاری بوڑھے کو ہلاک کر دیا تو میں قاتل بن گیا۔ یہ ہم سب کس دنیا میں، کس ملک میں، کس سماج میں رہتے ہیں؟ اگر بنگلہ دیش میں مجھ پر مقدمہ چلے تو میں بنگالیوں کا قاتل، بنگال سے باہر میں ایک فاتح، جس نے بنگالیوں کے کشتوں کے پشتے لگا کر سرحد کو پار کیا لیکن بنگلہ دیش میں رہوں تو مجھے ایک دم توڑتے ہوئے بوڑھے بہاری کے قتل پر گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ اب یہ سرحد پار کرنے کے بعد تم لوگ مجھے اپنے شکنجے میں کس رہے ہو۔ چلو مار ڈالو۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں ایسی دنیا میں کیا رہوں گا، جہاں ملکوں کی سرحد کے اس پار قاتل کو پھولوں کے ہار پہنائے جاتے ہیں، اس پار پھانسی کا پھندا لگایا جاتا ہے:

عظمیٰ، کلیم الدین بھوئیاں، منظور اور صدر الدین گم صم کھڑے ہوئے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بستی میں کھڑا ہوا سحر پھونک رہا ہو اور وہ پتھر کے بن گئے ہوں۔ جیسے وہ سب چپ چاپ کھڑے اپنے اپنے ضمیر کے آئینے میں جھانک رہے ہوں۔ انسانی نفسیات میں ڈوب کر دیکھا جائے تو ایسی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے جنہیں انسان شعوری طور پر ماننے سے انکار کرتا ہے۔ مثلاً وہ یہ تسلیم نہیں کر رہے تھے کہ بڑے میاں بوجھ بن گئے تھے اور حقیقت یہ تھی کہ وہ بوجھ تھے، بیمار تھے، واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔ چلنے کی سکت نہیں تھی اور آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ جب موت نے انہیں آ کر دبوچا تو وہ مرنے سے انکار کر رہے تھے۔ پہلی بار ان پر درخت کے پتے ڈال دیے گئے تھے۔ ان کی موت کا یقین ہو گیا تھا لیکن وہ پھر موت سے جھگڑا کر کے لوٹ آئے تھے۔ بضد تھے کہ ساتھ جائیں گے۔ لیکن وہ کسی طرح بھی ساتھ چلنے کے قابل نہیں تھے۔ ایسی صورت میں حقیقت کیا تھی؟ صرف ایک، اور وہ یہ کہ وہ بوجھ تھے۔ اخلاقی طور پر کوئی اسے زبان سے تسلیم نہیں کر سکتا تھا لیکن سبھی کے لاشعور میں یہ بات تھی کہ بڑے میاں زندہ یا مردہ کسی طرح بھی ٹل جائیں۔

کلیم الدین بھوتیاں نے اپنے آس پاس کھڑے ہوئے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی۔ پھر غلطی کی ساری کے آخری سرے کو ڈھیل دیتے ہوئے بلندی سے پستی کی طرف چھوڑنے لگا۔

✱

نیپال میں پاکستانی سفارت خانے کے سامنے بہاریوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ان میں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سبھی تھے۔ خسرو اور زین تارا دفتر کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ایک بوڑھا کلرک بیٹھا تھا۔ زین تارا کے دو بھائی جو مغربی پاکستان میں تھے۔ ان کے نام اور مکمل پتے لکھ رہا تھا۔ خسرو نے پوچھا: "جناب! یہ بے شمار بہاری جو باہر کھڑے ہوئے ہیں۔ جن کا کوئی رشتے دار پاکستان میں نہیں ہے۔ وہ یہاں سے کیسے جائیں گے؟"

بوڑھے کلرک نے عینک کے پیچھے سے گھورتے ہوئے کہا: "تمہاری بیوی کے دونوں بھائی پاکستان میں ہیں۔ وہ وہاں سے کلیرنس بھیج دیں گے، پھر ہم تمہیں یہاں سے روانہ کر دیں گے۔ تم یہاں سے چلے جاؤ گے۔ دوسروں کا درد اپنے جگر میں نہ رکھو۔"

"کیسے نہ رکھیں۔ ہم نے اپنوں کو، دوسروں کو ایک ساتھ کٹتے مرتے اور موت سے لڑتے دیکھا ہے۔ آپ اس کرسی پہ بیٹھ کر نہیں سمجھ سکتے کہ یہ بے شمار لوگ پاکستان پہنچنے کے لیے سیکڑوں ہزاروں میل کے دشوار گزار راستوں سے کس طرح یہاں پہنچے ہیں۔ البتہ ایک مسلمان اور ایک پاکستانی کی حیثیت سے سمجھ سکتے ہیں۔ ہم یہاں جس عورت کے ساتھ ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ وہ بے چاری کئی ماہ سے پریشان ہے۔ وہ کہتی ہے، جب پاکستان کا مطلب کیا۔ لاالٰہ الا اللہ کہا جاتا ہے تو پھر اس سے پاکستانی ہونے کی شناخت کیوں پوچھی جاتی ہے؟"

سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ جب کلمہ پاکستان کی بنیاد بن جائے تو پھر تمام کلمہ گو مہاجر مشرقی پاکستانیوں کو پاکستان آنے سے کیسے روکا جا سکتا ہے؟

وہ سفارت خانے کے دفتر سے باہر آ گئے۔ جو لوگ دفتر سے نکل کر باہر پہنچے تھے، مایوس بہاریوں کا ہجوم انہیں گھیر لیتا تھا۔ لوگ طرح طرح کے سوالات کرتے تھے۔ "کیا ہوا؟ کیا کام بن گیا؟ کیا تمہارے رشتے دار پاکستان میں ہیں۔ تمہیں کلیرنس کس طرح [illegible] ہے؟"

سفارت خانے کے سامنے ایک اونچی سی جگہ پر کچھ لوگ کھڑے ہوئے باری باری تقریریں کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے: "کیا ہم نے پاکستان اسی دن کے لیے بنایا تھا۔ ہمارے باپ دادا نے اور ہم نے اسی لیے اپنی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتوں کو داؤ پر لگایا تھا، اپنے وطن کی سرزمین کو خون [illegible] کیا۔ پہلے ہندوستان سے پاکستان تک پہنچنے کے لیے اور اب [illegible] دیس سے پاکستان پہنچنے کے لیے ہم چوبیس برسوں سے پل صراط پر چلتے آ رہے ہیں۔"

ایک پُرجوش نوجوان نے سفارت خانے کی طرف ہاتھ.... اُٹھا کر پوچھا: "ہمیں پاکستان جانے سے کیوں روکا جا رہا ہے؟ کیوں ہمیں اپنے جائز حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے؟"

اس کے ساتھ تمام مجمع سفارت خانے کی طرف ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر چیخنے لگا: "ہمیں کیوں روکا جا رہا ہے؟ ہم سے پاکستانی ہونے کا ثبوت اس طرح نہ مانگو کہ ہمیں اپنی حب الوطنی پر شرم آنے لگے۔ یہ کون سا طریقہ ہے۔ کیا ہزاروں بہاریوں کے رشتے دار پاکستان میں ہو سکتے ہیں۔ جو ہمارے لیے کلیرنس سرٹیفکیٹ روانہ کریں گے۔ ہمارا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء میں بہار، مغربی بنگال، اڑیسہ، مدراس اور سی پی وغیرہ کے تمام مسلمان مشرقی پاکستان گئے تھے، کیونکہ جغرافیائی لحاظ سے مشرقی پاکستان قریب تھا۔ قائداعظم نے یا کسی بھی بڑے لیڈر نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہمیں مشرقی پاکستان نہیں جانا چاہیے، بلکہ مغربی پاکستان جانا چاہیے کیونکہ مغربی پاکستان دائمی ہے اور مشرقی پاکستان عارضی۔"

تعلیم و تربیت

طارق سلطان خان
حیدرآباد

- کتاب لکھنی ہو تو مصنف ایک منصوبہ بناتا ہے یہ بات منصوبے کے سب سے آخر میں دریافت ہوتی ہے کہ کتاب کہاں سے شروع کی جائے۔

پاسکل

- جو لوگ مطالعہ نہیں کرتے، ان کے پاس سوچنے کے لیے بہت کم باتیں ہوتی ہیں اور بولنے کے لیے بالکل نہیں۔

فرانسس بیکن

- علم کے ساتھ صحیح ذوق بھی ضروری ہے۔ علم کتنا ہی وسیع ہو، صحیح ذوق نہ ہو تو علم بے نتیجہ اور بے ثمر ہے۔

بابائے اردو

- خیالات کی جنگ میں کتابیں ہتھیار کا کام دیتی ہیں

ابوریحان البیرونی

- تعلیم ایک صلاحیت کا نام ہے اس کی بدولت تم اپنے آپے سے نکلے بغیر اور خود اعتمادی کھوئے بغیر مخاطب کی ہر بات سن سکتے ہو۔

رابرٹ فراسٹ

- پڑھا لکھا احمق، جاہل احمق سے بڑا احمق ہوتا ہے

مولیئر

- فطرت یہ نہیں چاہتی کہ ہم مکمل بن جائیں، صرف یہ چاہتی ہے کہ ہماری نشوونما ہوتی رہے۔

جوشوا لوتھ لائبمن

سفارت خانے کے سامنے روزانہ چھوٹی چھوٹی ٹولیاں اپنی تقریریں کرتی تھیں لیکن اس روز بہت بڑا مجمع لگ گیا تھا۔ اچانک ہی چاروں طرف سے نیپال کی پولیس نے انہیں گھیر لیا پھر آفیسر نے آ کر وارننگ دی: "یہاں سیاسی تقریریں نہیں ہوں گی، نہ ہی کسی جلسے جلوس کی اجازت ہے۔ آئندہ مجمع لگایا گیا اور تقریریں کی گئیں تو تم سب کو یہاں سے نکال دیا جائے گا۔"

نیپال سرکار کی ایک ہی دھمکی سے مجمع چھٹنے لگا۔ وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ وہاں سے نکالے جاتے تو کہاں جاتے۔ چاروں طرف جیسے سمندر تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر نہیں جا سکتے تھے۔ آگے جانے کے لیے راستہ روک دیا گیا تھا۔

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبرد عشق میں زخمی
نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے، نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے

شام کے وقت خسرو اور مین تارا اس کرائے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نیپال میں ان کا دوسرا دن تھا۔ کہیں باہر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ نیا شہر دیکھنے کی تمنا بھی نہیں تھی۔ بس یہی اضطراب تھا کہ پاکستان سے کسی طرح جلدی کلیرنس آ جائے۔

شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ کمرے کی نیم تاریکی میں مین تارا کا حسن چاندنی کی طرح تھا۔ چاند کو دور سے ہی دیکھا جاتا ہے۔ ہاتھ لگایا نہیں جا سکتا۔ اس کمرے میں دوسرے کرائے دار بھی تھے۔ ان کے بچے بھی تھے۔ اس کے باوجود چاند سے گفتگو کی جا سکتی تھی۔ اتنا بھرپور اعتماد تھا کہ اس کی چاندنی صرف ہمارے لیے ہے لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ پاکستان کی زمین اپنے لیے ہے۔ یہ کتنے دکھ کی بات تھی کہ وہ چاند کو چھو سکتا تھا مگر اپنے وطن کی مٹی کو نہیں چھو سکتا تھا۔

باہر سے دستک سنائی دی۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہاں پانچ چھ نوجوان کھڑے ہوئے تھے۔ وہ سب بنگلہ دیشی مہاجر تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا: "ہم ایسے لوگوں کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں، جن کو یہ امید ہو کہ ان کا کلیرنس پاکستان سے ضرور آئے گا۔ کیا آپ کو بھی یقین ہے؟"

"جی ہاں۔ میری بیوی کے سگے بھائی وہاں رہتے ہیں۔"

"تو پھر آپ ہمارے ساتھ آئیں۔ ابھی ایک اہم میٹنگ ہو رہی ہے۔ آپ کی موجودگی وہاں ضروری ہے۔"

اس نے مین تارا سے کہا: "میں ابھی آتا ہوں۔ تم دروازہ اندر سے بند کر لو۔"

اس نے دروازے کو بند کیا۔ وہ ان نوجوانوں کے ساتھ جانے لگا۔ راستے میں وہ جگہ جگہ رکتے تھے اور ایسے لوگوں کو ساتھ لیتے تھے جو جلد یا بدیر کلیرنس حاصل کر کے وہاں سے جانے والے تھے۔ آخر وہ سب باغ بازار کے ایک مکان میں پہنچے۔ اس مکان کے ایک بڑے کمرے میں بہت سے لوگ فرش پر بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک عمر رسیدہ شخص نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا: "میرے بزرگو! میرے بھائیو! میں آپ سب کی توجہ چاہتا ہوں۔ میں اونچی آواز میں تقریر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہاں ہم پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں۔ ہم نے اپنے طور پر خود کو پاکستانی ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کر لی، لیکن ہمارے زبانی ثبوت حکومتِ پاکستان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں۔ ایک مسلمان سے پوچھا جائے کہ وہ مسلمان ہے یا نہیں؟ اس کے ثبوت میں وہ صرف کلمہ ہی پڑھ سکتا ہے۔ ہمارے ہاں مسلمان ہونے کا کوئی کاغذی سرٹیفکیٹ جاری نہیں کیا جاتا۔ پاکستانیوں کی بھی صحیح شناخت کے لیے آج تک سرکار کی طرف سے کوئی قانون نہیں بنایا گیا۔ نہ ہم نے اور نہ حکومتِ پاکستان نے عوام کے لیے شناختی کارڈ کو ضروری سمجھا۔ بہرحال یہ ایک لمبی بحث ہے۔ فی الحال آپ لوگوں کو یہاں یکجا ہونے کی زحمت اس لیے دی ہے کہ ہم صرف ایک دوسرے کے تعاون سے پاکستان پہنچ سکتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں ایک تدبیر ہے۔"

سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا: "اس تدبیر پر آپ لوگوں کے تعاون سے عمل کیا جا سکتا ہے۔ جو حضرات کلیرنس حاصل کر کے پاکستان جا رہے ہیں، وہ بھائی چارے اور انسانی ہمدردی سے کام لے کر اپنے مختلف رشتے داروں کے ذریعے ہمارے نام کلیرنس بھیج سکتے ہیں۔ آپ وہاں پہنچ کر ہمارے پنجابی بھائیوں، سندھی بھائیوں، پٹھان بھائیوں اور بلوچ بھائیوں سے ہاتھ جوڑ کر التجا کر سکتے ہیں کہ اسلام اور پاکستان کے ناتے ہم آپس میں رشتے دار ہیں۔ وہ رشتے دار کی حیثیت سے ہمارے نام کلیرنس بھیج سکتے ہیں، ہمیں وہاں بلانے کے لیے آپ وسیع پیمانے پر تحریک چلا سکتے ہیں۔"

ایک شخص نے پوچھا: "تحریک کون چلائے گا؟ ہم میں سے کوئی لاہور، کوئی پنڈی، کوئی ملتان اور کوئی کراچی جا رہا ہے۔ نہ ہم ایک صوبے میں ہوں گے، نہ متحدہ تحریک چل سکے گی۔"

"آپ جس شہر میں پہنچیں، وہاں کی سماجی اور دیگر فلاح و بہبود کی تنظیموں کو اس مقصد کے لیے آمادہ کریں۔"

"کیا خوب۔ معلوم ہوتا ہے، پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے بھائیوں کو ہماری خانماں بربادی اور کسمپرسی کی کوئی خبر نہیں ہے۔ کیا وہ خوابِ غفلت میں ہیں کہ ہم انہیں جھنجھوڑیں گے؟"

ایک نے کہا: "کون جانتا ہے کہ ہمارے پاکستانی بھائی خاموش کیوں ہیں؟ ہو سکتا ہے، وہ اپنے دلوں میں ہمارا درد رکھتے ہوں، مگر انہیں ہماری دوا کرنے کا راستہ نہ مل رہا ہو۔ یہ تو پرانی کہاوت ہے کہ جب تک بچہ نہیں روتا، ماں بھی دودھ نہیں پلاتی۔ آپ وہاں جا کر دکھڑا روئیں گے تو وہ ضرور ہمارے لیے کلیرنس بھیجیں گے۔"

رات کے نو بجے تک وہ خفیہ اجلاس جاری رہا۔ آپس میں بڑی دیر تک بحث کرتے رہے۔ آخر یہ طے پایا کہ یہاں سے کلیرنس حاصل کر کے جانے والے پاکستان کی سماجی تنظیموں، صحافیوں اور قلمکاروں کے ذریعے تحریک

چلائیں گے۔ اپنے رشتے داروں اور دوسرے پاکستانی بھائیوں کے ذریعے کلیرنس بھیجتے رہیں گے۔

اجلاس کے اختتام پر لوگ دو دو، چار چار کی ٹولیوں میں اس مکان سے نکل کر جانے لگے۔ خسرو کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا شخص چل رہا تھا۔ اس نے کہا "یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ کون کرتا ہے؟ کون تحریک چلائے گا؟ پاکستان پہنچتے ہی ہم سب کو روزگار اور دال روٹی کی فکر ہوگی۔ بچوں کی تعلیم اور رہائش کا مسئلہ ہوگا۔ نئی جگہ نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے میں کون تحریک چلائے گا؟"

خسرو کو اس کی بات بری لگی۔ سچائی اکثر بری لگتی ہے۔ سچ یہی ہے کہ آدمی پہلے اپنا گھر دیکھتا ہے۔ اس کا ایک رومال بچوں کی رال اور بیوی کے آنسو پونچھنے اور اپنی عمر کی گرد جھاڑتے جھاڑتے پھٹ جاتا ہے۔ دوسروں کے آنسو پونچھنے کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا۔

دو ہفتے بعد نین تارا کے ایک بھائی نے ان کے نام کلیرنس بھیج دیا۔ اس کے ساتھ ہی حکومتِ پاکستان کے اخراجات پر انہیں وہاں سے پاکستان روانہ کر دیا گیا۔ رائل نیپال ایئرلائن کے طیارے صرف بھارت یا تھائی لینڈ تک پرواز کرتے ہیں۔ پاکستان جانے والوں کو نیپال سے بنکاک بھیجا جاتا تھا۔ پھر وہاں سے دوسرے طیاروں کے ذریعے پاکستان پہنچایا جاتا تھا۔ نین تارا اور خسرو بھی پہلے بنکاک گئے پھر کراچی پہنچ گئے۔

پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی انہیں خلافِ توقع اجنبیت کا احساس ہوا۔ یہاں کے لوگوں کی خوش لباسی، ان کے ہنستے بولتے چہرے اور چہروں کی تازگی دیکھ کر سابقہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کی غربت اور بدحالی آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ وہاں جو لوگ خوشحال تھے، اُن کے چہروں پہ بھی ایسی تازگی نہیں تھی۔ دراصل وہاں چہروں پہ رونق ہوتی ہے جہاں خوشگوار مستقبل کی ضمانت ہو۔ چوبیس برس کے بعد مشرقی پاکستان سے جب وطن پھر ایک بار مستقبل کی ضمانت کے لیے آئے تھے۔ اس لیے ابھی ان کے چہروں پہ رونق نہیں تھی۔

ایئرپورٹ کی عمارت میں بڑی بھیڑ تھی۔ نین تارا کو دُوری سے بھائی جان نظر آئے۔ وہ اسے تلاش کرتے آ رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بڑی دیر سے آنسو پھوٹ پڑنا چاہتے تھے۔ وہ بھائی سے ملتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتی تھی۔ طویل انتظار کے بعد اپنا بھائی اس کے آنسو پونچھنے والا تھا۔ لیکن بھائی اسے دیکھ کر ذرا ٹھٹک سا گیا۔ نین تارا اور خسرو کو یوں دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ منہ پہ آنچل رکھ کر رونے لگی۔ بھائی نے جلدی سے قریب آ کر کہا "ارے ارے! یہ کیا کر رہی ہو؟ یہ کوئی رونے کی جگہ ہے؟ میری پوزیشن کا خیال کرو۔ آنے جانے والے ہمیں تماشا سمجھ کر دیکھ رہے ہیں۔"

وہ سسکتے ہوئے ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "بھائی جان! ہماری

وہ ہولے سے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے بولا۔ "ہاں، ہاں۔ تم نے تو خط میں لکھا تھا۔ پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ کی مرضی یہی تھی۔ ہم ناچیز بندے کیا کر سکتے ہیں۔ اوہ گاڈ! آنسو تو پونچھ لو۔ کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

وہ روتے روتے حیرانی سے بھائی کو دیکھنے لگی۔ سوچنے لگی۔ لوگ دیکھ رہے ہیں تو کیا ہوا؟ کیا لوگوں کے گھر والے نہیں مرتے؟ جس ماں نے ہمیں جنم دیا اور دُودھ پلایا۔ جس باپ نے محنت کی چھاؤں میں ہمیں شفقت سے پالا۔ وہ دونوں دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہی دن بے موت مر گئے۔ کیا دنیا والوں کے سامنے ان کے لیے آنسو بہانا شرم کی یا جھینپنے کی بات ہے؟

وہ پہلی ملاقات میں بھائی جان سے شکایت آمیز گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے سوچتی رہ گئی۔ بھائی نے خسرو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہی خسرو ہیں؟"

"جی ہاں۔ میں ہی خسرو ہوں۔" اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ طارق بھائی ہیں یا حامد بھائی؟"

"میں طارق ہوں۔" اس نے مصافحہ کیا۔ پھر فوراً ہی ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا "سامان اٹھاؤ اور میرے پیچھے آؤ۔"

یہ کہتے ہی وہ پلٹ کر جانے لگا۔ ان کے پاس سامان ہی کیا تھا، صرف ایک اٹیچی تھی۔ اسے خسرو اٹھا کر نین تارا کے ساتھ چلنے لگا۔ طارق کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی بہت بڑا آفیسر ہو، اپنے ماتحتوں کو پیچھے آنے کا حکم دے کر آگے جا رہا ہو۔ اس نے بہت ہی قیمتی سُوٹ پہن رکھا تھا۔ ایئرپورٹ کی عمارت کے باہر اس کی بہت ہی قیمتی سفید رنگ کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ اُن کے لیے کھول دیا۔ پھر اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ عجیب شاہانہ انداز تھا۔ چہرے پہ سنجیدگی۔۔ رعب اور دبدبہ طاری کیے ہوئے تھے۔ کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔

وہ خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ نین تارا انتظار کر رہی تھی کہ وہ امی اور ابو کے آخری ایام کے متعلق بڑے دُکھ سے پوچھے گا۔ بنگلہ دیش سے پاکستان تک وہ بڑی دشواریوں کا سامنا کرتے آئے تھے۔ اس پر بھائی ان کے حوصلوں کی داد دے گا لیکن وہ چُپ تھا۔ پچھلی سیٹ کی طرف پلٹ کر انہیں دیکھنا بھول گیا تھا جیسے بڑے لوگ گاڑی کے پچھلے حصے میں غیر ضروری سامان رکھ کر بھول جاتے ہیں۔

نین تارا کو اپنی توہین کا احساس ستانے لگا۔ ٹھیک ہے وہ مرے ہوؤں کو نہ پوچھے، لیکن زندوں کو تو نظرانداز نہ کرے۔ بہن کے ناتے خسرو اُس کا بہنوئی تھا۔ پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے تو اخلاقاً بولنا چاہیے تھا۔ لیکن اُدھر سے توہین کے احساس کو بھڑکانے والی خاموشی تھی۔ پاپوش نگر کے قبرستان کے قریب کار ایک گلی میں رُک گئی۔

وہ کار سے اتر گئے۔ طارق نے ایک مکان کا تالا کھولتے ہوئے کہا۔ "اندر

چلو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ کار کو لاک کرنے گیا۔ یہ دونوں اندر آ گئے۔ وہ ایک پختہ مکان تھا۔ دو کمرے، باورچی خانہ اور باتھ روم کے علاوہ سامنے چھوٹا سا برآمدہ اور پیچھے ایک چھوٹا سا آنگن تھا کمروں میں رہائشی ضروریات کا مختصر سا سامان تھا۔ خسرو نے کہا "تارا! یہ تو خالی مکان ہے۔ تمہاری بھابی اور بچے نہیں ہیں؟"

یہ بات وہ بھائی سے پوچھنا چاہتی تھی" طارق نے اندر آتے ہی کہا "یہ تم لوگوں نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ بنگلہ دیش سے آنے والے مہاجر اپنے لباس اور گفتگو سے صاف پہچانے جاتے ہیں"

خسرو نے کہا "بھائی جان! ہر صوبے کے لوگ اپنے لباس اور حلیے سے پہچانے جاتے ہیں۔ اگر ہم پہچان لیے جائیں تو آپ کے لیے پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"ہاں۔ وہ بات یہ ہے کہ بنگلہ دیش سے آنے والوں کو یہاں والے کچھ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے ہیں۔ میرا مطلب ہے انہیں بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ انہیں دیکھ کر اپنی شکست یاد آتی ہے۔ ندامت سی ہوتی ہے۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ دوسری جنگِ عظیم میں جاپان شکست کھانے کے بعد کیا دنیا والوں سے منہ چھپا رہا ہے؟ نہیں۔ وہ تو شکست کے تلخ تجربات سے بہت کچھ حاصل کر کے دنیا کا ایک بہت بڑا صنعتی ملک بن گیا ہے۔ کیا لوگ ٹھوکریں نہیں کھاتے؟ کیا شہسوار میدانِ جنگ میں گر کر نہیں سنبھلتے؟ اگر سنبھلتے ہیں تو ندامت کیسی؟"

"بات صرف ندامت کی نہیں بلکہ اس زمین پر نئے مہاجروں کے لیے گنجائش نکالنے کی بھی بات ہے۔ یوں سمجھو پاکستان ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ اس گھر میں چار افراد رہتے ہیں۔ نپا تُلا پکاتے کھاتے اور نپا تُلا پہنتے ہیں۔ کوئی نیا فرد آئے گا تو موجود کھانے اور کپڑے میں حصے دار بنے گا۔ اس چھوٹے سے گھر میں اپنے لیے بھی ایک کمرہ طلب کرے گا۔ اور زمین اپنی زمین کسی کو دیتا ہے؟ جب سے یہ دنیا آباد ہوئی ہے روٹی، کپڑا اور مکان میں حصے داری کے مسئلے پر ہی فسادات ہوتے آئے ہیں۔"

نین تارا اور خسرو اسے یوں دیکھ رہے تھے، جیسے وہ اپنے وطن میں نہ ہوں، جیسے ان کے سامنے بھائی نہ ہو، اور وہ کسی مالک مکان کے گھر میں جبراً گھس آئے ہوں۔ نین تارا نے کہا "آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں جیسے آپ ہماری نہیں ہیں۔ آپ تو ہم سے صرف دو برس پہلے کراچی آئے ہیں۔"

"میں یہاں کسی کو نہیں بتاتا ہوں کہ میں بہاری ہوں۔ خود کو بہاری کہلاؤں گا تو نیا مہاجر کہلاؤں گا۔ میں یہاں دہلی والا ہوں۔ اس لیے پرانا مہاجر ہوں۔"

"آپ پرانے مہاجر کیسے ہو گئے؟"

"میں نے دہلی والوں میں شادی کی ہے صرف تمہاری بھابی اور ان کے والدین میری اصلیت جانتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خاندان والوں کو یقین دلایا ہے کہ میرے والدین دہلی سے یہاں آئے تھے۔ پھر ہندوستان چلے گئے۔ وہاں والدین کا انتقال ہو گیا۔ صرف ایک بہن ہے، وہ اپنے شوہر کے ساتھ آنے والی ہے۔ اور تم آ گئی ہو۔"

نین تارا نے پوچھا "بھابی اور بچے کہاں ہیں؟"

"اسی شہر میں ہیں۔ کسی دن اُن سے ملاؤں گا۔"

"کسی دن کیوں؟ آج کیوں نہیں؟"

"پہلے تم دونوں اس محلے میں رہو۔ تم لوگوں کی زبان میں بنگالی اور بہاری لہجے کی آمیزش ہے۔ پہلے یہاں رہ کر دہلی کی زبان سیکھو۔ میں تم دونوں کے لیے دوسرے لباس سلوا دوں گا۔ جب تم لوگ یہاں کے ماحول میں ڈھل جاؤ گے تو میں اپنے سسرالی خاندان والوں سے تمہیں ملاؤں گا۔ میری بات کا بُرا نہ ماننا۔ ہم یہاں کے بہت ہی مہنگے علاقے میں ایک بہت بڑی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ اونچی سوسائٹی میں ہمیں اعتنوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ یہاں ہم ٹاک آف دی سوسائٹیز ہیں۔ تم جیسے لوگوں کو اچھی خاصی ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ ٹریننگ دیے بغیر وہاں لے جاؤں گا تو میری سُبکی ہو گی۔"

نین تارا چٹ پڑی "آپ کی سُبکی ہو گی؟ آپ اپنی سگی بہن کو، اپنی ماں جائی کو اپنے بہنوئی کو سسرالی والوں سے ملائیں گے تو آپ کی

جوانی سے بڑھاپے تک

طارق سلطان اعوان - حیدرآباد

لڑکا ◐	بلینک چیک
لڑکی ◐	کراس چیک
یونیورسٹی ◐	دارالملبوسات
مخلوط تعلیم ◐	میرج بیورو
سچی محبت ◐	ڈکشنری کا ایک خوبصورت لفظ
محبت ◐	اندھا پن
شادی ◐	اندھے پن کا آپریشن
شوہر ◐	جو بیوی کے پاؤں کے درد کو اپنے پیٹ کے درد سے اہم سمجھے۔
بیوی ◐	سابق حسینہ
خاندانی منصوبہ بندی ◐	مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
رنڈوا ◐	سگریٹ کی خالی ڈبیا
دادا جان ◐	بجرا لکابل
نانا جان ◐	بجرا وقیانوس
بڑھاپا ◐	جسے ملک الموت نے بیکار سمجھ کر چھوڑ رکھا ہے

تبھی ہو گی؟ کیا ہم جنگل سے آئے ہیں کہ آپ انسانوں کی سوسائٹی میں لے جانے سے پہلے ہمیں ٹریننگ دیں گے؟"

طارق نے خسرو سے کہا: "خواہ مخواہ غصہ دکھا رہی ہے۔ تم اسے سمجھاؤ۔ مختلف سوسائٹی کے مختلف آداب ہوتے ہیں۔ ابتدا ہی سے مشرقی اور مغربی پاکستان کی طرزِ رہائش میں نمایاں فرق رہا ہے۔ تمہیں یہ فرق سمجھنا چاہیے۔ اگر میں ٹریننگ کی بات کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تم دونوں کو جنگلی سمجھتا ہوں۔ نہیں، تم دونوں میرے اپنے ہو۔ میں نے ایک بہاری سے دلّی والے کا روپ اختیار کیا ہے۔ اسے برقرار رکھنے کے لیے اسے سمجھا رہا ہوں مگر یہ ناراض ہو رہی ہے۔"

خسرو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی وہ بولی: "ہاں، مجھے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ دشمنوں نے میری امّی اور ابّو کو مجھ سے چھین لیا، میں ناراض ہو کر اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ پھر آپ کا کیا بگاڑ لوں گی۔ میں تو صرف ایک ہی خواب دیکھتی آئی ہوں کہ وہاں گھر لٹ گیا، یہاں گھر کا ماحول ملے گا۔ بھائی، بھابیاں، بھتیجی، بھتیجے ملیں گے لیکن آپ لوگ تو اعلیٰ کوالٹی کے انسان نکلے۔ آپ تک پہنچنے کے لیے ہم ادنیٰ لوگ کئی سیڑھیاں چڑھ سکتے ہیں۔ مگر ایک بات یاد رکھیے ہماری اپنے لہو کی لکیریں کھینچتے ہوئے مشرقی پاکستان گئے اور اب لہو کی لکیریں نقش کرتے ہوئے یہاں آ رہے ہیں۔ ہم مر سکتے ہیں، مگر اپنی شناخت کو نہیں مٹا سکتے۔ ہم آپ کو تو چھوڑ سکتے ہیں، مگر اپنے آبا و اجداد کی تہذیب سے منہ نہیں موڑ سکتے۔"

خسرو نے کہا: "بھائی جان! عورت نکاح کے بعد اپنے شوہر کے گھر آتی ہے۔ بھابی نے ایک بہاری سے شادی کی ہے۔ انہیں آپ کے ہاں آ کر رہنا چاہیے۔ اگر آپ وہاں جا کر اپنی شناخت بدل رہے ہیں تو یہ نادانی ہم نہیں کریں گے۔"

"تو پھر کیا کرو گے؟ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ اس مکان میں نہیں رہو گے؟ جانتے ہو کراچی کتنا بڑا شہر ہے؟ یہاں قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہیں۔"

"آپ سپاہیوں کو بندوق کی گولیوں سے ڈرا رہے ہیں۔ بھائی جان! ہمیں طوفانوں میں بھی تنکے جمع کر کے آشیانہ بنانے کا سلیقہ آتا ہے۔"

نین تارا نے کہا: "آپ کے مکان کا تالہ چابی کے بغیر بند ہو جاتا ہے۔ آپ چابی لے جائیں۔ بھابی اور بچوں کو لے کر آئیں۔ ہم یہاں دو گھنٹے تک انتظار کریں گے۔ اگر ہمیں گھر کا ماحول اور رشتے داری نہیں ملے گی تو آپ کے مکان میں تالا ڈال کر چلے جائیں گے۔"

"کیوں فضول باتیں کر رہی ہو؟"

"میں سیدھی سی بات کہہ رہی ہوں۔ ہم اپنا تہذیبی ورثہ چھوڑ کر آپ کی بلندی پر نہیں چڑھ سکتے۔ بھابی صرف ملاقات کرنے نیچے اُتر سکتی ہیں اور آپ اگر سمجھائیں گے تو وہ ضرور آئیں گی۔"

اس نے بہن اور بہنوئی کو بے بسی سے دیکھا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ گھر چھوڑ کر ایک بار پھر نئی شرائط پر چل سکتے ہیں۔ اس نے کہا: "میں جا رہا ہوں، تمہاری بھابی کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔"

وہ کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے سوچنے لگا۔ کیا کرے؟ اپنی نازنین بیگم کو کیسے سمجھائے؟ وہ سسرال میں ایک طرح سے گھر داماد تھا۔ لیکن اُسے گھر داماد سمجھا نہیں جاتا تھا۔ سسر کا تمام کاروبار اس کے ہاتھ میں تھا۔ نازنین اکلوتی اولاد تھی۔ اس لیے داماد کو بیٹے کی طرح سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ لیکن انہیں دلّی کی تہذیب اور خصوصاً دلّی کی زبان بہت عزیز تھی۔ اگر ان کے سامنے کوئی لہجے اور تلفظ کی ذرا بھی غلطی کرتا تو وہ غلطی ان کے مزاج پر گراں گزرتی تھی۔ بدحالی سے گزر کر آنے والے کچھ بھی نہیں سمجھتے کہ وہ خوشحال گھرانہ کھانے اور پینے کے معاملات میں صرف نفاست پسند ہی نہیں، حد سے زیادہ نازک مزاج بھی ہے۔ جب نیپال سے نین تارا کا پہلا خط موصول ہوا تھا۔ تب ہی نازنین نے کہہ دیا تھا: "دیکھو طارق! اپنی بہن اور بہنوئی کو ہمارے ہاں نہ لانا۔ میں سمجھتی ہوں" وہ بے چارے کتنی مصیبتیں اٹھا کر یہاں آ رہے ہیں۔ ہم ان کی بھرپور مدد کریں گے...۔ مصیبت زدہ رشتے داروں کی مدد کی جاتی ہے، انہیں سر پر نہیں بٹھایا جاتا۔ تم پاپوش والا مکان انہیں رہنے کے لیے دے دو۔ اپنے بہنوئی کو کوئی چھوٹا سا کاروبار کرا دو۔ میں بھی سوشل ورک کے لیے اُدھر جاؤں گی تو نین تارا سے ملاقات کر لوں گی۔"

طارق اپنی بیوی کے مزاج کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ وہ بڑی بڑی بیگمات کی طرح سوشل ورکر بن کر غریبوں کی جھگیوں میں جایا کرتی تھی۔ مگر غریبوں کا وجود اپنی عالی شان کوٹھی میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے بات صرف بڑی بڑی بیگمات کی نہیں تھی۔ پوری قوم، بنگلہ دیش سے آنے والے مہاجروں کو نظر انداز کر رہی تھی۔ آج چودہ برس گزر جانے کے باوجود یہاں کے لوگ المیۂ مشرقی پاکستان سے آنکھیں چار کرتے، اس سے موزوں نتائج اخذ کرنے اور اس کی ذمہ داری کا تعین کرنے سے کترا رہے ہیں۔ ہمارے ملک کے مشہور صحافی اور وقت کے نباض جناب ارشاد احمد حقانی صاحب فرماتے ہیں۔

"المیۂ مشرقی پاکستان کے بارے میں بقیہ پاکستانی قوم یعنی ہم مغربی پاکستانیوں نے جو رویّہ اختیار کیا ہے، اس کا اتفاقی تجزیہ کیا جائے تو ایک انتہائی خوفناک مریضانہ ذہنیت سامنے آتی ہے۔ بطور قوم ہمارے اندر حقائق کو جاننے اور ان کا سامنا کرنے کی جرأت کا ایسا شرمناک فقدان ثابت ہوتا ہے کہ انفرادی اور ذاتی زندگی میں کوئی شخص اپنے خاندانی یا کاروباری سانحات کے بارے میں ایسی غفلت اور بزدلی کا رویّہ اختیار کرے تو لوگ اسے پاگل قرار دیں۔ ظاہر ہے کہ جب ہم نے واقعے کے اسباب کا تجزیہ ہی نہیں کیا تھا تو اس سے سبق سیکھنے اور

آئندہ اس کے ادارے سے بچنے کا امکان کس طرح ابھر سکتا ہے ؟"

ایک حساس دانشور نے جس مریضانہ ذہنیت کا ذکر کیا ہے وہ پوری قوم کے لیے باعثِ تشویش ہے۔ طارق اپنی بیوی کو اور سسرال والوں کو ایسی ذہنیت سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ دوسری طرف نین تارا کو اور اپنے بہنوئی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ چار گھنٹے تک دفتری کاموں میں مصروف رہا اور کوئی تدبیر سوچتا رہا۔ پھر دفتر سے نکل کر اپنی کار میں بیٹھتے ہوئے سوچنے لگا۔ "کچھ تو جھوٹ بولنا ہی پڑے گا۔ کسی طرح نین تارا کو چند دنوں تک اس مکان میں رہنے پر مجبور کرنا ہوگا۔ انہیں سمجھانا ہوگا کہ اجنبی شہر میں میرے سہارے کے بغیر انہیں کتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پھر ایک بہن کے گھر بدر ہونے سے ایک بھائی کو بڑی ندامت ہوگی۔"

وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے پاپوش والے مکان کے سامنے پہنچا۔ اُسے گھنٹی کی ضرورت نہیں پڑی۔ دُور ہی سے مکان کے دروازے پر لگا ہوا تالا نظر آگیا۔ وہ تالا ان کی خودداری کا مظہر تھا۔ ایک بہن ہزاروں میل سے کانٹوں پر چلتے ہوئے اپنے بھائی اور بھابی سے محبت کا حق مانگنے آئی تھی۔ محبت کو خیرات کے طور پر حاصل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اپنے جیون ساتھی کے ساتھ جا چکی تھی۔

◆

جنگلوں سے گزرنے والے، پہاڑوں کو سَر کرنے والے آخر بنگلہ دیش کی سرحد کو پار کرکے برما پہنچ گئے۔ سب سے پہلے وہ اراکان ڈویژن کے شہر اکیاب پہنچے۔ اکیاب میں پاکستانی سفارت خانہ تھا۔ انہیں کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ وہ کیمپ برمی فوج کی خالی بیرک میں تھا اور یہ امریکن کیمپ کہلاتا تھا۔ بنگلہ دیش سے فرار ہوکر آنے والوں کے لیے وہاں بھی وہی مسئلہ تھا۔ سفارت خانے میں ان کی پاکستانی شناخت پوچھی جاتی تھی۔ کوئی ثبوت طلب کیا جاتا تھا اور کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوتا تھا۔ ہزاروں افراد کیمپ میں پڑے ہوئے تھے۔ پاکستان پہنچنے کے لیے دن رات دُعائیں مانگتے رہتے تھے۔ یعنی اپنے وطن سے نکل کر اپنے ہی وطن پہنچنے کے لیے صرف دُعا ہی ایک ذریعہ رہ گیا تھا۔

عظمیٰ اور کلیم الدین بھوتیاں کے ساتھ آنے والا منظور فرسٹ بار واپڈا کا ملازم تھا۔ اس کے پاس اس سلسلے کے اہم کاغذات تھے۔ ان کے ذریعے وہ پاکستان چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے وعدہ کیا کہ اپنے والد و بھائی بہنوں کے لیے کلیرنس بھیجنے کے بعد ان کے لیے بھی کچھ کوششیں کرے گا۔ ہاشم کے دوست کے رشتے دار مغربی پاکستان میں تھے۔ انہوں نے اس کے لیے کلیرنس بھیج دیا۔ وہ بھی دو ہفتے بعد چلا گیا۔ اس نے جاتے جاتے عظمیٰ اور کلیم الدین بھوتیاں کو دیکھتے ہوئے کہا: "یہاں سفارت خانے میں جو پاکستانی اخبارات آتے ہیں، میں انہیں پڑھتا رہتا ہوں۔ اُدھر کی حکومت نے پاکستان کو نیا پاکستان کہنا شروع کیا ہے اور عوام بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ تم دونوں پرانے پاکستانی ہو۔ نئے پاکستان میں تمہارا کوئی نہیں ہے۔ تمہارے لیے جگہ کیسے نکلے گی؟ مجھے افسوس ہے۔"

وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ دن اور ہفتے گزرنے لگے۔ عظمیٰ اور کلیم الدین بھوتیاں خالی خالی نظروں سے دروازے کو تکتے رہتے۔ شاید کوئی انہیں لینے آجائے، شاید منظور بھائی وہاں سے کلیرنس بھیج دیں۔ وہاں ایسے بے شمار خاندان تھے، جن کے افراد اسی طرح آس لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ ویسے کیمپ میں انہیں تین وقت کا بہت ہی لذیذ کھانا ملتا تھا۔ سبزی بھاجی ایک الگ سی ڈش ہوتی تھی، ورنہ گوشت، مچھلی اور مُرغ وغیرہ کا سالن ہر روز کھانے کے لیے دیا جاتا تھا۔ ہر ہفتے فی خاندان بیس روپے دیے جاتے تھے۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی۔ بس ایک کرب تھا کہ وطن ہی میں بے وطن ہوگئے۔ اپنا گھر، اپنے وطن کی زمین پر ہو اور وہاں رُوکھی سُوکھی کھانے کو ملے تو کیمپ کے لذیذ کھانوں سے زیادہ لذت اور آسودگی ملتی ہے۔

ان دنوں جناب ریاض پراچہ صاحب برما میں پاکستان کے سفیر تھے۔ انہوں نے ایک سفیر کی حیثیت سے اپنی فرض شناسی کی مثال قائم کردی۔ وہ بنگلہ دیشی مہاجروں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ دُکھ، مصیبتیں اور صدمے اٹھا کر آئے ہیں۔ ان کے زخموں پر اپنی کوششوں کی حد تک مرہم رکھا جائے۔ اس کے باوجود لوگ ان سے ناراض رہتے تھے۔ لیڈر قسم کے حضرات، لوگوں کو جمع کرکے ان کے خلاف تقریریں کرتے رہتے تھے۔ یہ باتیں سفیر صاحب کے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں لیکن وہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ جو شخص کام کرنے والا ہو وہ نام حاصل کرنے کے پیچھے نہیں دوڑتا، اپنی لگن میں مست رہتا ہے اور ان کی کوشش یہی تھی کہ کیمپ میں ایک مہاجر بھی رہنے نہ پائے۔ کسی طرح سب لوگ پاکستان پہنچ جائیں۔

ایک روز کیمپ کے سامنے ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں ریاض پراچہ صاحب کو بھی مدعو کیا گیا۔ وہاں ان کے سامنے لیڈر حضرات نے طرح طرح کے الزامات لگائے۔ ایک نے کہا: "ہمیں یہاں مُرغن غذائیں کھلائی جارہی ہیں۔ ہفتے میں بیس روپے دیے جاتے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہمیں خانماں برباد سمجھ کر وقتی طور پر امداد دی جارہی ہے اور ہمیں جلد سے جلد پاکستان بھیج دیا جائے گا۔ لیکن یہاں تو یہ سلسلہ ایسا ہے، جیسے اسی امداد پر ہمیں ساری زندگی گزار دینا ہے۔ ہم صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہم بنگلہ دیش کو چھوڑ کر خیرات مانگنے نہیں آئے ہیں۔ ہم اپنے وطن جانا چاہتے ہیں۔"

لوگ اپنی دانست میں جوشیلی تقریریں کررہے تھے۔ آخر میں ریاض پراچہ صاحب نے اٹھ کر کہا: "آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا میں نے آپ تمام لوگوں کو یہاں روک رکھا ہے؟ مجھے اتنے اختیارات کہاں ہیں کہ جب چاہوں آپ لوگوں کو روک دوں۔ جب چاہوں آپ لوگوں کو

روانہ کردوں میرے پاس کیا اختیارات ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں؟

اگر نہیں جانتے تو سُن لیجیے۔ یہ جو ہفتے میں بیس روپے آپ کو ملتے ہیں اور روزانہ مرغن غذائیں کھانے کو ملتی ہیں تو یہ حکومتِ پاکستان کی طرف سے نہیں ہے۔ ہماری حکومت اگر اتنے مہنگے کھانے کھلا سکتی اور ہفتے میں نقد رقم دے سکتی تو بہت پہلے ہی آپ لوگوں کا بلوا آجاتا۔ جو کثیر رقم یہاں خرچ ہو رہی ہے۔ اس رقم سے ایک ایک خاندان کو اتنی رقم پاکستان میں دی جا سکتی ہے، وہ چھوٹی سی پان سگریٹ کی دکان لگا لے۔ کوئی ریڑھے پر دکان سجا لے۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ روزانہ آپ لوگوں پہ کتنی رقم خرچ کر رہا ہوں۔

لیکن میں یہ کثیر رقم کہاں سے لاتا ہوں؟ میرے پاس کوئی خزانہ گڑا ہوا تو نہیں ہے کہ زمین کھودتا رہوں اور آپ لوگوں کے لیے نکال کر خرچ کرتا رہوں۔ آج آپ سُن لیں۔ جب سے آپ لوگ آئے ہیں، میں دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھتا ہوں۔ سُکھ کا سانس لینا بھول گیا ہوں۔ آپ لوگوں کی خاطر میں برما کے جنوب میں رنگون جاتا ہوں۔ مشرق میں مولمن پہنچتا ہوں۔ شمال میں منڈالے کی طرف سفر کرتا ہوں۔ برما کے تمام دولت مند مسلمانوں سے میرا رابطہ قائم ہو چکا ہے۔ میں ان سے آپ لوگوں کے لیے چندہ وصول کرتا ہوں۔ وہ بڑی بڑی رقمیں آپ لوگوں کو دے رہے ہیں۔ لیکن اس طرح کہ میں ان کی دی ہوئی رقموں کو خود ہاتھ نہیں لگاتا۔ برما کے مخیر حضرات نے خود اپنے آدمی مقرر کیے ہیں جو آپ لوگوں کے لیے پکاتے ہیں اور کھلاتے ہیں۔ ان کا ہی ایک خاص آدمی آپ لوگوں کو بیس روپے فی خاندان کے حساب سے دیتا ہے۔

آپ میرے مسائل کو نہیں سمجھ سکتے۔ ایک طرف میں غیر ملک میں پاکستان کے وقار اور اس کی ساکھ کو برقرار رکھنے والا ایک جواب دہ سفیر ہوں۔ حکومتِ وقت کی پالیسی پر عمل کرنا میرا فرض ہے اور میں اس پر عمل کر رہا ہوں۔ جب تک کلیرنس نہیں آجاتا، میں آپ لوگوں کو یہاں سے بھیج نہیں سکتا۔ دوسری طرف حکومتِ برما کبھی نرمی سے اور کبھی سختی سے کہتی ہے کہ اُن کے ملک میں غیر ملکیوں کا اضافہ تشویشناک ہے۔ آنے والے مہاجروں کو جلد سے جلد بھیجا جائے اور کیمپ خالی کرایا جائے۔ مجھے انہیں بھی سمجھا بجھا کر رکھنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف یہاں کے ہمدرد مسلمان ہیں۔ وہ کوششیں کر رہے ہیں کہ جہاں اتنی رقمیں دیتے ہیں، وہاں بیرونی ممالک میں اپنے رشتے داروں کو خطوط لکھ کر آپ لوگوں کے لیے کلیرنس بھیج سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہفتے دو ہفتے میں ایک ایک، دو، دو خاندان یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ جن کا مغربی پاکستان میں کوئی نہیں ہے لیکن غیر متوقع طور پر ان کے لیے کلیرنس آجاتا ہے۔ میں کن حالات میں اپنے فرائض ادا کر رہا ہوں، یہ نہ آپ سمجھ سکتے ہیں، نہ میں تفصیل سے آپ کو سمجھا سکتا ہوں۔“

یہ باتیں سن کر سب لوگوں کو چُپ لگ گئی۔ کچھ لوگ سر جھکا کر سوچنے لگے۔ کچھ آپس میں تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ سفیر صاحب نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں، آپ لوگوں نے بنگلہ دیش میں قیامت کا وہ منظر دیکھا ہے جو خدا کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ ایسے بدترین حالات سے گزرنے والے یا تو پاگل ہو جاتے ہیں یا ذہنی طور پر کسی حد تک نارمل نہیں رہتے۔ مزاجاً چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ یہی کیفیت آپ لوگوں کی ہے۔ آپ میری مجبوریاں نہیں سمجھتے۔ صرف اپنی مجبوریوں کو دیکھ کر مجھ پر جھنجلاتے ہیں۔ میں آپ لوگوں کا نفسیاتی تجزیہ کرتا ہوں۔ اس لیے آپ لوگوں کی جھنجلاہٹ اور میرے خلاف ہونے والی باتوں کا بُرا نہیں مانتا اور نہ ہی مانوں گا۔ آپ سب میرے پاکستانی بھائی ہیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں جب تک اس کیمپ کا ایک ایک فرد پاکستان نہیں پہنچے گا اس وقت تک میں بھی اپنے وطن کی زمین پر قدم نہیں رکھوں گا۔“

کیمپ کے لوگ اُن سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے وہاں کے خود ساختہ لیڈروں کو لعن طعن کی اور ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ ان کی سیاست میں نہیں آئیں گے۔ وہاں ہر طرح کا آرام تھا۔ سونے کے لیے بستر، اوڑھنے کے لیے کمبل۔ سب کچھ دستیاب تھا۔ بیماروں کو دوائیں مل جاتی تھیں۔ دن ہفتے اور مہینے گزر رہے تھے۔ کیمپ میں لوگوں کی تعداد کم ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود عظمیٰ اور کلیم الدین بھوتیاں کے نام کلیرنس نہیں آرہا تھا۔

وہاں کئی لوگوں نے ان سے اُن کے رشتے کے متعلق پوچھا۔ پھر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ بزرگوں نے سمجھایا: ”جب ساتھ ہی رہنا ہے تو نکاح کیوں نہیں پڑھوا لیتے؟“

بھوتیاں نے عظمیٰ سے پوچھا: ”کیا تمہیں منظور ہے؟“

اس نے سر کو جھکا لیا۔ اب اتنی بڑی دُنیا میں نہ تو بھوتیاں کا کوئی رہا تھا اور نہ ہی عظمیٰ کا۔ وہی ایک دوسرے کے بن کر اس دُنیا میں اپنے رشتے کو مستحکم کر سکتے تھے۔ برما کے ایک قاضی نکاح پڑھانے کے لیے آئے۔ انہوں نے پوچھا: ”بیٹی! کیا تمہیں کلیم الدین بھوتیاں سے نکاح قبول ہے؟“

عظمیٰ نے ہولے سے سر کو ہلا دیا۔ قاضی صاحب نے کہا: ”ایسے نہیں زبان سے بولو۔ کیا قبول ہے؟“

وہ چُپ رہی۔ آس پاس بیٹھی ہوئی عورتوں نے کہا: ”بولو نا شرمانے کی کیا بات ہے؟“

عظمیٰ نے ان کے اصرار پر کہا: ”ڈو بوڑاے“

قاضی صاحب کے دیدے حیرت سے پھیل گئے۔ انہوں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا: ”تم کیا بول رہی ہو۔ پھر سے بولو۔“

اس نے پھر نکاح قبول کیا۔ قاضی صاحب نے پوچھا: ”یہ کون سی زبان ہے؟“

وہاں بیٹھی ہوئی ایک تعلیم یافتہ لڑکی نے کہا: ”یہ نفرت سے کٹی ہوئی زبان ہے جو محبت سے نکاح قبول کر رہی ہے۔“

نکاح ہو گیا۔ وہ میاں بیوی بن گئے۔ ایک ہفتے بعد بابر کا ایک خط موصول ہوا۔ بڑا سا لفافہ تھا۔ اس نے کلیرنس فارم کے ساتھ ایک خط لکھا تھا۔ "مسٹر کلیم الدین بھوتیاں! عظمیٰ سے دُور ہونے کے بعد میں نے اپنے آپ پر غور کیا۔ یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ چاٹگام سے برما تک میں ہمیشہ تمہاری مخالفت کیوں کرتا رہا۔ میرے دل نے کہا، میں عظمیٰ کو چاہتا ہوں۔ اسے تمہارے قریب دیکھ کر اور تمہاری طرف مائل دیکھ کر میرے اندر نامعلوم سی جلن پیدا ہو جاتی تھی۔ اس وقت سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ عظمیٰ مجھے اچھی تو لگتی تھی لیکن میں اسے اپنانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے حالات ہی ایسے تھے اور آئندہ کن حالات سے گزرنے والا ہوں، یہ سمجھے بغیر کسی لڑکی کو اپنانے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن یہاں پاکستان پہنچنے تک میرا دل میرے سینے کی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر دھڑکنوں کی زبان سے یہی کہہ رہا ہے: چاہیے۔ عظمیٰ چاہیے۔

پہلے تو جی میں آیا کہ صرف عظمیٰ کے نام کلیرنس بھیجوں اور تمہیں وہیں کیمپ میں سڑتے رہنے کے لیے چھوڑ دوں۔ پھر مجھے تمہارا وہ احسان یاد آیا۔ برما کی چکنی پہاڑی پر اگر تم میری مدد نہ کرتے تو میں کبھی اس کی بلندی تک نہ پہنچ سکتا اور یہاں تک نہ آتا۔ تمہاری دشمنی مجھے بڑی مہنگی پڑتی لیکن تم نے انسان دوستی کا ثبوت دیا۔ میں بھی انسان ہوں۔ جواباً تمہارے نام بھی کلیرنس بھیج رہا ہوں۔

مسٹر بھوتیاں! تم دونوں میں میاں بیوی کا رشتہ نہیں ہے۔ اس لیے میں تم دونوں کو بھائی بہن بنا کر کلیرنس بھیج رہا ہوں۔ اس کے مطابق تم بھائی بہن ہو لیکن عظمیٰ میری خالہ زاد ہے۔ اب تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اسے اپنی بہن سمجھو اور یہاں لے آؤ۔ میں اسے شریکِ حیات بنا کر عزت آبرو سے رکھوں گا۔"

عظمیٰ لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی۔ بھوتیاں نے اسے پڑھ کر سنایا تو وہ جھلا گئی، کہنے لگی۔ "اس کلیرنس کو پھاڑ کر پھینک دو۔ یہ ہمارے ازدواجی رشتے کے لیے ایک گالی ہے۔"

کیمپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہ خبر گشت کرنے لگی کہ ایک میاں بیوی کے پاس کلیرنس آیا ہے لیکن وہ بھائی بہن کے لیے ہے جسے وہ استعمال کرنا نہیں چاہتے۔ یہ خبر ملتے ہی لوگ ان کے پاس آنے لگے۔ کوئی خاتون آ کر کہتی تھی: "یہ ہمیں دے دو۔ میں وہاں جاتے ہی تم لوگوں کے لیے کسی نہ کسی طرح دوسرا کلیرنس بھیج دوں گی۔"

کوئی کہتا تھا: "ہم سے دو سو لے لو۔ چار سو لے لو۔ ہزار روپے لے لو اور یہ ہمیں دے دو۔"

کوئی اپنے زیورات لا کر رکھ دیتا تھا: "بیٹا! یہ ہماری عمر بھر کی کمائی ہے۔ اس میں سے کچھ تم رکھ لو، کچھ ہمارے لیے چھوڑ دو مگر وہ کلیرنس ہمیں دے دو۔ میں اپنے بیٹے اور بیٹی کو یہاں سے روانہ کر دوں گا۔"

ایک انار تھا اور سو بیمار تھے۔ سبھی دکھی تھے۔ اپنا دکھڑا اس طرح روتے تھے کہ ہر ایک پر ترس آتا تھا۔ سب ہی کے لیے کام آنے کو جی چاہتا تھا۔ اس رات عظمیٰ اور کلیم الدین بھوتیاں سو نہ سکے۔ ان کے سرہانے وہ کلیرنس رکھا ہوا تھا۔ اس وقت کیمپ والوں کے لیے وہ دُنیا کی سب سے بڑی دولت تھا۔ اتنا قیمتی ہیرا تھا، جسے کوئی بھی چرا کر لے جا سکتا تھا۔

رات کے دو بجے عظمیٰ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کلیم الدین بھوتیاں نے کہا: "مجھے بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، کل سفیر صاحب سے ملاقات کروں گا۔ پوچھوں گا، کیا اس کلیرنس میں رشتہ تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس کم بخت بابر نے ہماری ولدیت ایک ہی لکھی ہے۔"

عظمیٰ چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔ بھوتیاں نے خود ہی کہا۔ "لیکن نہیں، ہمارے سفیر صاحب قانون کے بڑے پابند ہیں۔ وہ کوئی غیر قانونی کام نہیں کریں گے۔ جیسا کلیرنس ہے، ویسا ہی استعمال کرنے کے لیے کہیں گے۔ یا پھر اسے واپس کرنے کا مشورہ دیں گے۔"

وہ سوچ رہی تھی۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اگر اس کلیرنس کو اچھے داموں فروخت کرنے کے بعد کوئی دُوسرا کلیرنس خریدا جا سکتا تو وہ ایسا ضرور کرتے۔ بھوتیاں نے کہا: "سوچ سوچ کر دماغ تھک جائے گا۔ بہتر ہے سونے کی کوشش کرو۔"

وہ بولی: "یہ کلیرنس ہمارے گلے میں ہڈی کی طرح اٹکا ہوا ہے نہ نگل سکتے ہیں نہ اُگل سکتے ہیں۔"

ایک امریکن اپنے عزیز کی قبر پر پھول سجا رہا تھا کہ اس نے برابر کی قبر پر ایک بوڑھے چینی کو دیکھا جو قبر پر پکے ہوئے چاول چھڑک رہا تھا۔ اس پر امریکن نے طنز سے پوچھا:

"تمہارے خیال میں کس وقت تمہارا عزیز قبر سے باہر آ کر یہ چاول کھائے گا؟"

چینی نے چاول چھڑکتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا: "جس وقت تمہارا عزیز قبر سے باہر آ کر پھولوں کی خوشبو سونگھے گا۔"

* * *

نوجوان اور خوبصورت لڑکی نے اپنے نئے بوائے فرینڈ کو اپنی سالگرہ میں شرکت کرنے کی دعوت دی اور اپنے گھر کا پتہ بتاتے ہوئے کہا۔

"لفٹ تم کو جب پانچویں منزل پر چھوڑے تو تم دروازے پر آکر اپنے گھٹنے سے دستک دینا۔"

نئے بوائے فرینڈ نے حیرانی سے پوچھا: "گھٹنے سے کیوں، ہاتھ سے کیوں نہیں؟"

حسینہ نے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: "تو کیا تم خالی ہاتھ میری سالگرہ میں شرکت کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

وہ اپنی گڑبڑ زبان میں بول رہی تھی۔ لیکن بھوتیاں اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھنے لگا تھا۔ اس نے کہا: "شیطان آخر شیطان ہوتا ہے۔ بابر ہزاروں میل دُور جانے کے باوجود ہم سے دشمنی کر رہا ہے۔ کہنے کو اس نے میرے احسان کا جواب دیا ہے۔ لیکن ایسا جواب جو ہم دونوں کو اور زیادہ کرب میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔"

وہ بڑی دیر تک دھیمی آواز میں گفتگو کرتے رہے۔ آس پاس بڑی دُور تک دوسرے مہاجرین اپنی اپنی چادروں اور چار دیواری میں سو رہے تھے۔ صبح چار بجے وہ بھی سونا چاہتے تھے۔ اسی وقت قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ انہوں نے چادر کو ایک طرف ہٹا کر دیکھا۔ ایک نوجوان لڑکی ایک نوجوان مرد کے ساتھ ان کی طرف آ رہی تھی۔ چادر ہٹتے ہی مرد نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ کلیم الدین بھوتیاں نے کہا: "اندر آ جاؤ۔"

وہ دونوں اندر آ گئے۔ پھر آنے والے نے کہا "میرا نام علی امام ہے اور یہ میری بہن فرزانہ ہے۔ میں تمام دن شہر میں رہتا ہوں۔ میں پیشے کے اعتبار سے مصور ہوں۔ لوگوں کی تصویریں بناتا ہوں تاکہ کسی بُرے وقت کے لیے ہمارے پاس چار پیسے رہیں۔ ابھی رات کو دیر سے آیا تو فرزانہ نے مجھے آپ کے پرابلم کے متعلق بتایا۔ میں نے سوچا رات زیادہ ہو گئی ہے۔ صبح آپ سے باتیں کروں گا۔ لیکن یہ بھی معلوم ہوا کہ بہت سے لوگ آپ سے اس کلیرنس کا سودا کر رہے ہیں۔"

"کیا آپ بھی سودا کرنے آئے ہیں؟"

"جی نہیں، ہمارے پاس کلیرنس آ گیا ہے۔ کل ہم سفارت خانے جائیں گے۔ سوچا کیوں نہ آپ سے باتیں کر لیں۔ دیکھیے، میں اور فرزانہ سگے بھائی بہن ہیں۔ آپ دونوں میاں بیوی ہیں۔ اگر آپ کی بیوی میری بہن فرزانہ بن جائے تو میری بہن فرزانہ کلیرنس کے مطابق آپ کی بہن بن جائے گی۔ کیا نام ہے آپ کی شریکِ حیات کا؟"

"عظمیٰ، اور میرا نام کلیم الدین بھوتیاں ہے۔"

"مسٹر بھوتیاں! اگر میری بہن عظمیٰ بن کر آپ کے ساتھ جائے گی تو آپ بلا جھجک اس فرضی عظمیٰ کو اپنی بہن کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ہزاروں لڑکیوں کے نام ایک جیسے ہوتے ہیں۔ صرف بیوی کو بہن نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرح آپ کی شریکِ حیات میری بہن بن کر میرے کلیرنس میں جائے گی۔ کہیے منظور ہے؟"

کلیم الدین بھوتیاں نے فرطِ عقیدت سے اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "بھائی صاحب! آپ نے ہمارے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہے۔ اس کلیرنس کی وجہ سے ہماری نیند اُڑ گئی تھی ہم ابھی تک جاگ رہے ہیں۔"

"آپ آرام سے سو جائیں۔ صبح دس بجے اٹھ کر ہم سفارت خانے جائیں گے اور یہاں سے روانگی کی تیاری کریں گے۔"

آپس میں بھائی چارگی سے کوئی بات بن جائے تو کام بھی بن جاتا ہے۔ وہ ایک ہفتے کے اندر ہی برما سے پاکستان کے شہر لاہور پہنچ گئے۔ وہاں علی امام کے ایک دوست نے ان کا استقبال کیا۔ انہیں ایک ٹیکسی میں بٹھا کر وہ مغل پورہ کی طرف جانے لگا۔ راستے میں ٹیکسی میں خرابی ہو گئی۔ قریب ہی ایک تانگہ کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس میں سوار ہو کر جانے لگے۔ کلیم الدین بھوتیاں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اجنبی ملک میں آ گیا ہے۔ جدھر نظر اٹھاتا تھا اُدھر ہی دیواروں پر جلی حرفوں میں اُردو زبان دکھائی دیتی تھی۔ اس کی پیدائش سے لے کر اب تک بنگلہ زبان اس کے دماغ میں نقش رہی تھی۔ دیناج پور ہو یا ڈھاکہ، ہر جگہ اس نے بنگالی زبان کو جلی حرفوں میں دیکھا تھا۔ پھر وہ تانگے کی سواری بھی نئی تھی۔ مغل پورہ کے ایک مکان تک پہنچتے پہنچتے اس نے بے شمار لوگوں کو پنجابی زبان بولتے سنا تھا۔ اس نے اپنے میزبان سے پوچھا "کیا یہاں تمام لوگ صرف پنجابی بولتے ہیں؟"

میزبان نے مسکراتے ہوئے کہا: "یہاں کے لوگ صرف اپنے گھروں میں اور آپس کی محفلوں میں پنجابی بولتے ہیں، ورنہ ان کے گھروں میں، ان کے شہروں میں جو مہمان آئے، اسی مہمان کی بولی بولتے ہیں۔ یہ اردو پڑھتے ہیں، اردو لکھتے ہیں۔ شہر لاہور اردو کی اشاعت کا بہت بڑا مرکز ہے۔"

اس رات عظمیٰ اور بھوتیاں کو ایک الگ کمرہ سونے کے لیے دیا گیا۔ تنہائی ملتے ہی بھوتیاں نے پریشان ہو کر کہا: "یہ جگہ بالکل اجنبی سی لگتی ہے۔ ہم نے وہاں کوئی اور پاکستان دیکھا تھا۔ یہاں کوئی اور پاکستان نظر آتا ہے۔ ہم اپنے میزبان پر بوجھ نہیں بن سکتے۔ ہم کل ہی یہاں سے چلے جائیں گے لیکن کہاں جائیں گے؟ پہلے مجھے کوئی کام تلاش کرنا ہوگا۔ لیکن کام کہاں تلاش کروں؟ اپنے میزبان سے ہی مشورہ کرنا ہوگا۔"

دوسرے دن میزبان نے مشورہ دیا: "ہماری عظمیٰ بھابی یہاں گھر کی عورتوں کے ساتھ رہیں گی۔ آپ دو چار دن لاہور کی سیر کریں۔ لوگوں سے ملتے جلتے رہیں اور اپنے حالات بتاتے رہیں۔ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی کام ضرور مل جائے گا۔"

اس نے مشورے پر عمل کیا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ عظمیٰ کو لے کر اجنبی شہر میں کہاں کہاں بھٹکتا رہتا۔ بہرحال وہ تنہا لاہور کی سڑکوں کو ناپنے کے لیے نکلا۔ وہ کسی کو اپنے حالات کیا بتاتا۔ اس کی گفتگو اور اس کے حلیے سے ہی لوگ سمجھ لیتے تھے کہ بنگال سے آیا ہے۔ اور جب یہ معلوم ہو جاتا تو اس سے ہمدردی کی جاتی تھی۔ اور کم از کم ایک کپ چائے یا ایک گلاس لسی پینے پر اصرار کیا جاتا تھا۔ لاہور والوں کی زندہ دلی اور مہمان نوازی مشہور ہے۔ وہ مہمان نوازی میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو اسے بنگالی سمجھنے کے بعد طنزیہ انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ ان کی گفتگو کا لبِ لباب یہی ہوتا تھا کہ تم جیسے بنگالیوں نے مشرقی پاکستان کو ڈبویا ہے۔

وہ دو دنوں تک شہر کی خاک چھانتے رہنے کے بعد انار کلی کی ایک

بہت بڑی دکان میں سیلز مین کی ملازمت مل گئی۔ وہ بھی اس لیے کہ اس نے انگلش میں ایم اے کیا تھا اور انگریزی بڑی روانی سے بولتا تھا۔ اسے ایک دن آزمائشی طور پر دکان میں رکھا گیا۔ اس نے صبح سے شام تک آنے والے غیر ملکی گاہکوں کو بڑی خوبصورتی سے ہینڈل کیا۔ ان سے انگریزی میں گفتگو کرتا رہا۔ دکان کے مالک نے خوش ہو کر اسے پانچ سو روپے ماہوار پر رکھ لیا۔

وہ اپنی تعلیمی صلاحیتوں کے پیش نظر بہت اونچے خواب دیکھتا آیا تھا۔ پانچ سو روپے ماہوار سے مستقبل کیا خاک بنتا؟ پھر بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا تھا۔ اب وہ اپنے میزبان پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ جب اسے پہلی تنخواہ ملی تو اس نے پورے پانچ سو اپنے میزبان کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ میزبان نے پوچھا: "یہ کیا؟"

اس نے جواب دیا: "آپ مجھے روزانہ آنے جانے کا کرایہ دیتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا دکان کے مالک کے ساتھ کھاتا ہوں۔ بقیہ دو وقت کا کھانا اور عظمیٰ کے تین وقت کا کھانا، یہ سارے اخراجات آپ ہی برداشت کرتے ہیں۔"

اس نے ان پانچ سو روپوں کو دیکھا۔ پھر کہا: "یہاں سو روپے تک ایک کمرے کا مکان کرائے پر مل جائے گا۔ آپ باقی رقم سے چولہے ہانڈی کا سامان خرید لیں۔ اپنا الگ گھر بسائیں۔ اس سلسلے میں کچھ رقم مجھ سے اد، قرض لے لیں۔ جب آپ کی تنخواہ بڑھے گی تو قرض ادا کر دیجیے گا۔"

یہ مشورہ مناسب تھا۔ اسی محلے میں ایک کمرے کا مکان مل گیا۔ اس کا کرایہ اسی روپے تھا۔ باقی رقم سے انہوں نے اپنے گھر کی ضروریات کا سامان خرید لیا۔ سو روپے اپنے آنے جانے کے کرائے کے رکھ لیے۔ اس کے علاوہ ستر روپے بچے۔ اس نے عظمیٰ کی شلوار قمیص کے لیے کپڑا خرید لیا۔ وہاں کی عورتیں عظمیٰ کو ساڑی میں دیکھ کر مسکراتی تھیں یا آپس میں سرگوشیاں کرتی تھیں۔ میزبان کے گھر والیوں نے بتایا: "یہاں ساڑیاں اول تو پہنی نہیں جاتیں یا پھر اونچے طبقے کی عورتیں خاص تقریبات میں پہنتی ہیں۔ یہاں کے لوگ ساڑی کو عریاں لباس کہتے ہیں۔"

بھوتیاں کو یہ بات بری لگی۔ بچپن سے اب تک اس نے بنگال کی عورتوں کو ساڑیاں پہنتے دیکھا تھا۔ ہندوستان کی شریف عورتیں ساڑی پہنتی ہیں۔ دراصل شریف عورتوں کا کوئی سا پہناوا ننگا نہیں ہوتا۔ دیکھنے والی آنکھیں ننگی ہوتی ہیں۔

وہ اس سلسلے میں کسی سے بحث نہ کر سکا۔ چپ چاپ عظمیٰ کے لیے کپڑا لے آیا تاکہ ماحول کے مطابق زندگی گزار سکے۔ جب کبھی وہ دکان میں بیٹھ کر ملنے جلنے والوں کے سامنے بنگلہ دیش کے بہاریوں کا ذکر کرتا اور انہیں یہاں بلانے کے سلسلے میں کوئی تجویز پیش کرتا تو سب سے پہلے دکان کا مالک اعتراض کرتا تھا: "دیکھو بھئی! یہاں صرف دکانداری کرو۔ یہاں سیاست نہیں چلے گی۔ سیاست کرنا ہے تو ملازمت چھوڑ دو۔"

محلے کے لوگ بنگلہ دیش کے بہاریوں سے ہمدردی کرتے تھے لیکن انہیں یہاں بلانے کے سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟ وہ نہیں جانتے تھے اور نہ ہی حکومت تک اپنی آواز پہنچانا جانتے تھے۔ کلیم الدین بھوتیاں ایسے وقت کہتا تھا: "کیا حکومت نہیں جانتی ہے کہ وہاں تک آواز پہنچائی جائے۔ جنگی قیدی واپس آ چکے ہیں۔ ہندوستان کی جیلوں میں مقید رہنے والے کئی ہزار بہاریوں کو یہاں لایا گیا ہے لیکن بنگلہ دیش کے محصورین کو اس طرح بھلا دیا گیا ہے جیسے سارے مسائل حل ہو گئے ہوں اور اب کسی کے متعلق سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے۔"

چھ ماہ بعد اس کی تنخواہ سات سو روپے ہو گئی۔ ایک سال بعد عظمیٰ نے ایک بہت ہی خوبصورت بچی کو جنم دیا۔ بیٹی کو دیکھ کر بھوتیاں کو احساس ہوا کہ وہ سات سو روپے ماہوار پہ اکتفا کر رہا ہے جبکہ ایک باپ بیٹی کے پیدا ہوتے ہی بہت دور تک سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرے دن اس نے وزارت داخلہ کے چیف سیکریٹری کو ایک خط لکھا ——

"جناب عالی! میرا نام کلیم الدین بھوتیاں ہے اور میں سابقہ مشرقی پاکستان دیناج پور کے ایک معزز مجسٹریٹ سلیم الدین بھوتیاں کا بڑا بیٹا ہوں۔ میرے والد، والدہ اور کنبے کے تمام افراد پاکستان کی وفاداری میں ثابت قدم رہے اور آخر میں دشمنوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ میں بڑی مشکلوں سے

جہنم کی آزادی

ایک بار برطانیہ کے وزیراعظم لائیڈ جارج پارلیمنٹ میں تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا: "ہم ڈنمارک اور ناروے کی آزادی کے لیے لڑیں گے۔ ہمیں عوام کی آزادی کی خاطر لڑنا پڑے گا ہم سوئٹزرلینڈ کی آزادی کے لیے لڑیں گے ہم..." وزیراعظم کی پرجوش تقریر جاری تھی انہوں نے کئی ممالک کے نام گنوا دیے۔ حزب اختلاف کے سربراہ نے جھلا کر کہا: "اور ہم جہنم کی آزادی کی خاطر لڑیں گے۔"

وزیراعظم نے مسکراتے ہوئے اس فقرے کا جواب دیا: "ضرور، ضرور! ہر شخص کو اپنے اپنے وطن کی آزادی کی فکر ہوتی ہے۔"

ان بچا کر اپنی شریکِ حیات کے ساتھ یہاں پہنچ گیا ہوں۔ میں نے بنگالی میڈیم سے تعلیم حاصل کی ہے لیکن انگلش لینگویج میں ایم اے کیا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ میرے والد مجسٹریٹ سلیم الدین بھوئیاں کی دمات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک اچھی سی ملازمت عطا کر دیں۔ میں پ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ مجھے میرے والد کی طرح پاکستان کا فادار پائیں گے۔"

اسے امید تھی، جواب "ہاں یا نہ" میں ضرور موصول ہوگا۔ ایک ماہ زر گیا پھر دو ماہ گزر گئے، جواب نہیں ملا۔ اس نے یاد دہانی کے طور پر یک خط لکھا اور پھر انتظار کرنے لگا۔ انتظار کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا کہ یکلخت ختم ہوگا۔ ایک برس گزر گیا۔ پھر دوسرے برس کے اختتام پر اسے جوابی خط موصول ہوا۔ اس میں لکھا تھا: "مسٹر کلیم الدین بھوئیاں! آپ اپنی شناخت کے لیے مجسٹریٹ سلیم الدین بھوئیاں سے تعلق رکھنے والے اہم کاغذات لے کر دفتر میں حاضر ہو جائیں۔"

اس نے ہنستے ہوئے وہ خط عظمیٰ کو دکھایا اور کہا: "یہ لوگ ہم سے ضروری کاغذات طلب کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے خط میں تفصیل سے لکھ دیا تھا کہ کس طرح ہمارا سارا کنبہ قتل ہو گیا اور گھر برباد ہو گیا ہے۔ میں بڑی مشکلوں سے جان بچا کر آیا ہوں۔ ایسی صورت میں ضروری کاغذات کیسے پیش کر سکتا ہوں؟"

عظمیٰ نے کہا: "آپ وہاں جا کر انہیں سمجھائیں۔ یقیناً بات ان کی سمجھ میں آ جائے گی۔"

اس نے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ اب وہ ڈھائی برس کی ہو گئی تھی۔ ماں باپ کے درمیان بیٹھی کھیل رہی تھی۔ اس نے اسے گود میں لیتے ہوئے کہا: "اسلام آباد جانے اور آنے میں دو دن ضرور لگیں گے۔ کام بنتا نظر آیا تو اور کچھ دن لگ جائیں گے۔ میں اپنی ببلی کے بغیر کیسے رہوں گا؟"

"پھر مجھے اور ببلی کو بھی ساتھ لے چلو۔ ہماری تفریح ہو جائے گی۔ میں ہر مہینے کچھ پیسے بچاتی ہوں۔ اتنی رقم ہے کہ ہم گھوم پھر کر بھی آ سکتے ہیں۔"

اس نے دکان سے چار دنوں کی چھٹی لی۔ پھر عظمیٰ اور ببلی کے ساتھ پنڈی پہنچ گیا۔ وہاں ایک سستے سے ہوٹل میں کمرہ لیا۔ دوسری صبح بیوی اور بیٹی کو ہوٹل میں چھوڑ کر اسلام آباد چلا گیا۔ جس دفتر میں اسے طلب کیا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنی مجبوریاں بیان کیں۔ جواب ملا: "مسٹر! آپ کی مجبوریاں درست ہو سکتی ہیں۔ آپ لوگوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا ہمیں بخوبی علم ہے لیکن کوئی بھی شخص آ کر یہ کہے گا کہ وہ مجسٹریٹ سلیم الدین بھوئیاں کا بیٹا ہے تو ہم کیسے تسلیم کر لیں گے؟"

"ٹھیک ہے، آپ تسلیم نہ کریں لیکن ایک بنگلہ دیشی مہاجر کی حیثیت سے، جو محبِ وطن ہے، جو اپنی علمی صلاحیتوں کو پاکستان کے لیے کام میں لانا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ ہزاروں میل دور سے آیا ہے تو اس کے جذبوں کو سمجھیے، آپ مجھے کوئی سی ملازمت دے سکتے ہیں۔"

"ایسے جذبے اور علمی صلاحیتیں رکھنے والے پاکستان میں بے شمار نوجوان ہیں۔ ہمارے ہاں اگر ویکینسی ہوتی تو ضرور رکھ لیا جاتا۔ وہ تو ہم مجسٹریٹ سلیم الدین بھوئیاں کی خدمات کو پیشِ نظر رکھ کر کسی شعبے میں کوئی اسامی نکالنے والے تھے۔ دوسری صورت میں یہ ممکن نہیں ہے۔ آپ ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔"

"اگر آئندہ کوئی ویکینسی ہو تو میں امید رکھوں؟"

"مسٹر! یہاں کوٹہ سسٹم ہے۔ پنجاب والوں کے لیے، سندھ والوں کے لیے، سرحد والوں کے لیے، بلوچستان والوں کے لیے الگ الگ کوٹہ مقرر ہے۔ اس کے مطابق وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار مہیا کیا جاتا ہے۔"

"یعنی ایک شخص جو بہترین علمی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اُسے محض اس لیے سرکاری طور پر ملازم نہیں رکھا جائے گا کہ اس کا تعلق پنجاب، سندھ، سرحد یا بلوچستان سے نہیں ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان کی ابتدا سے یہاں ایسے لاکھوں افراد ہیں جن کا تعلق چاروں صوبوں میں کسی سے نہیں ہے۔ وہ صرف پاکستانی ہیں اور ہم بنگلہ دیش سے آنے والے بھی کسی صوبے سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ ہم کس کوٹے والے کے کھاتے میں جائیں گے؟"

"مسٹر! آپ فضول بحث کر رہے ہیں۔"

"اگر یہ بحث فضول ہے تو اس حقیقت کو تسلیم کر لیجیے کہ کوئی بھی ملک اُس وقت ترقی کرتا ہے جب نوجوانوں کو تعلیمی اور تکنیکی صلاحیتوں کی بنا پر ملکی مشینری کا اہم پُرزہ بنایا جاتا ہے اور جہاں کوٹہ سسٹم کے مطابق نوجوانوں کو اسکولوں، کالجوں میں داخلہ دیا جاتا ہے اور سرکاری شعبوں میں ملازمتیں دی جاتی ہیں۔ ایسے ملکوں میں بہترین صلاحیتیں پسِ پشت رہ جاتی ہیں، اور ناکارہ لوگ سفارش کے بل بوتے پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔"

"یہ سرکاری دفتر ہے، کوئی جلسہ گاہ نہیں ہے جہاں آپ تقریر فرما رہے ہیں۔ ہم نے کہہ دیا، آپ کو ملازمت نہیں دے سکتے۔ اگر آپ واقعی مجسٹریٹ سلیم الدین بھوئیاں مرحوم کے صاحبزادے ہیں تو ثبوت پیش کریں۔ بس اب چلے جائیں۔ ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔"

وہ جب دفتر سے باہر آیا تو بہت بُری طرح جھنجلایا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کرے؟ کیا ساری عمر ایک دکان کا سیلزمین بن کر گزار دے؟ کیا اسی کے لیے اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی؟ مایوسی، ناکامی، غصے اور جھنجلاہٹ کی وجہ سے وہ بس میں سوار نہیں ہوا۔ وہ سے پیدل چلتا ہوا اور سوچتا ہوا زیرو پوائنٹ تک آیا۔ پھر وہاں سے بس میں سوار ہو کر پنڈی کے جنرل پوسٹ آفس پہنچا۔ وہاں اس نے

پچاس عدد لفافے خریدے۔ بازار سے ایک لیٹر پیڈ خریدا۔ پھر ہوٹل میں آ کر بیٹھ گیا۔ عظمیٰ نے اس سے سوال کیا۔ اس نے مختصراً اپنی ناکامی کی داستان سُنا دی۔ پھر خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا: "یہ خط کسے لکھ رہے ہو؟"

"پاکستان کے قانون ساز ادارے کو لکھ رہا ہوں۔ بڑے بڑے شہروں میں جتنے وکیل، بیرسٹر اور جج صاحبان ہیں، ان سب کے نام یہ خط پوسٹ کروں گا۔"

"ان سب کے نام اور پتے کس طرح حاصل کرو گے؟"

"میں کسی کے ذاتی نام اور پتے پر خط ارسال نہیں کروں گا۔ یہ تمام خطوط تمام شہروں کے سٹی کورٹ اور ہائی کورٹ وغیرہ کے تمام جج صاحبان اور قانون داں انجمنوں کے تمام وکیلوں اور بیرسٹروں کے پاس پہنچیں گے۔ ان تک پہنچانے کے لیے ذاتی نام اور پتے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

وہ تمام دن خط لکھتا رہا۔ کبھی ببلی سے دل بہلاتا رہا۔ شام تک اس نے تقریباً پینتالیس خطوط لکھے۔ تمام لفافوں کو ایک چھوٹے سے تھیلے میں ڈالا۔ پھر عظمیٰ اور ببلی کے ساتھ تفریح کے لیے نکل گیا۔ اس نے پوسٹ آفس پہنچ کر وہ لفافے پوسٹ کر دیے۔ وہ رات انہوں نے وہیں گزاری۔ دوسرے دن دس بجے وہاں سے روانہ ہوئے۔ شام کے چار بجے جب ان کی بس بڑے دریا کے پُل پر سے گزرنے لگی تو عظمیٰ نے یادگارِ پاکستان کو دیکھتے ہوئے کہا: "ہم وہاں جائیں گے۔ پھر شاہی قلعہ اور شاہی مسجد بھی دیکھیں گے۔"

وہ بس سے اتر گئے۔ شام کا وقت تھا۔ یادگارِ پاکستان کے پُررونق باغیچے میں بڑی چہل پہل تھی۔ مین گیٹ پر انہیں چار ایسے شخص نظر آئے جو آنے جانے والی عورتوں کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جب انہوں نے عظمیٰ کو دیکھا تو اسی پر نظریں جم کر رہ گئیں۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے بڑے دنوں کے بعد ساڑی پہنی تھی۔ ان دنوں امرتسر دُور درشن سے بھارتی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ ان فلموں کا اثر اس حد تک ہوا تھا کہ لاہور کی لڑکیاں کبھی کبھی ساڑیاں پہننے لگی تھیں اور اپنے ماتھے پر بندیا بھی سجانے لگی تھیں۔ عظمیٰ کے ماتھے پر بھی ایک بندیا چمک رہی تھی۔ جوڑا اتنی خوبصورتی سے باندھا تھا کہ دُور ہی سے بنگالی حُسن کی پہچان ہو جاتی تھی۔

بنگال کی زمین پر کہیں بھی قدم رکھو، ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔ لاہور کے کسی بھی باغ باغیچے میں جاؤ، ہر طرف پھولوں کی رنگا رنگی دیکھ کر نگاہیں حُسن سے اور دماغ خوشبو سے معطر ہو جاتے ہیں۔ عظمیٰ کو یہ شہر اسی لیے پسند تھا۔ اس نے مختلف باغیچوں میں اور گلبرگ کی شاندار کوٹھیوں کے لان وغیرہ میں اتنے رنگوں اور اتنی اقسام کے گلاب دیکھے تھے کہ نگاہیں ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ لاہور کو گلابوں کا شہر کہتی تھی۔ وہ لفٹ کے ذریعے یادگارِ پاکستان کے ٹاور کی بلندی پر پہنچے۔ وہاں سے شہر کو دُور دُور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ حدِ نظر تک نئے اور پرانے مکانات دکھائی دیتے ہیں۔ تاریخی عمارتوں کے علاوہ صدیوں پرانے اونچے نیچے شکستہ مکانات ہیں، ایسی پُرانی اور بوسیدہ عمارتیں بھی ہیں، جو آگے کی طرف جُھکی جا رہی ہیں جیسے تاریخ کی کمر جُھکی جا رہی ہو۔

ہر دَور میں شاہوں اور دولت مندوں کو نوازا جاتا ہے۔ آج کے دَور میں بھی تاریخی عمارتوں کی مرمت کی جاتی ہے۔ ان کو خوب سے خوب تر بنا کر رکھا جاتا ہے لیکن وہ بوسیدہ مکانات اور جُھکی ہوئی عمارتیں جو عوام کی ملکیت ہیں، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر زرِمبادلہ کمانے کے لیے ان عمارتوں کی بھی مرمت کی جاتی اور ان عمارتوں سے عوامی تاریخ کے مختلف باب کھولے جاتے تو سیاحوں کی بھیڑ زیادہ سے زیادہ ہوتی لیکن یادگارِ پاکستان کے ٹاور پر یا شاہی مسجد کے مینار پر چڑھ کر انکشاف ہوتا ہے کہ اس تاریخی شہر کا چہرہ صرف گلبرگ اور شادمان کالونی جیسے مہنگے علاقوں کی طرف بنایا، سنوارا اور نکھارا جا رہا ہے۔ باقی شہر وہی صدیوں پرانا ہے، جہاں غربت ہے، گندگی ہے، پھر بھی لوگ آسودہ رہتے ہیں۔ بات بات پر مسکراتے ہوئے زندہ دلانِ لاہور ہونے کا اعزاز برقرار رکھتے ہیں۔

عظمیٰ اور بھوتیاں یادگارِ پاکستان کے احاطے سے نکل کر شاہی مسجد کی طرف گئے۔ شام کا اندھیرا تقریباً پھیل چکا تھا۔ بھوتیاں نے اس کی گود سے بچی کو لیتے ہوئے کہا: "رات کو قلعے میں جا کر کیا دیکھو گی۔ پھر کسی دن آئیں گے۔ اب چلتے ہیں۔"

وہ شاہی مسجد کے دوسری طرف پہنچے۔ دوسری طرف ہیرا منڈی تھی۔ بھوتیاں عظمیٰ کو ادھر لے جانا نہیں چاہتا تھا ——— درمیان سے ایک اور راستہ مین روڈ کی طرف جاتا تھا۔ وہاں سے گزر کر وہ کسی بس میں یا تانگے میں سوار ہو کر ریلوے اسٹیشن تک جانا چاہتے تھے۔ وہاں سے پھر انہیں مغل پورہ کے لیے بس مل جاتی۔ بھوتیاں سے یہیں ایک زبردست غلطی ہوئی۔ وہ عظمیٰ کو ہیرا منڈی کے پُر ہجوم بازار سے بچا کر لے جانا چاہتا تھا لیکن یہ بھول گیا تھا کہ عورتیں ویران اور تاریک راستوں سے گزر کر بھی اس بازار تک پہنچتی ہیں۔

وہ اس ویران اور نیم تاریک راستے سے گزر رہے تھے۔ اچانک چاروں طرف سے حملہ ہوا۔ حملہ کرنے والوں نے پہلے بھوتیاں کے سر پر پیچھے سے زوردار ضرب لگائی تھی۔ وہ چکرا گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ اس کے باوجود اس نے گھوم کر ایک ہاتھ مارا۔ کسی کو لگا۔ لیکن اس سے پہلے ہی کسی اور نے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔ پھر اس پر دوسرا حملہ ہوا۔ اس کے بعد اس نے صرف ببلی کو روتے اور چیختے ہوئے سنا جیسے وہ اپنی ماں کو اور اپنے باپ کو پکار رہی ہو۔ عظمیٰ کی چیخ بھی سنائی نہیں دی۔ وہ اپنی تمام آخری قوتوں کو سمیٹ کر اٹھنا چاہتا تھا۔ اپنی بیوی اور بچی کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن بے دم ہو کر زمین پر گر پڑا۔ آنکھیں بند

ہوگئیں۔ دماغ بے حس ہوگیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو کسی اسپتال میں محسوس کیا۔ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ واقعی وہ اسپتال کے ایک بستر پر پڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچتا رہا۔ پھر اسے سب کچھ یاد آگیا۔ فوراً ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا: "عظمیٰ کہاں ہے؟ بیلی میری بچی؟"

نرس نے آکر کہا: "شور نہ مچائیں۔ دوسرے مریض سو رہے ہیں۔"

"میری بیوی اور میری بچی کہاں ہیں؟"

"تمہارے ساتھ ایک عورت یہاں لائی گئی تھی۔ وہ اب زنانہ وارڈ میں ہے۔"

وہ فوراً ہی بستر سے اُتر کر کھڑا ہوگیا: "زنانہ وارڈ کہاں ہے؟ پلیز مجھے راستہ دکھا دو۔"

نرس نے اس کی رہنمائی کی۔ اس وارڈ تک جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ڈاکٹر کے کمرے کے سامنے ہی عظمیٰ دکھائی دی۔ اس کا سر اور چہرہ پٹیوں سے بندھا ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہہ رہی تھی: "میں کچھ نہیں جانتی۔ میری بچی کہاں ہے مجھے بتاؤ؟"

بھوتیاں دوڑتا ہوا عظمیٰ کے پاس پہنچا۔ اس کی کٹی ہوئی زبان کوئی نہیں سمجھ رہا تھا: "بھوتیاں! ہماری بچی، ہماری بیلی نہیں ہے۔ پتا نہیں کون اسے اٹھا کر لے گیا ہے۔"

انسپکٹر نے کہا: "دیکھو! یہ اسپتال ہے، یہاں شور نہ مچاؤ۔"

بھوتیاں نے غصے سے پوچھا: "اگر آپ کی بیٹی کو کوئی اغوا کر لیتا تو کیا آپ.....؟"

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی انسپکٹر نے اسے ایک ہاتھ سے دھکا دیتے ہوئے کہا: "یو شٹ اپ۔ زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بچی گم ہوئی ہے۔ رپورٹ لکھاؤ، اپنا بیان دو۔"

عظمیٰ نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر دانت پیستے ہوئے کہا: "پتا نہیں ہم کتنی دیر تک اسپتال میں بے ہوش پڑے رہے۔ میری بچی کو لوگ کہاں لے گئے ہیں۔ آپ انہیں تلاش کیجیے۔ بیان ہم بعد میں بھی دے سکتے ہیں۔ صرف ہم سے حلیہ پوچھ لیجیے۔ ہوسکے تو ہمیں مغل پورہ کسی طرح پہنچا دیجیے۔ وہاں ہمارے مکان میں بیلی کی تصویر ہے۔"

انسپکٹر نے کہا: "اے یہ کیا گڑبڑ گڑبڑ بول رہی ہے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

کلیم الدین بھوتیاں سمجھانے لگا۔ انسپکٹر نے کہا: "اچھی بات ہے۔ میں اپنے دو سپاہیوں کو لے کر تمہارے ساتھ مغل پورہ تک جاسکتا ہوں۔ جاؤ ٹیکسی لے آؤ۔"

"انسپکٹر صاحب! کیا آپ ہمارے ساتھ چار قدم چل کر اسپتال کے باہر نہیں جاسکتے۔ آپ کو دیکھ کر کوئی بھی ٹیکسی والا رک جائے گا۔ ہم فوراً چلے جائیں گے۔"

ان کی باتوں کے دوران عظمیٰ بیلی کو پکار رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بالوں کو نوچ رہی تھی۔ پھر وہ چکرا کر گرنے لگی۔ بھوتیاں نے فوراً ہی اسے سنبھال لیا۔

⁂

جن کے پاس کھانے کے لیے روٹی اور پہننے کے لیے ایک سے دوسرا جوڑا نہیں ہوتا، سر چھپانے کے لیے کوئی چھت نہیں ہوتی، ایسے لوگ سکہ رائج الوقت کے بغیر کیسے زندگی گزارتے ہوں گے؟ نین تارا اور خسرو کو چھت نصیب ہوئی تھی۔ لیکن وہ اس کے سائے سے نکل آئے تھے۔ ان کے پاس بڑودیدی کے دیے ہوئے کچھ روپے تھے۔ جنہیں پاکستانی کرنسی میں تبدیل کرلیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کم از کم پینتیس ہزار روپے کے زیورات تھے۔ وہ کہیں بھی پناہ حاصل کرسکتے تھے۔

اجنبی شہر کے لوگ ایسے بے مروت بھی نہیں ہوتے تھے کہ رقم ملتی ہو اور کرایہ پر مکان نہ دیں۔ ایک کمرے کا مکان انہیں کرائے پر مل ہی گیا۔ مالکِ مکان نے یوں تو دور ہی سے بھانپ لیا تھا کہ وہ بنگلہ دیش سے آئے ہیں۔ پھر بھی ان سے طرح طرح کے سوالات کرتا رہا اور وہ سیدھے سادے انداز میں جواب دیتے رہے۔ دوسرے دن وہ نین تارا کو مکان میں چھوڑ کر اس علاقے کو اچھی طرح دیکھنے، سمجھنے کے لیے نکل گیا۔ خیال تھا، کہیں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ جو ہزاروں روپے کے زیورات تھے، انہیں وہ وہاں ہاتھ نہیں لگانا چاہتا تھا۔ اسے الیکٹریکل گڈز کی خرید و فروخت کا اچھا خاصا تجربہ تھا۔ بجلی کا کاریگر بھی تھا۔ اگر ڈپلومہ ہوتا تو وہ الیکٹریکل انجینئر کہلاتا۔ کسی سند کے بغیر اس نے خود کو بجلی مستری کی حیثیت سے پیش کیا۔ ایک دکان میں اسے ملازمت مل گئی۔

دکاندار تنخواہ کم دے رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے ملازمت قبول کرلی۔ وہ وہاں رہ کر بازار میں لین دین کے طور طریقے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ پہلے ایک ملازم کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ تجربات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تقریباً ایک سال کے بعد اس نے نوکری چھوڑ دی۔ اس دوران سونے کا بھاؤ کچھ بڑھ گیا تھا۔ جب اس نے نین تارا کے لیے زیورات کا ایک سیٹ رکھ کر باقی تمام کو فروخت کیا تو اسے چالیس ہزار روپے ملے۔ اس رقم سے اس نے لالوکھیت میں ایک دکان کرائے پر لی۔ اورنگی میں ایک پلاٹ خرید کر ایک کمرے کا مکان بنایا۔ ایک سال کی ملازمت کے دوران کاروبار میں ہاتھ پاؤں پھیلانا اچھی طرح آگیا تھا۔ دکان میں بجلی کا سامان فروخت کرنے کے علاوہ وہ بڑی بڑی، زیرِ تعمیر کوٹھیوں کی الیکٹریکل وائرنگ کے ٹھیکے لینے لگا۔ اس کے لیے اس نے باقاعدہ ملازم رکھے۔ کام اتنی عمدگی سے چلنے لگا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دن پھرنے لگے۔ صرف پانچ سال کے عرصے میں اس نے گلشنِ اقبال میں ایک بہت بڑا پلاٹ خریدا اور وہاں ایک خوبصورت سی کوٹھی بنانے لگا۔

OUT
TO
LUNCH

سرمائے کو بڑھانے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ بے ایمانی کی جائے کم تولا جائے۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ لوگ دیانت داری سے کاروبار کرتے ہیں اور معقول منافع حاصل کرتے ہیں۔ خسرو کا بھی یہی دستور تھا۔ بڑی بڑی کوٹھیوں اور عمارتوں میں کنسیلڈ وائرنگ کے جو ٹھیکے اسے ملتے تھے، ان میں وہ صحیح مال استعمال کرتا تھا۔ کچا کام کبھی نہیں کرتا تھا۔ ٹھیکے کی معیاد کے مطابق مقررہ وقت پر اپنا کام ختم کر دیتا تھا۔ کام بھی کھرا کرتا تھا۔ پیسے بھی کھرے لیتا تھا۔ اس کا حلقۂ احباب وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس دوران جن لوگوں سے ملتا، ان سے بنگلہ دیش میں ان محصور بہاریوں کا ذکر ضرور کرتا۔ ان سے اپیل کرتا کہ وہ سب متحد ہو کر تحریک چلائیں۔ حکومت سے درخواست کریں کہ جن لوگوں نے پاکستان کو وجود میں لانے کے لیے اپنا گھر، اپنی زمینیں چھوڑ دی ہیں، اپنا خون بہایا، اپنی عورتوں کی عزتوں کو داؤ پر لگایا، آج وہ پاکستان آنے کا حق رکھتے ہیں اور ان کا یہ حق ادا کیا جائے۔

لیکن ایک بے حسی طاری تھی۔ لوگ اپنی اپنی ذات کی تعمیر میں لگے تھے۔ انہیں پہلے اپنا پیٹ بھرنا تھا۔ پیٹ بھرنے کے بعد تن ڈھانپنا تھا۔ اس کے بعد بیوی بچوں کی فکر تھی۔ ان کی ضروریات پوری کرنے کے بعد اپنے مستقبل کو شاندار اور محفوظ بنائے رکھنے کی فکر لاحق رہتی تھی۔ کوئی بھی اپنے مسائل سے آزاد نہیں تھا۔ پھر بنگلہ دیش کے بہاریوں کے متعلق سوچنے کی کسے فرصت تھی۔ سب ہی ہمدردی کرتے تھے۔ وہاں کے لوگوں کے المیہ حالات سن کر افسوس کرتے تھے۔ وعدہ کرتے تھے کہ ان کے لیے ضرور کچھ کیا جائے گا لیکن وہ وعدہ وفا کرنے کا وقت نہیں آ رہا تھا۔

بارہ برس گزر گئے۔ اس طویل مدت میں بہاریوں کو پاکستان میں قدم رکھنے کا اجازت نامہ نہیں ملا۔ جو لوگ یہاں لاکھوں کی تعداد میں آ گئے وہ مختلف راستوں سے جبراً آئے اور چور دروازے سے آئے اور یہ کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے مگر وہ چور دروازے کیوں کھولے گئے؟ کس نے کھولے؟ کس نے کھولنے پر مجبور کیا؟ یہ ایسے سوالات تھے جن کا جواب صرف ضمیر کا دروازہ کھولنے کے بعد مل سکتا ہے۔

بہرحال ان بہاریوں نے یہاں آ کر اپنی رہائش کے لیے خیمے طلب نہیں کیے۔ انہوں نے اپنی مدد آپ کے طور پر کراچی کی سب سے پتھریلی زمینوں کو کھود کر مکانات بنائے۔ سبزہ اگایا۔ اس شہر کی قدیم ترین بستیاں آج بھی غلاظت کا ڈھیر بنی ہوئی ہیں۔ وہاں کے باشندے پانی اور بجلی کے لیے ترستے ہیں۔ اورنگی میں پانی کے نلکے اور دور تک پھیلی ہوئی بجلی کی روشنیاں دیکھ کر کوئی بھی غیر ملکی تبصرہ نگار یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ بہاری کتنے تیز رفتار ہیں۔ کتنے محنتی ہیں۔ کتنے باصلاحیت ہیں۔ یہ صرف آج کی بات نہیں ہے جب پاکستان وجود میں آیا تھا، تو مشرقی پاکستان میں پٹ سن کے کاشتکار لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ ہندو بنیے کچا پٹ سن کلکتہ کی جوٹ ملوں میں بھیج دیا کرتے تھے۔ ان بہاریوں نے مشرقی پاکستان میں قدم رکھا تو جوٹ ملیں چلنے لگیں۔ جوٹ ملیں ہوں، پیپر مل ہوں، ٹیکسٹائل ٹینریز ہوں یا ریلوے کے شعبے ہوں، جہاں جہاں پہیہ چلانے کی بات آئی، ان پہیوں کو یہ بہاری چوبیس برس تک چلاتے رہے۔ کبھی انہیں رکنے نہیں دیا۔

صلاحیتیں خواہ کسی قوم میں ہوں، اگر ان صلاحیتوں کو پنپنے نہ دیا جائے تو وہ زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔ کراچی ایک بندہ پرور شہر ہے۔ یہاں جو لوگ اپنی محنت، اپنی ہنرمندی اور اپنی علمی صلاحیتیں لے کر آتے ہیں انہیں یہاں پھلنے پھولنے کا خاطر خواہ موقع ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہاریوں کی اکثریت اسی شہر میں ہے۔ جناب رئیس امروہوی نے بے شمار مہاجروں کو اورنگی کے ایک بہت بڑے علاقے میں آباد کیا ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اپنے محسن کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ لوگ اس علاقے کو انہی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایک غور طلب بات یہ ہے کہ اورنگی میں بے شمار کالونیاں ہیں۔ بیشتر کالونیاں حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے گرامی سے موسوم ہیں۔ چند کالونیاں ماضی کے سرفروشانِ اسلام کے نام پر ہیں۔ کچھ ایسی کالونیاں ہیں، جنہیں پلاٹ فروشوں نے اپنے نام سے قائم کیا ہے۔ لیکن اورنگی کی دس لاکھ کی آبادی میں ایسی کوئی کالونی نہیں ہے۔ جو موجودہ دور کے کسی سیاسی رہنما یا سماجی رہنما یا کسی اور معروف ہستی کے نام سے موسوم ہو۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ سابقہ مشرقی پاکستان کے محبِ وطن بہاریوں کو یہاں لانے اور آباد کرنے کے سلسلے میں کسی بھی معروف شخصیت نے کوئی بڑا یا چھوٹا کارنامہ انجام نہیں دیا۔ اگر دیا ہوتا تو اورنگی ٹاؤن کی کوئی نہ کوئی کالونی آج ان کے نام سے پہچانی جاتی۔

بہرحال بارہ برس کے عرصے میں حوصلہ مند لوگ دوسری ہجرت کے زخم بھر رہے ہیں اور ہنستے بولتے ترقی کی راہوں پر گامزن ہیں۔ بارہ برس کے عرصے میں خسرو نے بھی بے پناہ ترقی کی۔ اس نے گلشنِ اقبال کی کوٹھی بھی فروخت کر دی۔ ڈیفنس میں ایک بہت بڑی عالی شان کوٹھی خرید لی۔ اب خسرو اور نین تارا کے لیے الگ الگ نئے ماڈل کی کاریں تھیں۔ ان کے بچوں کو اسکول لے جانے کے لیے بھی الگ کاریں موجود رہتی تھیں۔ اونچی سوسائٹی کی بڑی بڑی تقریبات میں انہیں مدعو کیا جاتا تھا۔ وہ اکثر دعوت دینے والوں کو صورت شکل سے پہچانتے نہیں تھے۔ بس ان کے نام اخبارات میں پڑھ لیتے تھے یا ٹی وی پر دیکھ لیتے تھے۔ ایسے ہی ایک معروف شخص نے اپنے ہاں بہت بڑی پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ اس پارٹی میں نین تارا کا سامنا اپنے دونوں بھائیوں طارق اور حامد سے ہو گیا۔ حامد نے ایک طویل عرصے سے اپنی بہن کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن بارہ سال پہلے طارق نے دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ اس کے دماغ میں پہلا خیال یہی آیا کہ جس طرح بڑی بڑی پارٹیوں میں چھوٹے لوگ کسی بڑی شخصیت کا سہارا لے کر گھس آتے ہیں، اسی طرح نین تارا اور خسرو بھی آئے ہیں۔ اس نے اپنی بہن اور بہنوئی میں جو نمایاں تبدیلیاں ہوئی تھیں، ان پر غور نہیں کیا کہ انہوں نے کتنا عمدہ لباس پہنا ہوا ہے ان کے چہروں پر کتنی رونق ہے۔ وہ ایسے پُراعتماد تھے جیسے منزل بہ منزل اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑتے وہاں تک چلے آئے ہوں۔ طارق نے قریب آ کر آہستگی سے پوچھا: ”تارا! تم یہاں؟ مگر کیسے؟“

”کیا آپ کو اعتراض ہے؟“

”نہیں، بس یونہی پوچھ رہا ہوں۔“

نین تارا نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا: ”ویسے تو میں اپنے ذاتی معاملات پر کسی سے گفتگو نہیں کرتی ہوں۔ لیکن آپ کو جواب دے دوں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ کوئی راتوں رات امیر بننے کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے۔ کوئی محنت اور مشقت کے ذریعے ایک مدت کے بعد یہ مقام حاصل کرتا ہے۔ آپ نے ایک مالدار عورت سے شادی کر کے صرف دو برس کے اندر اونچی سوسائٹی میں اپنے لیے جگہ بنائی۔ ہم بارہ برس کے بعد یہاں پہنچے ہیں۔“

طارق نے خسرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”اس کے تیور وہی پہلے جیسے ہیں۔ کیا اسے اتنا نہیں سمجھا سکتے کہ ایسی محفلوں میں مسکرا کر باتیں کرنا چاہیے۔“

خسرو نے جواب دیا: ”پہلی بات تو یہ کہ کوئی شریف عورت کسی ایرے غیرے سے مسکرا کر بات نہیں کرتی۔ دوسری بات یہ کہ آپ ہمارے کون ہیں اور ہم کس رشتے سے مسکرا کر باتیں کریں۔ پہلے آپ اپنی شناخت پیش کیجیے کہ آپ کون ہیں؟ اگر آپ میری بیوی کے بھائی ہیں تو ہمارے لیے کلیرنس سرٹیفکیٹ دینے کے بعد پہاڑ کی اونچی چوٹی پر جا کر کیوں بیٹھ گئے تھے اور وہاں بیٹھ کر ہماری پستی کا احساس ہمیں کیوں دلا رہے تھے؟“

نین تارا نے کہا: ”ہم بھی بڑی جاں فشانی کے بعد اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ اور یہاں آپ کے سامنے آ کر آپ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جو شخص اپنے ماں باپ کو بھول جائے۔ خونی رشتوں سے انکار کر دے اور اپنی شناخت بدل دے اس سے ہم کس رشتے سے ملیں۔ اگر ہم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں تو پھر آئیے اس بھری محفل میں ہم یہ اعلان کریں، کہ ہم مشرقی پاکستان سے آئے ہیں اور ہم بہاری ہیں۔ کیا اس بات کو آپ کی بیگم صاحبہ اور آپ کے سسرال والے برداشت کر سکیں گے؟“

وہ تذبذب میں، کبھی بہن کو اور کبھی بہنوئی کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا: ”بات جتنی بڑھاؤ بڑھتی جائے گی۔ اس سے بھلا کیا حاصل ہو گا۔ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا اس پر خاک ڈالو۔ آؤ، میں تمہیں تمہاری بھابی سے ملاؤں۔“

نین تارا انکار کرنا چاہتی تھی۔ اسی وقت ایک فربہ اندام خاتون وہاں پہنچ گئیں۔ وہ قد آور تھیں۔ ڈیل ڈول کے اعتبار سے ایسی پھیلی ہوئی تھیں کہ تین عورتوں کی جگہ کھڑی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی طارق یوں مستعد ہو گیا جیسے کسی آفیسر کے آتے ہی اس کا ماتحت اٹینشن ہو جاتا ہے۔ اس نے مسکرا کر خوشامدانہ لہجے میں کہا: ”بیگم! اچھا ہوا، آپ آ گئیں۔ میں ابھی نین تارا کو آپ کی طرف لانے والا تھا۔ آپ نے اسے پہچانا۔ یہ ہماری نین تارا ہے۔“

بیگم نے اپنے ماتھے پر بل ڈالے جیسے سوچ رہی ہوں۔ یاد کر رہی ہوں کہ نین تارا کون ہو سکتی ہے اور نین تارا سوچ رہی تھی۔ آخر ہماری ان بھابی میں ایسی کون سی بات تھی کہ بھائی جان نے ان سے شادی کی۔ ہاں ایک بات ضرور تھی۔ ان کے گلے میں جو نیکلس تھا، اس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ لباس قیمتی تھا۔ بیگم نے ناگواری سے کہا: ”طارق! میں نے کتنی بار کہا، مجھ سے پہیلیاں نہ بجھوایا کرو۔ بھئی سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے کہ یہ کون ہیں؟“

اسی وقت ایک شخص مائک کے سامنے پہنچ کر بلند آواز میں کہنے لگا۔ ”خواتین و حضرات! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس تقریب میں کسی ایسے جوڑے کا انتخاب کیا جاتا ہے جو پرکشش اور باوقار ہو اور مہمانوں کے ہجوم میں نمایاں ہو۔ اس تقریب کی ابتدا سے اب تک ہم فرداً فرداً آپ کی رائے معلوم کرتے رہے ہیں۔ مجموعی طور پر جس خوش نصیب جوڑے کو منتخب کیا گیا ہے وہ ہے لیڈی آف دی ایوننگ مسز تارا نعیم۔“

چاروں طرف سے تالیاں گونجنے لگیں۔ اس کے بعد اعلان کرنے والے نے کہا ”اور ان کے ساتھ ڈیشنگ پرسنیلٹی ہیں مسٹر نعیم الدین خسرو۔“ تالیاں پھر گونجنے لگیں۔ ان دونوں کو مائک کے سامنے آنے کے لیے کہا گیا۔ نین تارا نے مسکراتے ہوئے اپنی بھابی سے کہا: ”ابھی معلوم ہو جائے

گا کہ میں کون ہوں اور آپ کے مجازی خدا سے میرا کیا رشتہ ہے۔"

طارق نے پریشان ہو کر کہا: "نہیں نین تارا! تم ایسا نہیں کرو گی۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔ میری باتوں میں آپ لوگوں کا نام ہرگز نہیں آئے گا۔"

وہ خسرو کا ہاتھ تھام کر تالیوں کے شور میں مہمانوں کے ہجوم سے گزرتی ہوئی مائک کے سامنے آگئی۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون اس کے قریب ہی مائک کے سامنے آ کر کہنے لگی: "خواتین و حضرات! میں نے سب سے پہلے انہیں ووٹ دیا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مسز تارا نعیم کے حسن میں سنگھار میں، ان کے پہناوے میں نہایت ہی سادگی ہے۔ بھرپور مشرقیت ہے۔ ان سے میرا سوال ہے۔ مسز تارا نعیم! کیا آپ نے اس تقریب میں منفرد اور نمایاں نظر آنے کے لیے یہ سادگی اختیار کی ہے؟"

خاتون یہ سوال کر کے وہاں سے ہٹ گئیں۔ مجمع میں شامل ہو گئیں۔ نین تارا نے کہا: "میں بناوٹ کی عادی نہیں ہوں۔ سادگی میری گھٹی میں اور میری مٹی میں شامل ہے۔ شاید آپ لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ میں اور میرے شوہر آج سے بارہ برس پہلے پاکستانی مہاجر کی حیثیت سے بنگلہ دیش سے آئے تھے۔ بنگال کی سادگی مشہور ہے۔ شاید اس لیے کہ وہاں غربت ہے۔ ہیرے جواہرات کے زیورات بہت کم عورتوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ اسی لیے ایک زمانے سے وہاں کے سنگھار میں، وہاں کے پہناوے میں سادگی چلی آرہی ہے۔ میرا تعلق ایک بہاری خاندان سے ہے لیکن میں نے بنگال کی مٹی میں جنم لیا۔ وہاں کی ہوا میں سانس لیتی رہی اور وہاں کی عورتوں سے متاثر ہوتی رہی۔ یہاں میں جس تقریب میں بھی جاتی ہوں، وہاں ایک ایسی بہاری عورت کی نمائندگی کرتی ہوں جو بنگال کی خوبیوں کو اپناتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ کسی بھی صوبے کی خوبیوں کو اپنانا، انسان دوستی کے مترادف ہے لیکن اپنے صوبے کی شناخت چھوڑ کر کسی دوسرے صوبے کی شناخت اختیار کر لینا، یا اپنی ذات سے اور اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے آباؤ اجداد کے لہو سے سراسر انکار کرنا ہے اور ایسا وہی لوگ کرتے ہیں جو احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔"

وہ دور کھڑے ہوئے اپنے بھائی طارق کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک نوجوان عورت نے مائک کے پاس آ کر کہا: "خواتین و حضرات! میں مسز تارا نعیم سے سوال کرتی ہوں۔ ان کی لانبی، سیاہ اور گھنی زلفوں کا راز کیا ہے؟ یہ کون سا شیمپو اور کون سا ہیئر آئل استعمال کرتی ہیں؟"

یہ سوال کر کے وہ نوجوان عورت وہاں سے ہٹ گئی۔ مجمع میں شامل ہو گئی۔ نین تارا نے کہا: "میں جب سے پیدا ہوئی ہوں تب سے ناریل کے تیل میں سرسوں کا تیل ملا کر اپنے سر میں لگاتی ہوں۔ آج تک میں نے کوئی خوشبودار تیل یا کوئی شیمپو استعمال نہیں کیا۔ یہ لانبی، سیاہ اور گھنی زلفیں بھی بنگال کا عطیہ ہیں۔"

ایک شخص نے مائک کے پاس آ کر سوال کیا: "سنا ہے، بنگال کی لڑکیوں کو بچپن ہی سے رقص و موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کیا آپ نے بنگال کی خوبیوں میں سے فنونِ لطیفہ کی کوئی خوبی اپنائی ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہم آپ سے کوئی گیت سننا ضرور چاہیں گے۔"

یہ بات سنتے ہی چاروں طرف تالیاں بجنے لگیں۔ سب اس کی تائید کرنے لگے۔ نین تارا سے گیت سننے پر اصرار کرنے لگے۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولی: "یہ ضروری نہیں ہے کہ جو بنگال میں رہے وہ موسیقی اور رقص کی بھی تعلیم حاصل کرے۔ رونا سب کو آتا ہے، گانا سب کو نہیں آتا۔ مگر تقریباً سب ہی گنگنا لیتے ہیں۔ آپ اتنی محبت سے اصرار کر رہے ہیں تو میں ضرور گنگناؤں گی۔ آج سے بارہ برس پہلے جب میں یہاں آئی تو اپنے پیچھے بنگلہ دیش میں اپنے والدین کی لاشیں چھوڑ کر آئی تھی۔ یہاں پاکستان میں میرے دو بھائی ہیں۔ میں نے سوچا، ان بھائیوں کی پناہ میں مجھے ایک اچھی گھریلو اور خاندانی زندگی گزارنے کا موقع ملے گا۔ لیکن وہ دونوں بھائی میرے لیے جیتے جی مر گئے۔ آج بھی وہ میرے سامنے ہیں —— لیکن اس طرح کہ ہمارا درمیانی فاصلہ ختم نہیں ہوتا ہے۔ یہ گیت میں اپنے بھائی کے لیے گا رہی ہوں۔"

اس نے دور کھڑے ہوئے طارق کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ ایک بنگالی گیت گنگنانے لگی: "اے کوئلے آمی، اے کوئلے تمی۔ ماجھ کھانے نودیا بولے چولے جائے۔ اس پار میں ہوں اور اس پار تم ہو۔ ہمارے درمیان ایک ندی بہتی جا رہی ہے۔"

طارق سخت اضطراب میں مبتلا تھا۔ نین تارا نے گانے کے دوران دیکھا، اس کی بھابی طارق کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اس مجمع سے نکل رہی تھی۔ پھر وہ دروازے کے پاس پہنچے۔ طارق نے پلٹ کر بہن کو دیکھا۔ پھر بھابی نے اس کی لگام اپنی طرف موڑ لی۔ وہ دروازے کے اس پار نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ گیت کے بول تھرانے لگے تھے۔ تکلیف سے کراہنے لگے۔ نین تارا کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

*

عظمیٰ اور کلیم الدین بھوئیاں کے لیے دن دن نہیں رہا تھا اور رات رات نہیں رہی تھی۔ وہ مارے مارے پھر رہے تھے۔ کبھی پولیس اسٹیشن جاتے تھے۔ کبھی پولیس انسپکٹر کے گھر پہنچ کر اس کے دروازے پر بیٹھے رہتے تھے۔ ان کا ایک ہی مطالبہ تھا۔ تم قانون کے محافظ ہو۔ تمہارے علاقے میں ہماری بچی ہم سے چھین لی گئی۔ اسے کسی طرح بھی واپس لا کر دو۔

انسپکٹر کبھی انہیں نرمی سے سمجھاتا تھا۔ کبھی بیزار ہو کر دھتکارتا تھا۔ دھمکیاں دیتا تھا لیکن ان پر غصے اور دھمکیوں کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ بھلا اثر کیسے ہوتا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کیا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اپنے عزیز ترین رشتوں کو اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ عزتیں لٹتی ہوئی دیکھی تھیں۔ گھر جلتے ہوئے دیکھے تھے۔ مشرقی پاکستان کیسے نابود ہو گیا۔ یہ وہی جانتے تھے جن کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ وہ

اب ایک بار پھر وہ لٹ گئے تھے۔ اس بار ان کا لٹنا ناقابلِ برداشت تھا۔ کیونکہ عورت اپنی زندگی کی ساری پونجی ہار سکتی ہے۔ اپنی اولاد کو کسی قیمت پر ہارنا گوارا نہیں کرتی۔

کلیم الدین بھوتیاں مرد تھا۔ حوصلے سے کام لے رہا تھا لیکن اندر سے وہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اوپر سے عظمیٰ کو تسلیاں دیتا تھا۔ وہ روٹی نہیں کھاتی تھی تو اسے اس طرح سمجھاتا تھا کہ نہیں کھائے گی تو زندہ نہیں رہے گی۔ زندہ نہیں رہے گی۔ تو ہم اپنی بیٹی کو کس طرح تلاش کریں گے۔ آخر ایک نہ ایک دن تو وہ ہمیں ضرور ملے گی۔ ہم نے اس دنیا سے کچھ نہیں چھینا۔ یہ اللہ جانتا ہے اور جب وہ جانتا ہے تو آزمائشوں کے بعد انعام ضرور دیتا ہے۔ ہماری بیٹی بھی نہیں چھینی جائے گی۔"

وہ بیٹی کو پالینے کی آس میں زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ کھا لیتی تھی۔ لیکن کھانا بدن کو نہیں لگتا تھا۔ دن بدن اس کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ وہ آنکھ بھر کے نہیں سوتی تھی۔ کبھی نیند کی حالت میں ہوتی، تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی۔ چیخیں مار کر ببلی کو پکارتی۔ وہ کہاں کھو گئی؟ کس حال میں ہوگی۔ دشمن اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے۔ کیا اسے زندہ رکھا ہوگا۔ یا۔۔۔"

اس کے بعد وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی تھی۔ پاکستان کی محبت ہمیں بڑی مہنگی پڑ رہی ہے۔ کیا ہم اسی لیے یہاں آئے تھے کہ میری گود اجڑ جائے، میری بچی کو اغوا کیا جائے، اور اسے نہ جانے کس گندے ماحول میں پہنچا دیا جائے۔

کلیم الدین بھوتیاں نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ "یہ صرف پاکستان کی یا ملک کی یا ایک صوبے کی بات نہیں ہے۔ ایسا ہر جگہ ہوتا ہے۔ متحدہ بنگال سے لے کر آج تک بنگال میں جتنی لڑکیاں اغوا کی گئیں اور بازاروں میں فروخت کی گئیں ان کی مثال پورے برصغیر کے کسی اور صوبے میں نہیں ملتی۔ یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا، جب تک قانون کمزور رہے گا اور عورت بے بس رہے گی اور غنڈے سرکش رہیں گے۔"

وہ کچھ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ صرف اتنا جانتی تھی کہ اس کی ببلی چھن گئی ہے۔ جو اسے سمجھانے آتا تھا تو اس سے پوچھتی تھی، وہ کیسے ملے گی؟ کہاں ملے گی؟

محلے پڑوس کی عورتیں سمجھاتی تھیں۔ "آخر کب تک ماتم کرو گی؟ صبر سے کام لو۔ ابھی جوان ہو۔ اللہ نے چاہا تو اور بھی اولادیں ہوتی رہیں گی۔"

وہ ایسے وقت سہم کر ایک ایک کا منہ تکتی تھی اور کہتی تھی "نہیں نہیں۔ اب میں ماں نہیں بنوں گی۔ میں نے دیناج پور سے یہاں تک کتنی ہی ماؤں کی گودیں اجڑتے دیکھی ہیں۔ اب مجھ میں اپنی گود اجاڑنے کا حوصلہ نہیں ہے۔"

بھوتیاں اسے تنہائی میں سمجھاتا تھا۔ "پاگل نہ بنو۔ اگر اولاد ہوگی تو تمہارا غم ہلکا ہو جائے گا۔"

وہ اس سے کتراتی تھی۔ سوال کرتی تھی۔ "کیا اس لیے اولاد چاہتے ہو کہ میں اپنی ببلی کو بھول جاؤں۔ دوسری اولاد میں مگن ہو جاؤں؟ نہیں پہلے مجھے میری ببلی کا حساب دو۔ ایک کے بعد دوسرے زخم لگتے چلے جائیں تو آدمی حوصلے سے برداشت کر لیتا ہے لیکن ایک اولاد کے بعد دوسری اولاد چھننے کا اندیشہ ہو تو اس کے تصور سے ہی خوف آتا ہے۔ سارے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ نہیں پہلے مجھے ببلی چاہیے۔۔۔ مجھے میری ببلی چاہیے۔"

وہ مطالبہ کرتی رہی۔ کرتی ہی رہی۔ ایک برس گزر گیا۔ دو برس گزر گئے۔ کلیم الدین بھوتیاں کے نام ایک سرکاری خط موصول ہوا۔ اسے ملازمت کے سلسلے میں پھر اسلام آباد بلایا گیا تھا۔ اب عظمیٰ کو نہ تو اس کی ملازمت سے دلچسپی تھی، نہ ہی اپنے مستقبل کی فکر تھی۔ وہ لاہور چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ ہر آنے والی صبح یہ یقین دلاتی تھی کہ کہیں سے ببلی کے متعلق کوئی اطلاع ملے گی۔ وہ مجبوراً اسے پڑوسیوں کی نگرانی میں چھوڑ کر اسلام آباد گیا۔ وہاں پتا چلا، بہت سے بیرسٹر حضرات اور جج صاحبان نے اس کی سفارش کی تھی۔ دو برس پہلے اس نے جو خطوط لکھے تھے ان کے جوابات اسے براہِ راست موصول نہیں ہوئے تھے لیکن جواب دینے والوں نے حکومت سے اپیل کی تھی کہ وہ نوجوان خود کو مجسٹریٹ سلیم الدین بھوتیاں کا بیٹا کہتا تھا تو اسے مجسٹریٹ سلیم الدین بھوتیاں کی وفاداری اور خدمات کے طفیل تسلیم کر لیا جائے۔ وہ جو کوئی بھی ہو، "ایک پاکستانی ہے" جو آگ اور خون کے دریا سے گزر کر اپنے وطن کی محبت میں یہاں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس کی درخواستیں دو سال میں رنگ لائی تھیں۔ یہ بھی بڑا کرم تھا۔ اگر جواب بھوتیاں کی موت کے بعد آتا یا نہ آتا تو بھی کون پوچھنے والا تھا۔

بہرحال اسے لینگویج ڈپارٹمنٹ کے انگریزی اور بنگالی سیکشن میں ملازمت مل گئی۔ بنگلہ دیش سے خوشگوار تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ ایسے میں بنگالی زبان جاننے اور اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں کی ضرورت تھی۔ چونکہ اسامی خالی تھی، اس لیے اسے ملازمت مل گئی۔

اس نے اسلام آباد سے واپس آ کر یہ خوشخبری سنائی لیکن عظمیٰ کے لیے ببلی کی بازیابی ہی خوش خبری تھی اور وہ کوئی خبر نہیں سننا چاہتی تھی۔ اس نے اسلام آباد جانے سے انکار کر دیا۔ بھوتیاں نے سمجھایا۔ "دیکھو یہاں ہم دو برس سے اپنی بچی کو تلاش کر رہے ہیں۔ میں باپ ہوں، اور مجھے کتنا دکھ ہے اور میں اندر سے اپنے آپ کو کتنا منظم کر کے رکھتا ہوں۔ یہ میں جانتا ہوں۔ ورنہ میں بھی تمہاری طرح ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا۔ ہمیں زندگی گزارنے کے لیے صبر، تحمل اور حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ جہاں ہم نے اتنی آفات کا سامنا کیا، وہاں اس بچی کی جدائی بھی ہمارے مقدر میں تھی۔ اسے ہم برداشت نہیں کریں گے تو زندگی کیسے گزرے گی۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ ہو سکتا ہے، وہ آج کہیں مل جائے، کل مل جائے۔"

"اس آج اور کل میں کتنے دن گزر چکے ہیں۔ یہاں محلے پڑوس والے ہمیں جانتے ہیں۔ میں اپنے دکان دار سے بھی کہہ دوں گا۔ اپنے ملنے جلنے والوں کو بھی اپنا اسلام آباد کا پتا لکھوا دوں گا۔ جب بھی بلی ملے گی۔ وہ ہمیں فوراً ٹیلی گرام یا ٹیلی فون کے ذریعے اطلاع دے دیں گے۔ ہم یہاں پہنچ جائیں گے۔"

محلے کے بزرگوں اور جہاں دیدہ بوڑھی عورتوں نے سمجھایا: "بیٹی! تمہارا یہاں سے جانا ہی مناسب ہے۔ اس شہر میں رہو گی تو تمہارا صدمہ کبھی کم نہیں ہو گا۔ ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں، جب بھی تمہاری بلی کے بارے کوئی اطلاع ملے گی، ہم ٹیلی فون کے ذریعے اطلاع کر دیں گے یا اپنا کوئی آدمی تمہارے پاس بھیج دیں گے۔ تم اپنے شوہر کے ساتھ جاؤ، اپنا گھر سنبھالو۔"

عظمیٰ نے دل پر پتھر رکھ کر وہ شہر چھوڑ دیا۔ اسلام آباد آ گئی۔ یہ غلط ہے کہ جگہ چھوڑ دینے سے دکھ درد سے بھی پیچھا چھوٹ جاتا ہے۔ مرنے والوں پر اس لیے صبر آ جاتا ہے کہ موت انہیں واپس دنیا میں نہیں بھیجتی۔ لیکن جو غائب ہو جائیں، ان کے واپس آنے کی امید بندھی رہتی ہے۔ وہ کلیم الدین بھوئیاں کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے جاتی، کسی پارک میں یا کسی بازار میں ڈھائی تین برس کی بچیوں کو دیکھتی تو بے تحاشا ادھر دوڑ کر جاتی۔ ہر بچی اسے پیچھے سے بلی نظر آتی تھی۔ سامنے جا کر دیکھتی تو کلیجے پر پتھر سا لگتا۔

بھوئیاں اس کے پاگل پن کا عادی ہو گیا تھا لیکن وہاں جو زندگی گزر رہی تھی، اس میں کوئی لطف نہیں تھا۔ وہ کبھی کبھی سوچتا تھا، یہاں کیوں آیا۔ اگر بنگلہ دیش میں ہی رہ جاتا تو کیا برا تھا۔ جب وہ دفتر میں کام کرتا رہتا تو اس کے ساتھ کام کرنے والوں اس سے ملنے والوں کا پہلا سوال یہ ہوتا: "بھئی! تم تو بنگالی ہو، تمہیں تو بنگلہ دیش میں رہنا چاہیے تھا۔"

بھوئیاں کہتا: "اگر میں وہاں رہتا تو وہ مجھ سے سوال کرتے کہ بنگلہ دیش میں کیوں ہو؟ پاکستان جاؤ۔ تمہارا باپ تو پاکستان کا وفادار تھا۔ تو میں انہیں کیا جواب دیتا یا اب آپ کو کیا جواب دوں؟"

کبھی کوئی کہتا: "بھئی اب تو بنگلہ دیش سے اچھے تعلقات ہیں۔ تم یہاں سے جاؤ گے تو کوئی تمہارا محاسبہ نہیں کرے گا۔ وہاں تمہارے لیے زیادہ سے زیادہ ترقی کے مواقع ہیں۔"

وہ جھلا کر جواب دیتا: "آخر آپ لوگ ہمیں پاکستان میں کیوں برداشت نہیں کرنا چاہتے۔ کیا یہ پاکستان میرا نہیں ہے۔ میرا باپ آخر دم تک پاکستان کا وفادار رہا۔ اس نے بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا اور میں اپنے باپ کا جائز وارث ہوں۔"

"بے شک پاکستان آپ کا ہے لیکن ہزاروں کی تعداد میں پاکستانی باشندے مختلف ممالک میں جا کر روزگار حاصل کرتے ہیں۔ وہیں زندگی گزارتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ باہر رہنے سے وہ پاکستانی نہیں رہے۔ بیشک ہیں۔ ان کے ذریعے ہمارے ملک کو زرِ مبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ بنگلہ دیش میں رہتے تو.....؟"

"تو کیا ہوتا؟ کیا بنگلہ دیش میں تیل نکلتا ہے۔ کیا وہ امیر ترین ملک ہے کہ پاکستان سے مزدور، کاریگر، انجینئر، ڈاکٹر اور دوسرے باصلاحیت لوگوں کو وہاں جا کر پاکستان کے لیے زرِ مبادلہ کمانا چاہیے۔"

"مسٹر بھوئیاں! آپ تو ناراض ہو کر جواب دیتے ہیں۔ ہم سیدھی طرح بات کرتے ہیں اور آپ کو غصہ آ جاتا ہے۔"

"آپ سیدھی باتیں کرتے ہیں یا آپ کی باتوں کے پیچھے خود غرضی چھپی ہوئی ہے۔ میں تو خیر بنگالی ہوں۔ نہ ادھر کا رہا ہوں، نہ ادھر کا رہا ہوں لیکن آپ لوگ تو بنگلہ دیش کے لاکھوں محبِ وطن پاکستانیوں سے غفلت برت رہے ہیں۔"

"ہمارے غفلت برتنے یا نہ برتنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"بہت کچھ ہوتا ہے۔ ہر حکومت رائے عامہ کو تسلیم کرتی ہے بشرطیکہ آپ اور ہم اور ہمارے لیڈر رائے عامہ کو صحیح طور پر حکومت کے سامنے پیش کریں۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے ملک کے ایک دانشور منظور احمد اپنے ایک مضمون کے مطابق ایک رات لاہور نکلسن روڈ پر ایک بہت مشہور و معروف سیاست داں سے ملنے گئے۔ ان سے ملاقات کے دوران عرض کیا، "جناب! آپ کا سیاسی ماضی بڑا جمہوری، انقلابی اور تابناک ہے۔ آپ سہروردی صاحب کے ساتھی اور عوامی لیگ کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ کیا آپ اپنے پلیٹ فارم سے بہاریوں کو بنگلہ دیش سے پاکستان منتقل کرنے کے لیے کوئی تحریک چلا رہے ہیں؟"

معروف سیاسی رہنما نے فرمایا: "لاکھوں افراد کا منتقل کرنا ایک مشکل کام ہے بلکہ عملاً ناممکن ہے۔ پھر مقامی آبادی اور پاکستان کے صوبے ان کو لینے پر آمادہ نہیں ہیں۔"

منظور احمد صاحب نے کہا: "جناب! دو قومی نظریے کے مطابق بنگلہ دیش کے ہندی النسل باشندے پاکستانی ہیں اور وہ اپنے وطن آنے کا ہر طرح کا حق رکھتے ہیں۔ اگر بنگلہ دیش کے بے وطن لوگ اپنے مطالبے میں حق بجانب ہیں تو سیاست دانوں کا فرض ہے کہ رائے عامہ کو تیار کریں۔"

انہوں نے فرمایا: "ان بہاریوں کو ہندوستان جانا چاہیے، یا بنگلہ دیش میں رہنا چاہیے۔ پاکستان میں ان کی آمد ناممکن ہے۔"

منظور احمد صاحب نے کہا: "لیکن ان کا جمہوری اور قانونی حق جو پامال ہو گا؟"

"انہوں نے کہا: "صاحب! وہ تو ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ پھر آج کل ملک جن حالات سے گزر رہا ہے، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان آ کر وہ لوگ محفوظ ہو جائیں گے؟"

منظور احمد نے کہا: ”ہمارا انجام پاکستان سے مختلف نہیں ہو سکتا. لیکن ایک موہوم خدشے کی وجہ سے لاکھوں افراد کو موت کے منہ میں تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔“

لیکن وہ سیاسی رہنما بہاریوں کے بارے میں کوئی مدد کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور یہ صرف ان ہی پر منحصر نہیں ہے۔ یہ سیاسی رویّہ عام ہے۔“

ایک دن بھوتیاں نے پریشان ہو کر کہا: ”عظمی! ہم یہاں کیوں آئے تھے؟“

وہ خلا میں تکتے ہوئے بولی: ”اپنی بچی کا ماتم کرنے۔“

”عظمی! بِلی سے ہٹ کر بھی کبھی سوچا کرو۔ کب تک اس کی جدائی کا ماتم کرتی رہو گی۔ ہم نے سوچا تھا کہ یہاں آ کر اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے تحریک چلائیں گے اور ان کے لیے یہاں آنے کا راستہ ہموار کریں گے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم پاکستان کے وفادار ہیں لیکن وہ لاکھوں بہاری جو پاکستان سے وفا کر رہے ہیں۔ کیا خطا کر رہے ہیں؟“

عظمی کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ چپ بیٹھی رہی۔

بھوتیاں نے کہا: ”ہم بنگلہ دیش واپس جائیں گے۔“

عظمی نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں: میں اپنی بچی کے بغیر کہیں نہیں جاؤں گی۔ پہلے اسے ڈھونڈ نکالو پھر میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

وہ اپنی رَو میں کہتا جا رہا تھا: ”ہم یہاں سے جائیں گے۔ میں بنگالی ہوں۔ وہاں میرا تمہارا گزارا ہو سکتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں وہاں جائیں اور ہمارے پاسپورٹ اور اجازت نامے پر وہاں سے دو بہاری اِدھر چلے آئیں۔ وہ ہم سے زیادہ یہاں آنے کا حق رکھتے ہیں۔“

یہ بھوتیاں کے جذبات تھے لیکن قانون جذبات کو نہیں سمجھتا. ایسا کہیں نہیں ہوتا کہ ایک کے پاسپورٹ پر کوئی دوسرا چلا آئے۔ پھر عظمی، بِلی کے بغیر کہیں جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔

وقت تیزی سے گزرنے لگا۔ ملک میں مارشل لا نافذ ہو گیا. اس دوران صرف دو ہزار بہاریوں کو حکومت کی طرف سے پاکستان بلایا گیا اور انہیں لانڈھی کے ایک دُور افتادہ علاقے یا کالونی میں بسایا گیا۔ یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ اسی طرح قسطوں میں بہاریوں کو بلایا جائے گا۔ لیکن شاید یہ خبر محض ایک خبر تھی۔ کیونکہ آج تک بہاریوں کی دوسری قسط یہاں بلائی نہیں گئی۔

یہ ۱۹۸۴ء ہے۔ اکتوبر کا آخری دن ہے۔ ابھی ابھی دن کے ساڑھے دس بجے خبر ملی ہے کہ مسز اندرا گاندھی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ نہایت ہی افسوسناک خبر ہے۔ دنیا کے کسی حصے میں کسی کے ساتھ تشدد ہو تو وہ قابلِ مذمت ہے

۸۴ ،، مذمت ہے

تین لاکھ سوختہ بخت

محبِّ وطن بہاری ابھی تک ظلم سہہ رہے ہیں۔ تیرہ برس گزر چکے ہیں اور پتا نہیں کتنے برس گزرتے جائیں گے۔ نین تارا اور خسرو، عظمی اور کلیم الدین بھوتیاں کی یہ داستان ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور یہ اس وقت تک ختم نہیں ہو سکے گی جب تک محبِّ وطن بہاریوں کا ایک ایک بچہ اپنے ملک پاکستان نہیں پہنچ جائے گا۔ یہ ذکر اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک اسلامی مملکت کا ہر فرد اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکے گا کہ ایک طرف اسلامی نظام قائم کیا جا رہا ہے“ دوسری طرف ہزاروں بہاری مسلمان بنگلہ دیش میں کسمپرسی کی زندگی سے تنگ آ کر اپنا مذہب تبدیل کر رہے ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد عیسائیت کی تبلیغ کرنے والوں نے خانماں برباد مسلمانوں کے لیے خیمے مہیا کیے تھے۔ انہیں سونے کے لیے بستر، اوڑھنے کے لیے کمبل، کھانے کے لیے روٹی اور مختلف امراض کے لیے مفت دوائیں تقسیم کرتے رہے تھے۔ اس وقت انہوں نے عیسائیت کی تبلیغ نہیں کی تھی لیکن اب اپنے دروازے کھول دیے ہیں۔ جسے روٹی کپڑا، محفوظ پناہ گاہ اور بچوں کی تعلیم اور علاج کی ضرورت ہو“ وہ اس دروازے سے گزر جائے اور وہ گزر رہے ہیں۔ وہ مجرم نہیں ہیں۔ انہیں چاروں طرف سے کالی بلاؤں نے گھیر رکھا ہے۔ پاکستان کا دروازہ ان کے لیے بند ہے۔ کوئی اسلامی مشن ان کی دلجوئی کے لیے بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ جب چاروں طرف دروازے بند ہوں اور ایک ہی دروازہ کھلا ہو تو اپنی عورتوں اور بچوں کو بلاؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے اس ایک دروازے سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔

اگر جرمِ وفا محض ایک خیالی داستان ہوتی تو اس کا اختتام کسی بھی اچھے موڑ پر کیا جا سکتا تھا لیکن سچائی کسی موڑ پر ختم نہیں ہوتی۔ تاریخ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ جس لمحے اس سچی داستان کا اختتام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اسی لمحے دُور کہیں ایک نو برس کی بچی کے پاؤں میں گھنگھرو باندھے جا رہے ہیں۔ تا تھئی، تھا تھا تھئی کی تال پر اسے رقص کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ایک عورت نو برس سے اپنی اُجاڑ ممتا کا ماتم کرتی نظر آ رہی ہے۔ وہ رقص کرتے ہوئے پاؤں ابھی رقص کرتے رہیں گے۔ اب وہ ماں باپ اس معصوم بچی کو کبھی پہچان نہیں سکیں گے بالکل ایسے ہی جیسے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد یہاں کے پاکستانی وہاں کے پاکستانیوں کو پہچاننا بھول گئے ہیں۔ اس عرصے میں بِلی کا چہرہ بدل گیا ہے اور ہماری آنکھیں بدل گئی ہیں۔